سب رس

اجرا: ۱۹۳۸ء

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

فون نمبر (۳۸۴۶۹)

یر اعزازی : ڈاکٹر مغنی تبسم

عاون مدیر : وقار خلیل

د ۴۲ جنوری، فروری ۱۹۸۳ء شمارہ (۱: ۲)

ست فی پرچہ : ۲ روپے

دارۂ ادبیات اردو، پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد ...

مجلس مشاورت

صدر — سید علی اکبر

نائب صدر — حامد علی عباسی

معتمد — ڈاکٹر مغنی تبسم

ارکان

پروفیسر گوپی چند نارنگ

سید ہاشم علی اختر

ین راج سکینہ

عابد علی خاں

محمد اکبر الدین صدیقی

پروفیسر سراج الدین

محمد منظور احمد

رسالانہ	بیرونی ملکوں سے	
روپے	ہوائی ڈاک سے	بحری ڈاک سے
ب خانوں سے ۲۵ روپے	مشرق وسطی ۱۰ ڈالر	۴ ڈالر
ریعہ رجسٹری ۵۰ روپے	امریکہ ۱۶ ڈالر	۶ ڈالر
ستان، برما، سیلون	۸ ڈالر	۳½ ڈالر
نگلستان	۶ پونڈ	۳ پونڈ

مطبوعہ نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان، حیدرآباد

فہرست

اپنی باتیں

عثمانیہ یونی ورسٹی کے فارغ التحصیل دانشوروں نے مختلف شعبۂ حیات میں اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر حیدرآباد اور مادرِ جامعہ کا نام ہر دور میں روشن رکھا۔ طیلسانینِ عثمانیہ نے ملک کے چپہ چپہ میں سائنس، آرٹ، ادب اور کلچر کے شعبوں کے علاوہ تعلیمی اور تنظیمی عہدوں پر فائز رہ کر اپنی اعلیٰ صلاحیتوں سے ملک اور اربابِ وطن کی خدمت انجام دی اور غیر معمولی شہرت اور عزت حاصل کی۔ مادرِ جامعہ کے ایسے ہی چند نامور سپوتوں میں جناب سید ہاشم علی اختر (آئی اے ایس) کا شمار ہوتا ہے، جنھیں حکومت آندھرا پردیش نے ان کی علمی اور تنظیمی صلاحیتوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے عثمانیہ یونی ورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدے کے لیے منتخب کیا۔ جناب ہاشم علی اختر کا اس عہدۂ جلیلہ پر فائز ہونا نہ صرف ادارۂ ادبیاتِ اردو کے لیے ایک اعزاز ہے بلکہ ریاست کے اردو بولنے والوں کے لیے باعثِ افتخار بھی ہے۔ موصوف نے بحیثیت معتمد عمومی ادارہ، اس انسٹی ٹیوٹ کی ہمہ جہتی علمی ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں کو تقویت بخشی اور گولڈن جوبلی تقاریب کا اہتمام کر کے ادبی دنیا سے خراج حاصل کیا۔ امید ہے کہ عثمانیہ یونیورسٹی کے طلبہ اور اساتذہ جناب ہاشم علی اختر کی دانشورانہ صلاحیتوں سے استفادہ کرتے ہوئے جامعہ کو اس کے سابقہ سنہرے دور سے مربوط کرنے میں عثمانیہ برادری کے اس نامور فرد سے بھرپور تعاون کریں گے۔ ہم ادارۂ سب رس اور ادارۂ ادبیات کی جانب سے جناب ہاشم علی اختر صاحب کی خدمت میں دلی مبارکباد اور ہدیۂ تہنیت پیش کرتے ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ وہ ادارۂ سب رس سے دیرینہ تعلق برقرار رکھیں گے اور
۴
کارکنانِ ادارہ کو اپنے مشوروں اور ہدایتوں سے مستفید فرماتے رہیں گے۔

یومِ جمہوریہ ہند کے موقع پر معروف ادبی شخصیتوں کو صدرِ ہند نے پدم شری کے خطاب سے نوازا، جن میں اردو کی صاحبِ طرز افسانہ نویس محترمہ صالحہ عابد حسین اور ممتاز ڈرامہ نویس جناب حبیب تنویر قابلِ ذکر ہیں۔ ہم ہر دو اصحاب کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ مرکزی ساہتیہ اکیڈمی نے صفِ اوّل کے نقاد ڈاکٹر و پروفیسر گیان چند جین (صدر شعبہ اردو سنٹرل یونیورسٹی حیدرآباد) کو ان کی تحقیقی اور تنقیدی خدمات کے اعتراف میں ادبی انعام سے نوازا ہے۔ پروفیسر جین اپنی تحقیقی دروں بینی اور تنقیدی صلاحیت کی آپ مثال رہے ہیں۔

ڈاکٹر وحید اختر جدید نسل کے باشعور نقاد و شاعر ہیں اور مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے استادِ فلسفہ کی حیثیت میں نمایاں رہے ہیں، آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی حیدرآباد نے انھیں مخدوم ادبی ایوارڈ کے لیے بہ کثرتِ آراء منتخب کیا ہے۔
(باقی صفحہ ۵۳ پر دیکھیے)

ڈاکٹر گیان چند جین

دکنی کے لسانی رشتے

زمان و مکان کا پھیلاؤ ایک زبان میں بہت سی بولیوں کو جنم دیتا ہے۔ اگر ایک زبان مثلاً ہندی بڑے علاقے پر پھیلی ہوگی تو اس میں مکانی اعتبار سے کئی بولیاں مثلاً ہریانی، کھڑی، برج، بندیلی وغیرہ پہلو بہ پہلو افتادہ ہوں گی۔ دوسری طرف ایک زبان کا زمان میں طویل ارتقا ہوگا تو کئی سو سال کے بعد اس کا روپ اتنا بدل جائے گا کہ قدیم اور جدید روپ دو مختلف بولیوں جیسے معلوم ہوں گے۔ قدیم فارسی اور جدید فارسی میں یہی رشتہ ہے دکنی اردو کی ایسی بولی ہے جو زمان اور مکان دونوں کے تفاوت کی آفریدہ ہے ادبی دکنی اور شمالی ہند کی اردو میں علاقائی بعد بھی ہے زمانی بھی۔ دکنی مقدم ہے شمالی اردو مؤخر۔ اردو اور دکنی کا یہی تعلق ہے کہ دکنی اردو کی ایک پارینہ بولی ہے۔

پاکستان میں ڈاکٹر سہیل بخاری اور ہندوستان میں آمنہ خاتون کو اصرار ہے کہ دکنی اور شمالی اردو کے فرق کے پیشِ نظر دکنی کو اردو سے علاحدہ زبان کہا جائے۔ سہیل بخاری اپنی خود ساختہ اصطلاح میں دکنی کو بیجاپوری کہتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

"مدعا کہنے کا یہ ہے کہ دکنی یا بیجاپوری اردو ہی کی طرح لیکن اردو سے الگ ایک آزاد و مستقل زبان ہے جو آج بھی بیجاپور میں سنی جا سکتی ہے۔ یہ زبان اپنی پڑوسن دکنی سے بہت زیادہ ملتی ہے[1]

"مورخینِ ادب بیجاپوری شعرا کے جس کلام کو تاریخِ ادب میں شامل کر رہے ہیں وہ اردو میں نہیں بیجاپوری زبان میں ہے"[2]

"بیجاپوری کو قدیم کہنے والے شاید اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ بیجاپور میں آج بھی وہی زبان بولی جا رہی ہے جس میں قدیم دکنی شعرا اور ادبا نے آج سے چند سو سال پہلے اظہارِ خیال کیا تھا جسے ہمارے مورخین اردوئے قدیم کا نام دے رہے ہیں۔ آج اسی زبان میں وہاں لوک گیت گائے جا رہے ہیں اور لوگ اپنے اپنے گھروں اور بازاروں میں اسی بولی سے کام چلا رہے ہیں"[3]

مجھے اس میں بہت شبہ ہے کہ سہیل بخاری کبھی بیجاپور آئے ہوں گے۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ دکن میں آج بھی قدیم دکنی شعرا کی زبان بولی جا رہی ہے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں لکھتے ہیں:۔

"موجودہ دکنی کلاسیکی دکنی کی اکثر خصوصات کھو چکی ہے"[4]

دکن کی موجودہ بول چال کی اردو میں قدیم دکنی کے بعض روپ اور الفاظ مل جاتے ہیں لیکن بحیثیت مجموعی یہ قدیم دکنی سے کافی مختلف اور شمال کی اردو سے بہت مماثل ہے۔ سہیل بخاری اپنی تائید میں باقر آگاہ کی مثنوی نہہ درپن (معجزات نبی کریم) ۱۲۰۶ھ کا یہ شعر درج کرتے ہیں

اگر بھاکے میں اردو کے میں کہتا
کوئی اس کو یہاں کے لوگوں سے نہ پوچھتا ۵

ظاہر ہے کہ یہاں اردو کے بھاکے سے مراد شمالی ہند کی اردو کا لہجہ ہے۔ انھوں نے دو لہجوں یا بولیوں کا ذکر کیا ہوگا دو زبانوں کا نہیں۔ "دکنی اور اردو دو مختلف" زبانیں ہیں، اس کی تردید میں دلائل دینا تضیع اوقات اور تحصیل حاصل ہے۔ ولی کی غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جن میں سے پہلا قدیم زبان میں اور دوسرا اتنی شستہ زبان میں ہے کہ جسے آج بھی قبول کیا جا سکتا ہے

تیں دکھا کر اپس کے مکھ کی کتاب
علم کھویا ہے دل سوں قاضی کا
اے ولی سرو قد کو دیکھوں گا
وقت آیا ہے سرفرازی کا

کیسیچیں اپس انکھیاں منے جوں کجل جو اہر
عشاق کے گر ہاتھ وہ خاکِ چرن آوے
سایہ ہو مرا سبز برنگ پرِ طوطی
گر خواب میں وہ نو خطِ شیریں بچن آوے

ان جوڑوں کا پہلا شعر بالیقین دکنی میں ہے اور دوسرا جدید اردو میں۔ کیا یہ غزلیں ایک زبان میں نہیں دو زبانوں میں ہیں۔

دراصل دکنی اور اردو میں زبان کی دو منزلوں (قدیم وجدید) کا تعلق ہے۔ طبقات الشعرا میں قدرت اللہ شوق نے لکھا ہے کہ شاہ سعد اللہ گلشن نے ولی کو مشورہ دیا۔

"شما زبان دکنی را گزاشتہ ریختہ را موافق اردوئے معلی شاہ جہاں آباد موزوں بکنید"

اس کے یہ معنی نہیں کہ گلشن نے ولی کو کسی دوسری زبان میں لکھنے کا مشورہ دیا تھا مثلاً یہ کہ تم دکنی چھوڑ کر آسامی میں لکھنے لگو بلکہ یہ کہ اسی زبان کے دوسرے لہجے، اسلوب یا بولی کو اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔

مجھے یہ اعتراف کرنے میں باک نہیں کہ شمالی ہند کے قدیم شعرا نے دکنی کو کم قدر قرار دیا تھا باقر آگاہ مثنوی گلزار عشق (۱۲۱۱ ہجری) کے دیباچے میں لکھتے ہیں

"اکثر جاہلان بے معنی و ہرزہ داریانِ لایعنی زبان دکنی پر اعتراض اور گلشنِ عشق و علی نامہ پر اعتراض کرتے ہیں اور جہلِ مرکب سے نہیں مانتے کہ جب تک ریاست سلاطینِ دکن کی قائم تھی زبان ان کی درمیانے ان کے خوب رائج اور طعن و شماتت سے سالم تھی ...... جب شاہانِ ہند اس گل زمین جنت نظیر کو تسخیر کیے، طرز روزمرۂ دکنی نہج محاورۂ ہند سے تبدیل پائے تا آنکہ رفتہ رفتہ اس بات سے لوگوں کو شرم آنے لگی" ۶

معیاری زبان کے علاقے سے دور کی بولیا

بکو چشم کم سے دیکھا ہی جاتا ہے لیکن اس کی وجہ سے وہ بولیاں معیاری زبان کے حصار سے نہیں نکل جاتیں۔ دکنی، اردو کی ایک بولی ہے۔ لسانیاتی اصطلاح میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ علاقائی اعتبار سے مغربی ہندی کی پانچ بولیاں کی جاتی ہیں۔ ہریانی، کھڑی بولی، برج بھاشا، قنوجی، بندیلی ان میں ایک چھٹی یعنی دکنی کا اضافہ بھی کرلیا جائے۔ یا پھر دکنی کو کھڑی بولی ہی کا ایک روپ مان سکتے ہیں۔

اس مضمون میں دکنی کا دوسری زبانوں سے تعلق کھوجنا ہے۔ دکنی کی بنیادی زبانوں مثلاً سنسکرت، پراکرتوں، اپ بھرنشوں، مغربی ہندی اور عربی فارسی وغیرہ پر غور نہیں کیا جائے گا بلکہ ملک کی دوسری زبانوں اور دکنی کے تار ملائے جائیں گے۔ اس سلسلے میں دو کارنامے قابلِ ذکر ہیں۔

۱۔ محمود شیرانی کی پنجاب میں اردو (۱۹۲۸ء) جس میں انھوں نے پنجابی اور قدیم اردو، بالخصوص دکنی کے اشتراکات کی طرف پہلی بار توجہ دلائی۔ اس سے یہ واضح ہوگیا کہ اردو اگر پنجابی سے ماخوذ نہیں تو بھی شدت سے متاثر ضرور ہے۔

۲۔ دوسری کتاب عثمانیہ یونی ورسٹی کے سابق پروفیسر ڈاکٹر شری رام شرما کا تحقیقی مقالہ ہے جو اصلاً ہندی میں ہے لیکن جس کا اردو ترجمہ مولوی غلام رسول نے "دکنی زبان کا آغاز اور ارتقا" کے نام سے کیا۔ اسے ساہتیہ اکیڈمی آندھرا پردیش نے ۱۹۶۷ء میں شائع کیا۔ اس میں دکنی کے مختلف عنصر کی اصل، ارتقا اور دوسری ہندوستانی زبانوں

سے رشتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ ایک تاریخ ساز کارنامہ ہے جسے اگر کسی یورپی مستشرق نے جرمن یا انگریزی زبان میں پیش کیا ہوتا تو اس کی دھوم مچ جاتی۔ اردو ترجمے کے مقدمے میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے درست لکھا ہے کہ یہ کتاب ژول بلاک کی "مراٹھی زبان"، ڈاکٹر سنتی کمار چٹرجی کی "بنگالی کا آغاز و ارتقا" اور ڈاکٹر بابو رام سکسینہ کی "اودھی کا ارتقا" کے مرتبے کی کتاب ہے۔ اسے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو اور ہندی دونوں میں ڈاکٹر شری رام شرما کے مرتبے کا دکنی کا عارف و مزاج داں نہ ہوا ہے نہ ہے۔

اردو ایک ہندوستانی زبان ہے۔ اس کی دکنی بولی ہندوستانیت میں یہاں تک شرابور ہے کہ اہلِ ہندی اسے ہندی کہنے پر مصر ہیں۔ اہلِ اردو کی یہ کمزوری ہے کہ وہ عربی، فارسی کے تو ماہر ہوتے ہیں لیکن اردو سے قبل کے ہندوستان کے لسانی نقشے سے براہِ راست واقفیت نہیں رکھتے۔ ان کے لیے یہ ایک بند قلعہ ہے جس کے بارے میں ہندی والوں سے کچھ سن سنا کر لکھ دیتے ہیں۔ گویا ہم اپنی دھرتی سے اکھڑے ہوئے ہیں۔ تاریخی لسانیات پر اردو میں جو کچھ لکھا جاتا ہے .... وہ ہندی سنسکرت کے کارناموں کی زلہ ربائی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اردو اور دکنی کے تمام بنیادی الفاظ کا سلسلہ اپ بھرنش، پراکرت اور پالی سے ملتا ہے۔ ڈاکٹر شرما نے اپنی کتاب میں ایک طرف دکنی کے رشتے ہم عصر زبانوں سے تلاش کیے ہیں تو دوسری طرف ماضی میں پیچھے کو سفر کرکے اپ بھرنش، پراکرت اور سنسکرت میں دکنی الفاظ کی اصل کی نشاندہی

کی ہے۔ یہ راقم الحروف ۱۹۵۶ء سے تاحال ایک دو سال چھوڑ کر ہمیشہ دکنی کی تدریس کرتا رہا ہے۔ شرم کی بات ہے کہ مجھے ۱۹۸۱ء ہی میں اردو کی اس کتاب کے وجود کا علم ہوا۔ میرا یہ مضمون عام طور سے اسی کتاب سے ماخوذ ہے۔

دکنی اور دوسری ہندوستانی زبانوں کی مماثلت کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

دکنی اور پنجابی

محمود شیرانی نے قدیم اردو اور پنجابی کی مماثلت دکھاتے وقت دکنی اور پنجابی کے لیے مشترک عناصر پر زور دیا۔ ان کا عندیہ ہے کہ یہ دکنی میں پنجابی سے درآمد کیے گئے۔ ذیل میں ان کی اور ڈاکٹر شرما کی کتاب سے لے کر چند مماثلات درج کیے جاتے ہیں۔

۱۔ دکنی میں پنجابی کی طرح لفظوں کے دوسرے طویل مصوتے کو مختصر بنانے کا رجحان ہے مثلاً لک (لاکھ) منگ۔ تٹنا۔ (ٹوٹنا)۔ بندنا (باندھنا)۔ بہت۔ ڈبا (ڈربا)۔ لیکن پنجابی کے برخلاف اس کی تلافی کے لیے اگلا مصمتہ مشدد نہیں کیا جاتا۔ پنجابی میں لکھ بت وغیرہ کا آخری مصمتہ مشدد ہے۔

۲۔ ڑ اور ڑھ کی جگہ بعض اوقات ڈ اور ڈھ لانا مثلاً بڈیا (بڑا)۔ بڈی (بڑھی)۔ پڈھیا (پڑھا)

۳۔ الفاظ میں ہکاریت (ہائے مخلوط) کو حذف کرنے کا رجحان مثلاً بی۔ بت۔ بڑی۔

۴۔ فارسی عربی الفاظ کے آخر میں حشوی ی کا اضافہ مثلاً خواری۔ غروری۔

۵۔ جمع میں ' اں ' کا اضافہ مثلاً لوگاں۔ بعض خلافِ قیاس جمع کے صیغے پنجابی سے مماثل اور غالباً ماخوذ ہیں مثلاً

سات سے ستیں۔ دو سے دوہوں۔ برس سے براں۔ غم سے غمیں

۶۔ ضمیر اشارہ قریب الیہ۔ ای۔ اے اور اشارہ بعید اوہ۔ او

ان میں ای، او لہندا سے مماثل ہیں۔

۷۔ مصدر میں نا کے بجائے محض ' ن ' کا خاتمہ مثلاً ' چلن ' بمعنی چلنا۔ پھرن۔

مصدر کے آخر میں ' نا ' بھی ہو تو اس کی تعریف میں آ کر اکثر محض ' ن ' پر اکتفا کرنا مثلاً کاپنے لگا کے بجائے کاپن لگا '

۸۔ ' گا ' کے معنی میں سی لانا مثلاً ہلاسی نا (نہیں ہلائے گا)۔

۹۔ ماضی مطلق میں ا کے بجائے ' یا ' کا لاحقہ لگانا۔ اس کی ی مخلوط ہوتی ہے اور پنجابی سے مماثل ہے مثلاً بولیا ، بوجیا

۱۰۔ ماضی مطلق کے آخر میں بعض اوقات پنجابی کی طرح ' تا ' کا لاحقہ لگانا مثلاً

دینا ہور کینا اب سوں خطاب (احمد دکنی)

درج بعد شعر میں اس کے مقابل میں کینا اور لینا ہے۔

۱۱۔ بعض اوقات امر کے لیے ' یں ' کا لاحقہ لگایا جاتا ہے مثلاً آپ کریں ، آپ آویں۔

۱۲۔ بعض فعلی مادے یا مصدر دکنی اور پنجابی میں مشترک ہیں لیکن شمالی ہند کی اردو میں نہیں ملتے مثلاً آکھنا (کہنا)۔ اپڑنا (پہنچنا) لوڑنا (ضرورت ہونا)

سٹنا (پھینکنا)، پچھانتا (پہچاننا) بھالنا (تلاش کرنا)
ونا (لگانا)، پاما (ڈالنا) لڑنا (سانپ بچھو کا کاٹنا)
ناسنا (بھاگنا - پنجابی نسنا) - کھڑنا (کھڑا ہونا)
۱۳ - کہیں کہیں حرف جار 'نوں' بمعنی 'کو'
مل جاتا ہے جو خالص پنجابی ہے
۱۴ - نہ کی جگہ 'نہ' اور 'ناں' پنجابی سے
مماثل ہیں۔
۱۵ - حالت مجروری میں 'وں' کا لاحقہ
لگانا مثلاً
جتی کا حال دیکھ آ کے نطروں (محمد امین)
[illegible] نظروں سے [illegible] پنجابی میں 'پچھوں' کے معنی پیچھے
سے اور 'اگوں' کے معنی 'آگے' [illegible] ہوتے ہیں۔
۱۶ - [illegible] اسم کے آخر میں لاحقہ
"یں" لگانا مثلاً
[illegible] کوئی اس راتیں بالک کوں (محمد امین)
'راتیں' بمعنی 'رات میں'
۱۷ - [illegible] اسم، فعل اور حرف وغیرہ میں
جمع کا لاحقہ [illegible] مثلاً [illegible] نشانیاں دکھیاں
کیاں - معیاری اردو میں [illegible] جمع کا لاحقہ لگایا جاتا
ہے [illegible] مثالیں
[illegible] (معراج العاشقین)

[illegible] (احمد دکنی)
جمع [illegible] نظم میں
[illegible] کے چیتیں [illegible] ہوتا ہے۔
۱۸ - دکنی میں ایسے متعدد الفاظ ہیں جو پنجابی
سے مشترک ہیں۔ لیکن شمالی ہند کی اردو میں نہیں ملتے۔
فعلی مادّوں کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ چند دوسرے الفاظ یہ ہیں۔
بھوک (جھوٹا) - اجنوں (آج تک) - تیچھے
ہور - نیڑے - نال (ساتھ) - لئی (واسطے) - چکڑ
(کیچڑ) - بھین (بہن) - دولاں (دونوں طرف) - کھیر
(دودھ) - لوک (لوگ) - جوک (جونک) - کاند (دیوار، پنجابی کندھ) - نک - منجا (پنجابی منجھا) - لوڑ لوڑی
(اپنی خوشی دوسرے کی خوشی پر چھوڑنا)
علامت '<' کے معنی ہیں کہ اس سے پہلے
کا لفظ مشتق ہے اور بعد کا لفظ ماخذ ہے۔ اس کی
الٹی علامت '>' کے معنی ہیں کہ اس سے پہلا کا لفظ ماخذ
ہے اور اس کے بعد کا لفظ مشتق ہے۔ یعنی زاویے کی
نوک یا جوڑ ماخذ کی طرف اشارہ کرتا ہے اور کھلے ہوئے
اضلاع مشتق روپ کی طرف۔

(ب) اردو اور ہریانی۔

محمود شیرانی نے قدیم اردو کی جن خصوصیات کو پنجابی
سے مشترک اور ماخوذ بتایا ہے ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی کوشش
ہے کہ ان میں سے بیشتر کو ہریانی سے متعلق اور ماخوذ کر دیا
جائے۔ اس سلسلے میں میرے دو معروضات ہیں۔
۱- انھوں نے جن نمونوں مثلاً محبوب عالم شیخ جیون
مولانا باجدی وغیرہ کی مثنویوں کو ہریانی کا نمائندہ سمجھا ہے
وہ قطعاً ہریانی نہیں۔ وہ ہریانہ کے ارد گرد مصنفین کی اردو
ہے۔ ہریانی یا بانگرو ذیل کی زبان کو کہتے ہیں۔
کوݨ جاوے سَے (کون جاتا ہے)
ہور کے جاوَے سُو۔ ایپ تھارے تَے اُتّے
بھٹا دوں گا ارادہ کیا چاہتے ہو۔ اب تم سے اس کی ملاقات

کرادوں گا)

تجھیلی میں تئے پسنا نکڑن لاگ رہیا۔ (ہتھیلی میں سے پسینہ نکل رہا ہے)

ممکن ہے ہریانے کے اردو مصنفین کی تخلیق میں کہیں ہریانی بولی کے صیغے ہوں لیکن ہمارے دو مصنفیں کی زبان سے ہریانی کے نمونوں کا استثنا نہیں کر سکتے

۲۔ پنجابی سے نہیں کہ نہیں۔ کسی مشترک خصوصیت کو پنجابی نہ کہہ ہریانی کہہ دینے سے کوئی ذہنی آسودگی نہیں ملتی۔ پنجابی نسبتاً قدیم، قوی اور بالیدہ زبان ہے۔ اس میں قدیم زمانے سے ادب ملتا ہے۔ ہریانی کم ترقی یافتہ بعد کی بولی ہے جس میں قدیم ادب نہیں۔ خود ہریانی پر پنجابی کا اثر ہے بہرحال ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے دکنی کی جن خصوصیات کو ہریانی سے مشترک بتایا ہے اور ہریانی سے ماخوذ کرنا چاہا ہے وہ یہ ہیں۔ ان میں سے بعض پنجابی سے بھی مشترک ہیں۔

۱۔ ڑ، ڑھ کی جگہ ڈ، ڈھ ہونا مثلاً بڈھے، چڈھنا (سب رس میں)

۲۔ لفظ کے دوسرے مختصر مصوتے کو طویل کر دینا مثلاً راکھے، تائیں، باڈّہ (بڈی)۔ لوہو۔ لاگا۔ مائی، چالیں (چلیں)

دراصل یہ برج بھاشا کا بھی خاصہ ہے۔

۳۔ حشوی غنا ئیت مثلاً سین، کوں توں کو بخچے، سنتانا، آدمیں (آدمی)، مرسانت۔ مصدری لاحقہ 'نا' کے بجائے 'ناں' ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے مطابق یہ ہریانی کا اثر ہے۔

۴۔ بعض اوقات ہکاریت کا حذف مثلاً بی (بھی)۔ تج۔ منج

۵۔ فعل معطوف میں یے کا اضافہ۔ آئے کر۔ جائے کر

۶۔ ماضی مطلق میں الف سے پہلے یائے مخلوط کا ہونا مثلاً چلیا

۷۔ بعض ضمائر ہریانی سے مماثل ہیں مثلاً ہمن، تمن

۸۔ بعض ضمائر کی تعریف دونوں میں مماثل ہے مثلاً ہموں، ہمیں، تموں، تمھیں، انھاں، انھوں

۹۔ 'سے' کے معنی میں تے، تھے، سیتی کا استعمال دونوں میں ہے۔

۱۰۔ ڈاکٹر شری رام شرما کے مطابق 'بنولا' ہریانی کا لفظ ہے۔ یہ دکنی کے علاوہ کھڑی بولی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ دکنی اور برج بے شک

ابتدائی دکنی ادب فارسیت سے متاثر تھا اور ہندی روایات میں شرابور تھا۔ اس وقت کی ہندی روایات کیا ہیں؟ برج بھاشا کی روایات۔ صوفیا کے کلام پر نیز ابراہیم عادل شاہ ثانی اور علی عادل شاہ کے یہاں برج کا اتنا اثر ہے کہ بعض اوقات ان کے کلام کو اردو کہنے میں بھی تکلف ہوتا ہے۔ علی عادل شاہ کی چند سطریں دیکھیے۔

در مقام نٹ

تر یہ پیر کو مکتا کنچ پھل بھیو
سیام دسن لال آدھر مل اپسورنگ لیو

(راگ مالار)

پسلیس داہی سنگ من انکھیوری ہیلی
تم جانت نیں جیہ کی کاہے موہ ہنکھیوری

دکن اور برج کی چند مشترک خصوصیات یہ ہیں۔

۱۔ جیسا کہ اوپر ہریانی کے سلسلے میں لکھا گیا بعض الفاظ میں، دوسرے مقام پر آنے والے مختصر مصوّتے کو طویل کر دینا مثلاً ”اکھنا“ چاکھا“ لاگنا“ مانی“ سانچا (سچا)

۲۔ بعض الفاظ کے آخر میں آ کر او سے بدلنا مثلاً کیو“ تہارو

۳۔ ل کو ’ر‘ میں بدلنا۔ شورسینی ر کو ترجیح دیتی تھی اور ماگدھی ’ل‘ کو۔ ر کو بند کرنا برج کے مزاج میں بھی ہے۔ دکنی میں بڑبڑے (بلبلے)، روپہرے، تروار، نکاروں (نکالوں)

تک مل جانے ہیں سچ دکھ اپنے دل کے لوسوں وان نکالوں
(کلیات شاہی)

۴۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے کلیات قلی قطب شاہ میں سے ذیل کے دکنی ضمائر کی نشان دہی کی ہے

ہوں۔ (میں) تو (تجھ) مو (مجھ)

پیارے نہ کر کھینچ ہوں تو یہ واری

۵۔ برج میں جمع کا لاحقہ ’ن‘ ہے
اس کی مدد سے ہم سے ہمن تم سے تمن بنتا ہے۔ دکنی میں یہ دونوں ضمیریں ملتی ہیں۔ ہمن بہت عام ہے۔ تمن کی یہ مثال ہے

ہوں تل تل تمن پر سے تھے واری ہو پیاری
(قلی قطب شاہ)

۶۔ ڈاکٹر شری رام شرما نے دکنی کے ماضی مطلق کے لاحقہ ’یا‘ پر غور کیا ہے۔ سنسکرت میں اس مقام پر ات آتا تھا۔ اِ ارتقا پا کر دکنی وغیرہ میں یائے مخلوط ہو گیا اور ت ’آ‘ میں بدل گیا۔ دکنی کی طرح یہ ی برج میں بھی محفوظ ہے۔ مارنا سے دکنی ماضی مطلق ماریا اور دکنیماریو ہے جب کہ کھڑی بولی ’مارا‘ میں ’ی‘ مفقود ہے۔

۷۔ مصدر میں نا کے بجائے محض ’ن‘ کا لاحقہ مثلاً چلن۔ یہ پنجابی میں بھی ہے

۸۔ حالیۂ ناتمام کے لیے مادّے میں صرف ت کا اضافہ ہے مثلاً چلت، دیکھتا۔ برج کا یہ معیاری صیغہ

۹۔ بعض حروف برج سے مشترک ہیں مثلاً سوں، میں، تے (تینوں معنی سے)۔ کوں برج کے کن سے ماخوذ ہے۔

۱۰۔ فعلی مادہ باپخنا برج سے ماخوذ ہے۔ یہ دینچھی باچا‘ میں موجود ہے۔

دکنی اور پوربی

پوربی کے تحت ہم مشرقی ہندی کی بولی اودھی اور بہاری کی بولیوں بھوج پوری، میتھلی اور مگھی کو یک جا لے رہے ہیں۔

سولھویں صدی کے نصف اوّل میں اودھی شمالی ہند کی اہم ادبی زبان تھی۔ ہندی کے گیان آشری شاعروں میں کبیر اور ان کے پیروں نے اودھی میں لکھا۔ پریم مارگیوں میں اتفاق سے کئی مسلم شعرا نے اپنے کارنامے اودھی میں پیش کیے جن میں ملک محمد جائسی پیش پیش ہیں دوسری طرف رام بھگت پریم مارگ

میں گولکنڈے کی دکنی میں راجستھان کے لفظی رویوں میں کئی مقامات پر حیرت انگیز یک رنگی ہے۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ دکھنی پر راجستھانی کا اثر ہے جس طرح برج پر راجستھانی کا اثر تھا۔ دکنی لفظوں کی جمع، فعل، معطوف فعلوں کی تانیثی شکلوں اور متعلقاتِ فعل پر راجستھانی اثرات ہیں۔ ذیل کی مماثلتیں قابلِ ذکر ہیں۔

۱۔ جمع میں "آں" کا لاحقہ راجستھانی میں بھی ہے بالخصوص مارواڑی، میواڑی میں۔ اسی طرح بعض اوقات ہائے مختفی پر ختم ہونے والے الفاظ میں "ماں" لگایا جاتا ہے۔ مثلاً مالیاں، بندیاں وسنتاں۔

۲۔ ماں، سیں بمعنی "ہوں" ہیں میواتی سے ماخوذ ہیں۔ ذیل کے الفاظ بھی میواتی سے ماخوذ ہیں

یوانی (پچلا)، نبکا (کہاوت)، بھیلی گُڑکی بھیلی (یہ کھڑی بولی میں بھی مستعمل ہے) لوتری (چیل حود)۔ اپن یہ ضمیر مالوی بندیلی میں بھی ہے)

۳۔ سی سوں بمعنی "گا" پنجابی کے علاوہ مشرقی راجستھانی میں بھی ہے۔

۴۔ سوں (سے) اور اچھنا (ہونا) مارواڑی میں ہیں۔

۵۔ ذیل کے الفاظ بھی مارواڑی سے ماخوذ ہیں۔

کھوٹ (بدنامی)۔ چنری (راجستھانی چنڑی) ڈوں گر (پہاڑ گلشنِ عشق)۔ دھن (عورت۔ قدیم راجستھانی میں)۔ دھنی (شوہر)۔ پکھواڑے راجستھانی پاکھو بمعنی پنکھڑی)۔ پرچو (کرامات)

ابلاڑ (اِس طرف)۔ پیلاڑ (اُس طرف پرے، پھولبن میں۔ راجستھانی پیلاڑی۔ یہ الفاظ مراٹھی میں بھی ہیں) بنا (دولھا)۔ بندڑا (دولھا) (دولھن)۔ مانڈا (منڈپ۔ راجستھانی میں بھی مانڈا ہے)۔ رنک۔ بٹر۔ راجستھانی روکھ۔ نیڑے۔ (پاس)

دکنی اور گجراتی

دکن کے مقابلے میں گجرات شمالی ہند سے نزدیک تر ہے۔ بیرونی نیز دلی حکومت کے حملہ آور گجرات تک بھی پہنچتے رہے۔ ۱۲۹۷-۹۸ م ۱۲۹۷ء میں علاؤالدین خلجی نے گجرات کو سلطنت دہلی کا صوبہ بنالیا لیکن ایک صدی بعد ۱۳۹۲ء میں دلی پر تیموری حملے کی خبر آئی۔ گجرات کے صوبے دار ظفر خاں نے خود مختاری کا اعلان کردیا اور مظفر شاہ کے نام سے تخت نشیں ہوگیا۔ ۱۵۳۱ء میں گجرات کے بادشاہ نے مالوے کو گجرات میں ملالیا۔ ۱۵۶۸ء میں اکبر نے گجرات پر پہلا حملہ کیا اور ۱۵۷۲ء میں دوسرا حملہ کرکے وہاں کی آزاد حکومت کو ختم کردیا۔ تیموری حملوں کی وجہ سے دلی سے کافی بڑی ہجرت گجرات کی طرف ہوئی چناں چہ گجرات کھڑی بولی کی توسیع کی پہلی منزل گجری کا مرکز بنا۔ گجری دکنی اردو کی ایک بولی ہے جو گجراتی سے متاثر ہے۔ احمد آباد اور پٹن سے لوگ بیجاپور اور گولکنڈہ گئے جس کی وجہ سے وہاں کی دکنی میں بھی گجراتی اثرات آگئے۔ دکنی اور گجراتی کے اشتراک کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ تشدید کی تعمیل مثلاً بھٹی

۲۔ اگر لفظ میں دو معکوسی حروف آتے ہیں تو پہلے کو دندانی

کر دیا جاتا ہے مثلاً واٹ (بجائے ڈاٹ)

۳۔ جنس کے معاملے میں دکنی کھڑی بولی کی نسبت گجراتی سے زیادہ متاثر ہے۔

۴۔ اسم کی کثرت دکھانے کے لیے گھرے گھر (گھر گھر)، بالے بال جیسی ترکیبیں گجراتی ہیں

۵۔ ذیل کے اسم گجراتی سے مستعار ہیں

انجھو (آنسو) بندرا (نیند)۔ گدھڑا ے گجراتی گھرھاڑو۔ چاڑی (چغلی)۔ ٹیلا (ٹیک۔ سہارا۔ ابھال (بادل)۔ نار (دھن۔ گھمنڈ)۔ پھانٹا (کھِلا ہوا، پھولا ہوا)۔ موس (کٹھالی)۔ زادٹ (گھڑ سوار) بیری (ایک قسم کی لکڑی)۔ ہیر (چمک)۔ پوٹ (طوطا)۔ کھام (کھاڑی) ڈوسا (بوڑھا)۔ ڈونگر (پہاڑ)

۶۔ ذیل کے ضمیر گجراتی سے ملتے ہیں

ہوں (میں)۔ تمَ (تم)۔ ہمن، ہمن سے گجراتی ہمنے۔ ہموں نے۔ تموں نے۔ اسے (یہ)

۷۔ ذیل کی صفات گجراتی سے مماثل ہیں

نیٹ (طے شدہ)۔ پَیلا سے گجراتی پیلوں بمعنی پہلا۔ پھوک (جھوٹا)۔ گھنو (بہت)۔ گیلا یا گھیلا (سادہ لوح)۔ سگلا (سب)۔ اونڈا (گہرا)۔ اگل (اگلا)۔

۸۔ ماضی مطلق میں یائے مخلوط گجراتی میں بھی مثلاً پڑیا کینا بمعنی کیا۔ گجراتی میں ہے

۹۔ اتھا بمعنی تھا۔ سی یا سے بمعنی گا۔ مثلاً رہے (رہے گا) اچھے بمعنی ہے گجراتی چھے جائے کہ جیسے مینے بھی گجراتی سے مماثل ہیں

۱۰۔ ذیل کے افعال گجراتی ہیں۔

داٹنا (گڑھے کو مٹی سے بھرنا) دٹ وَن۔ کیچونا (دِق دکھانا) کیچون۔ لونا (فصل کاٹنا)۔ دھارنا۔ (بھاگنا)۔ پاسنا (ہَل چلانا)۔ جوینا (دیکھنا)۔ جوتا (دیکھا)۔ ناتھنا (ڈالنا)۔ گمنا (پسند آنا۔ دل بہلانا) سوسنا (برداشت کرنا)۔ بیسنا (بیٹھنا)۔ نہاسنا یا ناٹھنا (بھاگنا)۔ بھوگل (بھیجنا، پہنچانا)۔ کھوائے بمعنی کہلائے)۔ رہے

۱۱۔ تاکید کے لیے ج یا اَیچ کا لاحقہ گجراتی سے ماخوذ ہے مثلاً دلیچ (دل ہی)

۱۲۔ ذیل کے حروف گجراتی سے مستعار ہیں

پو (پر)۔ سیتی، سیں، تے، تھے، ستے (پانچویں بمعنی سے)۔ جے (جو)۔ نے (نہیں)۔ ایم اور ایمنا (اس طرح)

۱۳۔ ذیل کے متعلقِ فعل یا تمیز گجراتی سے ماخوذ ہیں۔

پچھیں (بعد میں، پھر)۔ ہبے (اب)۔ ایلاڑ (اس طرف، ندی کے اس کنارے)۔ پیلاڑ (اُس طرف، ندی کے اس کنارے)۔

دکنی اور مرہٹی

ایک زمانے میں دیوگیری مہاراشٹر کا پایہ تخت تھا۔ دکن میں مسلمانوں کا پہلا پڑاؤ وہیں پر ہوا۔ محمد تغلق نے اسی جگہ دولت آباد آباد کیا جس کے قریب اورنگ زیب نے اورنگ آباد آباد کیا۔ اس طرح یہاں دکنی اور مراٹھی کا قِران ہوا۔ مہاراشٹر کے حکمرانوں کی سرکاری زبان فارسی رہی ہے۔ بیجاپور کی حکومت میں مرہٹے اہم عہدوں پر فائز تھے۔ عرصے تک بیجاپور کی سرکاری زبان مراٹھی رہی ان سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف مراٹھی میں

کثرت سے فارسی اردو الفاظ ہیں دوسری طرف دکنی اردو پر دوسری ہندوستانی زبانوں کی نسبت مراٹھی کا اثر سب سے زیادہ ہے۔ اس کی نشان دہی کسی حد تک ڈاکٹر شری رام شرما نے اپنی کتاب میں کی ہے۔ ان سے بھی زیادہ تفصیل سے ڈاکٹر عبدالستار دلوی نے ایک مفصل مضمون میں[۱] لکھا ہے۔ ذیل میں ان سے بطورِ خاص استفادہ کرکے دکنی اور مراٹھی کے مشترک عناصر کی نشان دہی کی جاتی ہے۔

صوتیات

۱۔ مراٹھی کے طویل مصوتے کو خفیف کر دینا۔ ذیل میں پہلے دکنی لفظ دیا ہے بعد میں اس کی اصل مراٹھی
سانپڑنے ۔ اندھلا ۔ آندھلا ۔ کنولی (خام، نرم) کونولی۔

۲۔ اس کے برعکس مراٹھی میں انوسوار سے پہلے کے خفیف اُ کو دکنی میں بدل کر طویل اُو کی مثالیں بھی ملی ہیں شلاً مراٹھی ہندی سنسار ۔ دکنی سوں سار ۔ مراٹھی ڈنگر ۔ دکنی ڈون گر ۔

۳۔ اگر کسی لفظ میں دو معکوسی مصمتے ہوتے ہیں تو جنوبی مراٹھی اور کونکنی کی طرح پہلے کو دندانی بنا لیا جاتا ہے شلاً داٹ (ڈاٹ) ٹکڑا ۔

۴۔ مراٹھی اور دکنی میں ذیل کی آوازوں کا تبادلہ ملتا ہے۔
۱۔ مراٹھی و ۔ دکنی ب واٹے ۔ بانٹے (حصہ)
۲۔ مراٹھی نْ ۔ دکنی ن آنڑے ۔ آننے (لانا)۔ دسنے ۔ دسنے (دیکھنے)
۳۔ مراٹھی ز ۔ دکنی ج ازول ۔ اجول (ابتک) زالنے ۔ جالنے (جلانے) شاذ مراٹھی ج دکنی ز میں بدلی ہے ۔ مراٹھی جیاست ۔ دکنی زیاست (زیادہ) واضح ہو کہ کھڑی بولی علاقہ میں بھی جیاستی اور زیاستی بولا جاتا ہے ان کی اصل اردو لفظ زیادتی ہے ۔
۴ مراٹھی ڑ ۔ دکنی ر پیلاڑ ۔ پیلار
۵ مراٹھی زھ ۔ دکنی جھ زھانپ ۔ جھانپ، زھڑتی جھڑتی ۔
۶ شاذ مراٹھی پ ۔ دکنی ب ۔ نپھر ۔ بنتر (بیکار)
۷ مراٹھی ش ۔ دکنی س میخوٹ ۔ میوٹ (آخری)

۵ ۔ مراٹھی کی ہائیت بعض اوقات دکنی میں حذف ہو جاتی ہے شلاً دکنی اندلا ۔ مراٹھی آندھلا ۔ دکنی میٹر ۔ مراٹھی میٹر دکنی کا عام رجحان ہائیت کو زائل کرنے کا ہے ۔ ادک ، سادنا ، لاب ، کاڑنا جیسے الفاظ مراٹھی اور ہندی میں ہائے مخلوط کے ساتھ ہیں ۔

صرف

۱ ۔ جمع کے لیے ان کا لاحقہ لگانا شلاً لوکاں ۔ جن الفاظ کے آخر میں ی یا ہ ہے ان کی جمع میں یا ی لگایا جاتا ہے شلاً ستاریاں، کپڑیاں ۔

۲ ۔ موصوف کے ساتھ صفت میں اور فعل کے دونوں اجزا میں جمع کا لاحقہ لگانا مثلاً بڑیاں شیدتاں لکھتیاں چلیاں ۔

۳ ۔ بعض اوقات مصدر بغیر د کے شلاً چلن ۔

۴ ۔ تابع مل بنانے کے لیے دوسرے لفظ کے پہلے حرف کو گ سے بدلنا ۔ یہ کنڑ میں بھی ہوتا ہے شلاً باجا گیجا ، روٹی گیٹی ۔

نحو

۱ ۔ جنس کے معاملے میں دکنی کھڑی بولی کے بجائے مراٹھی سے نزدیک تر ہے ۔

۲۔ صفت نما فقرے کو جملہ کا جزو بنانا مراٹھی نحو کا اثر ہے مثلاً

پیو منا کیا سو پرہیز (معراج العاشقین)

جیسے کیڑے بیچ نیں اس کی آستین میں پیکے تھے

(شکار نامہ)

۳۔ ہی کے معنی میں ’چ‘ کا لاحقہ لگانا مثلاً کیڑے بیچ۔ یہ گجراتی میں بھی ہے۔

لفظیات۔ ڈاکٹر شری رام شرما اور ڈاکٹر دلوی دونوں نے دکنی اور مراٹھی کے مشترک لفظوں کی طویل فہرست دی ہے۔ دلوی نے نسبتاً زیادہ مفصل ہے۔ دلوی مراٹھی اہلِ زبان کی طرح بولتے ہیں اس لیے ان کی نشان دہی پر پورا بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ دونوں حضرات کی فہرستوں کو ملا کر درج کیا جاتا ہے۔

اسم۔

ڈھل (نجات)۔ ابھال (آسمان) اڑی (ایک مقام سے دوسرے مقام پر جلدی سے اچھل کر پہنچنا یعنی کام کی صلاحیت کالوا (تالاب یا نہر) کلاسا (پودے کی قلم)۔ کوسا (جلنا۔ مراٹھی کونٹ سا) گمت (لغو تیج) گوی (کھار۔ شیرکی) گانڈا (گنا) جیاڑ (جھیکا [illegible])۔ خرا (یاتر)۔ جھلا جھسی (پھولوں کا گچھا، ایک قسم کا عر اور زیور) ڈھکار (ڈیبہ۔ مراٹھی ڈھگال) یا ڈھیگ ہنگٹ (زری کا کپڑا، ایک زیور، طاس کھنسا۔ مراٹھی تاس)۔ ٹھوڑا (ٹھوڑی کے نیچے لٹکتے ہونٹ۔ مراٹھی ٹھوبڑ) ڈرانی یا ڈ[illegible] حکومت کی طرف سے دلائی گئی قسم۔ مراٹھی ڈرانی، ہندی ڈھلائی)

نڈوا (رکاوٹ۔ مراٹھی نڈ) نیٹ (کوشش، محنت) پیجر: گھڑے سے رسنے والی رقیق شئے۔

یارمی: بڑی داڑھی۔ پیک۔ پیداوار۔ پورن: پوریوں کے بیچ بھرنے کی میٹھی شئے۔ مراٹھی پُرن۔ پیکا: پیسا، چار کوڑی۔ بڑبڑیا۔ بلبلہ۔ بوبی۔ ناف۔ مڑی: پہاڑ کے نیچے سنچائی کے لیے کھودا ہوا گڑھا مراٹھی، مڑھی۔ ماکڑ: مکڑا۔ ہواس: ساتھ رہنا بستی۔ راج وٹ: ریاست: راجہ کا طور طریقہ۔ لاوک: خرافات، جھگڑا۔ ویتاگ: پچھتاوا، ترک دنیا۔ ہوڑی: کشتی۔

ذیل کے تمام مماثلات ڈاکٹر دلوی کے مضمون سے ماخوذ ہیں۔ انھوں نے کئی ایسے الفاظ بھی دیے ہیں جو مراٹھی کے علاوہ کھڑی بولی یا ہندی میں مستعمل ہیں مثلاً اپکار، بچار، بست (چیز)۔ ماٹ وغیرہ۔ انھیں مراٹھی کے ذمے رکھنے کی ضرورت نہیں۔

اڑباٹ: ناہموار راستہ۔ تغادا: تقاضا۔ بیک: بیٹھک، نشست۔ جھاڑ: درخت۔ پاٹ: کواڑ، پٹ۔ اودھان: جوار۔ بانٹے: حصے (کھڑی بولی میں بھی آتا ہے)۔ دھانوں: راہ۔ یکٹ پن: اکیلا پن۔ لٹک: ادا۔ اندلا: اندھا۔ امس: امنگ دھاک: ڈر۔ جھانپ: چھلانگ۔ اڈناول: جلد بازی باؤلاں: قدم (جمع) پادنا: جہان، مراٹھی پاہونا۔ جھرا: جھرنا، چشمہ۔ چاڑی: چغلی۔ پور: سیلاب۔ چیشورے: خنزیر۔ ٹیلک: تلک، ٹیکا۔ ٹام: ٹیکا۔ ٹیٹوی: ٹیٹری ایک آبی پرندہ۔ ڈونگر: پہاڑ۔ ڈیوٹی: چھوٹا چراغ

دھر صر۔ سب : خرگوش۔ کارچ : کانچ۔ روس :
نقہ۔ ... بھوں۔ جونک : مقناطیس، چمبک۔ بوٹھ
لکی۔ جنک گیلی لکڑی کا رس۔ کُلف : قفلی۔ کولا :
لومڑی۔ کیلی : کنجی۔ کھنکا : بھینسا۔ کاڑوڑی : شعبدہ باز۔
مارنگر۔ ترنگا۔ گھٹ۔ لانڈگا : گیدڑ، بھیڑیا۔ ساندا :
جوڑ۔ سسرواڑ : سسرال۔ سوس : برداشت۔ مالا :
مرلی۔ ... : بالاخانہ، بنگلہ۔ مت : مشورہ۔
متا منے۔ مشورہ۔ موناڑی : سسر۔ نرڑی : نرخرہ،
حلق۔ ... کاٹی۔ ... : بکا۔ کلنگر : تربوز۔ کونڈا :
گملہ۔ کونڈیار : ... کوئلہ۔ کوم : اکھوا،
پودے کی نوک۔ پاتر : طوائف۔ نٹوت : نخرے
... گرہ ... تفریح۔ گمت خانہ : تفریح خانہ۔
گھٹ۔ ... ستاپ : پریشانی، کلکلاٹ :
... نبض۔ نایک : سردار
... ساری ... مارا : ہوا۔ توڑان :
... جگہ ... دھامنیاں : بڑے
سانپ۔ ... ان پان : کھاتے
گاتے ... تکرپٹے ہوئے چنے۔ ماپل :
چانفل۔ ... ضرب المثل

صفات :

... بیکٹ : سعت، ترچھے
... جیل خوب۔ جگا جوت :
دنیا کو روشن کرے ... : زیادہ۔ منرس :
اچھا ... سیوٹ : آخری
... مضبوط، گاڑھا۔
... نوا : نیا۔ کنوئی : نرم

خام۔ نیٹ : سیدھا، اچھی طرح۔ بچ : احمق۔
یکادے، یکادھے : ایک آدھ۔ لسلسا تا : سرسبز و شاداب
ادتاولا : جلد باز۔ نول : عجیب۔ موپ : بہت۔
نکار : ل سے شروع ہونے والے تین الفاظ لچا،
لفنگا، لباڑ۔ (یہ دونوں مثالیں شرمانے دی ہیں)

افعال :

ایٹنا : اکھاڑنا۔ آننا : لانا۔ پاڑنا : ڈان۔
جالنا : ملانا۔ بھکنا : اول فول بکنا۔ بلکانا : ناجائز
طور پر کسی چیز پر قبضہ جمانا۔ سینا : بیٹھنا۔ دسنا :
دکھائی دینا۔ بھرا کر : بدل کر۔ پھر گیا : پھرن گیا۔ ٹاک :
ڈال۔ ساڈنا : حاصل کرنا۔ ساہنا : جوڑنا۔ سوسنا :
برداشت کرنا۔ پڑپڑکر : گرگر کر۔ جھنجنا : گھٹنا،
گھسنا۔ چڑاوتر : چڑھنا، اترنا۔ کونڈنا : بند کرنا۔
گلنا : پگھلنا۔ گمنا : طبیعت بہلنا۔ گرگے : گھٹنا۔
گھالنا : ڈالنا۔ دھونڈ کاڑی : ڈھونڈ نکالی۔ کاڑنا :
نکالنا۔ سیڑنا : پانا۔ النگنا : پار کرنا۔ ناندنا : سکھ
سے زندگی بسر کرنا۔ سونا : چھونا۔ ہیرنا : گھیرنا،
ذہن میں رکھنا۔ گونتھیا : پھنسا۔ لاجنا : شرمانا۔
بھاٹ : پھٹ کر۔ ڈھلنا : ہلنا۔ پس وپیش کرنا۔
ہنکنا : پوچھنا۔ پیرنا : بُونا۔

متعلقات فعل :

حالی : فی الوقت۔ نزیک : نزدیک۔ لگالگ :
متواتر۔ بیگی : جلدی۔ اجھوں : ابھی

حرف :

پن : لیکن۔ سار، ساریکھا : مثل، مانند
نکو : نہیں۔

محاورے:

ڈاکٹر دلوی نے دکنی ادبیات میں بعض مراٹھی محاورے بھی دریافت کیے ہیں جو یہ ہیں۔

بات پھوڑنا: راز فاش کرنا (غواصی)
سوکھ سوکھ کر کاڑی ہونا: سوکھ سوکھ کر کانٹا ہونا (غواصی)
پایاں پڑ: پاؤں پڑنا (غواصی)
بول اگانا: نام دھرنا۔ داناں دان ہونا: برباد ہونا۔
دڑی مارنا: خاموش رہنا۔ ناؤں جگارنا: نام روشن کرنا۔

ذیل کی دو مراٹھی کہاوتیں وجہی نے سب رس میں استعمال کی ہیں۔

۱۔ بیل گیلا آنی زو پا کیلا: کسی کام کو وقت گزرنے پر کرنا۔
۲۔ سانٹھے و بد نھاٹے: سٹھیانا۔

مراٹھی اثرات کی طویل داستان ختم ہوئی۔ اس سے واضح ہوا ہوگا کہ دکنی پر جتنا مراٹھی کا اثر ہے اتنا کسی دوسری ہندوستانی زبان کا نہیں۔

دکنی اور کونکنی:

کونکنی مراٹھی کی ایک بولی ہے جو گوا سے لے کر کرناٹک اور کیرلا کے ساحل تک بولی جاتی ہے۔ اس کے بولنے والوں کی تعداد دو لاکھ کے قریب ہے جن میں سے بیشتر گوا میں ہیں۔ گوا کے باشندے بالخصوص عیسائی کونکنی کو مراٹھی سے علاحدہ زبان کہنے پر مصر ہیں۔ ڈاکٹر سہیل بخاری نے دکنی پر اپنے طویل مضمون میں دکنی کی کونکنی سے مماثلت پر زور دیا ہے۔ ذیل کی سطور کا ماخذ انہیں کا مضمون ہے۔ دقت یہ ہے کہ ہمیں ان کا ماخذ معلوم نہیں۔ میں نے ایک کونکنی بولنے والے سے ان مماثلات کی تصدیق چاہی تو غنائیت کے علاوہ بقیہ سے اس نے ناواقفیت کا اظہار کیا۔ وہ کرناٹک کا رہنے والا ہے۔ واللہ اعلم حقیقت کیا ہے۔ بہرحال ڈاکٹر سہیل بخاری کے حوالے سے ذیل کے مماثلات درج کرتا ہوں۔

۱۔ مراٹھی کا 'اے' کونکنی اور دکنی میں آ ہو جاتا ہے مثلاً دکنی لٹارا، اندھارا، کسالا۔ ہندی میں یہ لٹیرا، اندھیرا، کسیلا ہیں۔
۲۔ لفظ کے شروع میں اِ کو ی میں اور آ کو و میں بدلنے کا رجحان جو اودھی سے ملتا ہے یتا (اِتا) یکس (ایکس)۔ ووٹ (اوٹ)۔ دِتا (اِتا)
۳۔ پو (پر)۔ کو (کے)۔ چل کو، پی کو
۴۔ طویل مصوتے کو مختصر کرنا۔
۵۔ تشدید کی تحلیل لیکن تلافی کے لیے کسی مصوتے کو کھینچا نہیں جاتا مثلاً پت۔ ہت
۶۔ ہائیت کو حذف کرنا مثلاً بات، بی۔ شاذ ہائیت کا اضافہ مثلاً دور کی جگہ دھور۔
۷۔ نون غنہ کی کثرت خصوصاً طویل مصوتے کے بعد مثلاً کوں، سوں۔ غنائیت کونکنی میں بہت کثرت سے ہے۔
۸۔ مراٹھی وغیرہ کی طرح دو معکوسی مصمتوں میں پہلے کو دندانی کر دینا مثلاً تھاٹ۔ تھنک
۹۔ جمع میں آں کا لاحقہ
۱۰۔ حالیہ ناتمام میں ت کا لاحقہ مثلاً دیکھت بھلت
۱۱۔ لفظ کھلگا: بعینہٖ کونکنی ہے۔

دکنی اور کنڑ:

حالانکہ دکنی کرناٹک میں خوب پھلی پھولی ہے

در بیجاپور، بیدر، گلبرگہ، میسور دکنی کے مراکز ہیں
لیکن ادبی دکنی پر کنڑ کا کوئی اثر نہیں۔ ڈاکٹر شری
رام شرما نے دکنی ادبیات سے ۹ الفاظ تلاش
کیے جو کنڑ میں بھی ملتے ہیں۔ وہ یہ ہیں۔
اڑ: رکاوٹ۔ کنڑ اڈّا (ارشادنامہ)۔ آدا:
نکھار کا آدا۔ ہندی آدا، کنڑ آدی۔
پھول بن
کھڑی۔ کنڑ کوڑو: بیٹھنا۔ ہندی کھڈی (قطب مشتری)
چارن کنڑ چاری۔ مراٹھی چاڑی (پھول بن)
داٹ۔ مراٹھی داٹ کنڑ دٹ: بھیڑ، کھچ تچ۔
ظاہر ہے کہ دکنی نے مراٹھی سے لیا ہوگا ان کے علاوہ
چار الفاظ آدا (کنڑ آدی)۔ گدڑی (کنڑ گد کھوندنا)
تکڑا (کنڑ تکڑی، ہندی تکڑا) جھونپڑی (کنڑ جھونپڑے)
دکنی ادبیات میں آئے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ وہاں کنڑ
سے نہیں لیے گئے۔
بول چال کی موجودہ دکنی میں ذیل کے الفاظ کنڑ
سے ماخذ ہیں
گدڑی: جھونپڑی۔ کنڑ گدّی۔ تامل: کچھوا
کوٹ: قلعہ۔ سنسکرت کوٹ۔ کنڑ کوٹے
کولسا، جلنا۔ کنڑ کول نی
بیجاپور کی بول چال میں مصوتوں اور ہائیت کو ادا
کرتے وقت کنڑ لہجے کا اثر ملتا ہے۔ تابع مہمل بنانے
کے لیے، دوسرے لفظ کے شروع میں گ لگانا بھی
کنڑ سے ماثل ہے مثلاً باجا گیجا، میانا گینا، روٹی گیٹی
دکنی اور تیلگو
دکنی کے دو سب سے بڑے مرکز بیجاپور

اور گولکنڈہ تھے گولکنڈہ تیلگو علاقہ تھا۔ چوں کہ کنڑ اور
تیلگو دراوڑ خاندان سے تعلق رکھتی ہیں اس لیے ادبی
دکنی میں ان کے الفاظ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ہاں چیتاپا،
کرنول وغیرہ کی بول چال کی موجودہ دکنی میں ضرور کئی
تیلگو لفظ ملتے ہیں۔ واضح ہو کہ دراوڑی زبانوں میں
تیلگو سنسکرت سے کافی نزدیک ہے۔ اس میں سنسکرت
الفاظ کی کثرت ہے۔ دکنی نے کئی سنسکرت تت سم و
تدبھو الفاظ براہِ راست سنسکرت سے نہ لے کر تیلگو سے
لیے مثلاً کوپ: غصہ (کلیات قلی قطب شاہ) تیلگو کوپم
اگر سنسکرت سے مستعار لیتی تو کرودھ سامنے کا لفظ تھا۔
دوسری طرف بعض سنسکرت الفاظ اصلاً دراوڑی
ہیں۔ ان میں سے ذیل کے لفظ تیلگو میں بھی ہیں۔ ڈاکٹر
شری رام شرما نے ایسے چند الفاظ کی فہرست دی ہے۔
آی۔ سنسکرت آلی: سہیلی۔ تیلگو آل: بیوی
کوٹ: قلعہ۔ سنسکرت اور تیلگو کوٹ
نیر: پانی۔ سنسکرت نیر۔ تیلگو نی،
اسی طرح پٹن: شہر، گاؤں، نارنگی اور لنگا بھی دراوڑی
الفاظ ہیں جو دکنی ادب میں ملتے ہیں۔ کتابی دکنی ادب
میں تیلگو کے صرف حسب ذیل الفاظ ملتے ہیں۔
بھنگار: سونا۔ تیلگو بنگار۔ سکل کوٹ پو گرد بھنگار کے
(قطب مشتری)
منجل: تاڑ بیل۔ تیلگو منج، جمع منجل۔ میٹھے کئی یہ کے
چشمے ستی بھریا ہے منجل (کلیاتِ شاہی)
ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے دکنی ادب سے تیلگو کے
دو تین الفاظ کی نشان دہی کی ہے (قلی قطب شاہ)
کالوے، نالہ، نہر۔ جع ٹین نے کالوے ہو کے بہایے
صنم حال مرادوں نی تا ڈال ہو کوپ رقیب (قلی قطب شاہ)

ان کے نزدیک درنی ماخوذ ہے دوراجب:
راجہ، زمیندار ہے لیکن ڈاکٹر شری رام شرمانے لکھا ہے کہ ڈاکٹر لدد کا یہ خیال صحیح نہیں کہ یہ لفظ تیلگو دراہ بڑا سے بنا ہے۔ دکنی میں کسی نے اس لفظ کا استعمال بڑے پن یا حکومت کے معنی میں نہیں کیا۔ دراصل یہ مراٹھی لفظ ہے۔ سب رس اور کلیاتِ شاہی میں یہ سرکاری حکم کے لیے مستعمل ہے۔ مندرجۂ بالا مصرع میں کوپ مشتق ہے تیلگو کوپم سے

بکٹ　تج منج کرتے کٹ منے پیرت بکٹ، پنسر یا بکٹ
(قلی قطب شاہ)

ڈاکٹر گوڑ کے مطابق اس میں بکٹ بمعنی 'ایک' ہے اور تیلگو لفظ 'واکٹی' سے ماخوذ ہے

تلنگانہ کی بول چال کی دکنی میں کافی تیلگو الفاظ ہیں۔ کچھ الفاظ کی فہرست ڈاکٹر شری رام شرمانے دی ہے مثلاً کتّا: جھاڑ دیا تالاب کا باندھ۔ گمڑسی: جھونپڑی۔ تیلگو گڑسی

تانبل: کچھوا۔ تیلگو "تانبیل"۔ مندا: بھیڑوں کا ریوڑ
ایٹی: بیگار۔ کپّا: ڈھیر۔ کمپا: ٹوکرا۔ ڈبّا: ٹوپی
ڈبّا: موبا۔ پوٹّا: لڑکا۔ بنڈی: بیل گاڑی۔ جٹّا: گوڑی۔ مندم: موٹائی

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے بول چال کی زبان میں ذیل کے مزید تیلگو الفاظ کی نشان دہی کی: کریا پات: کری پتّا۔ کریا پاکٹ۔ بوڑہ کاٹ: ایک قسم کی چھوٹی لکڑی۔ جھکورا: ایک سبزی۔ تیلگو چیم کورہ۔ ایرو: کھاد۔ گدّا: کپڑا۔ گینگل۔ کنتھا: قصّہ۔ کاوڑی: بہنگی۔ ڈنڈ: بیکار، فضول۔ کوڑھہ: کھانا، کڑوی بھنسوں کو کھلائی جاتی ہے۔
کوڑونڈ: ایسا شخص جسے کھلانا فضول ہے۔ گنڈم: مصیبت۔ چگر: املی کا نیا پتّا۔ کنٹا: تالاب۔ گماّ کتی: بانس کے سرے پر بندھی ہوئی چھری جس سے پیڑ کے پتّے توڑتے ہیں۔

روپ رائی: دال پیسنے کا گول پتھر۔ بنجر دوڈی: جانوروں کو باندھنے کی جگہ۔ تیلگو بندل دوڈی۔ ٹبّا: ٹیلا۔ لگ لگ: ڈھیلا۔ گلارا: پلاسٹر۔ چیرونڈی: چڑوا۔ چبانے کی ایسی چیزیں جو چلتے پھرتے کھائی جائیں۔ مدّد: کند ذہن۔ مودلا: درخت کا کاٹا ہوا موٹا ٹکڑا۔ مُرکل: بیسن کی چکلیاں۔ ٹِتّو: ٹیکا۔ کمبا: گھر۔ بِچڑا: املی کا شربت۔ گتّا: ٹھیکا۔ پچی پلسو: املی کا کھٹّا رسم۔ کھٹّا پلسو: بہت کھٹّا۔ تیلگو پلیو: کھٹّا۔ پکا پنڈو: بہت پکا ہوا پھل۔

چھوٹے بچوں سے بات کرنے میں بہت سے تلگو الفاظ استعمال ہوتے ہیں مثلاً
بوّرا: تندرست، گھٹا ہوا۔ ہندی: توند۔ بوجّا: پیٹ۔ اپّا: روٹی۔ چیا: بوٹی۔

ذیل کے محاورے بھی تیلگو الفاظ پر مبنی ہیں۔
گمپا گتہ لے لینا: سارا مال خرید لینا۔ تِکا بنانا: سبق سکھانا۔ کِرکری کرنا: حجت کرنا۔ چِٹّے مارنا: گپّیں ہانکنا۔ مُرسنا: خوش ہونا۔ کِٹ کِٹ کرنا: جھگڑا کرنا۔ تِرگی تِرگی پھرنا: آوارہ گردی کرنا۔ رسکے لے جانا: وزن بادلِ ناخواستہ ڈھونا۔ دِک نیں ہے: سہارا نہیں ہے۔ تیلگو دِکو۔
کائے میں کچھ نیں گلے میں روپ رائی: جس خاتون کے پاس اہلیت نہ ہو صرف دکھاوے کا شوق ہو۔

ڈاکٹر شری رام شرما کے مطابق دکنی کا فعلِ معطوف

تیلگو سے ماخوذ ہے۔ اس کو "بول کو" یا بول کر کے
اضافے سے ادا کیا جاتا ہے۔ یہ تیلگو کا لفظی ترجمہ
ہے مثلاً انوں کھانا بول کر کھالیا۔

دکنی میں وہ جانا کتے۔ وہ جانے کو کہتے ہیں بھی
نحوی ساخت تیلگو نحو کا ترجمہ ہے۔

دکنی اور متفرق زبانیں

دکنی کی صفتِ عددی پراکرت اور اپ بھرنش سے
متعلق ہے۔ صفات اپ بھرنشوں سے نزدیک ہیں
لیکن بعض عددی صفات اپ بھرنشوں میں بھی نہیں
ملتیں۔ وہ کسی نامعلوم پراکرت سے متعلق رہی ہوں گی۔

دکنی میں تشدید سے تسہیل سندھی کی طرح
ہے مثلاً بچھو، اول، بھٹی

باڑ: کمار کی دھار بندیلی ہے۔ پوتا: اونٹ کا بچہ۔
اہیری پوٹ ڑا۔ آلی: بیوی۔ گونڈی آلی۔ کوٹ:
سنسکرت کوٹ۔ تامل کوٹ نے۔ پٹن: شہر۔
دراوڑی پٹ ٹ، نارنگی۔ دراوڑی نار: سونگھنا۔
ملیالم ناوان گاٹے: پھل۔ لنکا۔ دراوڑی جزیرہ۔

مندرجۂ بالا سطور میں دکنی اور دوسری زبانوں
کے مماثلات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ دو زبانوں ا اور
ب میں بعض مشترک خصوصیات و عناصر ہوں تو اس
لازماً یہ معنی نہیں کہ ا نے انھیں ب سے لیا ہے۔ یہ
بھی ممکن ہے کہ ب نے وہ عناصر ا سے لیے ہوں۔
ایک تیسرا امکان یہ ہے کہ ا اور ب دونوں نے اپنے
مشترک صورت سے لیے ہوں۔ چوں کہ دکنی بالذات
ایک مستقل زبان نہیں بلکہ کھڑی بولی کی ایک ذیلی بولی ہے
جب کہ مراٹھی، گجراتی، پنجابی وغیرہ مستقل مستحکم
زبانیں ہیں اس لیے زیادہ امکان یہ ہے کہ دکنی نے
ان سے فیض اٹھایا ہے۔ بعض خصوصیات ایک سے زیادہ
زبانوں کے ساتھ مشترک ہیں مثلاً جمع میں آں کا لاحقہ
پنجابی، ہریانی، راجستھانی، مراٹھی اور کئی زبانوں میں
ہے۔ کئی دکنی الفاظ اور لاحقے مثلاً تاکیدی "چ" گجراتی
اور مراٹھی دونوں میں ہیں۔ قربِ مکانی کے سبب اگر
ایک طرف گجراتی کا اشتراک مراٹھی سے ہے تو نسلی قرب
کے سبب گجراتی، راجستھانی اور برج میں بہت کچھ
مماثلت ہے۔ ہند آریائی بولی ہونے کے سبب دکنی ان
سب سے متاثر ہوئی ہے۔

اردو کو مخلوط زبان کہا جاتا ہے جو لسانی اعتبار
سے صحیح نہیں۔ دکنی اس کی ایسی بولی ہے جس نے دخیل
الفاظ کے علاوہ قواعد کے اصولوں میں بھی پاس پڑوس
کی زبانوں سے اخذ و استفادہ کیا۔ دکنی پر دوسری
ہندوستانی زبانوں کا اثر ایک مستقل تحقیق کا موضوع
ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ اردو اکیڈمی کی اعانت سے
میری یونی ورسٹی میں اس پر تلاش و تدقیق ہو رہی ہے۔

حوالے اور حواشی:۔

۱ سہیل بخاری: قدیم دکنی اور اردو زبان کا تقابلی مطالعہ۔ اردو نامہ، شمارہ ۱۸۔ بابت اکتوبر تا دسمبر ۱۹۶۴ء ص ۶۹۔

۲ و ۳ سہیل بخاری: اردو کا قدیم ترین ادب۔ نقوش ۱۰۳، مئی ۱۹۶۵ء ص ۸۲

۴ ڈاکٹر شری رام شرما: دکنی زبان کا آغاز اور ارتقا۔ اردو ترجمہ از غلام رسول۔ مقدمہ از مسعود حسین خاں ص ۹۔

حیدرآباد ۱۹۷۶ء ۔

۵ بحوالہ سہیل بخاری: اردو کا قدیم ترین ادب نقوش
مئی ۱۹۶۵ء ۔ نیز گنج ہائے گراں مایہ از افسر امروہوی ۔
قومی زبان کراچی ۔ جنوری ۶۴ء ص ۲۹ ۔

۶ گلزارِ عشق قلمی مخزونہ انجمن ترقیِ اردو پاکستان بحوالہ
تاریخ ادبِ اردو جلد اول از جمیل جالبی ص ۵۴۳ ۔ طبع
اوّل دلّی ۔

۷ یہ حصہ زیادہ تر ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی مقدمہ
تاریخِ زبانِ اردو اور ڈاکٹر شری رام شرما کی کتاب سے
ماخوذ ہے ۔

۸ شرما: دکنی زبان کا آغاز اور ارتقا، ص ۴۴۳ ۔

۹ یہ حصہ ڈاکٹر شرما سے ماخوذ ہے

۱۰ شرما: ص ۲۶۵

۱۱ شرما: ص ۴۷، ۴۸

۱۲ گجراتی کے باب میں میں نے تین تحریروں سے فائدہ
اٹھایا ہے ۔
۱۔ حفیظ اللہ انصاری: مضمون گوجری، گجری یا بولی
گجرات ۔ شاعر شمارہ ۵، ۶ ۔ ۸۱ء ص ۸۰
۲۔ ڈاکٹر عبدالستار دلوی: دکنی پر مراٹھی کا اثر ہندستانی
زبان بمبئی ۔ اکتوبر ۱۹۷۰ء
۳۔ ڈاکٹر شری رام شرما کی کتاب

۱۳ ڈاکٹر دلوی: بحوالہ بالا مضمون

۱۴ تیلگو کا باب دو کتابوں سے ماخوذ ہے
۱۔ ڈاکٹر شرما کی کتاب
۲۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ: مضمون دکنی اردو
پر تیلگو کے اثرات ۔ مشمولہ تیلگو والی عالمی تیلگو کانفرنس
اپریل ۱۹۷۵ء کا سوونیر مرتب عابد علی خاں

۱۵ ڈاکٹر شری شرما کی کتاب ص ۲۵۲

۱۶ یہ جزو ڈاکٹر شرما کی کتاب ص ۲۹۳ سے ماخوذ ہے ۔

(اختر الایمان صفحہ ۱۲ سے آگے)

کی نمائندہ نظمیں قرار دی جاسکتی ہیں ۔ ان نظموں میں
اُن کا پختہ رومانی شعور ملتا ہے ۔

تجھ سے وابستہ وہ اک عہد وہ پیمانِ وفا
رات کے آخری آنسو کی طرح ڈوب گیا
خواب انگیز نگاہیں وہ لبِ فریاد
اک فسانہ ہے جو کچھ یاد رہا کچھ نہ رہا
میرے دامن میں نہ کلیاں ہیں، نہ کانٹے نہ غبار
شام کے سائے میں درماندہ سحر بیٹھ گئی
کارواں لوٹ گیا مل نہ سکی منزلِ شوق
ایک امید تھی سو خاک بسر بیٹھ گئی

(محرومی)

مختصر یہ کہ موجودہ نسل اختر الایمان کے کارناموں
کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی وہ نئے اسلوب، اور نئے
اندازِ فکر کے مروج کرنے میں اہم حصہ لیا ہے ۔ انھوں نے
تجدیدی عنصر کا جادو جگایا ہے ۔ اختر الایمان کی شاعری
عہدِ جدید کے ادبی سرمایے میں ایک اہم اضافہ ہے ۔
اسلوب بیان ۔ فکر انگیزی، احساس کی ندرت،
ایمائی انداز کی وجہ سے ان کی شاعری میں خاص طرح
کی انفرادیت پیدا ہوگئی ہے ۔ انھیں اپنے معاصرین
سے ممتاز بناتی ہے ۔

حسن عسکری

ایک تجرید سے دوسری تجرید تک

ایٹمی دور میں ادب زندہ رہ سکتا ہے یا نہیں؟ اگر زندہ رہ سکتا ہے تو ان حالات میں آخر اُس کا فریضہ اور معاشرے میں اس کی جگہ کیا ہوگی؟ یہ سوالات ایسے ہیں جو آجکل ادیبوں اور ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کی توجہ کا مرکز بن گئے ہیں۔ ان مسائل پر نظریہ سازی اور خیال آرائی تو خیر دھڑلے سے ہی رہی ہے۔ لیکن جو بُرا بھلا ادب اور جس نوعیت کا بھی ادب آج کل پیدا ہوتا ہے اس پر بھی انہیں مسائل کا منحوس اور تخریبی سایہ پڑتا ہے۔ مفکر ہوں یا ادیب ان مسائل پر جس انداز سے غور کرتے ہیں اس کے پیچھے تین مفروضات ہوتے ہیں جنھیں یہ لوگ مسلّمات کا درجہ دیتے ہیں۔ (۱) کائنات کی تسخیر میں ادب نہیں بلکہ سائنس انسان کی مدد کر رہا ہے، اس لیے ادب کی اہمیت بالکل گھٹ گئی ہے اور سائنس کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے (۲) پوری دنیا نے صرف مادی ترقی کو اپنا مطمح نظر بنالیا ہے، اور غیر مادی مشاغل سے بیگانہ ہو گئی ہے۔ چناں چہ ہر ملک کی جد و جہد کا ماحصل یہ ہے کہ پیداوار کی شرح میں اضافہ ہو (۳) اس دنیا میں رہنے والے افراد کا ذہنی اُفق بھی اتنا سکڑ گیا ہے کہ وہ مادی آسائشوں کے سوا اور کسی چیز کی طلب ہی نہیں رکھتے۔

یہ مفروضات ایک طرح حقائق بھی ہیں۔ مجھے اس سے انکار نہیں۔ یہ چیزیں تو اب اتنی بدیہی بن چکی ہیں کہ اندھے کو بھی نظر آجائیں مگر دوسری طرح دیکھیے تو یہ تینوں رجحانات انیسویں صدی کے ہیں، بیسویں صدی کے نہیں۔ بیسویں صدی نے صرف اتنا اضافہ کیا ہے کہ جو بات چند ملکوں اور چند طبقوں تک محدود تھی اسے بڑھا کر عالمگیر بنا دیا ہے، اور اب یہ رجحانات اپنی اندرونی منطق کی آخری حدوں تک پہنچ رہے ہیں۔ اس عمل کا لازمی نتیجہ ہے کہ جب ایک طرح کے امکانات ختم ہونے لگیں تو دوسرے رجحانات پیدا ہوں۔ اور اب ہماری دنیا اس نئے دور میں داخل ہو چکی ہے۔

اس نئے عمل کو یورپ کے بعض شاعر اور ادیب آج سے تیس چالیس سال پہلے ہی بھانپ گئے تھے۔ ایزرا پاؤنڈ نے یوں تو زیادہ تر مذکورہ بالا تین رجحانات کو اپنی طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ مگر نئے عمل کی طرف اشارے اس کے یہاں بھی موجود ہیں۔ نئے رجحانات کا ادبی واضح تصور ڈی، ایچ لارنس کے یہاں ملتا ہے اور ۱۹۴۵ء میں رینے گینوں نے تو اس عمل کا پورا تجزیہ پیش کیا ہے لیکن اب

رجحانات اُس منزل میں داخل ہو چکے ہیں کہ انہیں دیکھنے کے لیے شاعرانہ بصیرت کی خاص ضرورت باقی نہیں رہی اب تو یہ اتنے نمایاں ہو چکے ہیں کہ معاشیات اور عمرانیات کی رُو سے بھی ان کا تجزیہ ہو سکتا ہے۔

اس قسم کے دو تجزیے امریکہ کے دو عالموں نے شائع کئے ہیں۔ معاشیات کی رُو سے گیل بریتھ نے اپنی کتاب "دی ایفلوئنٹ سوسائٹی" میں اور عمرانیات کی رُو سے ولیم وائٹ نے "دی آرگنائزیشن مین" میں۔ یہ دونوں کتابیں بیسویں صدی کے دوسرے حصے کی دنیا کو سمجھنے کے لیے ناگزیر ہیں، اور چوں کہ ادب بھی اس دنیا کے عوامل میں پھنسا ہوا ہے۔ اس لیے ادب کی موجودہ حیثیت متعین کرنے کے لیے بھی کتابوں کا مطالعہ ضروری ہے۔

ان کتابوں میں امریکی معاشرے کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے لیکن ایک اعتبار سے امریکہ کسی خاص ملک کا نام نہیں۔ امریکہ تو چند عوامل اور مظاہر کا نام ہے مغربی یورپ میں چند نظریات چودھویں صدی میں، اور وضاحتاً سولہویں صدی میں پیدا ہوئے تھے۔ ان رجحانات کی پوری اور منطقی نشوونما امریکہ میں ہوئی ہے اور یہ آخری شکل اب امریکہ کے اثر سے پوری دنیا میں پھیلتی جا رہی ہے۔ چناں چہ یہ اصول صرف امریکہ ہی سے مخصوص نہیں ان کا دائرہ عالمگیر ہے۔ جو باتیں امریکہ میں ظاہر ہو چکی ہیں وہ دوسرے ملکوں میں آہستہ آہستہ ظاہر ہو رہی ہیں عمل کا آغاز مغربی یورپ سے ہوا ہے، اور انجام میں کم و بیش ساری دنیا شامل ہے۔

اس پورے عمل کے پیچھے یہ نظریہ کام کر رہا کہ حقیقت دراصل مادہ ہے اور مادّے کے سوا کوئی حقیقت نہیں۔ چناں چہ انسان کا فرض یہ قرار پایا کہ جو کچھ کرے مادّی دنیا کے اندر رہ کے کرے اور اس کے افعال کے نتائج مادی شکل میں نمودار ہوں۔ اصلی کام جسمانی کام ٹھیرا۔ لیکن چوں کہ انسان کے پاس ذہن بھی ہوتا ہے اور ذہن جسمانی افعال میں مدد بھی دیتا ہے۔ اس کے ذمہ یہ کام لگایا گیا کہ وہ اپنی توجہ صرف مادے تک محدود رکھے۔ ان اصولوں کے ماتحت یورپ نے مشرق کے فکر کو بھی رد کیا اور خود اپنے یہاں کے ازمنۂ وسطیٰ والے فکر کو بھی۔ یورپ کو شکایت یہ تھی کہ اس قسم کا فکر بالکل مطلق اور مجرّد ہوتا ہے اور مادی دنیا سے واسطہ نہیں رکھتا چناں چہ عمل اور فکر دونوں سے یورپ نے مطالبہ کیا کہ انھیں تجرید سے بچنا چاہیے اور ٹھوس بنے رہنا چاہیے۔

تجریدی فکر سے کنارہ کشی اختیار کر کے یورپ نے ساڑھے تین سو سال تک جو کارنامے سرانجام دیے ہیں وہ یہ ہیں۔ قوموں نے سیاسی اعتبار سے سلطنتیں قائم کیں، اور معاشی اعتبار سے ایک طرف تو مشینی پیداوار میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کیا اور دوسری طرف اس پیداوار کو زیادہ سے زیادہ علاقے میں بیچنے کی کوشش کی۔ اس جد و جہد میں وہ چیز بھی رونما ہوئی جسے سائنس کی ترقی یا تسخیر کائنات کہتے ہیں۔ افراد نے اپنا شیوہ یہ بنایا کہ زیادہ سے زیادہ روپیہ اور آسائش کی چیزیں جمع کی جائیں۔ یہ کام اچھے ہیں یا بُرے، اس سے مجھے یہاں مطلب نہیں۔ میں اس وقت اخلاقی نقطۂ نظر سے غور نہیں کر رہا ہوں، بلکہ انسانی سرگرمیوں کا ایک نقشہ بنا رہا ہوں۔ اور یہ نقشہ بالکل

سید ھاسادا ہے۔ مغرب کے عمل اور فکر نے تجرید چھوڑ کر ٹھوس بننے کی کوشش کی۔ اور اس کوشش میں کامیاب ہوا۔ اس امید کے ساتھ کہ یہ سلسلہ ہمیشہ یوں ہی چلتا رہے گا۔

یہ امید کہاں تک پوری ہو رہی ہے۔ اس کا حال ہمیں ان دو کتابوں سے معلوم ہوتا ہے جن کا ذکر میں نے اوپر کیا۔ جو لوگ ادب پڑھتے ہیں انھیں تو ان کتابوں میں کوئی نئے انکشافات نہیں ملیں گے۔ مگر ان کتابوں کی خوبی یہ ہے کہ انھیں آپ انفرادی ردِ عمل اور داخلی تاثر کہہ کے نہیں ٹال سکتے۔ ان کا تجزیہ خارجی نوعیت کا ہے اور انھوں نے مادی عوامل سے بحث کی ہے۔ ان دو کتابوں کی بنیاد پر بیسویں صدی کے دوسرے نصفے میں انسانی زندگی کی تازہ ترین حیثیت کو سمجھنے کے لیے فرد سے شروع کیجیے۔

آج کل کے عام آدمی کے بارے میں مقبول ترین مفروضہ یہ ہے کہ وہ پیسے کمانے کے جنون میں مبتلا ہے۔ اور اس کے اندر یہ خواہش باقی سب خواہشوں پر غالب آچکی ہے۔ جنون کی حد تک تو یہ بات درست ہے، لیکن جہاں تک پیسہ جوڑنے کا سوال ہے، یہ کام مغرب میں اُنیسویں صدی کا آدمی کرتا تھا۔ آجکل کا مغربی انسان پیسہ جوڑتا نہیں خرچ کرتا ہے۔ بلکہ اکثر تو خرچ پہلے کر دیتا ہے، کماتا بعد میں ہے، کیوں کہ وہ ہر چیز قسطوں پر خریدتا ہے۔ چناں چہ کاغذ پر تو اس کی آمدنی بہت ہوتی ہے، لیکن پاس کچھ نہیں ہوتا۔ یعنی وہ صرف تجریدی شکل میں پیسہ کماتا ہے۔ اسکی کمائی ٹھوس نہیں ہوتی۔

دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ آج کل کا انسان معیارِ زندگی بلند کرنے کی فکر میں آسائش کی چیزیں بہت جمع کرتا ہے۔ یہ بھی درست۔ لیکن چیزیں چوں کہ قسطوں پر خریدی جاتی ہیں۔ اس لیے قانونی طور پر آدمی کی ملکیت نہیں ہوتیں۔ پھر چوں کہ ہر سال ہر چیز کا نیا ماڈل آجاتا ہے۔ اس لیے فیشن کے مطابق ہر سال بدل بھی دی جاتی ہیں۔ لہٰذا گھر میں جو چیزیں ہوتی ہیں، ان سے آدمی کا کوئی جذباتی رشتہ بھی نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ یہ چیزیں لازمی طور پر کسی ضرورت کے ماتحت نہیں خریدی جاتیں۔ یہ چیزیں عموماً سماجی رُتبے کی علامتیں ہوتی ہیں۔ اور یہ علامتیں محلے اور علاقے کے ساتھ بدلتی جاتی ہیں۔ چناں چہ آدمی ضرورت یا آسائش کی چیزیں نہیں خریدتا۔ بلکہ سماجی رُتبے کی علامتیں یوں سمجھے کہ جس طرح انیسویں صدی میں انگلستان کے تاجر خطابات خریدا کرتے تھے۔ آجکل مغرب کے عام آدمی اسی طرح وہ فیشن کی چیزیں خریدتے ہیں جن سے ان کا سماجی رُتبہ ظاہر ہو سکے۔ ان کے گھر میں چیزیں نہیں ہوتیں بلکہ سماجی علامتیں۔ یہ ٹھوس زندگی نہیں، خالص تجرید ہے۔

اسی طرح مغرب میں آدمی کے عادات و اطوار، سماجی تعلقات، سیاسی رائیں، ادبی مذاق، بلکہ بعض اوقات مذہب تک چند اتفاقات کا مرہونِ منت ہوتا ہے، اور جسمانی تبدیلیوں کے ساتھ ہر چیز بدلتی جاتی ہے۔ ان سب چیزوں کا تعین ایک ایسے انوکھے نظام کے ماتحت ہوتا ہے جس کی نہ تو کوئی عقلی توجیہ ہو سکتی ہے نہ جذباتی۔ چند نہ معلوم یا نیم معلوم حادثات ہر علاقے میں زندگی کا ایک نظام مرتب کر دیتے ہیں جس کی پیروی اُس علاقے کے لوگ کرتے رہتے ہیں، چاہے ان کی جذباتی، ذہنی، بلکہ جسمانی ضرورتوں سے بھی اس نظام کا کوئی واسطہ

ہو یا نہ ہو۔ مثلاً اگر کسی محلے میں یہ دستور قائم ہو گیا کہ مکان نمبر ۱ والے مکان نمبر ۲ والوں سے دوستی کریں گے اور نمبر ۲ والے نمبر ۳ والوں سے تو چاہے رہنے والے بدلتے رہتے ہیں مگر مکانوں کی جوڑی اسی طرح قائم رہے گی۔ غرض روزمرہ کی زندگی میں بھی تجریدی نظام ہر قسم کی انسانی ضرورتوں پر حاوی آچکا ہے۔

اب فرد سے آگے اجتماعی زندگی پر نظر ڈالیے۔ امریکہ میں تو پوری طرح اور مغربی یورپ میں فی الحال کم درجے پر قسطوں پر چیزیں خریدنے کا رواج اتنا بڑھا ہے کہ قرضہ پورے معاشی نظام کی بنیاد بن گیا ہے —— نہ صرف افراد کے معاملہ میں، بلکہ تجارتی اور صنعتی اداروں کے معاملے میں بھی، اس کا مطلب یہ ہے کہ معاشی نظام پر صنعت کاروں کا نہیں بلکہ بنکوں اور انشورنس کمپنیوں کا راج ہے۔ یعنی سارالین دین محض کاغذی کارروائی میں تبدیل ہو کے رہ گیا ہے۔ انیسویں صدی میں سرمایہ ایک ٹھوس چیز تھی۔ آج کل سرمایہ ایک تجریدی چیز ہے۔

کہتے ہیں کہ آج کل ہر ملک پورا زور پیداوار بڑھانے میں صرف کر رہا ہے۔ مگر جو ملک صنعتی اعتبار سے دنیا میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں وہاں ہر ادارے نے اپنا ایک نظامِ عمل (بلکہ نظامِ اخلاق بھی کہنا چاہیے) اصرار اس بات پر ہوتا ہے کہ اس نظام کی چھوٹی سی چھوٹی شرائط پر سختی سے عمل کیا جائے۔ چاہے پیداوار بڑھے یا گھٹے۔ ان اداروں کو سب سے زیادہ تشویش یہ رہتی ہے کہ ان کے نظام میں خلل نہ آنے پائے۔ اگر کوئی کارخانہ قائم کیا جائے تو اس کا مقصد بظاہر تو یہی ہوتا ہے کہ یہاں کوئی چیز بنے گی۔ لیکن ترقی کی آخری منزل یہ ہے کہ چیزیں بنانا اتنا ضروری

نہیں جتنا ایک مجرد نظام کو قائم رکھنا ...... اور اس نظام کو یہ تقدس کا درجہ کسی افادیت کی وجہ سے حاصل نہیں ہوتا، بلکہ صرف اس لیے کہ یہ ایک نظام ہے۔ یہ حال تو صنعت کا ہے۔ اب سائنس کو دیکھیے جس کے سہارے مغربی تہذیب قائم ہے اور جس سے ابھی آگے بڑی بڑی امیدیں ہیں۔ آجکل سائنس کا جتنا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے اس سے تو یہی خیال پیدا ہوتا ہے کہ مغرب میں سائنس کی تحقیقات کے لیے بڑی آسانیاں ہوں گی۔ اور سائنس دانوں کی بڑی قدر کی جاتی ہو گی۔ لیکن ولیم وائیٹ نے بڑی تفصیل سے دکھایا ہے کہ تحقیقی اداروں میں سب سے اہم شخص سائنس دان نہیں ہوتا بلکہ وہ شخص جو دفتری نظام چلا رہا ہو۔ ان اداروں میں سائنس دان کا اولین فرض یہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنی تحقیق میں ڈوب جائے۔ اس سے پہلا مطالبہ یہ کیا جاتا ہے کہ وہ ادارے کے نظام کی پابندی کرے۔ صرف اپنے کام کے سلسلے میں نہیں بلکہ اٹھنے بیٹھنے اور ساتھیوں سے ملنے جلنے کے معاملے میں بھی۔ وائیٹ نے تو یہاں تک کہا ہے کہ سائنس داں اپنے کام میں جتنا اچھا ہو گا اس کے لیے ان اداروں میں کام کرنا بلکہ وہاں داخل ہونا بھی اتنا ہی مشکل ہوتا جائے گا۔ کیوں کہ ان اداروں میں سب سے مقدس چیز سائنس نہیں بلکہ نظام ہے۔ یعنی موجودہ مادیت اب سائنس داں کے لیے وہی حالات پیدا کر رہی ہے جو قرونِ وسطیٰ میں مذہب نے گیلیلیو کے لیے پیدا کیے تھے۔ ہماری دنیا ادب کو تو خیر رد کر ہی چکی ہے لیکن پوری طرح قبول سائنس کو بھی نہیں کر رہی۔ موجودہ حالات سے ادیب

فضول ہی گھبرا رہے ہیں۔ ورنہ دراصل ادیب
اور سائنس داں دونوں ہی ایک ہی مد میں۔

سولھویں صدی میں مغرب نے مابعد الطبیعات
اور مجرد فکر کو اس لیے چھوڑا تھا کہ انسان مادی دنیا
کے وسائل سے کام لے کر جذباتی، حیاتی اور جسمانی
تسکین حاصل کر سکے، مگر مادی وسائل سے کام لینے
کی صلاحیت جیسے جیسے بڑھتی گئی ہے، کسی چیز سے
تسکین حاصل کرنے کی اہلیت اسی حساب سے کم ہوتی
گئی ہے۔ اور اب انسانی زندگی پر ایک نئی تجرید
حاوی ہوتی جا رہی ہے پرانی تجرید چوں کہ انسانی
جذبے اور حیات کو اپنے دائرے میں لے لیتی تھی
بلکہ جذبے اور حیات کا مخرج ہی سمجھی جاتی تھی اس لیے
اس تجرید میں بھی حیاتی تسکین کا سامان موجود تھا مگر
نئی تجرید ایک طرف تو مادے سے آگے کسی حقیقت کو
نہیں مانتی۔ دوسری طرف انسان کے جذباتی اور حیاتی
تجربے کو بھی قبول نہیں کرتی۔ یہ تو پیدا ہی ہوئی ہے۔
ان دونوں چیزوں کی نفی سے۔ چناں چہ اس نئی تجرید میں
نہ تو روحانی تسکین کی گنجائش ہے نہ جسمانی تسکین کی۔
اس میں وہ تخلیقی صلاحیت بھی نہیں جو تجزیہ کار عقل میں ہے
کیوں کہ تجزیہ کار عقل کم سے کم مادے سے تو اپنا رشتہ
قائم رکھتی ہے۔ لیکن یہ تجرید روح سے بھی کٹ کے الگ
ہو گئی ہے اور مادے سے بھی۔ یہ نہ روحانی چیز ہے
نہ جسمانی۔ اس کا اختصاص یہ ہے کہ یہ کسی حقیقت
سے بھی رشتہ قائم نہیں رکھنا چاہتی۔ بلکہ اپنے آپ کو
واحد حقیقت سمجھتی ہے، اور قائم بالذات۔

یہ نئی تجرید سب سے پہلے پروٹسٹنٹ ممالک
میں پیدا ہوئی ہے اور وہیں روز بروز شدت اختیار
کرتی جا رہی ہے۔ جو لوگ اس تجرید کے شکنجے میں آ چکے
ہیں ان سے تو خیر کیا، پروٹسٹنٹ علمائے دین سے البتہ
توقع ہو سکتی تھی کہ وہ اس نئی تجرید کی مخالفت کریں گے،
یا کم سے کم پرانی اور نئی تجرید کا فرق واضح کریں گے۔
لیکن لطف یہ ہے کہ جرمنی اور امریکہ کے علمائے دین اس
تجرید کی حمایت میں سب سے آگے ہیں، اور وہ اسے
نہ صرف تقویت پہنچا رہے ہیں بلکہ اسے حقیقی مذہب
بتا رہے ہیں یا اس کی بنیاد پر ایک نیا مذہب ایجاد
کر رہے ہیں۔

یہ ہیں وہ حالات جن کے درمیان آج کے
ادب کو زندہ رہنا ہے، اور اپنا راستہ ڈھونڈھنا
ہے۔ روپیہ کا لالچ اور سائنس کا رعب ان دو دشمنوں
سے تو ادب کو انیسویں صدی میں بھی سابقہ رہا ہے،
اب یہ ایک تیسرا دشمن نکلا ہے جو سب سے زیادہ طاقت ور ہے۔

(اپنی باتیں ص ۳ سے آگے)

ڈاکٹر اختر، حیدرآبادی روایت اور تہذیب
کا عمدہ اظہار بھی ہیں اور مخصوص مخدوم سے گہرا تعلق خاطر
بھی رہا ہے۔

پروفیسر جین اور پروفیسر وحید اختر کیا
سب رس اور ادارۂ ادبیات اردو کی سرگرمیوں سے
دل چسپی لیتے رہتے ہیں۔ ہم ہر دو اصحاب کی خدمت
میں ہدیۂ تحسین و مبارک باد پیش کرتے ہیں (د، غ)

رفعت عنبر

اخترالایمان

نئی شاعری میں بیسویں صدی کے غم و اندوہ، المناکیاں اور اس کے المیہ تجربے ملتے ہیں، نئی شاعری زندگی سے مضبوط رشتہ رکھتی ہے، اس عہد کے بنیادی مسائل سے شعرا کا گہرا تعلق ہے۔ سماج اور سماجی زندگی کی گھٹن، اونچے طبقے کی الجھنیں، فرد کے داخلی ہیجانات، ماضی پسندی، مستقبل کی دھندلی تصویر، امیدیں، آرزوئیں، احساسِ تنہائی، مجروح اور ٹوٹی ہوئی شخصیت، قدروں کا بحران اور انتشار اور تہذیب کا کھوکھلا پن —— یہ آج کی زندگی کے چند نمایاں پہلو ہیں جن کا عکس نئی شاعری میں جھلکتا ہے، نئی شاعری محسوسات کی شاعری ہے، ضروری نہیں کہ اس میں کوئی پیام بھی ہو، نئی شاعری کو نئی زندگی کے حوالے ہی سے پہچانا جا سکتا ہے۔ نئی شاعری پر کئی سمتوں پر سخت تنقید کی گئی اور یہ کہا گیا کہ یہ شاعری زندگی سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی اس میں مایوسی، گھٹن اور ماضی پرستی کا رجحان ملتا ہے لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ نئی زندگی کے ہیجانات سے نئی شاعری کا رشتہ بہت گہرا ہے۔ نئی شاعری میں انفرادی شعور کے ذریعے اجتماعی شعور تک رسائی ہوتی ہے۔ نئی شاعری میں ماضی سے دلچسپی ملتی بھی ہے تو وہ دراصل آج کے دور کی میکانکی اور مشینی زندگی کا ردِ عمل ہے۔ انسانیت کے حال کے آئینے میں مستقبل کا جو عکس نظر آتا ہے وہ مہیب اور مایوس کن ہے۔ شاعر جب ناکامیوں، محرومیوں اور مایوسیوں سے دوچار ہوتا ہے تو اسے مستقبل تاریک نظر آنے لگتا ہے وہ ماضی پسند بن جاتا ہے گزرے ہوئے لمحوں کی یادیں اسے سہارا دیتی ہیں، یہ ایک نفسیاتی عمل ہے۔ نئی شاعری کا آہنگ حلقۂ اربابِ ذوق اور ترقی پسند تحریک کے شاعروں سے مختلف ہے وہ موضوعات کے انتخاب میں عام طور پر بھی اد داخلی قسم کے چھوٹے اور نازک تاثرات اور تجربات کو پسند کرتے ہیں یہ موضوعات خاصے اجتماعی اد خارجی ہیں۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ نئی شاعری میں پرانی تشبیہوں اور استعاروں سے کام لینے

کی بجائے نئے علائم اور پیکر وجود میں آئے ہیں، ان میں کچھ مغربی طرز پر ڈھالے تاثر پارے بھی ہیں۔ نئی شاعری میں سرگوشیوں کا سا انداز بھی ہے، ربودگی، سپردگی اور داخلیت بھی۔ انفرادیت پر زور اور اظہارِ ذات کی کیفیت بھی پائی جاتی ہے۔ کہیں کہیں حقیقت سے گریز اور فرار بھی پایا جاتا ہے۔ غم سے پیار، گدازِ عشق، ماضی سے لگاؤ، فطرت سے قربت کا احساس بھی ہے۔

میں اسی پس منظر میں اختر الایمان کی شاعری کے چند مخصوص پہلوؤں کا تجزیہ کرنا چاہوں گی۔ نئی شاعری میں اختر الایمان ایک مستقل عنوان کی حیثیت رکھتے ہیں، اختر الایمان کی ماضی پسندی گزرے ہوئے لمحوں سے ان کی دل چسپی، ان کی تنہائی، علامت سازی، ذہنی الجھن، کربِ تنہائی اور انفرادیت پسندی یہ سب چیزیں نئی شاعری کی نمائندگی کرتی ہیں۔ اختر الایمان نے اردو شاعری کو پُروقار سنبھلی ہوئی خود کلامی اور تیکھی حقیقت نگاری سے نوازا ہے۔ وہ زخم کھایا ہوا دل ہی نہیں فلسفیانہ دماغ بھی رکھتے ہیں، وہ سماج کے تقاضوں کو نظر انداز نہیں کرتے، بھوک اور افلاس پر غور و فکر کرتے ہیں اور سماج کو ترقی کی راہ پر گامزن دیکھنے کے خواہش مند ہیں۔ ڈاکٹر محمد حسن نے "جدید اردو ادب" میں لکھا ہے:۔

" اختر الایمان نے ہماری شاعری کو نئی فکری جہت سے آشنا کیا ہے۔ اس میں فوراً سر چڑھنے والا نشہ نہیں آہستہ آہستہ سرشار کرنے والی کیفیت ہے۔"

اختر الایمان جذباتی اور ذہنی زندگی کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔ اس سے ان کے رومانی مزاج کا پتہ چلتا ہے۔ نظم "تعمیر" کے چند اشعار پیش ہیں:۔

میں بھی تعمیر اک جہاں کروں
بستیاں چند، غم کے مارے چند
مہ و خورشید اور تارے چند
ٹوٹنے والے ہوں سہارے چند

روشنی تیرگی میں کھو جائے
زندگی روتے روتے سو جائے
یہ حکایت دراز ہو جائے
بے کسی کا چراغ جلتا ہو
موت کے غم سے جی بہلتا ہو

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن "لاوے کا سمندر" میں لکھتے ہیں:۔

" جس کو بیشتر نقاد اختر الایمان کی قنوطیت، گہری افسردگی اور گھٹن کہتے ہیں اس میں مجھے ان کا پختہ رومانی شعور ملتا ہے۔"

اختر الایمان کے یہاں صدیوں کی شکست و ریخت، زندگی کی گھٹن، مایوسی خارجی اور داخلی حالات کی کشمکش میں بھی ان کا رومانی ذہن کام کرتا ہے۔ اختر الایمان کی شاعری میں درد، تڑپ اور غم کا عنصر زیادہ ہے لیکن ان میں پسپائی اور زندگی سے بیزاری نہیں۔ وہ اپنے تصورِ حیات میں غم کو اس لیے اہمیت دیتے ہیں کہ یہ ایک روشن حقیقت ہے۔ ان کی شاعری میں غم کی جذباتیت نہیں ہے بلکہ غم فلسفیانہ وقار اور تحمل کی کیفیت لیے ہوئے ہے۔ وہ غم میں ڈوب نہیں جاتے بلکہ ڈوب کے ابھرتے بھی ہیں ان کے

یہاں حوصلہ وہمت ہے اور وہ ایک روشن صبح کا خواب
بھی دیکھتے ہیں

مدتوں کی تاریکی
روشنی سے ڈھل جائے
چشمۂ بقا پھوٹے!
آسمانِ تازہ پر
آفتابِ تازہ ہو
زندگی کے شانوں پر
موت کا جنازہ ہو
(قیامت)

حقیقت کی ہو بہو عکاسی اور حقیقت کو فنکارانہ طور پر پیش کرنے میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے اکثر شعرا کے یہاں حقیقت کی سپاٹ تصویرکشی ہوتی ہے، شعریت نہیں ہوتی لیکن اخترالایمان حقیقی زندگی کے تاثرات کو فنکارانہ طور پر پیش کرتے ہیں۔ اُن کے تاثرات داخلیت میں جذب ہوکر سامنے آتے ہیں۔ اخترالایمان کی نظموں کا ڈرامائی انداز متاثر کرتا ہے، بڑی خوبی یہ ہے کہ نظم کے مطالعہ کے وقت یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم کہانی سن رہے ہیں، کہانی ختم ہوتی ہے اور تاثر پورے حواس پر چھا جاتا ہے یہی وہ خصوصیت ہے جو اخترالایمان کو دوسرے شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔ وہ ایسے موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں جو زمانے کی تیز رفتاری کا شکار نہ ہو جائیں، ایک زمانے کے بعد بھی ان کی نظموں کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہی شگفتگی اور شادابی نظر آتی ہے جب کہ وہ تخلیق پائی تھیں انھوں نے نظم کے فارم میں کئی تجربے کیے ہیں۔ اخترالایمان نے بہ حیثیت انسان، رہنما اور شاعر شخصیت کے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ ان کے یہاں فن کارانہ حسن کے بڑے مرغوب صورت اور اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔ انھوں نے حقیقت کے عرفان کی وہ سرحد چھو لی ہے جہاں پہنچ جانا شاعر کے لیے فخر کی بات ہوتی ہے اس کا اعتراف انھوں نے خود نظم "اجنبی" میں کیا ہے:-

میں نے وہ سرحد چھو لی ہے جہاں امر ہو جائیں پران
لے آنکھوں میں کھلنے والی جانے کون کہاں رہ جائے
جیون کی اس دوڑ میں پگلی ہم دونوں ہیں آج انجان
اے سپنوں کی دنیا تو چاہے تو روگ مٹیں
میں نے دنیا دیکھی ہے تو میری باتیں جھوٹ نہ جان
جیون کی اس اس دوڑ میں ناداں یاد اگر کچھ رہتا ہے
دو آنسو، ایک دبی ہنسی، دو روحوں کی پہلی پہچان!

اخترالایمان کی آواز اس لحاظ سے بھی منفرد ہے کہ انھوں نے داخلیت کے سوز کو بھرپور انداز کے ساتھ پیش کیا ہے اس آواز میں بڑا ضبط و نظم ہے، وہ تحت الشعور اور لاشعور کی باتیں نہیں کرتے، وہ ایسی باتیں کرتے ہیں جو ہماری اپنی دنیا میں ہوتی ہیں، ان کی نظموں میں ایک جانی پہچانی لَے سنائی دیتی ہے۔ ان کے درد میں کھوئی ہوئی سی آواز ذہنوں کو بیدار کرتی ہے۔ اُن کی شاعری میں چاندنی کی سی ٹھنڈک اور دھوپ کی سی شدت بھی ہے۔ اخترالایمان کے اس مخصوص شعری رجحان سے متاثر ہوکر ایک پوری نسل نے اُن کی تقلید اور تتبع میں شاعری کا آغاز کیا لیکن اُن کے مخصوص شعری مزاج سے مایوس ہوکر انھوں نے بھی ہار مان لی "تنہائی میں" "مسجد"۔ "ایک لڑکا"۔ "پرانی فصیل" اور "موت" وغیرہ اخترالایمان
(باقی صفحہ ۲۱ پر دیکھیے)

فضا ابن فیضی

...بہت، مگر آخر فنا ہوئے یارب
...یک قرض تھے خود ہی ادا ہوئے یارب
...تھی وہ مرتیں، وہ شفق شفق راہیں
...ب ایک سوال ہوا، ماجرا ہوئے یارب
...ب آگ بھی۔ وہ جسم جل کے راکھ ہوا
...گر ہم اور بھی کچھ آشنا ہوئے یارب
...ہیں لفظ لفظ، ہوئی کششِ معانی ہم
...کس عذاب میں ہم مبتلا ہوئے یارب
...جگر سے خود اپنا وجود چاک ہوا
...لیقے کی ہم بھی ردا ہوئے یارب
بنایا معجزۂ فن، ذرا سنبھال کہ ہم
کلیم ہوتے ہوئے بے عصا ہوئے یارب
خیالات معتبر ہیں، جذبے بے ترسیل
شعور و دانش و ابلاغ کیا ہوئے یارب
اب آگئی راس انھیں زرد موسموں کی ہوا
یہ اور بات شجر بے قبا ہوئے یارب
انھیں شعور عطا کر، کہ اپنی راہ چلیں
تمام لوگ، مرا نقشِ پا ہوئے یارب
نہیں ... کہ ہے کون ذمہ دار ان کا
... بھی مرے سر، تو قضا ہوئے یارب
فضا ... پوچھ اب کہ وہ بقولِ کسے
... آموختہ ہوئے یارب

●●

ایک حرفِ اعتراف بھی نکلا زباں سے کب
مرعوب وہ ہوا، ہنرِ دیگراں سے کب
دیکھا تو زرد شعلوں میں لپٹے ہوئے تھے سب
کس کو خبر یہ آگ گری آسماں سے کب
پوچھ آخری ستارے سے، تجھ کو بتائے گا
بچھڑا تھا اک مسافرِ شب، کارواں سے کب
اب سوچتا ہوں ہاتھ میں سورج لیے ہوئے
آخر اتر کے دھوپ گئی سائباں سے کب
آئینے ریزہ ریزہ ہوئے، چاند لخت لخت
چونکے ہیں اہلِ شہر بھی، خوابِ زیاں سے کب
ہے برگِ گل سے ہم کو چٹانیں تراشنا
یکسو ہوئے سیاستِ بازیگراں سے کب
دل کے برے سہی وہ، زباں کے برے نہ تھے
شرمندہ میں رہا، سخنِ دوستاں سے کب
کھویا رہا میں قرب میں اس کے، پتہ نہیں
وہ لے اڑا مجھے، مرے آغوشِ جاں سے کب
میں نے تو احتیاط سے لکھا تھا حرف حرف
وابستہ ہوگیا وہ مری داستاں سے کب
لفظوں کی بندشیں ہیں، معانی کی الجھنیں
ہم لوگ بھی سبک ہوئے بارِ گراں سے کب
چپ رہ کے بھی سنا ہے فضاؔ طعنِ ناشناس
پائے کسی نے پھل شجرِ رائیگاں سے کب

●●

رفیعہ شبنم عابدی

○

اُسے تو میرا بھی ذرّہ دکھائی دیتا ہے
زمانہ واقعی اندھا دکھائی دیتا ہے

نہ جانے کتنے سمندر کی پیاس ہے اس میں
وہ ایک شخص جو دریا دکھائی دیتا ہے

میرے وجود ہی کا ایک عکس ہے شاید
اس آئینے میں جو چہرا دکھائی دیتا ہے

نہ جانے کس لیے کرتے ہیں لوگ اس کا گِلا
وہ دیکھنے میں تو اچھا دکھائی دیتا ہے

نظر ہے شرط وگرنہ جہاں میں کچھ بھی نہیں
جو دیکھیے گا تو کیا کیا دکھائی دیتا ہے

ہر ایک جنس گراں ہے، ہر ایک شے انمول
بس اک شر ہے جو سستا دکھائی دیتا ہے

اس ارتقائے تمدّن کے دور میں شبنم
دلوں پہ یاس کا پہرا دکھائی دیتا ہے

●●

وقار واثق

○

آزاد تھا، کہ قیدِ زماں و مکاں میں تھا
جب وہ ملا، خبر نہیں میں کس جہاں میں تھا

تمیزِ خار و گل میں نہ کر پائے اب کے لوگ
اک مشترک سا رنگ، بہار و خزاں میں تھا

ہر سننے والا سر بہ گریباں تھا کس لیے
کیا کُل جہاں کا حال مری داستاں میں تھا

لٹتے رہے ہیں کارواں، لیکن اسی طرح
اب کیا بتاؤں، میں بھی اسی کارواں میں تھا

بجلی ہزار بار گری، وہ نہ جل سکا
ایسا بھی ایک تنکا مرے آشیاں میں تھا

گزرا ہے ایک ایسا زمانہ بھی دوستو
جب نام ہی کا فرق بہار و خزاں میں تھا

منزل ملی تو سمجھا مجسّم خیال ہے
الجھا ہوا وقار یقین و گماں میں تھا

●●

○

کھُلنے لگی ہے دوستو، اصلیتِ بہار
آپے میں گم ہے، دیکھیے محویتِ بہار

ہاتھوں سے چھوٹتا نہیں دامانِ باغباں
اب کے مگر بدل گئی خاصیتِ بہار

اب رنگ و بُو کے مدعی کانٹے بھی ہو گئے
خود آشکار ہو گئی عصبیتِ بہار

کہتا ہو اک زمانہ بہار آفریں جسے
اس کی نظر میں خاک ہو اہمیتِ بہار

لکھنے سے پہلے سوچ رہا ہوں کہ کیا لکھوں؟
تہنیتِ بہار، کہ تعزیتِ بہار؟

اہلِ گلستاں کہتے ہیں جن کو بہار زاد
محسوس کر رہے ہیں وہ غیریتِ بہار

ہر شخص گل بدست نظر آئے گا وقار
کل تک اگر بدل گئی نیّتِ بہار

●●

سید علی ظہیر

۳ نظمیں

○

جبر اور ظلم کی دو دھاری تلوار
کوئی نئی چیز تو نہیں
لیکن جب بھی چمکتی ہے نئی لگتی ہے
اس کی زبان میں عجیب چپچپاہٹ ہے
راتوں میں یہ زبان آسمان سے لٹکتی رہتی ہے
اور دن کے اجالے میں صاف چھپ جاتی ہے
اس کی نوک پر چپکے ہوئے ہزاروں ہاتھ پاؤں
کسی پھسلتے ہوئے لمحے کے منتظر ہیں
لیکن پھسلتا ہوا کوئی لمحہ
ان کو نہیں بچا سکتا
صرف گرم
ٹھوس اور ابلتا ہوا وقت ہی انشاءاللہ انھیں بچائے گا

○

کتنے ہی ساتھی
میدانِ جنگ میں
بازو ہی بازو ختم ہو جاتے ہیں

○

ریت کے ماحول میں خامشی
خاکی وردیوں کی طلایہ گردی کا ماتم کرتی ہے
چاقو، تلوار، بندوق سے
گائیڈیڈ مزائیل تک
اور معمولی جاسوسی سے لے کر
ہائپر سینیٹیو لیسنگ اور رکارڈنگ ڈیوائس تک (HYPER SENSITIVE)
بہت لمبا سفر ہے
اور کافی واضح تبدیلی ہے
صرف آواز کی نہیں
بلکہ خون کی بھی
خون لفظ و معنی سے گزر کر
اندھی اور روشن جسم کی خانقاہوں میں گونجتا ہے

●●

صلاح الدین نیرؔ

○

رہتی ابھی مرا دستِ سوال رہنے دو
حدِ نظر میں ہے حسن وجمال رہنے دو
ابھی تو آئی کہاں ہے وہ فیصلے کی گھڑی
دل ونظر کو ابھی ہم خیال رہنے دو
بہت عزیز ہیں دن رات میزبانی کے
تم اپنا فیصلہ اب اگلے سال رہنے دو
ہمارا پیار ہے رشتوں کی قید سے آزاد
ہمارے پیار کو یوں لازوال رہنے دو
پہونچ ہی جاؤں گا اک دن میں سرحدِ غم تک
اسی طرح سے مجھے پائمال رہنے دو
ملی ہے کس کو یہاں ٹوٹنے کی لذت بھی
اگر ہے آئینۂ دل میں بال رہنے دو
میں ٹوٹ ٹوٹ کے اصلاح اپنی کرلوں گا
نظر میں اپنی مجھے باکمال رہنے دو
کبھی تو آئیں گے حسن وفا کے سوداگر
ہمارے زخموں کو بے اندمال رہنے دو
وہ اب نہیں تو کسی دن تو آئے گا نیرؔ
نظر میں اپنی وہ پہلا سوال رہنے دو

٥٥

○

یہ سچ ہے کہ اب شہر سے وہ دشمن مکیں ہے
لگتا ہے مگر اب بھی مرے گھر میں مکیں ہے
ناخواستہ مہماں کی طرح قافلہ دل کا
تم نے جہاں چھوڑا تھا ابھی تک بھی وہیں ہے
جس کو مرے ہونٹوں نے چھوا تھا بہ صد اخلاص
اب تک مری آنکھوں میں جھلکتی وہ جبیں ہے
کھوئے ہوئے رہ کر نہیں پانے کی تمنا
یہ وہم سہی میرا مگر تم سے حسیں ہے
حصہ نہ بنا زیست کا خوشبو کا وہ لمحہ
اُس بزم سے اٹھ جانے کا افسوس نہیں ہے
رخساروں پہ بکھری ہوئی زلفوں کا تصور
پاکیزہ نگاہوں کی طرح کتنا حسیں ہے
چلنے لگیں پُروائیاں بے موسم باراں
شاید کسی دیوانے کے مقتل کی زمیں ہے
رک جاتے ہیں مجھ جیسے گنہ گار بھی نیرؔ
پیوند زمیں کون یہاں خاک نشیں ہے

٥٥

○

افسوس نہیں مجھ کو تری حرف زنی کا
جاں لیوا ہے لیکن ترا غم کم سخنی کا
رکھ دو دل گا تری نرم ہتیلی پہ میں آنکھیں
احساس ستائے تجھے جب بے وطنی کا
بہتر تو یہی تھا کبھی گھر سے نہ نکلتے
خدشہ جو تھا رہبر سے تمھیں راہ زنی کا
اک قطرۂ شبنم نہ ملا تشنہ لبوں کو
یہ کونسا انداز ہے خاطر شکنی کا
گلشن میں کوئی پھول تبسم کو نہ ترسے
گر عکس بھی پڑ جائے تری گل بدنی کا
غربت میں ہے جب خاکِ وطن ہی مری چادر
افسوس نہیں ہوگا مجھے بے کفنی کا
لب کھلنے نہ پائے تھے زباں کٹ گئی میری
انعام یہ کیسا ہے تری ہم سخنی کا
اب کون یہاں تیشہ بہ کف آئے گا نیرؔ
اک نام رہ گیا ہے بس اب کوہ کنی کا

٥٥

علی عباس امید

نایافت

○

فروغِ شمع کو شعلے سے اجتناب تو ہو
اے میرے ذہنِ رسا بند تیرا باب تو ہو
جو آنے والا ہے اُس عہد کا بھی حال لکھیں
ہمارے نام کسی پل کا انتساب تو ہو
یہ ریزہ ریزہ اکائی تو سمٹ سکتی ہے
فقط یہ شرط ہے ریزوں میں پیچ و تاب تو ہو
بھٹکتے ذہنوں کی یہ جستجو نے لا حاصل
بہت عظیم ہے پر داخلِ نصاب تو ہو
بہت ہے زندگی کو خفقانِ دلوں میں گھر کر لیں
مرے اُداس فسانے کا احتساب تو ہو
قلم کے حسن میں پنہاں ہے رنگِ قوسِ قزح
فضائے شہر کبھی اس سے فیض یاب تو ہو
نہ کرب چہرے پہ ہو اور نہ آنکھ میں شکوے
خود اپنے نفس سے ہٹ کر کوئی عذاب تو ہو
یہ روز و شب کی صعوبت سزا سہی امید
ہے جس گنہ کی سزا اس کا ارتکاب تو ہو

○○

نہ منزل کا تعین نہ راستوں کا پتہ
سُلگتی دھول، تپے پتھروں کے سینے پر
کبھی ملا نہ ملے گا کسی کا نقشِ پا ○

اسیرِ سیلِ گماں ہے عروسِ عمرِ رواں
لباس تنگ ـــــ لہو رنگ
موجِ خوں پیاسی
صدا بہ صحرا ہیں چیخیں، دریچہ سم زدہ ہیں
تمام دل زدہ چہرے، بجھی بجھی نظریں
تمام بکھرے ارادے، دھواں دھواں یادیں
قرآن و وید کا سایہ لہو کی گردش پہ
پشیماں دشمنِ آدم خود اپنی سازش پر
ہوائیں آگ میں، پانی میں ٹوٹتے رشتے
شکستہ تعمیرِ محبت اداس نسلوں کا ○
شکستہ سانس کی ابتر سی کوشش پیہم ــــ
وجود ڈھونڈنے کی ــــ حادثوں کے صحرا میں
وجہ ڈھونڈنے کی ــــ فیصلوں کی وادیاں
شکستہ سانس کی سعیٔ گراں ــــ گراں مایہ
شکستہ سانس کی سعیِ گراں کا سرمایہ
اک اضطراب، تجسس، فسردگی، الجھن
خیال و خواب کی لذت، حقیقتوں کی جلن
لٹی لٹی سی مسرت، اُداسیوں کی چبھن
شکستہ سانس کی سعیِ گراں کا سرمایہ

نہ منزلوں کا تعین نہ راستوں کا پتہ
سُلگتی دھول، تپے پتھروں کے سینے پر
کبھی ملا نہ ملے گا کسی کا نقشِ پا !!

○○

عوض سعید

خالی میز

اسے ایک لمحے کے لیے احساس ہوا جیسے وہ غلط جگہ آ گیا ہے۔ وہ ضرور راستہ بھٹک گیا ہے۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ وہ جس کمرے میں داخل ہوا تھا وہ اسی کی ملکیت تھا۔ اور تو اور گزرتے جاڑوں کی وہ رات بھی اسی کی تھی جسے وہ اپنے پیچھے چھوڑ آیا تھا۔

پھر وہ مسہری پر چپ چاپ سوئی ہوئی سرد نعش کے قریب پہنچ کر آرام سے سو گیا۔

اور جب وہ نیند کی گرم آغوش سے باہر نکلا تو ہر طرف سحر کا پرتو تھا۔ اس نے دریچے سے باہر جھانک کر دیکھا۔ دو گوالے سر پر دودھ کی بالٹیاں لیے دھیرے دھیرے قدم ڈالتے ہوئے راستہ طے کر رہے تھے۔

ایک جاروب کش سڑک صاف کرنے میں مشغول تھا اور اس کے ساتھ بھرے بھرے جسم والی ایک نوجوان عورت بھی تھی جو اس کا ہاتھ بٹانے میں مصروف دکھائی دے رہی تھی۔

اب دریچے سے جھانکتے ہوئے اسے بڑی بے چینی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے پلٹ کر مسہری کی طرف دیکھا۔ وہ عورت ابھی تک بے سُدھ سو رہی تھی۔ جیسے وہ جاگنے اور سونے کے عذاب میں رات بھر مبتلا رہی ہو۔

وہ پھر ایک بار دریچے کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔

اب سڑک پر چہل پہل شروع ہو گئی تھی۔ ایک ناٹے قد کا آدمی ایرانی ہوٹل کے کونٹر پر کھڑا اسیٹھ سے باتیں کرتا ہوا اطمینان سے چائے پی رہا تھا۔ ہوٹل کی کرسیوں میں دھنسے ہوئے دو چار آدمی اور بھی تھے جو شاید اخبار کی سرخیوں میں ڈوبے ہوئے حالاتِ حاضرہ کا جائزہ لے رہے تھے۔ وہ جاروب کش ابھی تک اسی عورت کے ساتھ کھڑا تھا اور وہ اُسے ہاتھ کے اشارے سے کوئی بات سمجھا رہی تھی اور وہ بے ساختہ ہنس رہا تھا۔

اس نے سوچا۔ شائد اُس عورت نے کوئی دلچسپ واقعہ اسے سنایا ہو۔

لیکن ان ساری باتوں سے اس کا کیا واسطہ—؟

وہ پھر ایک بار دریچے سے اکتا کر درِ اندر ونے میں آ کر ٹہلنے لگا۔

اب اس کا دھیان مسہری پر بے سُدھ پڑی ہوئی نعش کی طرف نہیں تھا کہیں اور تھا ان پر پیچ

گھاٹیوں میں جہاں وہ اپنے وجود کو اپنے ہی ہاتھوں دفن کر آیا تھا۔

وہ اب ایک عجیب و غریب اضطراری کیفیت سے دوچار تھا۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا جیسے تھوڑی دیر بعد ایک ہولناک، طوفان آئے گا اور وہ اس طوفان میں خس و خاشاک کی طرح بہتا ہوا بہت دُور نکل جائے گا۔ اتنی دُور کہ اس کی نعش کو شناخت کرنے والا بھی کوئی نہ ہوگا — یہاں تک کہ وہ نعش بھی نہیں جسے اس نے سہری پر . . . .

پھر ایک بار اسے وہ پُر پیچ گھاٹیاں یاد آنے لگیں۔

وہ بدصورت پہاڑ اور اس سے ذرا پرے ٹیڑھے میڑھے پتھروں سے لدی ہوئی وہ تنہا قبر۔

اس نے ایک جھرجھری سی لی۔ اُسے حیرانی ہوئی کہ دھند میں لپٹی ہوئی صبح ابھی تک چپ چاپ اس کی دہلیز پر کھڑی ہے۔

مگر وہ طوفان ابھی تک نہیں آیا تھا۔ شاید دبے پاؤں آکر چپ چاپ چلا بھی گیا ہو —

وہ ایک سحرزدہ آدمی کی طرح پھر ایک بار دریچے کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی نڈھال آنکھیں سڑک کے اُس پار پھیلا دیں۔

اُس نے سڑک پر کیا دیکھا۔ کن کن چہروں سے اُس کی آنکھیں چار ہوئیں اُسے کچھ یاد نہ تھا۔

اسے احساس ہو رہا تھا اس کے وجود کی طرح اب یہ در و دیوار بھی زخمی ہو گئے ہوں۔ اچانک اس کی نگاہ دروازے پر گئی جہاں صبح کا تازہ اخبار دروازے ہی میں پھنسا ہوا تھا۔ شائد اخبار والے نے آواز دی ہو اور جواب نہ پاکر عجلت میں اخبار کو دروازے ہی میں پھنسا دیا ہو۔

وہ بھی کتنا بے وقوف آدمی ہے۔ ان چھوٹی چھوٹی فضول سی باتوں ہی پر غور کرتا ہے!

اور ——————

پھر شائد اسے ناشتے کا خیال آیا۔ اس نے اسٹور روم میں پہنچ کر پلیٹوں کی تلاش شروع کر دی۔ بغیر مانجھی ہوئی پلیٹوں کے ساتھ اسے چھوٹے بڑے کئی کٹورے بھی دکھائی دیے۔ جس پر گرد اٹی ہوئی تھی۔

وہ پھر ایک بار ماضی کی دھندلاہٹوں میں ڈوب سا گیا۔ اب ناشتہ بھی اُسے ایک فضول سا فعل لگا۔ آدمی بغیر ناشتہ کئے بھی رہ سکتا ہے۔

اس کے لیے یہی طمانیت کافی تھی کہ اس کے پرس میں اس کی حیثیت سے کہیں زیادہ نوٹ تھے۔ وہ ان نوٹوں کو ایک ایک کر کے گننے لگا۔

"صاحب ناشتہ" اچانک اس کے کانوں میں ایک عجیب و غریب آواز اُبھری۔ اس نے دروازہ کھول کر دیکھا ایک نوجوان بیرہ ہاتھ میں کھانے کی کشتی تھامے کھڑا تھا ——

"۲۴ نمبر ——"

"مگر یہ تو ۲۲ نمبر ہے۔" اس نے بیرے کی غلط فہمی دُور کر دی۔ اور تیچے کمرے میں داخل ہو کر پھر ایک بار اُس عورت کو دیکھا جو ابھی تک سہری پر بے سُدھ سو رہی تھی۔

وہ کچھ دیر کھانے کی خالی میز کے اطراف یوں ہی بے معنی انداز میں ٹہلتا رہا۔ اس کا جی چاہا کہ جانے سے پہلے اسے نیند سے جگا کر یہ کہہ دے کہ وہ جا رہا ہے اور وہ اُٹھ کر دروازہ بند کر لے۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے لبوں کو جنبش دی اور اس کی کپکپاتی ہوئی آواز گھر کے ہولناک سناٹے میں دب کر رہ گئی۔ !!

اردو نامہ

وقار خلیل

علمی ادبی اور تہذیبی خبریں

یکم نومبر : نظامس اردو ٹرسٹ لائبریری اسٹیڈی سرکل حلقۂ ارباب ذوق کی طرف سے منعقدہ اجلاس میں جناب سیتھو مادھو راؤ پگڑی ریٹائرڈ آئی اے ایس (مہاراشٹرا) نے "اردو ادب میں آپ بیتیاں" کے موضوع پر مبسوط لکچر دیا۔ پروفیسر رفیعہ سلطانہ ڈین فیکلٹی آف آرٹس عثمانیہ یونیورسٹی نے صدارت کی۔ ابتداً معتمد حلقہ جناب محمد منظور احمد نے مسٹر پگڑی کا تعارف کرایا۔

۸ نومبر : اردو ایسوسی ایشن سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد کا ادبی اجلاس پروفیسر گیان چند جین صدر شعبہ اردو کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مہمان ادیب ڈاکٹر پیام اعظمی نے اردو مرثیہ پر مقالہ سنایا۔ جناب حبیب نثار نے جدید اردو غزل پر اپنے خیالات ظاہر کیے۔ ڈاکٹر مجاور حسین رضوی نے ڈاکٹر اعظمی کی علمی، ادبی خدمات پر روشنی ڈالی۔

۱۸ نومبر : ہفتۂ کتب خانہ کے سلسلے میں اسٹیٹ سنٹرل لائبریری کے احاطے میں سالانہ مشاعرہ ملک الشعراء اوج یعقوبی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ابتداً جناب عبدالغفور لائبریرین نے خیر مقدمی تقریر کرتے ہوئے ہفتۂ مطالعہ کی افادیت کو روشن کیا۔ اس مشاعرہ میں تاج مہجور، علی احمد جلیلی، صلاح الدین نیر، رئیس اختر، فیض الحسن خیال، عزیز النساء صبا اور روشن خیال نے کلام سنایا۔ جناب منوہر لال بہار مہمان خصوصی تھے۔

۲۰ نومبر : اردو گھر میں معراج ادب کی طرف سے دیوالی ملاپ کی شعری و ادبی تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ نواب میر احمد علی خاں سابق وزیر داخلہ نے صدارت کی۔ مسز رمن راج سکسینہ شریک معتمد ادارۂ ادبیات اردو، محبوب حسین جگر جوائنٹ ایڈیٹر سیاست نے حیدرآبادی کلچر کے پس منظر میں دیوالی کے روایتی اہتمام پر اپنے زرین خیالات کا اظہار کیا۔ محفل شعر میں علی احمد جلیلی، صاحب حیدرآبادی، منوہر لال بہار، وقار خلیل، خورشید جنیدی، بشیر وارثی، مبین نرمی، جوہر ہاشم، ڈاکٹر راہی، وید پرکاش ساون، پپیا سنگھ ورما، وجے نائک سکسینہ درد، ہلال آغائی اور دیگر شاعروں نے نظمیں اور غزلیں سنائیں۔ خورشید جنیدی نے نظامت کی۔

۲۱ نومبر : اردو گھر ٹرسٹ کے زیر اہتمام نامور فزیشن اور بزرگ رباعی گو ممتاز شاعر ڈاکٹر رگھو نندن راج سکسینہ الہام کے مجموعۂ رباعیات "کشکول" کی رسم اجرا مرکزی وزیر پٹرولیم مسٹر شیو شنکر نے انجام دی۔ مسٹر اکبر علی خاں سابق گورنر یو پی نے صدارت کی۔ جناب عابد علی خاں بانی اردو گھر ٹرسٹ، ڈاکٹر مغنی تبسم، ڈاکٹر یس اے شکور نے ڈاکٹر الہام کی شخصیت اور شاعری پر اظہار خیال کیا۔ مسٹر منوہر راج سکسینہ نے خیر مقدمی خطاب کیا۔ قدر عریضی اور ڈاکٹر اسمٰعیل ہاشمی نے نذرانۂ سخن پیش کیا۔ صلاح الدین نیر نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

○ زندہ دلان حیدرآباد اور ماہنامہ شگوفہ کی طرف سے بہ صدارت مسٹر نریندر لوتھر ایک محفل ادب آراستہ ہوئی۔ مہمان ادیب ڈاکٹر حامد حسین (بھوپال) کے علاوہ مسرز عنایت اللہ، مسیح انجم، طالب خوندمیری، مصطفیٰ علی بیگ، اسمٰعیل ظریف

سرپٹ ، رشید جلیل، یعقوب عمر، کلیم نے شعری و نثری تخلیقات سے نوازا۔ جناب سید مصطفیٰ کمال نے خیر مقدمی تقریر کی۔

۲۴ رنومبر : سنٹرل یونیورسٹی حیدرآباد میں اردو تنقید پر ایک سیمینار پروفیسر گیان چند جین کی صدارت میں استفادہ کا باعث ہوا۔ ڈاکٹر مغنی تبسم، ڈاکٹر ثمینہ شوکت اور ڈاکٹر حامد حسین نے مخاطب کیا۔ جناب حبیب نثار نے نظامت کی۔

۲۵ رنومبر : حلقۂ ارباب ذوق (نظام اردو ٹرسٹ لائبریری) کا ماہانہ ادبی اجلاس جناب حسن الدین احمد کی صدارت میں خسرو شناسی کا سبب بنا۔ جناب ابوالفیض سحر اسپیشل آفیسر گجرال اردو کمیٹی نے "امیر خسرو اردو تہذیب کا نقیب" کے موضوع پر سیر حاصل مقالہ سنایا۔ جناب محمد منظور احمد نے نظامت کی اور ہر دو اصحاب کا علمی و ادبی کارناموں کے پس منظر میں تعارف کرایا۔

○ حیدرآباد کرناٹک فرینڈس کلب کی طرف سے بصدارت جناب نریندر و تمر شعری محفل میں مہمان شاعر روی سونی (دہلی) کا خیر مقدم کیا گیا۔ صدر محفل نے ان کی شعری خدمات کو روشن کیا۔ امیر احمد خسرو، علی احمد جلیلی، افتخار احمد اقبال، لوتھر، سونی، صلاح الدین نیر، رئیس اختر (صدر کلب) فیض الحسن خیال، عزیز النساء صبا نے کلام سنایا۔ جناب امجد حسین چندا نے شکریہ ادا کیا۔

۲۶ رنومبر : بزرگ اردو شاعر جناب ابوالحامد سید عبدالرزاق عرشی مختصر علالت کے بعد رحلت کر گئے۔ حق مغفرت کرے وضعدار اور قادر الکلام سخنور تھے۔

۲۸ رنومبر : اردو مجلس کا ادبی اجلاس جناب سید ہاشم علی اختر سکریٹری ادارۂ ادبیات اردو کی صدارت میں بمقام اردو ہال آراستہ ہوا۔ ڈاکٹر اکبر علی بیگ نے اکبر الہ آبادی کی شاعری پر اور جناب تراب الحسن نے حیدرآبادی کلچر پر مقالے سنائے۔ آخر میں شعرا نے کلام سنایا۔ جناب صلاح الدین نیر معتمد اعزازی نے نظامت کی۔

○ اردو گھر میں بزرگ شاعر جناب [illegible] کے مجموعۂ کلام "یادوں [illegible]" کی رسم اجرا جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست کے ہاتھوں انجام پائی۔ ڈاکٹر [illegible] کی شاعری اور ان کی حیدرآبادیت

کو محبوب حسین جگر، میر احمد علی خاں، اوج یعقوبی، علی احمد جلیلی اور مشتاق احمد نے خراج ادا کیا۔

دسمبر ۸۲ ۱۹ء

۲ ردسمبر : حلقۂ ارباب ذوق کا ادبی اجلاس نظام اردو ٹرسٹ لائبریری کے احاطے میں بصدارت جناب اختر حسن منعقد ہوا۔ ڈاکٹر حامد حسین اسسٹنٹ پروفیسر انگریزی عثمانیہ نے گاندھی جی اور حسرت موہانی کی قومی خدمات پر لکچر دیا۔ محمد منظور احمد صاحب نے نظامت کی۔

○ بزم تزئین ادب کی طرف سے صدر اجتماع اردو اکیڈیمی ڈاکٹر محمد علی زیدی اور پروفیسر وحید اشرف (مدراس یونیورسٹی) کا مشترکہ خیر مقدم کیا گیا۔ پروفیسر غلام عمر خاں صدر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی نے صدارت کی۔ ابتداً جناب بشیر احمد نے ہر دو مہمانوں کا تعارف کرایا۔ ڈاکٹر زیدی نے ادب کے جدید رجحانات اور اکیڈیمی کی کارکردگی پر اظہار خیال کیا۔ محفل شعر میں پروفیسر اشرف، علی احمد جلیلی، خورشید جنیدی، بشیر وارثی، داؤد نصیب، یعقوب عمر، عقیل ہاشمی، زور آغائی (صاحب حیدرآبادی) نے کلام سنایا۔

۴ ردسمبر : گورنر جہار شٹرا کی بیگم محمودہ لطیف لطیف نے عثمانیہ یونیورسٹی میں علی یاور جنگ گلگشت روم کا معائنہ کیا اور اپنی زیر ترتیب

کتاب حیدرآبادی کلچر کے سلسلے میں ذخیرۂ کتب خانہ سے استفادہ کیا۔

۵ ر ڈسمبر: ادارۂ تنظیم اُردو کے زیر اہتمام " اردو گھر " میں ڈاکٹر راہی کے مجموعۂ کلام " دستک " کی جناب محبوب حسین جگر جوائنٹ ایڈیٹر سیاست نے رسم اجرا انجام دی۔ جناب منوہر راج سکسینہ صدر انجمن ترقی اردو حیدرآباد نے صدارت کی۔ نواب میر احمد علی خاں سابق وزیر داخلہ، جناب ابوالفیض سحر اسپیشل آفیسر نگراں اردو کمیٹی اور جناب اکرام جاوید اور رحمٰن جامی نے راہی کی شعری صلاحیتوں کو روشن کیا۔ خورشید جنیدی نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

۷ ر ڈسمبر: استادِ سخن حضرت فصاحت جنگ جلیل کے مکاتیب پر مبنی کتاب مرتبہ جناب علی احمد جلیلی ادبی ٹرسٹ اور فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی کی اعانت سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب جلیل منزل نور خاں بازار حیدرآباد ۲۴ سے خریدی جاسکتی ہے۔

۸ ر ڈسمبر: روزنامہ ملاپ حیدرآباد دلی اور جالندھر کے ایڈیٹر مجاہد آزادی اور نامور صحافی مسٹر رنبیر کا دہلی میں انتقال ہوا۔ حیدرآباد کے صحافتی اور ادبی حلقوں میں اظہار الم کیا گیا اور ان کے بھائی مسٹر یدھ ویر کو تعزیتی پیامات بہ کثرت روانہ کیے گئے۔

۹ ر ڈسمبر: پروفیسر غلام عمر خاں صاحب صدر شعبہ اردو جامعۂ عثمانیہ یونیورسٹی کی اطلاع کے بہ موجب شعبہ اردو کی طرف سے مخطوطہ شناسی کا ایک سالہ ڈپلوما کورس شروع کیا گیا ہے۔

۱۰ ر ڈسمبر: ریاستی محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ کی طرف سے سہ لسانی قومی یکجہتی مشاعرہ تلگو ملک الشعراء ڈاکٹر داسرتھی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مسرز خواجہ شوق، کنول پرشاد کنول، خیرات ندیم، صلاح الدین نیر، رئیس اختر اور نور النساء تسکین نے اردو کی نمائندگی کی۔

○ عثمانیہ لٹریری سوسائٹی کی طرف سے صاحبزادہ محمد علی خاں کلیم صدیقی کے مجموعۂ کلام " جلوۂ طور " کی قادر جنگ نے رسم اجرا انجام دی۔ ڈاکٹر غیاث صدیقی، جناب جہانداد افسر، صاحبزادہ احمد الدین علی خاں ریسرچ اسکالر، رضا صفی ادیب حیدرآبادی نے کلیم کی شاعری اور ان کی شخصی صلاحیتوں کو خراج ادا کیا۔ ہلال آغائی نے شکریہ ادا کیا۔

۱۵ ر ڈسمبر: ریاستی اردو اکیڈیمی نے جلسہ تعزیت منعقد کرکے مشہور صحافی رنبیر جی کی صحافتی اور جد و جہد آزادی میں ان کی گراں قدر خدمات کو زبردست خراج ادا کیا اور ان کی یاد میں صحافت کے لیے میموریل گولڈ مڈل اکیڈیمی کی طرف سے جامعۂ عثمانیہ کو ہر سال دیے جانے کا صدر اکیڈیمی مولانا حافظ ابو یوسف نے اعلان کیا۔ جناب اختر حسن مددگار معتمد اکیڈیمی اور جناب اعجاز قریشی ایڈیٹر بھارت نیوز اور مسٹر منوہر راج سکسینہ نے رنبیر جی پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ یوسف ندیم صاحب نے نظم سنائی۔

○ جناب یعقوب عمر لکچرار فارسی نظام کالج کو ان کے مقالہ " اردو غزل کی ترقی میں فارسی غزل کا حصہ " پر عثمانیہ یونیورسٹی نے پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری کا مستحق قرار دیا۔ ڈاکٹر عمر نے پروفیسر غلام عمر خاں صدر شعبہ اردو کی نگرانی میں مقالہ قلمبند

۱۸ ر ڈسمبر: ریاستی اردو اکیڈیمی نے ریاست کے ۴۵ کتب خانوں اور مطالعہ گھروں کو ۵۰۰ روپیے فی کتب خانہ کتابوں کی خریدی کے لیے رقمی اعانت کی منظوری دی ہے۔ ادارۂ ادبیات

مکتب خانہ بھی اس میں شامل ہے۔
اس اعانت پر ادارہ اکیڈمی سے
اظہار تشکر کرتا ہے۔
۱۹ ڈسمبر: گولڈن جوبلی تقاریب
ادارۂ ادبیاتِ اردو کے سلسلے میں
محفلِ خواتین کا ایوان اردو میں انعقاد
عمل میں آیا۔ ڈاکٹر زینت ساجدہ نے
افتتاحی خطاب کیا اور ادارۂ ادبیاتِ
اردو کی خدمات اور اہلِ قلم خواتین
کی اس ادارہ سے حوصلہ افزائی کو
ڈاکٹر زورؔ کا علمی کارنامہ قرار دیا۔ محترمہ
ڈاکٹر عاصمہ کمال نے صدارت کی۔
محترمہ عظمت عبدالقیوم نے ڈاکٹر
زور اور ادارہ پر مقالہ سنایا۔
محترمہ ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید نے
اردو کی خواتین شعراء پر مفید مقالہ
سنایا۔ محترمہ شفیعہ قادری نے
خواتینِ حیدرآباد کی خدمات
پر مضمون سنایا۔ محفلِ خواتین کی اس
و شعری محفل میں محترمہ جیلانی بانو،
سلطانہ شرف الدین اور قمر جمالی
ف نے اور بانو طاہر سعید، عظمت
مظفر النساء ناز، ناز حیدر،
س، نسیم نیازی، حفیظ النساء
اور زبیدہ تحسین نے کلام سنایا۔
حیدرآباد لٹریری فورم کے زیرِ اہتمام
شعری محفل پروفیسر حسن عسکری
کی صدارت میں آراستہ ہوی۔
ڈاکٹر مغنی تبسم، راشد آذر، تاج
مہجور، مظفر مجاز، رؤف خیر، علی الدین
نوید، غیاث متین، رضا وصفی، اعجاز
صدیقی، ڈاکٹر یوسف کمال اور
حامد حلیم نے فکر و شعور کی حامل
تخلیقات پیش کیں۔ جناب غیاث
متین نے نظامت کے فرائض انجام
دیے اور جناب یوسف اعظمی نے
شکریہ ادا کیا۔
۲۴ ڈسمبر: تلگو دیشم کے صدر
مسٹر این ٹی راما راؤ نے اسمبلی
انتخابات کے موقع پر اس امر کا
یقین دیا کہ ان کی پارٹی ریاستی
انتخابات میں برسرِ اقتدار آئے گی
تو اردو کو دوسری سرکاری زبان کا
درجہ دیا جائے گا۔
○ جناب عبدالحمود سکریٹری نظام
اردو ٹرسٹ کے اعلان کے بموجب
ٹرسٹ کی طرف سے حیدرآباد شہر
میں تعلیم بالغان اسکیم کے تحت ۳۰
مراکز کو اعانت دی جائے گی۔
۲۵ ڈسمبر: علمی و ادبی حلقوں
میں یہ خبر نہایت مسرت سے پڑھی
جائے گی کہ ممتاز دانشور اور
ریٹائرڈ آئی اے ایس عہدہ دار جناب
سید ہاشم علی اختر معتمد اعزازی ادارۂ
ادبیاتِ اردو کو ریاستی گورنر نے ایک
حکم نامہ کے ذریعہ عثمانیہ یونیورسٹی کا
وائس چانسلر نامزد کیا ہے اور جناب
اختر نے اس عہدہ جلیلہ کا جائزہ لے
لیا ہے۔ ادارہ کی گولڈن جوبلی تقاریب
کے سال میں جناب اختر کا اس عہدہ پر
فائز کیا جانا اردو کے علمی و ادبی حلقوں
کے نزدیک باعثِ افتخار سمجھا جا رہا ہے۔
۲۸ ڈسمبر: سالانہ کل ہند نعتیہ مشاعرہ
جناب حامد علی خاں ایڈیٹر سیاست کی نگرانی
میں بہ مقام دارالسلام جہتم بالشان طریقے
پر منعقد ہوا۔ مہمان شعراء والی آسی، عالم
فتح پوری، اور ڈاکٹر مدنا منظر کے علاوہ
زائر حرم مرزا شکور بیگ، شاذ تمکنت،
کنول پرشاد کنول، علی جلیلی، سعید شہیدی،
ہاشم جاہ، خورشید جنیدی، بشیر وارثی،
امیر احمد خسرو، منوہر لال بہار، وقار خلیل،
صلاح الدین نیر، پرشو رام پرشاد، معین
بزمی، سیف حموی، جوہر ہاشمی، رحمن جامی،
رئیس اختر، فیض الحسن خیال، راز عابدی،
جوہر ہاشمی، داود نصیب، صادق نقوی،
ڈاکٹر گودڑ شاہی، بے ہوش، صبر آغائی،
زیدہ آغائی اور ضمیر الزماں منیر نے نعتیہ کلام
سنایا۔ اقبال حسین اقبال کے نعتیہ کلام کی
جشن شرف الدین احمد نے رسم اجرا انجام دی

وقار خلیل

وفیات

۱۹۸۲ء اردو والوں کے لیے صبر آزما اور جانکاہ ثابت ہوا۔ جوش، فراق اور حفیظ جالندھری کی وفیات نے اردو شعر و ادب کی تہذیب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ "زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے" کے مصداق اس صدمے کو برداشت کرنا ہی اردو والوں کا مقدر بن گیا ہے۔ ۱۹۸۲ء رخصت تو ہو گیا مگر جاتے جاتے جناب نیر سنگھ (متوفی ۸ دسمبر) ایسے مجاہد آزادی بے باک صحافی اور روزنامہ ملاپ دہلی / حیدرآباد اور جالندھر کو ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھین لیا، یہی نہیں قزاق اجل نے ۲۰ دسمبر کو ممتاز ترقی پسند ادیب اور شاہراہ (دہلی) کے اردو ایڈیٹر جناب پرکاش پنڈت کو تاکا۔

۵ اکتوبر ۱۹۸۲ء کو ادارۂ ادبیات اردو کے لائبریرین اور محب اردو مولانا محمد شمس الدین انصاری بعارضۂ قلب رحلت کر گئے۔ بانی ادارہ ڈاکٹر زور کی آنکھیں دیکھنے اور انھیں پڑھ کر اپنے میں اردو زبان و ادب کی خدمت کا ولولہ اور جذبہ روشن کرنے والوں میں مرحوم انصاری صاحب بھی ایک تھے۔ خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرحوم میں۔

۱۹۸۳ء کی شروعات کے عشرۂ اوّل ہی میں اردو شاعری کو اپنے دو معتقد شعراء کی وفیات کا سوگ منانا پڑا۔ ۴ جنوری کو کانپور میں غزلیہ شاعری کے بزرگ سخنور حضرت نشور واحدی رحلت کر گئے آٹھ شعری مجموعے ان کی یادگار ہیں، انکے ترنم کی مہک اور غزل کے معطر لہجے کا بہت دنوں یاد رہے گی۔ نشور واحدی، وضعدار تھے اور محب وطن شاعر تھے۔ حیدرآباد کے مشاعروں میں کئی بار بھی مگر وہ مدعو کیے جاتے رہے اور اپنی غزل سرائی سے تشنگانِ سخن کی پیاس بجھائی۔ ۶ جنوری کو مرزا پور (یو، پی) ایک معروف شاعر جناب سید حرمت الاکرام بعارضۂ قلب اللہ کو پیارے ہو گئے۔ حرمت الاکرام تو درالکلام شاعر اچھے نثر نگار اور ... نتھے زندہ صحافی تھے۔ اقتصادی بدحالی کی وجہ سے فارغ البالی کی آرزو مند رہتے رہے۔ برصغیر کے ادبی حلقوں میں انکی رحلت کا احساس نم دیدہ کرے گا۔ دو شعری مجموعے اور ایک مثنوی "کلکتہ: ایک رباب" حرمت الاکرام کے فکر و فن کو دنیائے ادب میں روز اول رکھیں گے۔ سب رس سے بھی مرحوم کا دیرینہ قلمی ربط و ضبط رہا ہے۔ ان پر خدا کی مغفرت ہو اور پسماندگان کو حکومت یو، پی کی طرف سے معاشی سکون کے اسباب فراہم ہوں۔

برصغیر کے ناول نویس اور کہانی کار جناب غلام عباس کی پاکستان میں رحلت ہند و پاک کے ادبی حلقوں کو نم دیدہ کر گئی۔

تلنگانہ کے مشہور شاعر جناب غلام یٰسین، ان کی بیگم اور کم عمر لڑکے کو جنوری کے عشرۂ اول (۷، ۸ جنوری) میں فرقہ وارانہ فسادات نے لقمۂ اجل بنایا۔ گھر کا گھر تباہ و تاراج ہو گیا، آدرش اور عقیدے تہس نہس کر دیے گئے، فکر اور قلم، نظریات اور زبانوں کی تقدیس و طہارت کی پاسداری اب کیسے ہو، انسانی اقدار اور بھائی چارگی کی دہائی دیتے ہوئے ضمیر جھلاہٹ محسوس کرتا ہے۔ آرٹسٹ اور قلم کار تو ملک اور قوم کی روشن تقدیر ہوتے ہیں۔ خدا مرحوم یٰسین، انکی بیگم اور کمسن لڑکے کو جوار رحمت میں جگہ دے اور پسماندہ بزرگوں کا نصیبہ روشن فرمائے۔

اردو کے ذکی انور کے بعد غلام یٰسین کا قتل لسانی ہم آہنگیوں کا دعویٰ کرنے والوں کے ظرف و ضمیر کو چیلنج کرنے کا باعث بنے گا یا نہیں؟ حیدرآباد کے تلگو، اردو، ہندی ادیبوں، شاعروں اور آرٹسٹوں نے غلام یٰسین کے قتل پر من مارچ کا مظاہرہ کر کے فرقہ وارانہ فسادات کے خلاف آواز بلند کی ہے اسکو صدا بصحرا نہیں بنانا ہے۔

سن اجراء: ۱۹۳۸ء   فون نمبر ۳۸۴۶۹

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

حیدرآباد

مدیر اعزازی: ڈاکٹر مغنی تبسم

معاون مدیر: وقار خلیل

جلد ([illegible]) مارچ ۱۹۸۳ء شمارہ (۳)

قیمت فی پرچہ: ۲ روپے

ادارۂ ادبیاتِ اردو، پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد ۴۰۰۰۰۵

زرِ سالانہ		بیرونی ملکوں سے	
		ہوائی ڈاک سے	بحری ڈاک سے
	۲۰ روپے		
کتب خانوں سے	۲۵ روپے	مشرقِ وسطیٰ ۱۰ ڈالر	۴ ڈالر
بذریعہ رجسٹری	۴۵ روپے	امریکہ ۱۴ ڈالر	۶ ڈالر
		پاکستان، برما، سیلون ۸ ڈالر	۲½ ڈالر
		انگلستان ۷ پونڈ	۳ پونڈ

مطبوعہ: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان حیدرآباد ۲

فہرست

اپنی باتیں

ادارۂ ادبیاتِ اردو کی گولڈن جوبلی تقاریب کا ۱۴ مارچ ۱۹۸۲ء کو گنبدانِ قطب شاہی گولکنڈے پر جناب محمد ہدایت اللہ نائب صدر جمہوریہ ہند نے افتتاح کیا تھا ادارہ کی یہ تقاریب سال بھر تک وقفے وقفے سے منعقد ہوتی رہیں، سیمینار، مباحث اور شعر و افسانے کی محفل کے ذریعہ ادب، آرٹ اور کلچر کی ترقی میں حیدرآباد اور اردو کے حصے کو روشن کیا گیا۔ ادارہ کی چند مطبوعات کے طبع دوم کا انتظام اردو ٹرسٹ کی طرف سے اہتمام کیا گیا۔ گولڈن جوبلی تقاریب کا اختتام ۲۷ مارچ ۱۹۸۳ء کو ۱۲ ویں یوم قلی قطب شاہ کے جلاس پر ہوگا۔ ہمیشہ کی طرح حیدرآبادی عوام کے اس مقبول جشنِ اردو یوم محمد قلی کو جسے ادارۂ ادبیاتِ اردو کے سالانہ کاموں کا جائزہ بھی کہا جاتا ہے، جناب رمن راج سکسینہ صاحب معتمد تقاریب کی شخصی دل چسپی کے باعث شایانِ شان طریقہ پر انتظامات کئے گئے ہیں۔ چیف جسٹس آندھرا پردیش جناب کے۔ دھوینڈ ہنے افتتاحی تقریب کی صدارت کرنے سے اتفاق کرلیا ہے۔ یوم محمد قلی کے موقع پر ۱۳ مارچ کو ایوانِ اردو میں ادبی اجلاس بصدارت جناب امجد علی منعقد ہوگا۔ حیدرآباد کے اسکالر اہل قلم اصحاب و خواتین نے قطب شاہی تہذیب و ثقافت پر مقالے سنانے سے اتفاق کرلیا ہے معلوم ہوا ہے کہ اس اجلاس کو پاکستان کے نامور دکنی اور اردو ادب کے نقاد اور مورخ ڈاکٹر جمیل جالبی بھی خطاب کریں گے جنھیں سیاست توسیعی لکچر کے سلسلہ میں حیدرآباد آنے کی دعوت دی گئی ہے۔ ڈاکٹر مغنی تبسم ادبی اجلاس کے ناظم ہیں، اسی شب سالانہ مشاعرہ یوم محمد قلی قطب شاہ بھی آراستہ ہوگا۔ جس کی صدارت جناب محمود بن محمد کریں گے اور جناب منظور احمد جوائنٹ سکریٹری گولڈن جوبلی تقاریب ادارہ نظامت کے فرائض انجام دیں گے۔ ادارۂ ادبیاتِ اردو کے صدر جناب محامد علی عباسی، سرپرست جناب پروفیسر سید علی اکبر اور معتمد اعزازی جناب سید ہاشم علی اختر نے عمومی طور پر شرکت کی اپیل کی ہے۔

(وقار خلیل)

عظمت و بڑائی۔

جناب زورؔ کی اس شخصیت کی بحث سے آگے
بڑھنے سے پہلے اوروں کے سامنے یہ اعتراف بہت
ضروری ہے کہ میں ان کا شاگرد رہا ہوں اور بی۔ اے
ایم۔ اے میں ان سے درس لینے اور ان کے سامنے
زانوئے ادب تہہ کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔
اس قربت نے ان کی ذات و شخصیت کے جو گوشے میرے
سامنے بے نقاب کیے اس لیے استاد محترم پر قلم اٹھانے
اور کچھ کہنے کی جرأت پیدا کی۔ میں نے یہ بات محسوس
کی کہ جو شخص جناب زورؔ سے جتنا قریب ہوا اُسے
اتنا ہی ان کی بڑائی کا احساس ہوا۔ ان کی شخصیت
جو اس وقت تک تکمیل پا چکی تھی واقعی بڑی پُروقار اور
مرعوب کن تھی۔ بھرا ہوا جسم، سیاہ روشن چمکتی آنکھیں
گردن پر جھولتے ہوئے دراز بال۔ ڈھیلی ڈھالی
شیروانی، منہ میں پان کی گلوری، لہجہ میں گونج اور آواز
میں ملائمت تھی۔ جب میں اسکول میں پڑھتا تھا زورؔ
صاحب کا نام برابر سنتا چلا آیا تھا۔ دو چار جلسوں
میں انھیں دور سے دیکھا بھی تھا۔ پھر سٹی کالج سے انٹر
کرنے کے بعد جب میں نے جامعہ عثمانیہ میں داخلہ لیا
اور مضمونِ اختیاری اردو فارسی لیا تو دو سال تک
بی۔ اے میں اور اس کے بعد ایم۔ اے کی کلاسوں میں
ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور بات کرنے کی صورتیں بار
بار پیدا ہوئیں۔ سال اوّل میں یہ کلاسیں ٹمپریری شیڈس
میں ہوتی تھیں بعد ازاں دوسرے ہی سال جب آرٹس
کالج کی تعمیر مکمل ہو گئی تو یہ کلاسیں وہاں منتقل ہو گئیں۔ اس
وقت اردو، فارسی ڈپارٹمنٹ میں اچھی شخصیتیں جمع
تھیں۔ مثلاً سید سجاد، عبدالقادر سروری، عبدالقیوم باقی،
قاری کلیم اللہ اور ڈاکٹر نظام الدین وغیرہ۔ ان میں میں
جن اساتذہ سے متاثر ہوا وہ سید سجاد اور ڈاکٹر زور
تھے۔ بی۔ اے کی کلاسوں کی حد تک ان اساتذہ کو
کلاس روم میں آکر لکچر دینا پڑتا تھا۔ ایم۔ اے کے طالب علم
اساتذہ کے چیمبرس ہی میں اردو کا درس لیتے تھے۔ ان
دنوں طلبا کی تعداد بہت کم رہتی تھی اس لیے اساتذہ
اور شاگرد دونوں کو ایک دوسرے کو سمجھنے میں بڑی مدد
ملتی تھی۔ ہمارے بیچ میں رشید قریشی، خواجہ حمید الدین
شاہد اور حفیظ قتیل قابلِ ذکر ہیں۔ ہم تینوں پر ان کی خاص
نظر تھی اور ہماری موجودگی میں ان کے پڑھانے کی دلچسپی
بہت بڑھ جاتی تھی۔

ایک دن ایک عبارت کی تشریح کر رہے تھے
اس میں لفظ آتش آگیا۔ کچھ دیر کے لیے رک گئے۔ پھر
مجھ سے مخاطب ہو کر کہا اپنے والد یعنی استاد جلیل سے
پوچھ آئیے کہ صحیح لفظ آتش بالفتح ہے یا آتِش بالکسر۔
دوسرے دن میں دریافت کر کے لایا۔ جواب تھا کہ آتش کی
تائے دراز پر زبر ہے اور سند میں ایک شعر بھی لکھوایا
تھا جس میں آتش اور میکش کو ہم قافیہ بتایا گیا تھا۔ یہاں تو
جو بات یہاں غور طلب ہے وہ یہ ہے کہ لغت کی مدد سے
بھی وہ تلفظ کی صحت معلوم کر سکتے تھے لیکن وہ اس کی
تصدیق مستند ذریعے سے کرنا چاہتے تھے۔ اردو کے تعلق
سے تحقیق و جستجو کا یہ رویہ ان کی فطرت میں تھا خصوصاً
دکنی کی اردو سے ڈاکٹر صاحب کو جو لگاؤ اور پیار تھا
اس کو دہرانے کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ اسی تعلق سے
ایک اور واقعہ کا ذکر یہاں بے محل نہ ہوگا۔ ایک ا

زورصاحب نے والد مرحوم سے تحریراً دریافت فرمایا
یا اہل دکن کو اہل زبان قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہاں یہ بات
آپ کے سامنے واضح کردوں کہ والد مرحوم حضرت
جلیل ادبی استفسارات کے جواب بہت مکمل کر دیتے
لیکن جہاں کہیں کوئی ایسا سوال آجاتا جس کے جواب
میں اختلافی صورت پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا تو جواب
سے دامن بچا کر دیتے۔ مثلاً

ایک بار نورالحسن نیر کاکوری مولف نوراللغات
نے جناب داغ دہلوی کا یہ مشہور شعر لکھا ؎

[illegible] ادا منتا نہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی
اُف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی

اور دریافت کیا کہ ادا چھانا کا استعمال درست ہے یا
نہیں اس کا جواب جناب جلیل نے یوں دیا۔ ادا چھانا
نہ چھانا اور نہ چھانا درست نہیں ہے داغ نے
ادا چھائی جو کہا ہے یہ ان کی گویائی ہے۔ اسی نوعیت
کی ایک تحریر جناب اسمٰعیل کی ہے۔ ان کی تحریر کے
اسلوب سے بہت سارے حضرات واقف ہوں گے۔
انھوں نے اپنی ایک مطبوعہ کتاب والد مرحوم کے پاس
بھیجی اور رائے طلب کی۔ اس کا جواب یوں دے کر
دامن چھڑا لیا۔ — آپ کا رسالہ نیچر کے جذبات
سے بھرا ہوا ہے۔ میں اس کی کیا صراحت کرسکتا ہوں
— ہاں تو آمدم برسر مطلب جناب جب استاذی
زور صاحب نے دکن والوں کی زبان سے متعلق والد مرحوم
کی رائے جاننا چاہی تو جہاں تک مجھے یاد ہے انھوں نے
اتنی ہی تحریر پر اکتفا کیا تھا — کہ ایسے مسائل
پر اظہار خیال مناسب نہیں سمجھتا جس کے بارے

میں ایک سے زیادہ رائیں ہوسکتی ہوں۔ جناب زور کی
توجہ اس لیے بھی مجھ پر خاص تھی کہ ان کی ادارت میں
نکلنے والے سب رس میں میری نظمیں اور غزلیں شائع
ہوتی تھیں۔ حمید الدین شاہ جو سب رس کے حلقۂ ادارت
میں تھے وہ اکثر مجھ سے نظم اور رشید قریشی سے مضمون
مانگ لے جاتے اور سب رس میں چھپوا دیتے۔

غرض میں نے جناب زور کو پڑھاتے دیکھا
لکھتے دیکھا اور لگاتار کام کرتے دیکھا اور اس طرح
ان کی شخصیت کی تعمیر ہوتی گئی۔ ان کی ساری زندگی اردو
کے اطراف اپنا دائرہ بناتی ہے۔ اردو کے تحفظ اور ترقی
کے وسائل کے سوا کسی اور کاروبار سے انھیں شغف
نہ تھا۔ وہ اردو کے محسن اور اس کے عظیم خدمت گزار ہیں
نہ صرف اردو زبان و ادب کی خدمت کی بلکہ اس کی بقا کا
سامان بھی مہیا کیا — اور اس لحاظ سے بقول مولانا
عبدالماجد دریابادی — بابائے اردو کی جانشینی
کا مستحق اگر کوئی فرد واحد ہوسکتا تھا تو وہ مرحوم زور ہی تھے۔
ان کی ذات ایک ادارہ تھی، انجمن تھی۔ ان کے
علم و عمل کا حیرت انگیز امتزاج کہیں ادارۂ ادبیات اردو
کی تنظیم کی صورت میں ظاہر ہوا کہیں ایوان اردو کی تعمیر
کی شکل اختیار کی۔ ایوان اردو ان کے خواب کی تعبیر
تھی۔ اس کی تعمیر میں زور صاحب کے خون جگر کا وافر
آب و رنگ ہے۔ اتنا بڑا کام کس طرح انجام پایا۔ مالیہ
کس طرح فراہم ہوا اس کی تفصیل میں گئے بغیر صرف ایک واقعہ
کے ذکر پر اکتفا کرتا ہوں کہ غلام محمد وزیر فینانس نے (جو بعد
میں پاکستان کے گورنر رہے) جب اس کا معائنہ کیا
تھا تو اس کی تنظیم و ترتیب سے متاثر ہو کر فرمایا تھا —

زورؔ صاحب جی چاہتا ہے کہ آپ کو خزانۂ عامرہ لے چلوں اور کہوں کہ جتنا روپیہ لے جاسکتے ہو لے جاؤ۔ ایک اور بات اس ایوان کی تعمیر سے متعلق ہے اور بطورِ خاص قابل ذکر ہے کہ ایوانِ اردو کے سامنے کے حصے میں ایک گنبد بھی بنایا گیا ہے جو دور سے دعوت نظارہ دیتا ہے۔ میر یٰسین علی خاں کے بیان کے مطابق جب انھوں نے اس گنبد کی غیر ضروری تعمیر کی طرف توجہ دلائی تو اس کا پس منظر زورؔ صاحب کی تشریح کے مطابق بڑا دور اندیشانہ تھا۔ انھوں نے اس کی توجیہ یوں کی ــــ شاید آج سے سو برس بعد یا اس سے پہلے ہی یہ ادارے بھولے بسرے عجائب خانے بن جائیں گے اگر یہ گنبد قائم رہا تو متجسس نگاہیں اس پر پڑیں گی اور لوگ اسے کوئی مندر، مسجد یا مقبرہ سمجھ کر دیکھنے آئیں گے۔ اس طرح دکن کی تاریخ پھر زندہ ہوگی۔

جناب زورؔ کی شخصیت کا ایک اور روشن پہلو دکنی ادب کی تاریخ سے ان کی گہری دلچسپی ہے دکنی ادب کے محقق کی حیثیت سے زورؔ مرحوم اس کے تنہا وارث ہیں۔ دکنیات کے وہ امام تھے۔ جس طرح علی گڑھ یونیورسٹی کا تصور سرسید کے بغیر نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح دکنی ادبیات اردو کی خدمت کا تصور زورؔ صاحب کے بغیر ممکن نہیں۔ دکنی زبان پر انھیں اتنا ہی فخر تھا جتنا دہلی والوں کو اردوئے معلی پر۔ اس میں شک نہیں کہ دکنیات پر کام کی ابتداء مولوی عبدالحق صاحب کی تحریروں سے شروع ہوئی تھی۔ زورؔ صاحب کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے علمی سطح پر ان قدیم ادبی جواہر پاروں کی بازیافت کی۔

کتنے ادیبوں اور شاعروں کو گمنامی کی تاریکی سے باہر نکالا۔ وہ دکنی ادب کا سمبل تھے۔ آج کی ذہنی بیداری کو زورؔ صاحب ہی کی رہبری کا نتیجہ سمجھنا چاہیے۔ انھوں نے اپنے حلقہ اثر سے ایک پوری نسل کو متاثر کیا ہے۔

اس سلسلے کی ایک اور بات جس کا ذکر میں ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ ڈاکٹر زورؔ کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ شمالی ہندوستان والوں کے فطری احساس برتری کو [illegible] اردو کی ادبی تاریخ میں اور ہندوستان کی تہذیبی تاریخ میں دکن کے کارناموں کو ان کا جائز مقام دلانا ہے۔ مرعوب ذہنیت کا خاتمہ کرنا ہے۔ احساس کمتری کی زنجیروں کو توڑ کر دکن والوں میں خود اعتمادی پیدا کرنا ہے چنانچہ انھوں نے خود لکھا دوسروں سے لکھوایا اور اس چنگاری کو شعلہ بنانے میں لگے رہے ڈاکٹر زورؔ کی شخصیت کو نمایاں کرنے میں ان کے اردو انسائیکلوپیڈیا کا وہ مکمل منصوبہ بھی ہے جو انھوں نے سب سے پہلے ادارۂ معارف اسلامیہ کے دوسرے اجلاس میں پیش کیا تھا۔ اردو انسائیکلوپیڈیا کی اپنے طور پر انھوں نے طرح بھی ڈال دی تھی اور اس کے کچھ ابتدائی صفحات تیار بھی کر لیے تھے۔ بادشاہ حسین کو انھوں نے اس کام میں اپنا شریک بنا لیا تھا۔ بڑا جامع اور وسیع پلان تھا ان کا۔ مثال کے طور پر لفظ آزادی پنڈت جواہر لال نہرو کے سپرد تھا۔ گاندھی جی کو لفظ اہمسا سونپا گیا تھا۔ قائد اعظم محمد علی جناح نے امت پر لکھنا منظور کر لیا تھا۔ سروجنی نائیڈو نے بھی اس کام کو آگے بڑھانے میں بڑی ہمت افزائی کی تھی۔ لیکن حیدرآباد کی تقسیم کے بعد حالات نے ایسا موڑ لیا

کہ مرحوم زورؔ کا یہ پلان آگے نہ بڑھ سکا۔ لیکن حقیقت
یہ ہے کہ انہی کے بنائے ہوئے خطوط کی رہنمائی میں بعد میں
یہی کام اردو انسائیکلوپیڈیا پراجکٹ کی صورت
میں حکومت ہند کے ترقی اردو بورڈ کے ماتحت انجام
پایا۔ میں نے بھی دو سال تک بحیثیت اسسٹنٹ چیف
ایڈیٹر اس انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب و تدوین میں حصہ
لیا ہے اور میری موجودگی ہی میں اس عظیم کام کی تکمیل
ہوئی۔ آج اس انسائیکلوپیڈیا کے ۱۲ جلدوں کے
مسودات ترقی اردو بورڈ کی نگرانی میں زیر اشاعت ہیں
اور جلد ہی منظر عام پر آیا چاہتے ہیں۔ ہم اس دن کے
منتظر ہیں جب یہ جلدیں ارباب ذوق کے ہاتھ میں
ہوں گی اور اس اظہار عقیدت سے ان کے سر بلند
ہو جائیں گے کہ اس کی آبیاری میں ڈاکٹر زورؔ نے
اپنا لہو بھی شامل کیا ہے۔

جہاں تک ڈاکٹر زورؔ کی تصنیفات کا تعلق ہے
کیفیت اور کمیت دونوں اعتبار سے انھوں نے
جناب زورؔ کی شخصیت کو بہت ابھارا ہے۔ بالعموم
ہمارے لکھنے والے خواہ وہ تنقید نگار ہوں یا افسانہ
نگار چند تخلیقات کے بعد اپنے آپ کو دہرانے لگتے
ہیں یا پھر قلم رکھ دیتے ہیں۔ جناب زورؔ کی تصنیفات
پر یہ الزام وارد نہیں ہوتا۔ بات یہ ہے کہ ہمارے
مصنفین معاشی حالات کا شکار ہیں اور چوں کہ زندہ
رہنے کے لیے ادب سہارا نہیں بن سکتا اس لیے اکثر ان
کے لیے تصنیف و تالیف کل وقتی یعنی WHOLE TIME
کام نہیں بن سکا ہے۔ لیکن ڈاکٹر زورؔ اس اعتبار سے
بڑے خوش قسمت تھے کہ فکر روزگار سے وہ آزاد تھے
اور اس لیے ادب ان کے لیے فالتو وقت کا مشغلہ نہیں
کل وقتی کام بن گیا تھا۔ نتیجتاً وہ اپنی تخلیقات کے معیار
کی سطح کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہوسکے۔ ایک ADVANTAGE
انھیں یہ بھی تھا کہ مغربی ادبیات کے مطالعہ نے انھیں گہرائی
اور وسعت پیدا کر دی تھی چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ ادبی
تنقید و ادبی تاریخ پر قلم اٹھاتے وقت زورؔ نے اس بات کو
پیش نظر رکھا کہ ادبی تنقید، ادبی تاریخ کا ضمیمہ نہیں بلکہ
ایک دوسرے کا تکملہ ہیں مثلاً کلیات محمد قلی قطب شاہ
میں حیات محمد قلی صرف حیات ہی نہیں اس دور کی مبسوط
تاریخ بھی ہے جس میں قطب شاہی تمدن کی واضح
تصویریں بھی ہیں۔

حرف آخر یہ کہ ڈاکٹر زورؔ زمانہ طالب علمی،
قیام یورپ، جامعہ عثمانیہ کی پروفیسری، چادر گھاٹ
کالج کی پرنسپلی اور کشمیر میں زندگی کے آخری لمحے تک صرف
اردو اور اردو ہی کے لیے سانسیں لیتے رہے۔ اردو
تاریخ ان کی عظیم خدمات کو فراموش نہیں کر سکتی۔ آج
صورت حال یہ ہے کہ اردو پر ترس کھانے والوں کی
تعداد گھٹتی جا رہی ہے۔ ایسے وقت زورؔ صاحب کی یاد
ہمیں شدت سے آتی ہے۔ ان کی باقیات الصالحات پر کام
کرنے کی ضرورت ہے اور ان کے کام کو آگے بڑھانے کی
تاکہ چراغ سے چراغ جلتے رہیں۔ اردو کے مستقبل سے
اگرچہ ہم مایوس نہیں ہیں لیکن ہوا کا رخ بدلا ہوا ہے،
حالات سازگار نہیں ہیں۔ خدا نہ کرے کہ اردو پر وہ وقت
آئے کہ ہم اس شاعر کے ہمنوا ہو جائیں جس کی زبان
سے بڑی مایوسی کے عالم میں یہ شعر نکل گیا تھا۔

ذرا بڑھ کر اسے کندھا تو دینا۔ وہ اردو کا جنازہ جا رہا ہے

(یوم زورؔ ۸۲ء میں پڑھا گیا)

ڈاکٹر یوسف سرمست

زورؔ صاحب کی افسانہ نگاری

زورصاحب کا افسانہ نگار کی حیثیت سے مقام اور مرتبے کو متعین کرنے سے پہلے خود اس بات کے تعین کی ضرورت پیش آتی ہے کہ افسانہ کیا ہوتا ہے؟ تاریخ اور افسانے میں کیا فرق ہوتا ہے؟ حقیقت تاریخ اور افسانہ میں کیا ربط ہے؟ جب تک یہ تمام باتیں پیش نظر نہ ہوں زورصاحب کی افسانہ نگاری کی حقیقت اور اہمیت ہماری نظر میں اوجھل رہے گی۔

افسانہ کیا ہوتا ہے؟ اس کا مختصر جواب تو یہ ہو سکتا ہے کہ جو حقیقت نہیں ہوتی ہے وہ افسانہ ہوتا ہے لیکن یہ بات پوری طرح صحیح اور قابلِ قبول اس لیے نہیں ہے کہ افسانے میں حقیقت کا ہونا بھی ضروری ہے۔ افسانے میں حقیقت نگاری کی اصطلاح سے کون واقف نہیں۔ سوال یہ ہے کہ جب افسانے اور حقیقت میں گہرا ربط ہوتا ہے تب افسانے اور حقیقت میں فرق کس طرح کیا جا سکتا ہے؟ اصل میں اس نے کسی بھی افسانے نگار کی بڑائی اور اہمیت صرف اسی بات پر منحصر ہوتی ہے کہ وہ حقیقت کو کس حد تک افسانہ بنا سکتا ہے اور افسانے کو کس حد تک حقیقت بنا دینے پر قادر ہے۔ افسانہ نگاری کا سارا کمال حقیقت کو افسانہ اور افسانہ کو حقیقت بنا دینے میں مضمر ہوتا ہے۔ اچھا یا بُرا اور کامیاب افسانہ نگار کسی بھی بات کو کسی بھی واقعہ کو خواہ وہ کتنی ہی خیالی کیوں نہ ہو اس انداز اور اس طرح پیش کرتا ہے کہ وہ ہمارے لیے بے حد حقیقی اور واقعی بن جاتی ہے۔ وہ حقیقت سے زیادہ ہم کو متاثر کرتی ہے اچھا افسانہ ہمارے لیے اسی بنا پر حقیقت سے زیادہ متاثر کن ہوتا ہے۔ ہم حقیقی واقعات کو جو آئے دن پیش آتے رہتے ہیں اخباروں کی بڑی بڑی سرخیاں بنتے ہوئے دیکھتے ہیں مگر بھول جاتے ہیں لیکن ایک کامیاب افسانے کے واقعات کو آسانی سے بھُلا نہیں سکتے افسانہ نگار ان کو ہمارے اپنے تجربے اور مشاہدہ کا جزو بنا دیتا ہے اور ہم اس کے تخلیقی تاثر میں گم ہو جاتے ہیں اسی طرح افسانہ نگاری ایک خیالی بات کو ہمارے لیے حقیقی بنا دیتا ہے۔ بالکل اسی طرح وہ حقیقی بات کو ہمارے لیے افسانوی اور خیالی بنا دیتا ہے۔ کیوں کہ ہم ایک اچھے افسانے میں یہ نہیں جانتے کہ حقیقت کتنی ہے اور افسانہ طرازی کتنی ہے۔ حقیقت اور افسانہ یہاں اس طرح ملے ہوئے ہوتے ہیں کہ ہم ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کر سکتے۔ اسی لیے ہمارے لیے افسانہ حقیقت

ورحقیقت افسانہ بن جاتی ہے۔ افسانہ نگار اپنے
اثر کو قاری کا تاثر بنا دینے کا کمال جانتا ہے۔ اس کے
سوا افسانہ نگاری کچھ نہیں رہی افسانے کی تکنیک
وراس کے مختلف عناصر کی بحث تو یہ بھی تمام اسی
بنیادی اور محوری بات کی تکمیل کے لیے وجود میں آتی
ہیں۔ اب یہاں یہ بتانے اور کہنے کی ضرورت نہیں
ہے کہ اس اعتبار سے زورؔ صاحب کتنے بڑے
افسانہ نگار تھے۔ یہاں اس بات سے بحث نہیں ہے
انھوں نے کہاں تک حقیقت بیان کی ہے اور کہاں
افسانہ طرازی سے کام لیا ہے۔ یہ الگ بحث ہے
وراس پر آگے روشنی ڈالی جائے گی۔ زورؔ صاحب
افسانہ نگاری کا اس سے بڑا کمال کیا ہو سکتا ہے
انھوں نے سیر گولکنڈہ اور گولکنڈے کے ہیرے
میں جو باتیں بیان کی ہیں وہ ہمارے لیے بالکل حقیقی
اور واقعی بن گئی ہیں۔ آج گولکنڈے کی تاریخ اور
اس دور کی تہذیبی زندگی کو زورؔ صاحب نے اتنا
حقیقی اور واقعی بنا دیا ہے کہ یہ افسانے ہمارے
لیے حقیقت بن چکے ہیں۔ آج لاکھ تاریخی تحقیق
اور موشگافی زورؔ صاحب کی باتوں کو جھٹلائے لیکن اس
تاثر میں کوئی کمی نہیں آسکتی جو زورؔ صاحب کا تخلیق کردہ
ہے۔ زورؔ صاحب نے اپنے افسانوں کے ذریعہ
قطب شاہی دور کو اس قدر زندہ اور تابندہ کر دیا
ہے کہ وہ آج ہمیں سانس لیتا ہوا نظر آتا ہے
زورؔ صاحب کی افسانہ نگاری کا جائزہ لیتے
ہوئے یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ تاریخ اور افسانے
میں کیا ربط ہوتا ہے؟ کسی بھی افسانہ نگار کے لیے

جب کہ وہ تاریخی واقعات یا شخصیات کو موضوع
بنا رہا ہوں تاریخ کو کس حد تک ملحوظ رکھنا ضروری
ہے۔ تاریخ اور افسانے کے بارے میں ارسطو
نے سب سے پہلے روشنی ڈالی ہے۔ اس نے
شاعری اور ادب کو تاریخ سے زیادہ اہم قرار دیا ہے
کیوں کہ تاریخ محدود ہوتی ہے یعنی جو کچھ ہو چکا ہے
اس تک۔ اپنے آپ کو محدود رکھتی ہے جب کہ شاعری
اور ادب جو کچھ ہو سکتا ہے اس سے بھی بحث کرتی ہے
یہی شاعری اور ادب کی قوت اور اہمیت کا باعث
ہوتی ہے تاریخ میں حقیقت یہ ہے کہ تخیل کو کھلا
اور آزاد نہیں چھوڑا جا سکتا اس کو حقیقت اور واقعات
کی زنجیریں جکڑ لیتی ہیں۔ جب کہ ادب اور شاعری میں
اور افسانہ نگاری میں تخیل کھلی فضا میں پرواز کر سکتا
ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب افسانہ نگار
تاریخی واقعات یا شخصیات کو موضوع بناتا ہے
تو وہ تاریخ اور حقیقت سے کس حد تک تجاوز کر سکتا
ہے۔ یہاں تاریخ حقیقت اور افسانے کا ربط
بھی زیر بحث آجاتے ہیں۔ افسانے اور تاریخ کا موضوع
حقیقی انسان ہوتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ
حقیقی انسان تاریخی انسان کب اور کس طرح بنتا
ہے اور افسانوی انسان کس طور پر بنایا جاتا ہے
تاریخ حقیقی انسان کے ظاہری عوامل سے بحث
کرتی ہے۔ وہ انسان کے خارجی رویے تک عام
طور پر اپنے آپ کو محدود رکھتی ہے۔ ان اعمال و
عوامل کے پیچھے جو جذباتی، ذہنی کشمکش چھپی ہوتی ہے
وہاں تک اس کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ گویا انسان

کی باطنی زندگی تاریخ کے احاطے میں نہیں آسکتے
یعنی کہ اگر وہ انسان کی باطنی زندگی یا جذباتی زندگی
کی بھول بھلیوں میں گم ہونے کی کوشش کرے تو پھر
ٹھوس حقائق سے اس کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے
اور اس کو صرف تخیل پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ تاریخ
یہ بتا سکتی ہے کہ قلی قطب شاہ نے کونسی کونسی
جنگیں لڑیں اور کون سے اہم کام انجام دیئے لیکن
وہ یہ نہیں بتا سکتی کہ ان کارناموں کے پیچھے کون
سے جذباتی اور ذہنی عوامل کارفرما تھے۔ وہ ان
شخصیتوں کے باطنی روپ کو پیش کرنے سے قاصر
ہوتی ہے۔ افسانہ اس کے برخلاف حقیقی انسانوں
کے باطنی روپ کو اپنی جولانگاہ بناتا ہے اگر وہ
تاریخی شخصیت کو بھی لیتا ہے تو وہ اس کے ظاہری
اعمال اور افعال کی پیش کشی پر اکتفا نہیں کرتا
بلکہ ان کے پیچھے جو ذہنی اور جذباتی محرکات کام کر رہے
ہیں ان سے بحث کرتا ہے اور ان کی شخصیت کو
ایک نئے زاویے سے جسم و جان بخشتا ہے۔ ڈاکٹر ایم۔ فاروق
نے تاریخی اور افسانوی شخصیت کے اسی فرق
سے بحث کرتے ہوئے یہ بات کہی ہے کہ اگر کوئی
افسانہ نگار ملکہ وکٹوریہ کو بالکل اسی طرح پیش کرتا
ہے جس طرح کہ وہ تاریخ میں تھی تو وہ افسانہ نگار
کی حیثیت سے کامیاب نہیں ہوا اگر وہ ملکہ وکٹوریہ
کی ظاہری زندگی ہی نہیں باطنی زندگی کو پیش کرنے
کی قدرت رکھتا ہے تو پھر وہ افسانہ نگار کی حیثیت
سے کامیاب ہوتا ہے۔ افسانہ نگار صرف تاریخی
شخصیات اور واقعات پر اس لیے اکتفا نہیں
کرسکتا بلکہ اپنے تخیل کے زور پر بعض اور بھی کرداروں
کی تخلیق کرتا ہے جن کا تاریخ سے کوئی واسطہ نہیں
ہوتا جو صرف اس کے تخیل کی پیداوار ہوتے ہیں
اس طرح سے وہ ایک ایسا ماحول تخلیق کرتا ہے
جہاں اس کے کردار زیادہ حقیقی اور زندگی سے
قریب معلوم ہوتے ہیں۔

زورؔ صاحب کی افسانہ نگاری کی تمام تر
کامیابی اصل میں ان تاریخی، نیم تاریخی اور خیالی
شخصیتوں کو حقیقی زندگی عطا کرنے پر ہی منحصر ہے
وہ اپنے کرداروں کو اس قدر زندگی سے بھرپور
جیتا جاگتا چلتا پھرتا دکھاتے ہیں کہ وہ ہمارے لیے
بالکل سچی اور واقعی بن جاتے ہیں۔ بھاگ متی
کے کردار کو ہی لیجیے۔ پروفیسر ہارون خاں شروانی
نے اس کو بالکل غیر تاریخی قرار دیا ہے۔ اب بھاگ متی
تاریخی اعتبار سے حقیقت میں گزری ہو نہ گزری ہو۔
زورؔ صاحب نے اس کو حقیقی اور واقعی بنادیا ہے۔
تاریخی تحقیق کا بڑے سے بڑا کارنامہ بھاگ متی کے
کردار اور شخصیت کو ہمارے دل سے محو کرنے میں
کامیاب نہیں ہوسکتا۔ بھاگ متی اب ہمارے اجتماعی
لاشعور کا جزو بن چکی ہے۔ زورؔ صاحب نے جو زندگی
اسے عطا کی ہے اس کو اب کوئی بھی چھین نہیں سکتا
زورؔ صاحب کی افسانہ نگاری کی یہی معراج ہے۔

زورؔ صاحب نے جب "سیر گولکنڈہ" لکھی
تو اس وقت انھوں نے ان واقعات اور شخصیات
کے تاریخی یا غیر تاریخی ہونے پر کوئی بحث نہیں کی ہے
بلکہ انھوں نے اپنے ان افسانوں کو مضامین کا نام

دیا ہے۔ لیکن اگر ان افسانوں کو غور سے پڑھا جائے تو یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ انھوں نے صرف تاریخ پر اکتفا نہیں کیا ہے ایک جگہ وہ لکھتے ہیں۔

"صاحب! قلعہ اور اہلِ قلعہ سے متعلق اتنی معلومات آپ کو کن کن ذریعوں سے حاصل ہوئیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ جناب یہ نہ پوچھیے۔ یہ ذوق مجھے ورثہ میں ملا ہے۔" حقیقت یہ ہے کہ زورؔ صاحب کا بھی ذوق ان کے سارے افسانوں کو حقیقت سے قریب کر دیتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے جب ان افسانوں کے تاریخی یا غیر تاریخی ہونے کی بحث چلی ہے تب زورؔ صاحب نے "گولکنڈے کے ہیرے" کے دیباچہ میں ان کی وضاحت کی ہے اور ان کو افسانہ قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:۔

"گولکنڈے کے ان نیم تاریخی افسانوں کا مواد قدیم تاریخوں، یوروپی سیاحوں کے سفر ناموں اور یادداشتوں اور گولکنڈہ اور بیجاپور میں لکھی ہوئی دکنی کتابوں کے علاوہ ان روایات سے بھی حاصل کیا گیا ہے جو اس ملک کے عہدِ حاضر کے باشندوں تک سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی آرہی ہیں۔ ان تمام ذریعوں سے "مستفید" ہونے کے بعد مصنف نے اپنے تخیل کی مدد سے ان افسانوں کو قلم بند کیا ہے۔ اس کی دلی خواہش بھی ہے کہ اس طرح دکن کی زندگی بے نقاب ہو جائے اور اگر ان افسانوں کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے دلچسپی کے سامان پیدا کر دیا ہے تو مصنف کی اس سے بڑھ کر کامیابی اور کوئی پیش نہیں ہو سکتی۔"

زورؔ صاحب کی افسانہ نگاری کی سب سے بڑی کامیابی یہی ہے کہ انھوں نے دکن کی قدیم زندگی کو اپنے افسانوں میں اس طرح بے نقاب کر دیا ہے کہ وہ اس زندگی سے دلچسپی ان کی توقعات سے کہیں بڑھ چڑھ کر آج پوری ہندوستان میں عام ہو چکی ہے۔

زورؔ صاحب کے افسانوں کے سلسلے میں جن کی نوعیت تاریخی ہے۔ یہ بات بھی پیشِ نظر رکھنی ضروری ہے کہ تاریخی واقعات یا شخصیات اس وقت تک واقعی اور حقیقی نظر نہیں آتیں جب تک کے اس پس منظر کی باز تعمیر نہ کی جائے جس میں کہ وہ زندگی بسر کرتے رہے ہیں۔ تاریخی واقعات اور شخصیات اپنے حقیقی پس منظر ہی میں زندگی سے معمور ہو جاتے ہیں۔ زورؔ صاحب کے ان تاریخی افسانوں کی سب سے بڑی خوبی اور ان کی افسانہ نگاری کا کمال اس میں بھی نظر آتا ہے کہ انھوں نے دکن کی قدیم تہذیب۔ اور زندگی کی چلتی پھرتی بولتی چالتی تصویریں پیش کی ہیں یہاں مثالیں دے کر اس مضمون کو طویل کرنا غیر ضروری ہوگا۔ آپ ان کی کسی بھی تاریخی افسانے کو پڑھ جائیے "محل کی رقاصہ" ہو "مکہ مسجد" "ملک خوشنود" ہو یا "نار کے چبوترہ" "چاندی برج" [illegible] خواہ کوئی بھی افسانہ ہو انھوں نے قطب شاہی دور کے ماحول کی بازیافت اس طرح سے کی ہے کہ وہ پورا ماحول حقیقی زندگی سے سرشار نظر آتا ہے۔ اس دور کی پوری سماجی اور تہذیبی زندگی ہمارے سامنے کھو جاتی ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے سیر گولکنڈے کے بارے میں بڑی

(باقی صفحہ ۱۲ پر دیکھیے)

غیاث [illegible] قمی

ڈاکٹر زور کا دکن سے عشق

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور دکن سے اسی طرح پیار کرتے تھے جس طرح کوپر اپنی محبوبہ سے کہتا ہے :- WITH ALL THY FAULTS I LOVE THEE STILL تجھ میں تمام کمزوریوں کے باوجود میں تجھ سے اب بھی محبت کرتا ہوں۔ اسی کو عشق کہتے ہیں۔ ہر شاخ گل پر پھول بھی میرا نغمہ بھی میرے۔ جب اردو زبان علم وفن کے چشموں سے نا آشنا تھی، عوام کے ذہنوں اور دلوں پر حکمرانی کی لذت سے نا آشنا تھی تو دلی اور لکھنؤ کے اردو داں اہل زبان کہلاتے تھے۔ اس میں کیا شک ہے کہ انھوں نے ادب کے مزید ان میں اپنے جوہر دکھائے اور خوب دکھائے۔ لیکن کسی عظیم زبان کی منزل، داستان، تمثیل، ناول، افسانہ، کہانی، مثنوی، قصیدے، ہجو اور نظم و نثر کے ادبی سرمائے تک ہی محدود نہیں رہتی۔ اور اگر ایسا ہو تو وہ زبان عظیم زبان کہلانے کی مستحق نہیں ہوتی۔ جس طرح حیات و کائنات کی وسعت متقاضی ہے کہ ہزاروں علوم وفنون کی آنکھوں سے دیکھا جائے، ان گنت انگلیوں سے چھو کر اسے محسوس کیا جائے۔ لاتعداد احساسات وجذبات اسے سمجھنے کی کوشش کریں، ہر جہت سے اس پر روشنی کے چھاکے ٹوٹ پڑیں اور ان کے ہر پہلو کا عکس ایک نئے تجسس کا متقاضی ہو۔ بالکل اسی طرح ایک عظیم زبان ادبی حصاروں سے نکل کر مختلف علوم وفنون کو اپنی آغوش میں لے لیتی ہے اور وہ ایک عظیم ادبی زبان بنائی جاتی ہے۔

تخلیق ادب کے گلشن میں اگر دلی اور لکھنؤ کے محسنوں نے رنگ رنگ کے پھول کھلائے ہیں تو اردو کے دامن میں اہل دکن نے بھی علوم وفنون کے خزانے بھر دیے۔ جامعہ عثمانیہ نے محبوبہ اردو کو گلشن ادب کے علاوہ تاریخ، سائنس، فلسفہ، معاشیات، سیاسیات اور عمرانیات وغیرہ کے گلشنوں کی بھی سیر کروائی ہے۔ فن ترجمہ کے حکمرانوں نے کئی عظیم زبانوں کے خزانے اردو زبان کو عطا کرکے اسے عالمی سطح پر ایک علمی زبان بنا دیا۔ اب وہ گل وبلبل اور حسن وعشق کی وادی طے کرکے، ہمالہ کی چوٹی پر کھڑی ہے اور دنیا کی کسی بھی عظیم زبان سے آنکھیں ملانے کے قابل ہے اور اہل دکن کو اس کارنامے پر فخر ہے کہ انھوں نے یہ سب کچھ کیا اور اب بھی کر رہے ہیں۔ جامعہ عثمانیہ نے کئی نامور

سپوت پیدا کیے جن کے نقوش پا کئی بین الاقوامی شہرت کے چاند شرماتے ہیں۔ لیکن یہاں مادرِ جامعہ کے ان سارے فرزندوں کے نام نہیں گنواؤں گا جن کی پیشانیوں کو بین الاقوامی شہرت نے چوما اور ان کے سر پر فضیلتِ علم کے تاج رکھے بلکہ ایک ایسے عاشق کا نام پیش کروں گا جو محبوبۂ دکن کی ہر ادا پر مرمٹا کیا شاعری کیا نثر، دکن کی تاریخ و تہذیب کے ہر پہلو کو دنیا کے سامنے پیش کیا اور بصد افتخار پیش کیا۔ جھجک شرم، ندامت اور احساسِ کمتری کے سپاہیوں نے ڈھالیں تلواریں پھینک کر گمنامی کے غاروں میں اپنے منھ چھپا لیے اور اہلِ زبان کے گھسے پٹے سکے چند مٹھیوں میں رہ گئے۔ اس نئی سلطنت کا حکمراں ڈاکٹر زورؔ تھا جس نے اہلِ دکن کو نئی راہیں دکھائیں عزم و ہمت کے اسپ و شتر و فیل عطا کیے، تحقیق و تنقید کی تھپکیاں دیں، مہمیز بخشی، نوجوانوں کے بازوؤں کو پر پرواز لگا کر منزل کی راہیں دکھائیں۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے کہا تھا کہ اگر غالب نہ ہوتے تو اقبال پیدا نہ ہوتے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر ڈاکٹر زورؔ نہ ہوتے تو اہلِ دکن اپنے سینوں میں تمام علوم و فنون کو چھپائے دکن ہی کی مٹی میں دفن ہو جاتے۔ کم بخت دکن کی مٹی ہی ایسی ہے۔ کم سخن شرمیلی۔ اوروں کی طرح اشتہار بازی آتی ہے نہ باتوں کے طوطا مینا بنانا آتا ہے۔ دوسری ریاستوں میں تو ایک معمولی فن کار کو بھی اس کے ساتھی سر پر بٹھائے پھرتے ہیں۔ باہمی توصیف و تعریف کے نقارے بجاتے ہیں۔ تحقیق و تنقید میں اُن کی نظر "آس پاس" سے آگے نہیں بڑھتی ع

"من ترا حاجی بگویم، تو مرا حاجی بگو" کی آنکھیں کبھی دکن پر نہیں اٹھیں اور کبھی ایک نگاہِ غلط انداز ڈالی بھی تو سو احسانات جتائے۔ ڈاکٹر زورؔ نے اس طلسم کو توڑا۔ ادارۂ ادبیاتِ اردو کے لیے قابل شخصیتوں کا انتخاب کیا۔ ایوانِ اردو تعمیر کر کے اس میں دکن کے اہلِ علم و دانش کو ان کے اعزاز کے مطابق تخت و تاج عطا کیے، اور دکن کی زبان کو تسخیرِ ذہن و قلب کا وہ جادو عطا کیا جو آج عظیم بھارت کے ہر شعبۂ حیات میں سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ میں اردو کا نہ محقق ہوں نہ مورخ۔ میں اردو کا ایک طالب علم ہوں۔ میں نے ڈاکٹر زورؔ کو قریب سے بھی دیکھا ہے، دور سے بھی۔ ان کے جانبازوں کی محفل میں بیٹھ کر بھی، ان کے مخالفین کی صفوں میں گھس کر بھی۔ اگر دیانت داری، حق گوئی، غیر جانبداری کی آنکھیں کھولیں، وسعتِ نظر، وسعتِ قلب، وسعتِ دل کے ساتھ تعصب کے پردوں کو اٹھا دیں تو یہ حقیقت نظر آئے گی کہ ڈاکٹر زورؔ دکن کی آبرو بچانے کے لیے پیدا ہوئے تھے اور انھوں نے دکن کی آبرو کو نہ صرف بچایا بلکہ چار چاند لگا دیے جس کی روشنی سے ساری دنیائے اردو آج منور ہے۔

ڈاکٹر زورؔ اردو کے مورخ بھی ہیں، محقق بھی ہیں، تنقید نگار بھی ہیں، ادیب بھی ہیں، شاعر بھی اور دکن کے قابل فرزندوں کے سالار بھی ہیں۔ اُن کا جسدِ خاکی، کشمیر کی برف میں مدفون ہے لیکن ان کی روح کے ہاتھ ایوانِ اردو میں غیر مجلد مخطوطوں کی ورق گردانی کرتے ہیں اور اہلِ علم، اہلِ زر

کو مخاطب کرتے ہیں کہ دیکھو کیسی کیسی نایاب قلمی کتابیں
میں نے جمع کی ہیں اگر تم اپنے تعیش میں سے کچھ روپے
بچا سکو تو ان انمول کتابوں کی جلد بندی ہو سکتی ہے
اُن کی آنکھیں ایوانِ اردو کے میوزیم میں نایاب اشیاء
کے گرد گھومتی ہیں۔ نواب عنایت جنگ بہادر سے
کہتی ہیں کہ آپ کو تو اس وقت ایوانِ اردو کے میوزیم
میں ہونا چاہیے تھا۔ یہ آپ میرے ہاں کیوں چلے
آ گئے۔ آپ کے عطا کردہ اور دیگر محبانِ دکن کے
عطا کردہ نوادر کھادی کی تھیلیوں میں بند ڈبوں
میں پڑے ہیں۔ آپ وہاں ہوتے تو کم از کم ان
نوادر کے لیے خوب صورت شوکیس قائم کرتے۔

اُن کے ہونٹ "ایوانِ اردو" میں اپنے ساتھیوں
کی ہمت افزائی کرتے ہیں۔ معمولی معاوضوں پر تم لوگ
مجھ سے کیے ہوئے عہد و پیماں کو اب تک نباہ رہے
ہو۔ ادارے اور ایوان کی خدمت کر رہے ہو۔ کس
زبان سے تمہارا شکریہ ادا کروں۔ کیا کروں میں کشمیر
کی برف میں بے بس پڑا ہوں۔ مرتے مرتے بھی دل
چک میں نے تم لوگوں کے لیے بھیجا تھا۔ مجھے امید
ہے کہ اہلِ دکن کے جیالے نہ صرف میرے خزانوں
کی حفاظت کریں گے بلکہ ان میں اضافہ کرتے رہیں گے
میرا جسدِ خاکی کشمیر میں ہے لیکن میری روح یہاں
سے روزناموں، ہفتہ واروں، ماہ ناموں میں دکن
کے اہلِ قلم نوجوانوں کے کارناموں کو تلاش کرتی رہتی
[illegible]

حفاظت نسلاً بعد نسلاً کی جائے گی یہ جان کر مجھے کس قدر
مسرت ہوتی ہے میں کیا بتاؤں کچھ اور دن جی لیتا تو
ادارے کے مالیے کو مستحکم بنا دیتا۔ اپنے ساتھیوں
سے معذرت خواہ ہوں کہ میں خاطر خواہ اُن کی خدمت
نہ کر سکا لیکن مجھے امید ہے کہ دکن کے جیالے میری امانت
کی حفاظت کریں گے۔

ہاں، ہاں، زورؔ صاحب، ہم اہلِ دکن بیدار
ہو چکے ہیں۔ ہم نے اپنوں کی قدر کرنا سیکھ لیا ہے
دیکھیے نا آپ نے جشنِ امجد منایا تھا بڑی دھوم سے
ہم نے بھی جشنِ مخدوم منایا ہے اور آج "اہلِ زبان"
مخدوم ایوارڈ حاصل کر کے فخر محسوس کرتے ہیں۔

زورؔ صاحب، ہم وعدہ کرتے ہیں، انشاءاللہ
دکن پر تحقیق کرنے والوں کو ہر سال زورؔ ایوارڈ بھی
دیا کریں گے۔

(یومِ زور منعقدہ ۳ر اکتوبر ۸۲ء کے موقع پر پڑھا گیا)

[illegible] سے آگے

نے نکمیں کے ساتھ زورؔ صاحب کے افسانوں کی اس
خوبی کو اس طرح بیان کیا ہے۔

"یہ بہت دل چسپ کتاب ہے اور دلچسپ
طرز میں لکھی گئی ہے۔ اس میں تاریخ اور افسانے
اور واقعات اور تخیل کو اس خوبی سے سمویا ہے
کہ قطب شاہی دور کی تصویر آنکھوں کے سامنے
پھر جاتی ہے۔ بڑی بڑی تاریخوں کو پڑھنے سے وہ
[illegible]

پڑھا جارہا ہو۔ وہ فرداپنے میں انجمن لگے۔ اپنے آپ میں اُس کی قوتِ جاذبہ اتنی شدید ہو کہ اُس کے دائرہ اثر میں آنے والی ہر شئے خود بھی جاذب دکھائی دینے لگے۔ وہ روایت کے احترام تلے اُن ذہنوں کی تربیت کرے جو ابھی منزل سفر میں ہوں۔ وہ ایک شمع کے مانند لگے جو خود جلتی رہے لیکن اندھیرے راستوں کے راہی کو روشنی عطا کرے۔ اُس کے عزت، دولت اور حکومت کے پُرکشش مقام ہوں لیکن وہ انھیں ٹھکرا کر آگے بڑھ جائے تو میں ایسے انسان کو عظیم بھی کہوں گا اور غیر فانی بھی۔

میرے ذہن میں ایسے انسانوں کی جو فہرست مرتب ہے ان میں کا ایک نام ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کا ہے۔ زور صاحب پر بہت کچھ لکھا جا چکا۔ عطیہ رحمانی کے مقالے کا عنوان ہے ڈاکٹر زور شخصیت اور کارنامے مقالہ زیور طباعت سے آراستہ ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سارے مضامین میں سے چند ایک یہ ہیں:
ڈاکٹر زور مرحوم۔ ڈاکٹر ایس۔ آر کلکرنی، تاریخ اردو میں ڈاکٹر زور کی شخصیت کا تعین۔ ضیاء الدین شکیب، سید محی الدین قادری زور کی اہم شخصیت، ڈاکٹر انور معظم، ڈاکٹر زور اردو کے عظیم خدمت گزار۔ پنڈت ونشی دھر ودیا لنکار، ڈاکٹر زور۔ ڈاکٹر عمر خاں، ڈاکٹر زور سے یادگار ملاقات، شیخ محمد۔ ڈاکٹر زور میری نظر میں، غلام جیلانی ڈاکٹر زور کے ادبی خدمات، لئیس صلاح۔ لیکن آپ یقین جانیے ڈاکٹر زور پر اتنا ہی اور لکھا جا سکتا ہے اور لکھا جائے گا۔ مجھے اپنے مضمون میں ان تذکروں کو نہیں دہرانا ہے جو لکھے جا چکے۔ میں انھیں آپ کی یاد تازہ کرنے کے لیے صرف گنتا چلا جاؤں گا

زور صاحب کے ابتدائی دو نیم تاریخی افسانے طلسم تقدیر اور فسانہ تاریانہ تھے۔ طلسم تقدیر ۱۹۱۵ء میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔ بی۔ اے کی تعلیم کے دوران زور صاحب کی وہ تصنیف شائع ہوئی جس نے زور کو دنیائے ادب میں متعارف کروایا۔ روحِ تنقید کو عبدالحلیم شرر، نیاز فتح پوری، پروفیسر محمود شیرانی، مسعود اور عظمت اللہ خاں نے سراہا۔ اگر زور صاحب اپنی زندگی میں کچھ نہ لکھتے بھی تو اُن کی عظمت کے لیے اتنا کافی تھا کہ بی۔ اے کے ایک طالب علم نے اردو کے اُس دور کے صاحبانِ فن کو اپنی کتاب پر رائے زنی کرنے پر مائل کیا۔

مجلۂ عثمانیہ کے پہلے مدیر کی حیثیت سے زور صاحب نے عثمانیہ یونیورسٹی کے اردو ادب کی لاثانی خدمات کا سنگِ بنیاد رکھا۔

پھر زور صاحب کی تین کتابیں "تنقیدی مقالات" محمود غزنوی کی بزم ادب اور تین شاعر یکے بعد دیگرے شائع ہوئیں۔

۱۹۲۷ء سے ۱۹۲۹ء تک زور صاحب یورپ میں رہے اور ہندوستانی صوتیات پر مقالہ لکھ کر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ یورپ سے واپس ہوتے ہی "اردو شہ پارے" شائع کی۔ ۱۹۳۱ء میں ڈاکٹر زور نے ادارہ ادبیات اردو کی بنیاد ڈالی۔ ان تصانیف کے علاوہ ۱۹۴۵ء تک ڈاکٹر صاحب کی حسبِ ذیل کتابیں شائع ہو کر مقبول ہو چکی تھیں (۱) قصصِ خوب ترنگ (۲) عہد عثمانی میں اردو کی ترقی (۳) گلزارِ ابراہیم (۴) جواہر سخن (۵) فنِ انشا پردازی

۷) مرقعِ سخن (۷) متاعِ سخن (۸) کیفِ سخن
۹) بادۂ سخن (۱۰) سیرِ گولکنڈہ (۱۱) فیضِ سخن
۱۲) محرم نامہ (۱۳) روحِ غالب (۱۴) سرگزشت
غالب (۱۵) مکتوبات شاد عظیم آبادی (۱۶) اردو
کے اسالیبِ بیان (۱۷) سلطان محمد قلی قطب شاہ
۱۸) کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ (۱۹) گارساں دتاسی
۲۰) تاریخ ادبِ اردو (۲۱) میر محمد مومن۔

زورؔ صاحب کی زندگی کا یہ ایک رُخ ہے
دوسرے رُخ پر زورؔ صاحب کی تنظیمی، ادبی علمی کاوشوں
کی بھی ایک طویل فہرست ہے۔ جس میں سرِ فہرست
ادارہ ادبیاتِ اردو اور ایوانِ اردو کی تعمیر و ترقی
کی تاریخ لکھی ہے۔

کسی بھی فرد کو ذہنِ انسانی میں زندہ رہنے
کے لیے اتنا کچھ کافی ہے لیکن مجھے زورؔ صاحب کے عمل
سے نہیں روحِ عمل سے دلچسپی ہے۔ عمل جس وقت
صرف ہوتا ہے جب محرکِ عمل صحت مند ہو۔ یہ اردو ادب
کے صاحب نظر نقادوں کا وطیرہ رہا ہے کہ وہ جب
بھی کسی شخصیت کا جائزہ لیتے ہیں تو ان کی نظریں
غلطیوں کا سینہ چاک کرکے اُن جذبوں تک نہیں پہنچ پاتیں جو
فن کار کی روح سے عبارت ہوتے ہیں فن جب شخصیت
بن جائے تو فن کار غیر فانی ہو جاتا ہے۔ فن کو شخصیت
بنانے کے لیے فن کار کو جن راستوں سے گزرنا پڑتا ہے
وہ طوفانوں کی زد پر اور آندھیوں کی گزرگاہوں کے
بیچ ہوتے ہیں تجربوں کی تیز دھوپ سے جلتے اور ریگزار
کی گودی سے ہوتے ہوئے چلتے ہیں۔ ان راستوں پر
فن کار کا لہو بوند بوند بہتا ہے۔ اُس کی فکر ریزہ ریزہ
بکھرتی ہے۔ ٹوٹتے ہوئے لمحوں کا کرب اُس کی قسمت
بن جاتا ہے۔ اور پھر شخصیت فن کا پیکر دھار لیتی ہے
پھر اُس کی آواز وقت کی سنگلاخ دیوار کا سینہ چیرتی
ہوئی ان ذہنوں کو جھنجوڑ کر بیدار کرتی ہے جن کی قسمت
جمود سے عبارت ہوتی ہے اسی لیے کسی عظیم شخصیت
کا جائزہ اُس کی تخلیقات کی گنتی سے نہیں لگایا جانا چاہیے
بلکہ اُس محرک کو تلاش کیا جانا چاہیے جو اُس کی تخلیقات
کے سائے میں کارفرما رہا۔ زورؔ صاحب دو ایک خصوصیات
میں مجھے منفرد نظر آتے ہیں۔ اُن کے عمل کے تلے محرکِ عمل
ان کا دکن کی تاریخ تہذیب اور زبان سے بے پناہ
خلوص تھا۔ انھوں نے دکن کی تہذیب کو جلا دی دکنی
تہذیب کے خطوط کو اجاگر کیا اور دکن کے صاحبانِ قلم کو سر
اٹھا کر چلنے کے قابل بنایا۔ اردو ادب کی تاریخ کو
اُن کی تصنیفات نے ایک صدی عطا کی اور اُس کے دامن
میں ان صاحبانِ کمال کی فکری کاوشوں کو جگہ دلوائی
جنھیں زمانے نے ناقدری اور لاعلمی کی خاک تلے دفن
کر دیا تھا۔ یہ سب کچھ تنہا زورؔ صاحب اگر کر کے گزر
جاتے تو وہ انفرادیت انھیں نہ ملتی جسے آج ان کا شکر
کہہ رہا ہوں۔ انھوں نے اپنے اطراف صاحبانِ فکر و نظر
کا ایک حلقہ بنایا۔ اس انجمن میں شامل کرنے کے لیے
انھوں نے صاحبانِ فکر کو یوں چنا جیسے کوئی جوہری
پتھروں کے انبار سے جواہر الگ کرتا ہے۔ ان غیر
تراشیدہ ہیروں کو انھوں نے کاٹا چھانٹا اور یوں
جلا دی کہ وہ دمکنے چمکنے لگے۔ زورؔ صاحب کا یہ
کارنامہ اُن کی لافانی زندگی کی وجہ بنا۔ وہ اردو ادب
ہو کہ ہندوستانی تاریخ آج لے تحقیق کے لیے دو عنوان

ہے جس پر کام کیا جا سکتا ہے۔ کام کیا گیا اور انھیں ہم دکن والوں نے فخر کے ساتھ ان لوگوں کے سامنے پیش کیا جن کی نظروں کے حدود وندھیا کی چٹانوں اور نربدا کے دھاروں سے آگے بڑھ نہیں پاتے تھے۔ جن کی نظر میں ہندوستان کے دورِ وسطیٰ کی تاریخ مغلوں سے آگے نہیں تھی۔ قطب شاہیوں کو جب زورؔ صاحب اور اُن کے رفیقوں نے ماضی کے اندھیروں سے حال کی روشنی تک پہنچایا تو ان تاریخ دانوں نے آنکھیں مل مل کر انھیں دیکھا۔ وہ بے اساس نظریہ جس کے تحت دلی کی زبان اور دکنی تہذیب کو بہتر سمجھا جاتا تھا کسی کانچ کے برتن کی طرح سطح مرتفع دکن کی سنگلاخ زمینوں پر گر کر ٹوٹ گئے۔ یہ زورؔ صاحب کا کارنامہ تھا۔ میں تھا نہیں کہوں گا بلکہ ہے جسے دکن کا کوئی بھی انصاف پسند دماغ فراموش نہیں کر سکتا۔

مجھے نہیں معلوم کہ کیوں اب تک کسی نے زورؔ صاحب کی دکنی تاریخ کے لیے خدمات پر قلم نہیں اٹھایا۔ میں نے زورؔ صاحب کی بہت ساری تخلیقات ایک تاریخ داں کی حیثیت سے پڑھی ہیں بلکہ اُن میں سے کثرت سے حوالے دیئے ہیں۔ میں یہ بات بڑے بھروسہ سے کہوں گا کہ زورؔ صاحب ادب اور تاریخ کے سنگم کا نام تھا۔ انھوں نے دماغ ایک تاریخ داں کا پایا تھا جس نے اردو ادب کو اپنایا۔ ان کے پہلے دو افسانے جو نیم تاریخی ہیں میری بات کا جواز ہیں پھر ان کی اکثر تصنیفات میں ادب اور تاریخ کا باہمی ربط نمایاں ہے۔ کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ میں قلی قطب کے حالاتِ زندگی، محمد قلی قطب شاہ کی تاریخ، میر مومن سیرِ گولکنڈہ وغیرہ زورؔ صاحب کو تاریخ دانوں کے درمیان اونچا مقام دلانے کے لیے کافی سے زیادہ سرمایہ ہے۔

زورؔ صاحب ادارۂ ادبیاتِ اردو کے بانی ایوانِ اردو کے معمار اور سب رس کے نگران تھے۔ یہ تو آپ سب نے بارہا پڑھا اور سنا ہوگا لیکن یہ تینوں عنوان ہیں اُن کے لیے جنھیں حالات کے پس منظر میں حرکات کا جائزہ لینے کا چسکا ہے یہ سارے کام اُس دور میں ہوئے جب اردو کی تاریخ کا رُخ روایت پسندی سے انحراف پسندی کی طرف تھا۔ کبھی شخصیتیں تحریک سے بنتی ہیں اور اداروں کے سہارے پروان چڑھتی ہیں اور کبھی شخصیتیں تحریک بناتی اور اداروں کو جنم دیتی ہیں۔ پہلا راستہ وہ اپناتے ہیں جنھیں اپنی فکر اور اپنی صلاحیتوں پر بھروسہ نہیں ہوتا۔ وہ کسی تحریک سے وابستہ ہو جاتے ہیں اور کسی ادارے کو سہارا بنا کر سماج میں اپنے لیے مقام بنانے پر کوشاں رہتے ہیں۔ جس دور میں زورؔ صاحب کا قلم قرطاس پر رواں دواں تھا اس دور میں یہ راستہ کھلا ہوا بھی تھا اور آسان بھی اگر زورؔ صاحب نے اُسے اپنا لیا ہوتا تو وہ اُس دور میں شاید اجاگر ہو جاتے انھیں شاید مرتبہ بھی ملتا، دولت بھی اور عزت بھی لیکن وہ فن کار تھے انھیں راہ رَو نہیں رہبر بننا تھا۔ انھوں نے یہ عام راستہ ترک کیا۔ اپنی راہ بنائی اور اس پر چل نکلے لیکن یہ بغاوت تھی اس لیے ان کا راستہ روکا گیا انھیں رجعت پسند سمجھا گیا۔ طنز کے تیر چلائے گئے لیکن زورؔ صاحب نے

(بقیہ صفحہ ۳۱ پر دیکھیے)

احمد علی خاں ادیب

ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق

۱۹۷۲ء کا ذکر ہے کہ راقم الحروف نے اپنی تالیف
"تنقیدی نظریے" کا مسودہ پروفیسر آغا حیدر حسن مرزا
[کی] خدمت میں اس غرض سے پیش کیا تھا کہ وہ اس پر
[ا]یک مبسوط مقدمہ تحریر فرمائیں۔ چوں کہ آغا صاحب سے
[میر]ے نیازمندانہ مراسم برسوں رہے، اس لیے
[ان]ہیں یہ زحمت دینا مناسب تھا۔ اس کے ایک ماہ بعد
[ج]ب میں ان سے ملا تو فرمانے لگے "میں نے آپ کے
[مسو]دے پر سرخ پنسل سے نشان لگا دیا ہے کہ مجھے
[کہا]ں کا دیباچہ لکھنا ہے، مگر ابھی تک اسے چھوا بھی
[نہیں]، ذرا کچھ اور مہلت دیجیے" مہینے ڈیڑھ مہینے
[کا] عرصہ گزار کے ایک دن صبح سویرے میں پھر [آغا]
صاحب کے دولت کدے پر پہنچا اور ان سے
حسب عادت دو گھنٹے تک ان کی لچھے دار باتیں
[ا]ور [illegible] کی ہوا کھاتا رہا مگر جس غرض سے
[گ]یا تھا وہ اب کے بھی پوری نہ ہوئی، عذر یہ کیا
[کہ] اس یونیورسٹی سے بی اے کے امتحان اردو
[ک]ی جو کاپیاں بھجوائی ہوئی ہیں انھیں کی جانچ
[میں] لگا ہوا ہوں، اس کام سے فراغت پاتے
انشاء اللہ آپ کا کام کر دوں گا۔ یہ معقول عذر
سن کے مجھے پھر بے نیلِ مرام لوٹنا پڑا اور لوٹتے
میں بے ساختہ زبان پر آیا۔

اے کاش جانتا نہ تری رہ گزر کو میں!

جوں توں کر کے ایک مہینہ اور کاٹا اور اب کی دفعہ
دل میں یہ ٹھان کے گیا کہ مطلوبہ مقدمہ دستیاب نہ
ہو تو اپنا مسودہ واپس لے لوں گا۔ پھر بھی ہنوز روزِ اول
والا معاملہ پیش آیا اور میں نے یہ سبب بتا کے مسودہ
لے لیا کہ اس کی کتابت کروانی ہے، چناں چہ کچھ ہی
دنوں میں کتابت مع تصحیح مکمل ہو گئی۔ اب جو متبادل
صورت درپیش ہوئی تو ایک دن سیدھا کلیۂ دارالعلوم
پہنچا جس کے پرنسپل ان دنوں ڈاکٹر غلام محی الدین
زور تھے اور میرے ہم جماعت دوست خواجہ
حمید الدین شاہد اردو کے لکچرار تھے۔ میں نے شاہد
صاحب کو آغا صاحب کا قصہ سنا کے اپنے مسودے
کے کتابت شدہ اوراق دکھائے اور کہا رسماً زور صاحب
مجھ سے متعارف نہیں ہیں، اس صورت میں آیا یہ
ممکن ہے کہ میری کتاب کے یہ منتشر اوراق انھیں دکھا
کے دو ایک دن میں ان سے اس کا پیش لفظ لکھوا دیں؟
کہا اس وقت وہ مریخ پر ہیں ذرا دیر آپ تشریف رکھیے،

اور اپنے کتابت شدہ اوراق میرے حوالے کر دیجیے۔ میں نے ایسا ہی کیا، وہ اوراقِ مذکور مجھ سے لے کے سیدھے پرنسپل صاحب کے اجلاس پر پہنچ گئے۔ نہ جانے میرے بارے میں اُن سے کیا کچھ کہا، پندرہ بیس منٹ کے بعد جب دوبارہ مجھ سے آ ملے تو میرے دیے ہوئے اوراق لوٹاتے ہوئے ڈاکٹر زور کا قلم برداشتہ تحریری پیش لفظ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں نے مسرت و حیرت سے جو اُسے پڑھا تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب نے میرے طریقۂ تالیف کو اردو کے طلبہ کے لیے قابلِ تقلید قرار دیا۔ میں نے شاہد صاحب کی غیر معمولی مہربانی کا شکریہ ادا کر کے اُس پیش لفظ کو شاملِ اشاعت کر دیا۔

اس واقعے سے بہ آسانی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ زور صاحب جہاں دوسروں سے وقت کے وقت کام لینے کے عادی تھے وہاں خود بھی آج کا کام کل پر اٹھا نہ رکھتے تھے۔ اپنے اسی وصف کی بدولت انھوں نے تنِ تنہا ایوانِ اردو کی تعمیر و تزئین اور علوم و فنون کے مکتوبی اثاثے سے اُسے مالامال کرنے کی ایسی بھاری ذمہ داری سنبھالی جیسی سابق مدارالمہام حیدرآباد نواب میر یوسف علی خاں سالارجنگ ثالث نے بہت بڑے پیمانے پر سالارجنگ میوزیم کی تشکیل کے لیے خوشی خوشی اختیار کی۔ آج ہم میں نہ تو سالارجنگ موجود ہیں نہ ڈاکٹر زور مگر اُن کا سالارجنگ میوزیم اور اِن کا ایوانِ اردو اِن دو عظیم شخصیتوں کے ایسے کارنامے ہیں جو تاریخ کے صفحات پر سنہرے حرفوں میں لکھے جائیں گے۔

ڈاکٹر زور مشائخ گھرانے میں پیدا ہوئے اور جاگیردارانہ ماحول میں بسر ہوئی اِس کے باوجود تن آسانی اور آرام پسندی انھیں چھو بھی نہیں گئی۔ اِن کے بارے میں ڈاکٹر ... کی رائے ہے "ان کی اہمیت ان کے علمی کام کی اہمیت سے عبارت ہے" ڈاکٹر زینت ساجدہ کا قول فیصل ہے "وہ بے حد باعمل آدمی تھے ایک بار جو بات اُن کے ذہن میں آ گئی تو پھر صرف خیال نہ رہ گئی، بہت جلد عمل بن ..." ڈاکٹر سیدہ جعفر کا تاثر ہے "اس سے انکار ممکن نہیں ... آنے والی نسل کے قاری اور محقق کے لیے انھوں نے بڑی جاں فشانی اور ادبی ذکاوت کے ساتھ ضروری مواد اکٹھا کر دیا ہے۔ ایک محقق کی حیثیت سے ڈاکٹر زور کا نام تاریخ ادبِ اردو کے صفحات سے محو نہیں ہو سکے گا۔"

یوں تو فطرتاً ڈاکٹر صاحب کو کام کرنے کا شوق تھا اور زندگی بھر کام کرتے رہے جیسا خود ان کے اس مقطع سے ظاہر ہے۔

موت سے بھی مریں گے نہیں زور ہم
زندگی میں جو کچھ کام کر جائیں گے

تاہم اُن کی پوری زندگی کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ اُن کا لگاتار علمی کام ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۵ء تک جاری رہا۔ انھوں نے کم و بیش دو ہزار مختصر مضامین لکھے اور پچاس کتابیں تصنیف کیں۔ اُن کے یہ ادبی کارنامے حسبِ ذیل زمروں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں: تخلیقی ادب، تنقید، تاریخ ادب، لسانیات۔

یہی نہیں، جن نادر علمی و ادبی مخطوطات کو انھوں نے اڈٹ کیا وہ پانچ ہزار سے کم نہیں۔ بیش بہا کتب اور نمائشی اشیاء کا ذخیرہ اس پر مستزاد ہے۔ اُن کے تمام علمی آثار، ایوانِ اردو کے در و دیوار اور اُس کے

اندر اور باہر اردو کی مسلسل خدمت گزاری کی تیز یاشست رفتار، سالانہ یوم قلی قطب شاہ کے روایات استوار غرض یہ سب چیزیں اردو کے ساتھ اُن کے والہانہ جذبۂ ایثار کی یاد تازہ کرتی رہتی ہیں۔

اُن کے ہم پیشہ معاصرین میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کا نام ہمیں سرِفہرست نظر آتا ہے جن کا مشن یہ تھا کہ اندرون و بیرونِ ہند معیاری اردو کی مسلسل توسیع و اشاعت ہوتی رہے اور ڈاکٹر زورؔ کا مطمحِ نظر کہ معیاری اردو سے دکنی زبان و ادب کے ڈانڈے ملا کے اردو کی شُدبُد رکھنے والوں کو اردو زبان و ادب اور مشرقی ثقافت کی منڈھے چڑھنے والی بیل سے روشناس کیا جائے۔ ہم اردو والوں کا یہ فرضِ عین ہے کہ اِن دونوں بزرگوں کی راہِ عمل پر گامزن رہ کر اپنی منزلِ مقصود کو جالیں تاکہ کسی وقت بھی ملک میں ایک سے زیادہ عبدالحق اور زورؔ پیدا ہوں۔

میں نے زورؔ صاحب کی بعض تصانیف دیکھیں، اُن کی متعدد تقریریں سُنیں اور انھیں دو ایک مشاعرے بھی پڑھتے سُنا اور اِس نتیجے پر پہنچا کہ شعر و شاعری کے بالمقابل وہ نثر اور خاص کر تحقیقی نثر نگاری کے میدان تھے۔ اُن کی تمام عبارتوں میں کہیں کوئی ...ک نام کو بھی نہیں، ان کی نگارش کا سب سے بڑا ...ف سادہ بیانی ہے جس کے حصول کے لیے ادیبوں ...یسوں پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔

اُن کے ایک مضمون "اردو اور قومی یک جہتی" ...اقتباسِ ذیل سے سادگیِ تحریر کا اندازہ لگایا جاسکتا ...ہ وہ تحریر فرماتے ہیں "اردو کے اس صدیوں کے روادارانہ انداز ہی میں اس کے آغاز و ارتقا کا راز چھپا ہوا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اردو کی ابتدا ہی قومی یکجہتی کے احساس اور باہمی ہم آہنگی کی ضرورت کا نتیجہ تھی۔ اس کی بنیاد ایک ایسے زمانے میں پڑی جب پورا ہندوستان مختلف ریاستوں اور علاقائی گروہوں میں بٹا ہوا تھا، ایک نئی قوم ہندوستان میں داخل ہو کر اس سرزمین کو اپنا وطن بنانے لگی تھی اور اپنے ساتھ ایران و توران اور عراق و عرب کے تہذیبی اور لسانی اثرات بھی لا رہی تھی اس قوم کے افراد پہلے پنجاب اور سندھ میں آباد ہوئے پھر بارھویں صدی کے آخر میں دلی اور دوآبے میں داخل ہوئے اور اس کے بعد انھوں نے گنگ و جمن کی زرخیز وادی میں اس نئی ہند ایرانی تہذیب کی بنیاد ڈالی جس کا عروج امیر خسرو کی شاعری اور تاج محل کی صناعی میں دیکھا جا سکتا ہے"

(یوم زورؔ ۸۲ء میں پڑھا گیا)

(بقیہ صفحہ ۱۵ سے آگے)

ان سب کا مقابلہ کیا سینتیں آئیں توان کی ہمت اور بڑھی طنز کیے گئے تو انھوں نے اپنے قلم کو اور روانی دی ادارۂ ادبیات کو انھوں نے ایک سایہ دار درخت بنادیا جس کے تلے وہ صاحبانِ قلم جمع ہوئے جنھیں حالات کی دھوپ نے جھلس دیا تھا آج ہم میں زورؔ صاحب نہیں رہے لیکن دکن کی کمزور تاریخ و ادب کو ان کے قلم و عمل نے جو زور بخشا تھا وہ آج بھی قائم ہے۔

وہ مشعل جو انھوں نے جلدی تھی آج بھی ان طالب علموں کے راستے پر روشنی کا سرچشمہ ہے جو دکن کی تاریخ، تہذیب اور ادب پر کام کر رہے ہیں۔

قدیر عارضی

۴ دوتبیاں

(یہ دوتبیاں ایسی ہیں جیسے تین مصرعے صرف قافیہ ردیف کے کُل میں مکمل ہیں)

(۱)

آفات کے ممنونِ کرم ہیں ہم لوگ
صدمات کے ممنونِ کرم ہیں ہم لوگ
دیتے ہوئے وقت کے تقاضوں کا ساتھ
حالات کے ممنونِ کرم ہیں ہم لوگ

(۲)

سامانِ حیات ہے تو پھر کیا غم ہے
امکانِ حیات ہے تو پھر کیا غم ہے
کرتے رہو واردات کا ردِ عمل
عرفانِ حیات ہے تو پھر کیا غم ہے

(۳)

حقدار کی منزل بھی عجب منزل ہے
ایثار کی منزل بھی عجب منزل ہے
انسان کی شخصیت اُبھرتی ہے یہاں
کردار کی منزل بھی عجب منزل ہے

(۴)

مفرور کی زندگی بھی اک آفت ہے
مجبور کی زندگی بھی اک آفت ہے
کرنا پڑتا ہے اُس کو مرتے ہوئے کام
مزدور کی زندگی بھی اک آفت ہے

قطب سرشار

دو ترائیلے

(۱)

تہذیب پیش و پس میں اُلجھتے رہے مگر
سانسوں کے زیر و بم بھی سنبھالے نہیں گئے
اقدار کے چراغ بھی بجھتے رہے مگر
تہذیب پیش و پس میں اُلجھتے رہے مگر
آنکھوں میں ریگ زار سے چبھتے رہے مگر
جذباتِ بے حجاب بھی ٹالے نہیں گئے
تہذیب پیش و پس میں اُلجھتے رہے مگر
سانسوں کے زیر و بم بھی سنبھالے نہیں گئے

(۲)

گہری بصیرتوں سے ہوا وضعِ فلسفہ
فکرِ صحیح موردِ الزام کیوں ہوئی
اسرارِ ہست و بود شعورِ فنا بقا
گہری بصیرتوں سے ہوا وضعِ فلسفہ
سب پر محیط اب بھی ہے سوچوں کا دائرہ
لیکن تلاشِ راہِ مفر عام کیوں ہوئی
گہری بصیرتوں سے ہوا وضعِ فلسفہ
فکرِ صحیح موردِ الزام کیوں ہوئی

وفا براہی

O

وہ مقاماتِ این و آں سمجھیں
جو مکاں کو بھی لامکاں سمجھیں
آپ اپنے کو مہرباں سمجھیں
نور و نکہت کی پھر زباں سمجھیں
خار و خس کو اگر سمجھنا ہے
غنچہ و گُل کی داستاں سمجھیں
ہے نگاہوں کے سامنے منزل
لذتِ کرب درمیاں سمجھیں
بے خبر ہیں صفاتِ آدم سے
آدمی کو جو ناتواں سمجھیں
ہے جبینِ خلوص کیوں مجروح
واقفِ سنگِ آستاں سمجھیں
...بظاہر خموش رہتے ہیں
...ن بتوں کی بھی کچھ زباں سمجھیں
...ل رہے ہیں جو آتشِ گُل سے
...یا انہیں برقِ گُل فشاں سمجھیں
...س میں کچھ بھی نظر نہیں آئے
...س تصور کو رائیگاں سمجھیں
...ل سبزہ ملے جو رستے میں
...ہوں اُسے میر کارواں سمجھیں
اے وفاؔ جنس معتبر کب ہیں
نغمۂ گُل کو جو فغاں سمجھیں

۵۵

O

خدارا نہ پوچھو مری بود و باش
نہاں اس میں ہے قصۂ دلخراش
کرے کس طرح اپنی وہ جستجو
جسے ہر نفس ہو کسی کی تلاش
ستائیں کسی کو مگر اس طرح
نہ چوٹ آئے دل پر نہ کوئی خراش
زمیں کی کشش کے جو قائل نہ تھے
گرے وہ فلک سے ہوئے پاش پاش
جسے دیکھنے کی نہیں مجھ میں تاب
ہے چشمِ تمنا کو اس کی تلاش
بڑھا میرا سایہ تو آیا نظر
کہ جیسے اٹھائے ہے وہ میری لاش
وہ بیٹھے ہوئے ہیں مرے سامنے
مگر پھر بھی دل کو ہے ان کی تلاش
ہوئی دید سے دل کی رفتار تیز
ہیں ہر چند ہم اے وفاؔ ذی فراش

۵۵

O

آیا جو لب پہ نام خزاں دیدہ خار کا
چہرہ ہوا اُداس عروسِ بہار کا
اب آدمی کو آدمی آئے گا کیا نظر
قبضہ ہے مہر و ماہ پہ ظلمت شعار کا
جو بارگاہِ فکر و نظر میں ہیں بے نصیب
لینا پڑے گا درس انہیں طور و نار کا
جن کی نظر میں کفر تھا اظہارِ آرزو
وہ نام لے رہے ہیں اسی سوگوار کا
وہ آتشِ نفاق کو دینے لگے ہوا
رونا جو رو رہے تھے غریب الدیار کا
وحشت نے چاک چاک گریباں کیا مگر
دینا پڑا حساب مجھے تار تار کا
جو مقصدِ حیات سے واقف نہیں وفاؔ
مطلب وہ خاک سمجھیں گے تحریرِ یار کا

۵۵

فرحت قادری

○

ں جُرم کی آخر یہ سزا کاٹ رہے ہیں
آنسوؤں سے ہم اپنا ہی گلا کاٹ رہے ہیں
نگ تراشی ہے کہ آواز تراشی
روز ہم اک کوہِ ندا کاٹ رہے ہیں
م کا تغیر اثر انداز نہیں ہے!
شام و سحر فصلِ انا کاٹ رہے ہیں
بد کوئی سورج ہے نہاں فکر و نظر میں
م کو بھی ہم شعلہ نما کاٹ رہے ہیں
وم ہے پرواز کا انجام، مگر ہم...
سوچ کے ان دیکھی ہوا کاٹ رہے ہیں
وف کے عفریتوں سے بچ کر کہاں جاؤں
مرے گھر کا سدا کاٹ رہے ہیں
ت مرے دشمن ہیں ٹھٹھرتے ہوئے لمحات
علگیٔ دل کی بنا کاٹ رہے ہیں

○○

○

کوئی تپش، کوئی خلش، شہرِ وفا! کچھ بھی تو ہو
کربِ ستم، دردِ کرم، غم کا صلا! کچھ بھی تو ہو
اب جسمِ غم نا آشنا مانگے ہے زخمِ بے بہا
لمحوں کی زہریلی ہوا، گردِ بلا! کچھ بھی تو ہو
ایسی بھیانک خامشی کب تھی تمہارے شہر میں
میرے لیے شورِ انا، سنگِ صدا! کچھ بھی تو ہو
برگِ شکستہ کی طرح احساس سے آری ہے دل
کوئی ہوا شبنم صفت، شعلہ نما! کچھ بھی تو ہو
طوفان اٹھے رشتے کہیں خیمے تعلق کے کہیں
تنہائیوں کے دشت میں ہنگامہ زا! کچھ بھی تو ہو
مٹھی میں ہو کوہِ گراں، بالو پہ بھی قابو چلے!
پانی سے بھی اٹھے دھواں، بدرِ فنا! کچھ بھی تو ہو
لب بند ہوں، پر زیست کے آثار تو ملتے رہیں
دل کے دھڑکنے کی صدا، آوازِ پا! کچھ بھی تو ہو
دیوانگی کا شور ہو تاروں بھری سی رات میں
کھڑکی کھلے، پتھر چلے، میرے خدا! کچھ بھی تو ہو

○○

صابر فخرالدین

۳ نظمیں

مٹی کے گھروندے
بازاروں میں برائے فروخت رکھے ہیں
ان کو ہمراہ لے جاؤں گا
میں،
گھر نہیں بنا سکتا

○

سیاہ بورڈ پر
تحریریں
نمایاں
ہوتی ہیں

○

سورج کچے پکے
مکانوں سے گزر کر
اونچی اونچی کوٹھیوں تک
آ گیا تو،
زرد ہو گیا تھا..

○○

قاضی انصار

○

میں نے دیکھا ایک سپنا بارہا
ایک ریگستان ہوں تپتا ہوا

کیا کہیں تازہ ہوئی ہے واردات
چیخ کر کوئی پرندہ پھر اڑا

دشمنوں میں بڑھ رہی ہے دوستی
آج بھی زندہ ہے بغضِ معاویہ

چاند تو دن میں نظر آتا نہیں
خوبیت رہیں تمہیں دیکھا کیا

میں یہ کیا تنقید ہوگی دوستو!
اڑ نہیں سکتا پرندہ پر کٹا

اے مظفر تیری صحبت کے طفیل
مرحوم نوا انصار بھی لے کر اٹھا

ڈاکٹر مظفر حنفی

●●

ارشد نظیر

○

کب تک بھٹکتے زخم لیے ہم ہرے ہرے
ہم تھے چمن میں موسمِ گل سے ڈرے ڈرے

بیٹھی ہوئی تھی صبح مرے انتظار میں
میں سو گیا تھا ہاتھ سرہانے دھرے دھرے

دل ابھی دھڑک رہا ہے کسی آبشار کا
آنکھوں میں ان کی دیکھ کے آنسو بھرے بھرے

سنگِ ہوس کی زد میں ہیں سب آئینے یہاں
پھرتے ہیں تیرے شہر میں ہم بھی ڈرے ڈرے

کیوں چونکتے ہیں آپ مثالِ غزالِ دشت
آہٹ کے سلسلوں سے ہیں جنگل بھرے بھرے

موجِ خرامِ ناز کا نقشہ ہے اہتمام
کہتا ہی رہ گیا وہ ستم گر ارے ارے

کیسے چھپائیں شہرِ ستم کی نشانیاں
جسموں کے پیرہن ہیں لہو سے بھرے بھرے

خوشبو بھی ساتھ دے نہیں سکتی اگر یہ
جب تک ہمارے ساتھ وفا وہ کرے کرے

دیکھیں نتیجہ کیا ہو ہواؤں کی جنگ کا
سہمے کھڑے رہتے ہیں پرندے ڈرے ڈرے

شہرِ سخن کے واسطے ضربِ کلیم تھی
اشعار جب بھی میں نے سنائے کھرے کھرے

کیوں زندگی کے ساتھ وہاں تک نہ میں گیا
غم اور خوشی جہاں یہ چلے ہیں دھرے دھرے

گزرے ہیں ایسے دور سے ہم بھی نظیر بھی
تھا ہم سے دشت دور گلستاں پرے پرے

●●

ذکی طارق

○

کتنا ہی غل مچے کہ ٹھہر جائیے جناب
چپ چاپ اس گلی سے گزر جائیے جناب

کاغذ کے پنکھ راہ میں جلنے لگیں اگر
اشکوں کی وادیوں میں اتر جائیے جناب

سنتے ہیں رات بھر کا ہے اس میکدے کا وقت
کہنے لگے ابھی سے کہ گھر جائیے جناب

لوگوں کے سامنے نہ بتاؤں نشانیاں
پہچان لیں گی ان کی نظر جائیے جناب

ہم سے تو ٹھے بھی شب کی مہک تک تھی دوستی
چلنے لگی نسیم سحر جائیے جناب

سر رکھ کے سو ہی جائیں گے یادوں کی گود میں
کہہ دیں گے ہم بھی رات بسر جائیے جناب

●●

سوامی حیدرآبادی

ماں

سنیما کا دوسرا شو بھی چھوٹ گیا۔ دھیرے دھیرے بھیڑ کم ہوتی گئی۔ سنیما گھر کے قریب اڈلی دوسے بیچنے والے کچھ دیر تک چلاتے رہے "ایک آنے میں تین، ایک آنے میں تین" اور پھر خاموش ہو گئے۔

شانتما آہستہ سے اپنا سامان سمیٹنے لگی۔ چولھا جو کبھی کا بجھ چکا تھا۔ بجھی ہوئی لکڑی اور چولھا بیجا کر پھواری کے حوالے کرکے ہانڈیاں ٹوکرے میں لادنے لگی۔

آج صرف تین روپے کی بکری ہوئی تھی۔ گیلا آٹا بھی بچ گیا تھا۔ خیر کوئی بات نہیں، کل اسی میں چنا ملا کر کھٹے اچار کی طرح بیچا جا سکتا ہے۔ ہاں کچھ اڈلی بھی بچ گئے تھے۔ ٹھنڈ کے مارے سوکھ گئے تھے۔ پروا نہیں، بچے چبا چبا کر کھا لیں گے۔

پارک کی بڑی گھڑی میں دو بج رہے تھے۔ شام کے پانچ بجے سے ایک ہی جگہ بیٹھے بیٹھے شانتما کی کمر کچھ اکڑ سی گئی تھی۔ بڑی مشکل سے اس نے ٹوکرا سر پر اٹھا لیا اور آہستہ آہستہ چلنے لگی۔

گھر پر بیٹے کا تقاضا روز بروز بڑھ رہا ہے۔ کہتا ہے "[illegible] بڑھاپے میں بھی یہ مصیبت کیوں اٹھاتی ہو ماں؟"

بے چارہ رمنیا! اسے کیا معلوم کہ اس کے ساٹھ روپے ماہوار میں گھر کا چلنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ اگر شانتما بھی روز کا ایک آدھ روپیہ کما نہ لاتی تو فاقے کرنے پڑتے۔ رمنیا ایک خانگی دوکان پر ملازم ہے۔ بیس سال کی ایماندارانہ نوکری کے بعد اس کی تنخواہ اب ساٹھ تک پہنچی ہے۔ وہ، اس کی بیوی، دو بچے اور خود شانتما، پانچ کھانے والے اور ایک کمانے والا۔ گزارا کیسے ہوتا؟ اسی لیے تو شانتما کو یہ محنت کرنی پڑ رہی ہے۔

بہو بڑی سیدھی سادی لڑکی ہے۔ پندرہ سال سے بلا کسی گلے شکوے کے گرہستی چلا رہی ہے۔

نہ جانے رمنیا کو ماں کے بارے میں اتنی فکر کیوں ہو چلی ہے۔ شانتما کی تو پیدائش ہی سے دکھ بھری زندگی تھی۔ وہ اتنی سکھی کبھی نہ تھی جتنی کہ اب ہے۔ مگر نادان رمنیا سمجھتا ہی نہیں۔ بار بار کہتا ہے "یہ دھندہ چھوڑ دو ماں! چھوڑ دو"

چاہو تو یہ ساری مصیبت یوں ٹل سکتی ہے۔ شانتما کا دوسرا لڑکا راما راؤ ایک اچھے عہدے پر فائز ہے، مہینہ سات آٹھ سو روپے پاتا ہے۔ ماں، کہنے کی دیر ہے کم از کم سو روپے ماہانہ ضرور بھیجے گا، جس سے رمنیا کی زندگی میں سہولت بہم پہنچ سکتی ہیں۔

لیکن یہ ہے بڑا ضدی، بھوک سے مرجائے مگر بھائی کا پیسہ چھوئے گا نہیں۔ صرف اس لیے کہ اس نے بڑے بھائی کی مرضی کے خلاف ایک غیر ذات کی لڑکی سے شادی کرلی تھی۔ بارہ برس سے جس بیوی کے ساتھ گھر سنسار چلا رہا ہے کیا اُسے بھائی اور ماں کی خاطر آج چھوڑ سکے گا؟ سنا ہے کہ وہ بھی بڑی اچھی لڑکی ہے۔ گاؤں کے لوگوں کا کہنا ہے کہ بہو اور بیٹا لکشمی نارائن دکھائی دیتے ہیں۔

بچپن ہی سے رمنیا کو چھوٹے بھائی سے بڑا لگاؤ تھا۔ جب اس کی تنخواہ صرف چالیس روپے تھی، بیس روپے بھائی کی پڑھائی کے لیے بھیجا کرتا تھا۔ بھائی لکھتا بھی تھا کہ "آپ تکلیف نہ کریں، میں گزارا کرلوں گا" مگر رمنیا سنتا نہ تھا۔ آخرکار شادی نے سب کچھ بگاڑ دیا۔ دونوں میں قطع تعلق ہوگیا۔ راما راؤ نے ایک دو مرتبہ منی آرڈر بھی بھیجے تھے، مگر رمنیا نے اُسے چھونے سے بھی انکار کردیا۔ مجبوراً چھوٹے بھائی کو خاموش رہ جانا پڑا۔

رمنیا کے بچے بڑے ہوچلے ہیں۔ لڑکا کالج میں شریک ہونے کی خواہش ظاہر کررہا ہے۔ لڑکی شادی کے قابل ہورہی ہے۔ ان سب کے لیے پیسے کی ضرورت ہے۔ مگر رمنیا اپنی ضد سے ہٹنے کو بالکل تیار نہیں ہے۔

شانتما گھر پہنچی تو دیکھا کہ بیٹا بہو پر بگڑ رہا ہے کہ ابھی تک ماں گھر کیوں نہیں لوٹی۔ جب ماں پر نظر پڑی تو چلا اٹھا "ماں! تو رات بھر وہاں سردی میں مرتی رہے گی اور ہم یہاں گھر میں آرام سے سوتے رہیں گے۔ یہ دیکھ کر لوگ مجھ پر تھوکیں گے۔ کم از کم اس کا تو خیال کرو ماں! میں بار بار کہتا ہوں کہ تم یہ کام چھوڑ دو۔ جو کچھ ہمیں ملتا ہے اس میں گزارا کرلیں گے، مگر تم مانتی نہیں ہو۔ آخر تم چاہتی کیا ہو ماں؟ میں اس گھر میں رہوں کہ نہیں؟" رمنیا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"بیٹے!" شانتما نے بڑی شانتی سے کہا "تم دکھی نہ ہو بیٹے! میرے لیے یہ کیا کوئی مشکل کام ہے؟ دن بھر تو میں گھر میں سوتی پڑی رہتی ہوں گھر کا سارا کام اکیلی بہو کرلیتی ہے پھر میں کیا کروں؟ سبھی بیٹھے کھاتے رہیں تو اتنے سبھوں کا پیٹ کیسے بھرے گا؟ کہنے کو تو تم بھی پیتے ہو مگر ان بڑھتے بچوں کو دیکھ کر میرا کلیجہ منہ کو آتا ہے۔"

رمنیا خاموش رہا، گم سُم دھڑ سے دروازہ کھول کر باہر چبوترے پر جا بیٹھا۔ شانتما نے سوچا یہ تو روز روز کی جھک جھک ہے ہی، سو کھانا کھالیا اور سوگئی۔

رمنیا ضد کا پکا تھا دوسرے روز جب رات گئے شانتما گھر لوٹی تو دیکھا کہ بہو رو رہی ہے۔ کہنے لگی "ماں جی! یہ لیجیے روپے، آپ کے بیٹے نے دیے ہیں۔ کہہ گئے ہیں کہ آپ کے چھوٹے بھائی تقاضا کررہے ہیں کہ آپ کو ان کے ہاں بھجوائیں۔ آپ چلی جائیں، اور اگر آپ نہ گئیں تو پھر وہ اس گھر میں قدم نہیں رکھیں گے" اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

شانتما گم صم بیٹھی رہی۔ اسے چادری بہو پر بڑا ترس آیا۔ وہ اتنی بھولی بھالی لڑکی ہے کہ ساس کی صلاح

بیٹے بنا اپاہ کام بھی کر نہیں پاتی۔ پھر اکیلی یہ گھر کیسے سنبھالے گی؟ .... مگر بیٹے کی ضد سے بھی بخوبی واقف ہے۔ اس لیے اور کوئی چارہ ہی نہیں ہے۔ کہنے لگی "بیٹی! رو نہیں۔ میں چلی جاؤں گی۔ اگر اس کی یہی مرضی ہے تو میں ضرور چلی جاؤں گی۔ ... لیکن ہاں! بچوں کا اور اس کا خیال رکھنا"

صبح سویرے ہی شانتما گھر سے نکل پڑی۔

راما راؤ تنگبھدرا پراجکٹ ڈیم پر ایک انجینئر کی حیثیت سے کام کر رہا ہے۔ جب شانتما بس سے اتری اور راما راؤ کا نام لیا تو کچھ کھلبلی سی مچی۔ دو چار لوگ جمع ہو گئے۔ ان میں سے ایک نے فوراً دوڑ کر کہیں سے ایک جیپ حاصل کر لی اور شانتما کو اس میں سوار کر دیا۔

ماں کو دیکھتے ہی راما راؤ ہکا بکا رہ گیا۔ ایک منٹ کے لیے تو گونگا سا کھڑا رہا۔ اور پھر بھرائی آواز میں "اوہ ماں! کتنے عرصے کے بعد ملی ہو ماں!" کہتے ہوئے ماں سے لپٹ گیا۔

چھوٹی بہو سمجھ گئی کہ کون آیا ہے۔ جھٹ سے جھک کر ساس کے پیر چھوئے۔ شانتما نے بہو کو اٹھا کر گلے لگا لیا۔

بہو نے فوراً نوکرانی کے ذریعہ گرم پانی کا بندوبست کیا اور اپنی ساڑھیوں میں سے ایک سفید ساڑی نکال کر ساس کے پہننے کو دی۔ بعد میں ماں کو چوکی پر بٹھا کر دونوں نے کھانا کھلایا۔

کم گو راما راؤ جیسے ایک دم دیوانہ ہو گیا ہے بہت بہت بولنے لگا۔ بھائی کی، بھاوج کی اور بچوں کی خیریت پوچھی، اور گاؤں کے ہر شخص کی کیفیت دریافت کی۔ کہنے لگا "ماں! میں تو سمجھا کہ تم مجھے بھول ہی گئی ہو۔" بہو بھی باتوں میں لگ گئی۔ جیجی، جیجا جی اور بچوں کے بارے میں کھرید کھرید کر پوچھنے لگی۔ اور بولی "ماں جی! کتنا اچھا ہوتا آپ بچوں کو بھی ساتھ لاتیں ..... اور ماں جی! آپ جانتی ہیں؟ ہمارے ہاں آپ کا ایک فوٹو ہے جسے یہ ہر روز پرنام کرتے ہیں۔

شانتما کا دل پیار سے بھر گیا۔ بہو کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی "بیٹی! میرا بیٹا بڑا ہی بھاگوان ہے تم جیسی سگھڑ بیوی ملی ہے"۔

دو دن گزر گئے۔ شانتما کو یہاں کے حالات کا کچھ کچھ اندازہ ہونے لگا۔ بیٹا واقعی بڑا آفیسر ہے۔ ایک بڑا سا بنگلہ، اطراف باغیچہ، گھر بھر نوکر چاکر، قدم ہلاتے ہی موٹر کار ..... غرور سے سر اونچا ہو گیا..... مگر یکایک ایک کالا سا بادل اس کے چہرے پر چھا گیا، بڑا بیٹا رمنیا یاد آ گیا۔ وہ صبح سویرے چھ بجے اٹھ کر دوکان پر چلا جاتا ہے۔ دوپہر کو بڑی جلدی میں زہر مار کر کے پھر بھاگتا ہے تو رات کے نو بجے ہی لوٹتا ہے۔ اتنی محنت کے باوجود پورا پیٹ نہیں بھرتا۔ دونوں بیٹوں کی متضاد تصویریں ایک ساتھ سامنے آتے ہی ماں کا دل غم سے لبریز ہو گیا۔

راما راؤ کے بڑے افسر کا تبادلہ ہو گیا تھا۔ اس نے رات اپنے گھر پر ڈنر کی دعوت دی۔ کئی لوگ مدعو تھے جن میں عورتیں بھی تھیں۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے کے لیے شانتما راضی نہیں ہوئی۔ سب کے چلے جانے بعد وہ کھانے پر بیٹھی۔

دعوت کے پکوانوں کو دیکھ کر شانتما کی آنکھیں

چُنی جا گئیں۔ کئی قسم کے کھانے، سالن اور میٹھے!۔
مگر یہ سب دیکھ کر اس کا من خوش نہیں ہوا۔ نوالہ منھ
میں رکھتے وقت رمنیا کا خیال آیا، بچے یاد آئے،
وہ جو کچھ کھاتے ہیں اس کا خیال آتے ہی شانتما کی
آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ ایک ہی ماں کے دو بیٹوں
میں اتنا فرق کیوں؟ بھگوان نے ایسا کیوں کیا؟ کیا
رمنیا بُرا آدمی ہے؟ بے چارے کے منھ میں تو زبان
لک نہیں ہے۔ پھر اس کے ساتھ بھگوان نے اتنی ناانصافی
کیوں کی؟ .... اور بڑی بہو؟ بالکل باؤلی ہے۔ نہ جانے
آج اس نے کھانا پکایا بھی یا نہیں۔ بچے بھوکے ہی سو گئے
ہوں گے؟

شانتما فوراً کھانے پر سے اٹھ گئی اور ہاتھ
دھونے لگی۔ چھوٹی بہو نے پوچھا تو جواب دیا کہ طبیعت
ٹھیک نہیں ہے۔

دوسرے دن راما راؤ ماں کو جیپ میں بٹھا کر
ڈیم دکھانے لے گیا۔ پہاڑی چوٹی پر بنا ہوا بنگلہ اور
اس کے اطراف کے باغ دیکھ کر شانتما دنگ رہ گئی
چوٹی پر سے نیچے زیر تعمیر ڈیم کو دیکھ کر اس کا سر
چکرانے لگا۔ اُسے یقین ہی نہیں آتا تھا کہ یہ سب
انسان کے ہاتھوں ہی ہو رہا ہے۔ نیچے اتر کر ماں اور
بیٹا ... کے پاس گئے۔ وہاں سے نکلتی ہوئی نہروں کے
بارے میں بتا رہا تھا بیٹا۔

اتنے میں پیچھے سے کسی نے آواز دی "ارے
شانتما! تم یہاں؟" شانتما چونک پڑی۔ سامنے
کشٹنا کھڑا تھا، اپنے ہی گاؤں کا کشٹنا۔ ...
"اوہ کشٹنا! تم ہو؟ .... ہاں میں یہاں اپنے
چھوٹے بیٹے کو دیکھنے آئی ہوں۔ یہی ہے میرا بیٹا"
راما راؤ کی طرف فخریہ اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

راما راؤ کا سر مارے شرم کے جھک گیا۔ وہ
ایک مزدور تھا۔ اس کا اپنی ماں سے اس بے تکلفانہ
انداز میں مخاطب ہونا اور ماں کا اس ملنساری سے
جواب دینا، راما راؤ کے لئے زہر سے کم نہ تھا۔ ایسا
محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کا سر اڑا دیا ہو۔ غصہ
کی حالت میں وہ جیپ میں بیٹھ گیا۔

شانتما کچھ دیر تک کشٹنا سے باتیں کرتی رہی،
اور پھر جا کر جیپ میں بیٹھ گئی۔ راما راؤ نے فوراً جیپ
اسٹارٹ کر لی اور ماں سے ایک بات نہیں کی۔

ماں نے پوچھا "کیوں بیٹے خاموش کیوں ہو؟"
راما راؤ ماں کی طرف دیکھے بغیر ہی بولا "ماں!
ان چھوٹے آدمیوں کو اس طرح منھ نہیں لگاتے۔"

شانتما کے دل کو [illegible] لگا۔ وہ چند لمحوں
کے لیے کچھ نہیں بول سکی۔ [illegible] رہی۔ پھر آہستہ
سے کہنے لگی "بیٹے، تم کو شاید یاد نہیں ہوگا، بچپن میں
تم گاؤں میں پھر پھر کر گوبر اکٹھا کر کے لاتے تھے جس سے
میں اُپلیاں بناتی تھی، اور تم انھیں لے کر بڑے گھروں
میں بیچ آتے تھے۔ املی کے درختوں پر چڑھ کر تم املی
توڑ لاتے تھے اور میں اُسے بازار میں بیچا کرتی تھی ....
بیٹے، اب ہماری قسمت بدل گئی ہے۔ ذرا سوچو تو اگر
تمہاری ذہانت اور ہوشیاری دیکھ کر ریڈی نائیڈو صاحب
نے مدد نہ کی ہوتی تو کیا تم آج اتنے بڑے آدمی ہو سکتے
تھے؟ .... اُن دنوں ہم ایک وقت کھاتے تو دوسرے
وقت بھوکے سوتے۔ تمہارے پتا جی گزر جانے پر ہمارے

سنسار کی ناؤ بیچ منجدھار میں ڈوب رہی تھی۔"

باتیں کرتے کرتے شانتا ایک دم رک گئی۔ دیکھا کہ بیٹے کے منہ کا رنگ فق ہو گیا ہے۔ شاید اس کے لیے پچھلی زندگی ایک برا خواب تھی جسے وہ بھول جانا چاہتا ہے۔ وہ اور کچھ نہ بول سکی۔

اسی رات ایک افسر کے گھر میں ڈنر کی دعوت تھی سنا ہے کہ بڑے افسر کے تبادلہ پر ہر ماتحت افسر کو اس طرح کی دعوتیں دینے کا ایک رواج چلا آ رہا ہے شانتا نے دعوت میں شریک ہونے سے انکار کیا لیکن بیٹے اور بہو نے چھوڑا نہیں، ساتھ لے ہی گئے۔

جس گھر میں دعوت ہو رہی تھی، وہاں رنگ برنگے قمقمے روشن تھے۔ عورتیں باغیچہ میں ایک طرف کرسیوں پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ قیمتی ساڑھیوں میں ملبوس، زیورات میں لدی پھندی۔ ان میں دو قسم کی عورتیں نظر آ رہی تھیں۔ چند تو نخوت بھری متانت سے خاموش بیٹھی ہوئی تھیں، اور چند بالکل بچوں کی طرح چہک رہی تھیں۔ ان کے باسوں کی طرح ان کی باتیں بھی آسمان کو چھو رہی تھیں۔ ایک کہہ رہی تھی کہ اس کے پتاجی کروڑپتی ہیں۔ دوسری فاطب تھی کہ اس کے پتاجی کا نام لیتے ہی منسٹر تک تھرتھر کانپتے ہیں۔ ایک اور گویا تھی کہ اس کے شوہر کی تنخواہ ساڑھیوں کے لیے بھی کافی نہیں ہوتی، اس لیے ہر ماہ میکے سے سینکڑوں روپے منگوا لیتی ہے۔ بس اسی ڈھنگ کی باتیں چل رہی تھیں۔

شانتا کو ان سب [illegible] جیسے سب کی سب [illegible] رہی تھیں۔

ایک نے شانتا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بہو سے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ [illegible] گئی۔

جیسے موسلا دھار بارش تھم گئی ہو۔ بہو نے کہا "یہ میری ساس ہیں۔ حال ہی میں آئی ہیں۔"

"کہاں رہتی ہیں؟"

بہو نے بتایا۔

"وہاں کون ہے؟"

"ہمارے چچا جی، ان کے بیٹے۔"

"وہ کیا کام کرتے ہیں؟"

بہو کا چہرہ ذرا سا اتر گیا۔ پل بھر خاموش رہ کر بولی "کرانہ کا بیوپار ہے، ہول سیل مرچنٹ ہیں۔"

"کرانہ کا بیوپار؟ کیا اس میں بھی فائدہ ہوتا ہے؟"

اس عورت نے عجیب سا منہ بنا کر پوچھا۔

بہو چڑ سی گئی۔ کہنے لگی "فائدہ کا کیا پوچھتی ہو بہن! ہماری تنخواہیں اس کے سامنے ہیچ ہیں۔" یہ کہتے ہوئے اٹھ کر کسی اور سے باتیں کرنے کے بہانے دوسری طرف چل پڑی۔

شانتا مبہوت بیٹھی رہی۔ بہو کو اتنا سفید جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟ تھوڑی دیر کے سوچ بچار کے بعد شانتا کی سمجھ میں آ گیا کہ یہاں کا ماحول ہی کچھ ایسا غیر فطری ہے کہ ڈینگ ہانکے بغیر کسی کی ساکھ باقی نہیں رہتی۔ بے چاری بہو بھی کیا کرتی؟ جھوٹ بولنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہ تھا۔

گھر لوٹنے کے بعد بھی شانتا اور گہری سوچ میں ڈوبی رہی۔ اس کے سامنے چند تلخ حقیقتیں تھیں، جس ماحول میں اس کا جنم اور پرورش ہوئی اس کا یہاں کے مصنوعی ماحول سے کوئی سمبندھ ہی نہیں ہے۔ یہاں اس کی موجودگی چھوٹے بیٹے اور بہو کے لیے کلنک

...باعث بن رہی ہے۔ اپنی پچھلی زندگی اور اپنے بڑے
بیٹے کو بالکل ہی فراموش کیے بغیر وہ یہاں کے پریوار میں
گھل مل نہیں سکتی۔

لیکن نہیں، اسے یہ خوشیاں نہیں چاہییں۔ یہ
... نہیں چاہیے۔ وہاں اس کا ایک اور بیٹا بھوک
سے تڑپ رہا ہے۔ چھوٹے بیٹے کو کسی قسم کی کمی نہیں ہے
... ماں کی ضرورت بھی باقی نہیں رہی ہے۔ اگر وہ کسی
کے کچھ کام آسکتی ہے تو صرف بڑے بیٹے کی۔ وہیں اس کا
مقام ہے، یہاں نہیں۔

دوسرے دن صبح ہی شانتا اپنا مختصر سا سامان
سمیٹ کر جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ بیٹے اور بہو نے
بہت منت سماجت کی کہ رک جائے۔ لیکن وہ نہ مانی۔
آخر کار بیٹے نے درد بھرے لہجے میں پوچھا "کیوں ماں!
کیا میں تمہارا بیٹا نہیں ہوں؟"

"کیوں نہیں بیٹے! تم میرے ہی بیٹے ہو ...
... فخر بیٹے ہو۔ لیکن بیٹے! میں تمہارے کسی کام
نہیں۔ میرا فرض ہے میں وہیں رہوں جہاں میری
... ضرورت ہے۔"

"یعنی تم میرے ساتھ اسی وقت رہ سکتی ہو
جب میں بھی ایک کنگال کی زندگی بسر کروں۔ یہی ہے نا
ماں؟"

"نہیں بیٹے! تم نہیں سمجھ سکتے ماں کا دل کیسا
ہے ... اور میں تمہیں سمجھانے کی قابلیت بھی
نہیں رکھتی ..... مجھے جانے دو۔"

راماراؤ نے ماں کے ہاتھ میں دو سو روپے
دینے کی کوشش کی، مگر شانتا نے لینے سے انکار کیا۔

"نہیں بیٹے! مجھے نہ دو۔ ان روپوں کے ساتھ وہاں
پہنچوں گی تو وہ میری صورت بھی نہیں دیکھے گا۔"
راماراؤ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ بس
چل پڑی۔

جب رات کو رمنیا گھر لوٹا تو دیکھا کہ ماں کھاٹ پر
سوئی ہوئی ہے۔ بہو نے ڈرتے ڈرتے کہا "دیکھو جی!
ماں کو کچھ نہ کہنا"۔ اگر ان کا دل دکھاؤ گے تو ہمیں
یہ چار دانے بھی نصیب نہیں ہوں گے۔"

رمنیا چند لمحے خاموش رہا اور پھر بولا "اری
پگلی! کیا تم سمجھتی ہو کہ میرے لیے ماں کا بوجھ زیادہ ہے؟
میں تو ان کا دل دکھا کر ہی بھائی کے پاس اس لیے
بھیج رہا تھا کہ وہ چند دن تو وہاں آرام سے گزارے
... ماں کے بغیر تو یہ مکان سونا سونا لگ رہا تھا
میرا ارادہ تو یہی تھا کہ جو شخص اپنی ماں کو ٹھیک سے
... بھی نہیں ... سے بھگوان بھی معاف نہیں
کرتے۔" وہ ایک آہ سرد بھر کر بیٹھ گیا۔

نہ جانے شانتا اس وقت سو رہی تھی یا جاگ
رہی تھی۔ مگر اس کا تکیہ سارا بھیگ گیا تھا۔

وقار خلیل
قدیر امتیاز

نقد و نظر

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہے۔ ادارہ کا مبصر کی رائے سے اتفاق ضروری نہیں)

نام کتاب "نفسیات" (مطالعہ و کردار)
مصنف: غیاث الدین احمد، ڈیمائی سائز صفحے (۱۰۰)
قیمت ۱۵ روپئے، اشاعت: ۱۹۸۲ء، تعداد: ۵۰۰
ملنے کا پتہ: پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی، آغا پورہ حیدرآباد

سائنس اور ٹکنالوجی کے اس دور میں انسانی جبلتوں اور ان کی نفسیات پر مبنی اردو میں کسی مختصر یا مبسوط کتاب کی اشاعت کو کارنامہ سے تعبیر کیا جائے گا شعر و ادب پر آئے دن سینکڑوں کتابوں کی اشاعت کے اس دور میں فنی اور ٹکنیکل کسی کتاب کی اشاعت کو عصری حیثیت کہا جائے گا جناب غیاث الدین احمد نے اپنے علم اور تجربے کو اساس بناتے ہوئے چھ ابواب میں انسانی نفسیات کے پیچیدہ اور فلسفیانہ مسائل کو سلجھانے کی سعی مشکور انجام دی ہے اور اپنے نظریات کی وضاحت کے لیے قابلِ قبول اصطلاحات توضیحات اور اشکال کی مدد لی ہے، یورپ اور امریکہ کے ماہرین نفسیات کی تحقیقات سے بھی فاضل مصنف نے حسن استفادہ کیا ہے۔ نفسیات پر یہ کتاب عام فہم قرار دی جا سکتی ہے اور کالج کے طلبا کے ساتھ ساتھ اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ [illegible] مفید [illegible] کوشش کا درجہ رکھتی ہے۔ نظامس اردو ٹرسٹ نے اشاعت میں اعانت کر کے مفید خدمت انجام دی ہے۔ یوپی اردو اکیڈمی نے اس کتاب کو انعام دے کر اس موضوع پر کتابوں کی اشاعت کی صحیح حوصلہ افزائی کی ہے

نام کتاب "خاموشی آواز کرے گی" ([illegible])
رعنا سحری، ڈیمائی سائز مجلد مع گرد پوش صفحے ۸۰
قیمت ۱۵ روپئے، اشاعت: ۱۹۸۲ء، تعداد ۵۰۰
ناشر: اتر پردیش گلڈ پبلی کیشنز A-81/275 [illegible] لارنس روڈ دہلی

جواں عمر طالب علم شاعر رعنا سحری کا یہ مجموعہ اسم بامسمیٰ معلوم ہوتا ہے۔ کلام میں روایت کی پاسداری کے ساتھ ساتھ عصر کی ذہانت بھی روشن نظر آتی ہے، رعنا کی شاعری میں ساحر کے آواز کی بازگشت اور غزلوں میں روایت اور کلاسیک کی ہم آہنگی کے ساتھ ساتھ جدید طرزِ فکر کی جھلکیاں بتاتی ہیں کہ شاعر زندگی کے سفر پر چل پڑا ہے اور قرب و جوار کی آوازیں اُسے اپنی طرف متوجہ کر رہی ہیں۔ ایک کم عمر شاعر کا یہ مجموعہ دعوتِ فکر و نظر ہی نہیں دیتا بلکہ اس امر کا متقاضی ہے کہ اس کا مطالعہ قاری کو اس کے اندر سے آگاہی بھی بخشتا ہے۔ رعنا سحری کسی خوش فہمی میں نہ ہوں اور اپنی آواز کو عہد سے استوار کرنے

میں (مشاعروں کی فضا سے بچ کر) منہمک ہوں علم کی تلاش کا سفر جاری رکھ سکیں تو منزل آشنا ہو سکتے ہیں۔ کتاب قرینے سے چھپی ہے اور مطالعہ کا باب وا کرتی ہے۔

نام کتاب : "دستکِ کوہکن" (مجموعۂ کلام) ڈاکٹر شرف الدین ساحل، ڈیمائی سائز مجلد مع گرد پوش صفحات ۹۲ سنِ اشاعت ۱۹۸۳ء، قیمت ۱۰ روپیے ملنے کا پتہ : ڈاکٹر ساحل، محمد علی روڈ۔ مومن پورہ، ناگپور۔

شرف الدین ساحل جانے مانے شاعر ہیں، خوب کہتے ہیں، ان کی غزلیہ شاعری میں روایت سے عصریت کا احساس اپنا تاثر چھوڑتا ہے۔ مجموعہ میں شامل نظموں کا افق قومی اور ملی نظریات کو روشن کرتا ہے، وطن دوستی اور انسانی تہذیب کے ارتقاء کو ساحل نے اپنے فکروفن کا مرکز بنایا ہے۔ مجموعہ سلیقے سے مطبوع ہوا ہے اور حوصلہ افزائی کا مستحق ہے۔

نام کتاب : "ننھی کتاب" شاعر: بدیع الزماں خاور، ڈیمائی سائز، صفحات ۴۸، قیمت : ۶ روپیے ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاوس دریا گنج۔ دہلی مصنف کے پتے ۴۹۴۳، نزد مارکٹ پوسٹ دریا پور ضلع رتناگری (مہاراشٹر) سے بھی خریدی جاسکتی ہے۔

جناب خاور کا شمار عہد جدید کے صاحب طرز شعراء اور پرگو سخنوروں میں ہوتا ہے۔ مرہٹی، کوکنی اور اردو پر یکساں عبور حاصل ہے۔ تحریر اور تخلیق، مطالعہ اور تدریس ان کی زندگی کا وظیفہ بن گیا ہے۔ بچوں کے لیے نظمیں زیر نظر "ننھی کتاب" میں شامل ہیں جن کے مطالعہ سے جی خوش ہو گیا اور حالی کا شعر زبان پر بے ساختہ آگیا۔

یوں تو چھوٹی ہے ذات بکری کی ؛ دل کو لگتی ہے بات بکری کی

خاور صاحب نے ننھے بچوں کی نفسیات، ان کی ذہانت تجسس کی فطرت کو پیش نظر رکھ کر ان نظموں کی تخلیق کی ہے۔ بیشتر نظمیں اور غزلیں اپنے اسلوب اور طرزِ احساس اور خوشبو کے باعث بچوں میں مقبولیت حاصل کرنے کی بھرپور اہلیت رکھتی ہیں۔ ابتدائی درجوں کے نصاب بنانے والوں کو اس ننھی کتاب سے پورا پورا استفادہ کرنا چاہیے قیمت زیادہ ضرور ہے مگر خوبصورت پیشکش کے لیے زر کار مصارف کا اندازہ کرتے ہوئے زیادہ سے زیادہ خرید کر ننھوں کو تحفہ میں دیا جاسکتا ہے۔

نام کتاب : "افاداتِ ادیب" مصنف ادیب حیدر آبادی، صفحات ۹۲ قیمت : ۵ روپیے اشاعت : ۱۹۸۱ء تعداد ۵۰۰ ملنے کا پتہ، حسامی بک ڈپو، مچھلی کمان، حیدر آباد۔ ۲

ادیب صاحب بزرگ شاعر اور اردو زبان و ادب کے بے لوث خدمت گار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ زیر نظر کتاب میں الفاظ کی اہمیت اور اس کے استعمال، زبان اور اہل زبان کی فضیلت انشا پردازی اور ادب، شعر و شاعری کے فلسفیانہ رموز و نکات، اردو املا اور علم عروض کے مسائل و مبادیات کو طالب علموں کے لیے سلیس پیرایہ میں قلم بند کر کے ادبی بے راہ روی کے اس دور میں احسن خدمت انجام دی ہے۔ شاعروں اور کالجوں کے طلباء

کے لیے یہ کتاب ہر آئینہ مفید اور قابل مطالعہ قرار پاتی ہے۔

نام کتاب: **"سجدۂ اخلاص"** (مناجات و سلام) شاعر ساجد رضوی، صفحات ۹۶ اشاعت، اپریل ۸۲ء قیمت: ۵ روپیے ملنے کا پتہ: ترابیہ گشتی کتب خانہ چورابا دیوانی بلدہ، حیدرآباد۔

جناب ساجد رضوی، حیدرآباد کے پرگو شاعر ہیں اور اصحاب اہل بیت اطہار کے حلقہ بگوشوں میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ زیر نظر کتاب "سجدۂ اخلاص" کی مناجاتیں اور سلام ساجد کے فکر و فن کی مہارت اور صلاحیت کا روشن نمونہ ہیں، حق کی تفسیر اور بندگی کو نزا... "از دل ریزد بر دل خیزد" کے مصداق ساجد رضوی نے ادا کیا ہے۔ ور فلسفۂ موت کی تفہیم کو اتنی پُراثر شاعری کے ذریعہ آسان بنا دیا ہے

نام کتاب: **"پریم چند"** مصنف: امرت رائے صفحات ۴۹ قیمت: ۵۰/۱ اشاعت: ۱۹۸۱ء، ناشر نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، A5 گرین پارک نئی دہلی ۱۶۔

نہرو بال پستکالیہ کے اشاعتی پروگرام کے تحت نیشنل بک ٹرسٹ نے ۱۵ زبانوں میں ادب اطفال کے لیے مفید قومی معلوماتی اور سائنسی کتابیں باتصویر شائع کی ہیں۔ زیر نظر کتاب اردو کے عظیم المرتبت کہانی نویس پریم چند کی سوانح پر مشتمل ہے، جسے ان کے صاحبزادہ جناب امرت رائے نے سہل اور دلچسپ اسلوب و عبارت میں سپرد قلم کیا ہے۔ تصاویر دیدہ زیب اور موثر ہیں۔ پریم چند کی شخصیت ان کی وطن دوستی اور ان کی اردو زبان و ادب سے وابستگی

سادہ زندگی کو امرت رائے نے اس انداز میں روشن کیا ہے کہ کیا بچے اور کیا بڑے سبھی کے لیے یہ کتاب مطالعہ کی ترغیب دیتی ہے۔ (د، خ)

نام کتاب **"کرناٹک کا اصلاحی ادب"**

زیر نظر تصنیف دراصل ایم فل کا مقالہ ہے جو فہیم النساء نے ڈاکٹر فہمیدہ بیگم کی نگرانی میں بنگلور یونی ورسٹی کے لیے ۱۹۸۰ء میں تحریر کیا تھا جو اب کتابی صورت میں شائع ہوا ہے۔ اس موضوع پر مواد جمع کرتے ہوئے مصنفہ نے محنت اور جستجو سے کام لیا ہے۔ یہ مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے پہلے باب میں اصلاحی ادب اور اس کی افادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرے باب میں کرناٹک کے اصلاحی مصنفین کا مختصر سا تعارف، تیسرے باب میں پیدائش کے بعد کی تقریبات چوتھے باب میں شادی بیاہ کی تقریبات اور پانچویں باب میں موت کے بعد کی مروجہ تقریبوں کا ذکر ملتا ہے۔

ہر باب میں رسومات اور تقاریب کی تفصیل کے بعد ان رسومات کی اصلاح کے بارے میں بھی مختصر نوٹ ملتا ہے جب کہ تقاریب کی تفصیل کو مختصر اور اصلاحی نقاط نظر کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کی ضرورت تھی بہتر ہوتا مصنفین کے اقتباسات و اشعار کے حوالوں کو بنیادی اہمیت دی جاتی اور اس پر کھل کر بحث کی جاتی یوں کہ کہیں کہیں یہ گمان گزرتا ہے کہ آیا یہ کتاب اصلاحی ادب پر ہے یا رسومات پر تحریر کی گئی ہے۔ "کرناٹک کا اصلاحی ادب" فہیم النساء کی پہلی ادبی کوشش ہے۔ اس کوشش اور جستجو کو دیکھتے ہوئے

مستقبل میں ان سے اچھی توقعات وابستہ کی جاسکتی ہیں امید کہ ادب کی جانب ان کی یہ مراجعت جاری رہے گی اور وہ زبان و بیان پر قابو پالیں گی وہ کوتاہیاں جو اس کتاب میں راہ پاگئی ہیں اور جس کی جانب انہوں نے اشارہ بھی کیا ہے جاتی رہیں گی توقع ہے کہ وہ مستقبل میں بھی اردو ادب کو مالا مال کرتی رہیں گی اور بہت جلد اپنا مقام بنالیں گی۔ ان کی تحریریں ان کے روشن مستقبل کی ضمانت ہیں مجھے توقع ہے کہ ادبی حلقوں میں اس کتاب کو سراہا جائے گا اور ان کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی اس کتاب کی اشاعت پر میں انہیں مبارکباد پیش کرتا ہوں، اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

یہ کتاب بارہ روپئے کے عوض نمبر ۱۴ اسکند اس محمڈن بلاک ملیشورم، بنگلور ۳ سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

(قدیر امتیاز)

کتاب کا نام "غبارِ حاضر" مصنف رؤف خوشتر، اشاعت ۸۲ء، قیمت ۱۰ روپئے، سائز کراؤن ۱/۱۶ مجلد معہ گرد پوش صفحات (۱۲۰) زیرِ اہتمام: شگوفہ پبلی کیشنز، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد۔

ماہنامہ شگوفہ اور زندہ دلانِ حیدرآباد نے عصرِ حاضر میں طنز و مزاح کو صنفِ ادب کا مقام دلانے میں اپنی اپنی سعیٔ مشکور انجام دی ہے۔ زوال پذیر اقدار کے معاشرہ میں اس صنف کو عوامی مقبولیت بھی مل رہی ہے۔ طنز و مزاح کے نام پر آئے دن کتابیں، مضامین اور شاعری زور وں پر ضرور ہے مگر کیفیت اور کمیت میں بہتر و کہتر کا ہنوز فقدان نظر آتا ہے۔ اس پس منظر جوان فکر اور حساس نظر قلم کار رؤف خوشتر کے (۱۸) فکاہی مضامین کے مجموعہ "غبارِ حاضر" کو پڑھتے ہوئے انبساط اور فرحت کا مثبت احساس افزوں ہوتا ہے۔ معاشرہ اور ماحول کے تعفن اور گھٹن کو رؤف خوشتر نے سنبھل سنبھل کر اپنے تیکھے اسلوب اور چبھتے ہوئے لفظوں کے دروبست کے سہارے ترسیل کا ہنر انجام دیا ہے۔ جہاں کہیں اشعار کی پیروڈی کا تجربہ کیا ہے۔ نفسِ مضمون کو باوقار بنایا ہے۔ دکن کے ماحول کو رؤف نے اپنی ان تحریروں کے طنز و مزاح کا نشانہ بناتے ہوئے دکنی روایات کی شکست و ریخت پر سرجن کی طرح نشتر زنی کی ہے پہلا مضمون " پان " کا یہ اقتباس پڑھیے " قومی یکجہتی کی تصویر ہمیں سیاست دانوں کی زبان سے زیادہ پان کی دوکانوں پر ملی۔ پان والا نہایت حسنِ خوبی اور نفاست سے کلکتہ، بنارس، مدراس، دہلی، کانپور، بمبئی اور دوسرے شہروں کے پان ایک بڑے برتن میں اس انداز سے سجاتا ہے کہ وہ آپس میں بغل گیر ہوکر ایک عجیب تاثر پیش کرتے ہیں،

کاش ہمارے قائدین پان والے سے قومی یکجہتی کا سبق سیکھتے اور تمام ہندوستانیوں کو اسی طرح محبت و رفاقت سے بغل گیر ہونے کا راستہ بتاتے۔ آخری مضمون "[illegible]" میں رؤف کا قلم اپنے نقوش یوں روشن کرتا ہے۔ ویسے ہی ہم ہندوستانی پہلے سے پیلے ہیں، یہاں کی غذائی قلت اور کثیر الاولاد باپ بننے کی مہلت نے اکثر چہروں کو پیلا بنا دیا ہے اس لیے ہمیں پیلے رنگ کا قومی رنگ اور یرقان کو قومی بیماری کا درجہ دینا چاہیے اور ملک کو پیلا ملک... جس طرح سرخ چین اور سیاہ افریقہ" عبارت مختصر: رؤف خوشتر کا غبارِ حاضر فکاہی ادب کے گنجینۂ وافر میں کئی اعتبار سے قابلِ مطالعہ کتاب ہے۔ رباعی کے فن کی طرح اختصار نے اس کے حسن کو انفرادیت بخشی ہے [illegible]

اُردو نامہ

وقار خلیل

اُردو کی علمی ادبی تہذیبی خبریں

یکم جنوری ۱۹۸۳ء: اربابِ نثر و نظم کے زیرِ اہتمام سالانہ طرحی مشاعرہ سالِ نو جناب شاذ تمکنت کی صدارت میں منعقد ہوا۔ سیف حموی، غیاث صدیقی، نذیر علی عدیل، وقار خلیل، تاج مہجور، رحمٰن جامی، رضا وصفی، بشیر وارثی اور دیگر شاعروں نے "اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے" پر طبع آزمائی کی۔ اختر جمالی نے خیر مقدم کیا اور وقار خلیل نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

۷ جنوری: ریاستی اسمبلی کے انتخابات کے بعد قدیم شہر کے فرقہ وارانہ فسادات میں نوجوان تلگو شاعر مسٹر غلام یٰسین (مجیجر) ان کی شریک حیات اور معصوم لڑکا شرپسندوں کے حملے سے جاں بحق ہوئے۔

۹ جنوری: ڈاکٹر حسینی شاہد سکریٹری ترقی پسند مصنفین نے غلام یٰسین اور ان کے افرادِ خاندان کے قتل پر تعزیتی بیان میں جارحانہ فرقہ پرستوں کے خلاف پُرامن اور سیکولر شہریوں کو متحد و متحرک ہونے کی درمندانہ اپیل کرتے ہوئے دانشوروں ادیبوں اور شاعروں کو فرقہ پرستی کی بے لاگ طور پر مذمت کی طرف متوجہ کیا۔

۱۳ جنوری: تلگو، اردو، ہندی کنڑی اور مرہٹی کے اہلِ قلم اصحاب اور دانشوروں کا ایک اجتماع محترمہ جیلانی بانو کی صدارت میں ہوا اور فرقہ وارانہ فسادات کے انسداد اور بھائی چارگی کے ماحول کو بنائے رکھنے میں ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کے فعال کردار پر غور کیا جا کر ایک تنظیم کے قیام کا فیصلہ لیا گیا۔

۱۷ جنوری: تلگو کے ترقی پسند ادیبوں اور دانش وروں کا ایک اجلاس ڈاکٹر سی نارائن ریڈی کی صدارت میں ہوا۔ غلام یٰسین اور ان کی بیگم اور لڑکے کو جس سفاکی سے قتل کیا گیا اس کی پُرزور مذمت کی گئی اور مخالف فرقہ واریت تحریک میں قلم کاروں کے پلیٹ فارم کا عہد کیا گیا۔ اس جلسہ کو ملک الشعراء ڈاکٹر داسرتھی، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کالوجی نارائن راؤ، ڈاکٹر حسینی شاہد احسن علی مرزا، بانو طاہرہ سعید اور عاتق شاہ نے مخاطب کیا۔

○ مختلف زبانوں کے اہلِ قلم اصحاب کی تنظیم سنگم کے وفد نے چیف منسٹر مسٹر این ٹی راما راؤ سے ملاقات کرتے ہوئے فرقہ وارانہ فسادات کے انسداد اور بھائی چارگی کے ماحول کو روشن کئے جانے میں اہلِ قلم کے تعاون کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک میمورنڈم حوالے کیا۔

۱۸ جنوری: مسٹر محمد شاکر ریاستی وزیر امور اکیڈمی نے اچانک اکیڈمی کا معائنہ کیا۔ مسٹر جیندر سریواستیو سکریٹری/ڈائرکٹر اردو اکیڈمی سے مشاورت کی۔

○ جناب سید ہاشم علی اختر وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی نے جناب صادق نقوی لکچرار تاریخ جامعہ عثمانیہ کی کتاب "قطب شاہی عاشور خانے" (انگریزی) کی رسمِ اجرا تقریب کی صدارت کی۔ مولانا اختر زیدی، ڈاکٹر ایم ایل نگم، ڈاکٹر مسعود علی بیگ اور جناب سعد حسن نے جناب نقوی کی کتاب پر اظہارِ خیال کیا اور مصنف کو مبارکباد پیش کی۔

۲۲ جنوری: ادارۂ ادبیاتِ اردو اور ادارۂ سب رس کی طرف سے

ادارہ کے معتمد عمومی جناب سید
ہاشم علی اختر (آئی اے ایس ریٹائرڈ)
کے وائس چانسلر جامعہ عثمانیہ ہونے
کی مسرت میں جلسۂ تہنیت صدر ادارہ
پروفیسر سید علی اکبر صاحب کی صدارت
میں منعقد ہوا۔ ادارہ کی طرف سے
شریک معتمد جناب رمن راج سکسینہ
اور سب رس کی طرف سے ڈاکٹر مغنی تبسم
نے جناب اختر کی گلپوشی کی۔ ایوانِ اردو
کے اسٹاف اور مرکز خوشنویسی کی
جانب سے علی الترتیب جناب میر
سراج الدین علی خاں اور جناب
عبدالقادر زرین قلم نے پھول مالائیں
نذر کیں۔ جناب عابد علی خاں ایڈیٹر
سیاست، پروفیسر سراج الدین،
ڈاکٹر مغنی تبسم، ڈاکٹر مرزا اکبر علی
بیگ نے جناب اختر کی دانشورانہ
صلاحیتوں اور ان کی ہمہ جہت شخصیت
کے روشن پہلوؤں کو اجاگر کرتے
ہوئے نیک توقعات وابستہ کیں
محترمہ بانو طاہرہ سعید اور صاحب
حیدرآبادی نے منظوم خراجِ تحسین
ادا کیا۔ جناب رمن راج سکسینہ
نے نظامت کے فرائض انجام دیے
جلسۂ تہنیت کے بعد ادارہ کی گولڈن
جوبلی تقاریب کے سلسلے شامِ انشائیہ
کا اہتمام جناب ہاشم علی اختر کی صدارت
میں کیا گیا۔ ابتداً ڈاکٹر تبسم نے
نے مخاطب کیا۔ ڈاکٹر یوسف سرمست
نے اردو میں انشاء نویسی کے ارتقاء
پر عالمانہ مقالہ پیش کیا۔ محترمہ
جیلانی بانو، محترمہ سلطانہ شرف الدین
محترمہ بانو طاہرہ سعید، محترمہ سیدہ
طیبہ بیگم، ڈاکٹر سید عبدالمنان اور
جناب مسیح انجم نے انشائیے سنائے
وقار خلیل نے معتمدی کی۔

۲۴ جنوری: تلگو دیشم پارٹی کے
صدر اور ریاستی چیف منسٹر این ٹی
راما راؤ نے اربابِ صحافت کو مخاطب
کرتے ہوئے کہا کہ ریاست کے
قابل لحاظ اردو آبادی والے علاقوں
میں دوسری سرکاری زبان کا موقف
حاصل رہے گا۔

۲۶ جنوری: ہمہ لسانی اہلِ قلم
اصحاب، خواتین اور آرٹسٹوں
کی امن پسند تنظیم سنگم کے زیرِ اہتمام
چار مینار سے حالیہ فساد زدہ محلوں
تک امن مارچ ہوا۔ جس کی قیادت
بزرگ تلگو شاعر سری کالوجی نارائن راؤ
نے کی۔ اس مارچ میں جیلانی بانو،
ڈاکٹر انور معظم، ڈاکٹر بلونت ریڈی
(آئی اے ایس) جوالا مکھی، منوہر لال
بہار، نیپال سنگھ ورما، وقار خلیل
جہاندار افسر، راجہ لال راجہ اور یم ٹی
خاں قابلِ ذکر ہیں۔ مفید الانام جونیر
کالج میں جلوس نے جلسۂ عام کی صورت
اختیار کی، ادیبوں، شاعروں، صحافیوں
اور دانشوروں نے فرقہ وارانہ فسادات
پر اظہارِ مذمت کرتے ہوئے سیکولر
روایات اور بھائی چارگی کے استحکام
پر تخاطب کیا۔

۲۸ جنوری: اردو گھر میں ادارۂ
سراجِ ادب کی طرف سے جناب خورشید
جنیدی کے مجموعۂ کلام "آتشِ گفتار" کی
رسمِ اجرا جناب سید ہاشم علی اختر
وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی کے
ہاتھوں انجام پائی۔ پروفیسر غلام عمر خاں
نے صدارت کی۔ ڈاکٹر مغنی تبسم، ڈاکٹر
یعقوب عمر، ڈاکٹر عقیل ہاشمی، جناب
منوہر راج سکسینہ اور جناب بشیر احمد
نے جناب جنیدی کی شاعری پر اظہارِ
خیال کیا اور مبارک باد دی۔ جناب
بشیر وارثی نے خیر مقدم کیا۔

۲۹ جنوری: عثمانیہ لٹریری سرکل کا
مشاعرہ بصدارت جناب مظفر مجاز
منعقد ہوا۔ قدیم و جدید طرز فکر کے
شعراء نے کلام سنایا۔ صاحبزادہ کلیم صدیقی
نے نظامت کی۔

فروری ۱۹۸۴ء

یکم فروری: آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی نے ۱۹۸۱ء کی اردو مطبوعات پر ادبی انعامات کی فہرست جاری کی ہے جن میں ۲ ہزار روپیے کا پہلا انعام شاذ تمکنت (ورق انتخاب) مجتبیٰ حسین (آدمی نامہ) بشیر کرنولی (نفیرِ شوق) ریاست علی تاج کریم نگری (نجیب اشرف ندوی: شخصیت اور کارنامے) اور داؤد اشرف (اور کچھ بیان اپنا) نے حاصل کیا۔ ایک ہزار روپیے کا دوسرا ادبی انعام پانے والوں میں علی احمد جلیلی، غیاث متین، نیّر صلاح، حسن فرخ، وہاب عندلیب اعظم راہی، ڈاکٹر صفدر علی بیگ راہی فدائی، قیصر سرمست، نظام الدین مغربی طیب انصاری، عابد النساء اور برق آشیانوی کی تصانیف قابل ذکر ہیں۔ ۵۰۰ روپیے کا انعام سوم ڈاکٹر طالب شاہ آبادی، محمد عبدالقادر ادیب، ڈاکٹر راہی، مومن خاں شوق، ملنسار اطہر، فاطمہ پروین، مجید سلیم، منوہر لال بہار، افتخار احمد بشر، بوالحسن حیدرآبادی رشید الدین، میر احمد الدین علی خاں، اور برق یوسفی کی مطبوعات کو دیا گیا۔ ہم تمام مصنفوں کو دلی مبارک باد دیتے ہیں کرتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اکیڈیمی کو ۹۹ کتابیں ایوارڈ کے لیے وصول ہوئی تھیں جن میں سے منجملہ ۴۵ مطبوعات کو حکم صاحبان کے فیصلوں کی روشنی میں ادبی انعام کا حقدار قرار دیا گیا ان میں ۱۴ بیرون ریاست کے مصنفین بھی شامل ہیں۔

۲ فروری: مسٹر طینہ رسر یوا ستیو ڈائرکٹر اسکریٹری اردو اکیڈیمی نے چیف منسٹر مسٹر این ٹی راما راؤ کو ایک مکتوب کے ذریعہ ریاست میں اردو کو اس کا مستحقہ قانونی موقف اور مراعات دئیے جانے کا مطالبہ کیا ہے

○ ریاستی اردو اکیڈیمی کے صدر مولانا حافظ ابویوسف اور چیرمین انتظامی کمیٹی مسٹر بدھ ویر ایڈیٹر ملاپ نے ریاستی حکومت کی تبدیلی کے پیش نظر ، وزیراعلیٰ کو اپنے استعفے پیش کردیے۔

۳ فروری: چیف منسٹر مسٹر این ٹی آر نے پریس کلب آف انڈیا دہلی کو بتایا کہ تلگو ریاست کی پہلی زبان ہوگی اور قومی زبان ہندی کی اہمیت بھی ریاست میں باقی رہے گی البتہ اردو کو اس کے موقف اور مقام کے لحاظ سے ریاست کے مختلف ضلعوں اور تعلقوں میں ثانوی زبان کا درجہ حاصل رہے گا۔

۴ فروری: مولانا حافظ ابویوسف صدر اردو اکیڈیمی نے این ٹی آر کے اس اعلان کا خیر مقدم کرتے ہوئے مطالبہ دہرایا ہے کہ اردو کو نئی حکومت ریاست کی ایک سرکاری زبان کا واضح موقف عطا کرے۔

۶ فروری: غزل کے مقبول شاعر حضرت سعید شہیدی کے تیسرے مجموعۂ کلام "آفتابِ غزل" کی رسم اجرا کا جلسہ اردو گھر میں بصدارت علامہ اختر زیدی آراستہ ہوا جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست نے رونمائی انجام دی۔ حضرت سعید کی غزلیہ شاعری کے حسن کو مسز ڈاکٹر مغنی تبسم، ڈاکٹر صفدر علی بیگ، سریتواسس لاہوٹی، علی احمد جلیلی، باقر امانت خانی اور صمصام گوہر نے روشن کیا اور مبارک باد دی، ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ نے کارروائی انجام دی۔

۸ فروری: ریاست میں اردو کے نمائندہ اداروں کے سربراہوں نے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی قیادت میں

چیف منسٹر مسٹر این ٹی راما راؤ سے ملاقات کی اور ریاست میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے اور دفعہ ۷ میں ترمیم کے دیرینہ مسئلہ پر میمورنڈم حوالے کیا۔ اس وفد کے شرکا میں ڈاکٹر منان، ڈاکٹر حسینی شاہد، مسٹر منوہر راج سکسینہ، مسٹر سرینواس لاہوٹی، مسٹر جیندر سرکوا ستیو، مسٹر کے پی ہنڈرا اور جناب سید علی موسوی قابل ذکر ہیں۔

۱۱ فروری: انجمن حریت اردو کی ادبی سالانہ کانفرنس جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ نواب میر احمد علی خاں سابق وزیر داخلہ نے افتتاح کیا۔ مسز غلام صادق الدین صدر انجمن، مسز سرینواس ریڈی اور دیگر مقررین نے اردو ذریعہ تعلیم کی درسگاہوں کو درپیش مشکلات پر اظہار خیال کیا اور اردو والوں سے اپیل کی کہ وہ اپنے بچوں کو مادری زبان میں تعلیم کی طرف اولین توجہ کریں۔ محترمہ فوزیہ بیگم پرنسپل اردو ماڈل اسکول نے شکریہ ادا کیا۔

۱۲ فروری: محفل خواتین کا ماہانہ ادبی اجلاس محترمہ زبیدہ ضیاء الدین احمد کی صدارت میں ہوا۔ محترمہ عظمت قیوم نے مضمون سنایا۔ خواتین شعرا نے کلام پیش کیا اور داد پائی۔

۱۳ فروری: بلبل ہند مسز سروجنی نائیڈو کے ۱۰۴ واں یوم پیدائش کے موقعہ پر سروجنی دیوی میموریل ٹرسٹ کی طرف سے اسکی اپنی عمارت میں جہاں سروجنی دیوی نے آنکھیں کھولی تھیں، ایک لائبریری اور ریسرچ سنٹر کا افتتاح عمل میں آیا۔ اس تقریب کی صدارت پروفیسر سید علی اکبر صدر ادارۂ ادبیات اردو نے کی نواب میر اکبر علی خاں سابق گورنر یوپی، محترمہ معصومہ بیگم سابق ریاستی وزیر اور تلگو، اردو نیز انگریزی کے شعراء نے سروجنی دیوی کو نذرانۂ سخن پیش کیا۔

۱۷ فروری: بزرگ شاعر حکیم شاہ اکبر حسینی داور کا طویل علالت کے بعد انتقال ہوا۔ خدا مغفرت فرمائے۔

○ شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کی طرف سے سالانہ ڈاکٹر زور میموریل کیبنٹ کلیاتی تقریری مقابلے منعقد ہوئے۔

۱۸ فروری: انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کی طرف سے جناب سید ہاشم علی اختر وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی کو جلسہ تہنیت میں ہدیۂ تبریک مبارکباد پیش کی گئی صدر انجمن ڈاکٹر سید عبدالمنان کے علاوہ جناب شاہ عالم خاں صدر انوار العلوم تعلیمی کمیٹی، جناب منوہر راج سکسینہ ڈاکٹر حسینی شاہد نے مخاطب کیا۔ مسٹر سرینواس لاہوٹی نے نظامت کی اور شکریہ ادا کیا۔ جناب رحمن جامی نے نظم تہنیت سنائی۔

○ کمانش کلب کے سالانہ مشاعرہ میں مسز علی احمد جلیلی، ہاشم جاہ، امیر احمد خسرو، کنول پرشاد کنول، صلاح الدین نیر، رحمن جامی، علی الدین نوید، رئیس اختر، فیض الحسن خیال، استعجاب سحر اور عزیز النساء صبا نے کلام سنایا۔

۲۳ فروری: جناب محمد شاکر ریاستی وزیر امور اردو اکیڈیمی مسلم اوقاف نے ارباب صحافت کو بتایا کہ اردو اکیڈیمی کی عنقریب تشکیل و تنظیم جدید کی جائے گی اور ایسے افراد کا تعاون حاصل کیا جائے گا جن میں اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی کا بے لوث جذبہ ہو۔

۲۴ فروری: حلقۂ ارباب ذوق (نظامس اردو ٹرسٹ لائبریری) کا ماہانہ ادبی اجلاس ڈاکٹر عبدالستار خاں صدر شعبہ عربی جامعہ عثمانیہ کی صدارت میں ہوا۔ ڈاکٹر اشرف رفیع ناظمی ریڈر شعبہ اردو نے نئی کتاب "نظلۂ الحامد"

مصنفہ رؤف امروہوی پر فاضلانہ تبصرہ سنایا۔ جناب محمد منظور احمد سکریٹری نے کارروائی انجام دی اور ہر دو اصحاب کی علمی خدمات کو آئینہ دکھایا۔

۲۶ رفروری : اردو گھر میں بزرگ شاعر جناب جسونت رائے ضیا استھانہ کے مجموعہ کلام "قوسِ قزح" کی رسم اجرا نواب میر احمد علی خاں کے ہاتھوں انجام پائی۔ جناب عابد علی خاں نے صدارت کی۔ جناب محبوب حسین جگر جوائنٹ ایڈیٹر سیاست، جناب منوہر راج سکسینہ، جناب صادق نقوی اور جناب رمن راج سکسینہ نے حضرت ضیاء کے فکروفن اور ان کی شخصیت کی خوبی پر اظہار خیال کرتے ہوئے اردو شعر و ادب سے ان کی دیرینہ رفاقت کو خراج ادا کیا۔ کنول پرشاد کنول اور قدر عریضی صاحبان نے منظوم تاثرات سنائے۔ حضرت ضیاء کے فرزند جگموہن استھانہ سحر نے دلنواز ترنم میں کلام ضیاء کو پیش کیا۔

○ اردو اسوسی ایشن سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد کی طرف سے نامور نقاد پروفیسر گیان چند جین صدر شعبہ اردو کو ساہتیہ اکیڈیمی کا ایوارڈ ملنے کی مسرت میں جلسہ تہنیت صدر اسوسی ایشن محترمہ اودیش رانی گوڑ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ طلبا اور اساتذہ نے پروفیسر جین کو مبارک باد پیش کی۔ ڈاکٹر مجاور حسین رضوی نے منظوم نذرانہ خلوص پیش کیا۔ محفل شعر میں ڈاکٹر مغنی تبسم اور جین صاحب نے کلام سنایا۔

۲۷ رفروری : اردو مجلس کا ماہانہ ادبی و شعری اجلاس اردو ہال میں بصدارت ڈاکٹر سید عبدالمنان صدر ریاستی انجمن آراستہ ہوا۔ جناب سرینواس لاہوٹی نے سعید شہیدی کے مجموعہ سخن آفتابِ غزل پر مضمون اور نواب غلام محمد عمر خاں نے قومی یکجہتی اور اردو پر اپنا نثر پارہ سنایا۔ شعراء نے کلام پیش کر کے داد پائی۔ جناب صلاح الدین نیر معتمد اردو مجلس نے کارروائی چلائی اور شکریہ ادا کیا۔

باقی تبصرے صفحہ ۳۵ سے آگے

فکر تونسوی، مجتبیٰ حسین اور یوسف ناظم نے بھی غبار خاطر کو طنز و مزاح کے ادب کا "ہوالشافی" نسخہ بتایا ہے رؤف جو خوش تر ہیں ہی اب خوش رقم و خوش قلم مصنف بھی بن ہیں اس سفر پر مبارکباد کے مستحق قرار پاتے ہیں (وحید کمال)

اعلان

بہ حکم پریس رجسٹرار
حکومت ہند
فارم ۴ رول نمبر ۸

ایڈیٹر پرنٹر اور پبلیشر کا نام : سید علی اکبر
قومیت : ہندوستانی
پتہ : ادارۂ ادبیاتِ اردو، حیدرآباد ۴۸
نام و پتہ مالک : ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد ۴۸

میں سید علی اکبر تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں، وہ میرے علم میں صحیح ہیں۔

شرح دستخط

سید علی اکبر

IO-4 1983

R. N. 169
Regd. H/ 10

The "SABRAS" Urdu Monthly

Organ of "Idara-e-Adabiyat-e-Urdu", Aiwan-e-Urdu, Hyderabad 500 001 (A. P

National Fine Printing Press, Charkaman, Hyd.

ادارۂ ادبیاتِ اُردو، حیدرآباد

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

ماہنامہ

حیدرآباد

مدیر اعزازی — مغنی تبسم
معاون مدیر — وقار خلیل

جلد (۴۶) اپریل ۱۹۸۴ء شمارہ (۴)
قیمت فی پرچہ ۲ روپے

ادارۂ ادبیاتِ اردو، پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد ۵۰۰۰۸۲

مجلسِ مشاورت

زرِ سالانہ	بیرونی ملکوں سے	
	ہوائی ڈاک سے	بحری ڈاک سے
۲۰ روپے		
کتب خانوں سے	مشرقِ وسطیٰ ۱۰ ڈالر	۴ ڈالر
۲۵ روپے	امریکہ ۱۶ ڈالر	۶ ڈالر
بذریعہ رجسٹری ۴۵ روپے		
پاکستان، برما، سیلون	۸ ڈالر	۳½ ڈالر
انگلستان	۷ پونڈ	۳ پونڈ

فہرس

سید علی اکبر ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان حیدرآباد ۔ ۲ سے شائع کیا۔

اپنی باتیں

"ادبی ٹرسٹ" ریاست آندھرا پردیش میں اردو زبان و ادب کا ایک فعال ادارہ ہے۔ ۱۹۶۶ء میں جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست کی کاوشوں نواب مہدی نواز جنگ اور جناب مخدوم محی الدین کی مشاورت سے اردو کے ادیبوں شاعروں کی وقتی مالی امداد اور اردو زبان و ادب اور تعلیم کی ترقی کی غرض سے اس ادارہ کا قیام عمل میں آیا تھا۔ ٹرسٹ کی جانب سے ہر سال ایک عظیم الشان مشاعرہ منعقد کیا جاتا ہے اور اس مشاعرے کی آمدنی کسی بڑے پروجکٹ پر صرف کی جاتی ہے۔ چناں چہ اردو آرٹس ایوننگ کالج کو زاید از ایک لاکھ کی رقم دی گئی قریب ساڑھے سینتیس ہزار روپے اردو تعلیمی ٹرسٹ کو دیے گئے۔ اسی طرح ۱۹۸۰ء میں اردو گھر کی تعمیر کے لیے مشاعرے ہی کے ذریعے ایک لاکھ روپے کی رقم فراہم کی گئی۔ علاوہ ازیں کئی ادیبوں اور شاعروں کو ان کی تصانیف کی اشاعت کے لیے ہر سال مالی اعانت دی جاتی ہے۔

۱۹۸۲ء میں ادارۂ ادبیات اردو کی گولڈن جوبلی تقاریب منائی گئیں۔ اس موقعہ پر ادارہ کی عمارت کی توسیع، کتب خانے کی حالت کو بہتر بنانے کے سلسلے میں اسکیمیں بنائی گئی تھیں ایک اشاعتی پروگرام بھی تشکیل دیا گیا تھا لیکن ان کاموں کے لیے ضروری مالیہ فراہم نہیں ہو سکا۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر ادبی ٹرسٹ کے ارباب حل و عقد نے یہ فیصلہ کیا کہ اس سال مشاعرہ سے ہونے والی آمدنی ادارۂ ادبیات اردو کے ترقیاتی کاموں کے لیے مختص کی جائے۔ اس سال یہ مشاعرہ "وزیر سلطان ٹوباکو کمپنی" کے تعاون سے زیادہ وسیع پیمانے پر منعقد ہو رہا ہے اور امید ہے کہ مشاعرے کی آمدنی سے ادارۂ ادبیاتِ اردو کے لیے کوئی ایسا ٹرسٹ قائم کیا جا سکے جس سے اس کو مستقل آمدنی ہوتی رہے۔

ادارۂ ادبیاتِ اردو برصغیر کا ایک اہم تحقیقی اور علمی ادارہ ہے۔ اس کو ترقی دینے کے لیے ادبی ٹرسٹ نے جو اقدام کیا ہے وہ لائق صد تحسین و سپاس ہے۔ ہم ادبی ٹرسٹ کے عہدہ داروں بالخصوص جناب عابد علی خاں سکریٹری ادبی ٹرسٹ و رکن مجلسِ انتظامی ادارۂ ادبیاتِ اردو کے خاص طور پر ممنون ہیں کہ ان کی توجہ اور دلچسپی کی وجہ سے بانیٔ ادارہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ کے لگائے ہوئے اس پودے کو بادِ صرصر سے محفوظ و مامون رکھنے کی ایک صورت پیدا ہوئی ہے۔

مغنی تبسم

ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ

ٹیچر سے وائس چانسلر تک

یہ بات ہمارے لیے مسرت و افتخار کا باعث ہے کہ ادارۂ ادبیات اردو کے معتمدِ عمومی جناب سید ہاشم علی اختر صاحب (آئی۔ اے۔ ایس ریٹائرڈ) کا تقرر جامعہ عثمانیہ کے وائس چانسلر کی حیثیت سے ہوا ہے۔ ہاشم علی اختر صاحب کی شخصیت حیدرآباد کے علمی، ادبی اور ثقافتی حلقوں میں محتاجِ تعارف نہیں۔ اردو زبان و ادب سے انھیں گہری دل چسپی اور لگاؤ رہا ہے۔ اسی بنا پر انھوں نے پرنسپل سکریٹری حکومت آندھرا پردیش کے عہدہ کی اہم ذمہ داریوں اور مصروفیات کے باوجود ادارۂ ادبیات اردو کے معتمدی کی ذمہ داری قبول فرمائی اور اس ادارہ کی علمی، ادبی سرگرمیوں کو زندہ رکھنے اور نشونما دینے کی بھرپور کوشش کی۔

ہاشم علی اختر صاحب غیر معمولی ذہانت رکھنے والی ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جس پر بجا طور پر نابغہ اور جینئس (GENIUS) کا اطلاق کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے ایک متوسط گھرانے میں آنکھ کھولی۔ وہ ۱۹۲۲ء میں حیدرآباد کے محلہ "تلی گوڑہ" میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد جناب سید حنیف صاحب مرحوم اردو اور فارسی کے استاد تھے اور ناظر تعلیمات کی حیثیت سے وظیفۂ حسنِ خدمت پر سبکدوش ہوئے۔ ہاشم علی صاحب کے دادا جناب سید شاہ محی الدین صاحب ایک عرب نژاد صاحب دل بزرگ تھے۔ اپنا زیادہ وقت رشد و ہدایت میں صرف کرتے تھے۔ انھوں نے ٹراونکور اسٹیٹ میں رہائش اختیار کرلی تھی ان کے فرزند جناب سید حنیف صاحب ٹراونکور سے حیدرآباد تشریف لائے۔ حیدرآباد میں ان کی شادی ڈاکٹر سید ہاشم علی صاحب میڈیکل آفیسر برطانوی فوج کی صاحب زادی فاطمہ بیگم صاحبہ سے ہوئی۔ سید حنیف صاحب ایک نیک دل، صاحب کردار اور بے خوف انسان تھے۔ انھیں علم و ادب سے گہری دل چسپی تھی وہ بحیثیت مدرس اور ناظر تعلیمات بہت مقبول رہے۔ انھوں نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ کی۔

ہاشم علی اختر صاحب کی ابتدائی تعلیم گھر میں ہوئی۔ نو سال کی عمر میں "مدور مڈل اسکول" ضلع نلگنڈہ میں چھٹے درجہ میں داخلہ حاصل کیا۔ ان کے انگریزی کے استاد راما راؤ صاحب تھے انھوں نے طلباء کو پابند کیا تھا کہ وہ ہر روز انگریزی کی کتاب سے ایک صفحہ خوش خط لکھ کر لائیں۔ ہاشم علی صاحب نے ایک صفحہ

لکھ کر پیش کیے تو ان کا خط دیکھ کر راما راؤ صاحب نے
انھیں ہوم ورک سے مستثنیٰ کر دیا اور کہا کہ اب وہ
خوش نویسی میں اپنا وقت ضائع نہ کریں اور یہی
وقت کتابوں کے مطالعے میں صرف کریں۔ اس تحریک
سے اُن میں مطالعہ کا ذوق پیدا ہوا اور انھوں نے
اسکول کے کتب خانے کی ساری کتابیں ایک ایک کرکے
پڑھ ڈالیں۔ اُن ہی دنوں جناب فیض محمد صاحب
صدر مہتمم تعلیمات (جو بعد میں ناظمِ تعلیمات حکومت
حیدرآباد ہوئے) اسکول کے معائنہ کے لیے آئے
ہاشم علی صاحب کی جماعت میں پہنچ کر بچوں سے مختلف
سوالات کیے لیکن ہاشم علی صاحب کے سوا کسی طالب علم
نے جوابات نہیں دیے۔ اس کے بعد انھوں نے کتب
خانے کا معائنہ کیا اور رجسٹر دیکھا تو معلوم ہوا کہ صرف
ایک طالبِ علم کتب خانے سے مستفید ہو رہا ہے انھوں
نے اُس طالبِ علم کو طلب کیا وہ ہاشم علی ہی تھے۔
انھوں نے پوچھا کیا تم نے یہ ساری کتابیں حقیقتاً
پڑھی ہیں۔ ہاشم علی صاحب نے اثبات میں جواب دیا
تو انھوں نے ایک کتاب نکال کر امتحاناً سوال کیا کہ
اس میں کیا لکھا ہے۔ ہاشم علی صاحب نے اس
کتاب کے موضوع کی تفصیل سنانی شروع کی۔ صدر مہتمم
تعلیمات بہت خوش ہوئے اور انھوں نے "انسپکشن
نوٹ" میں لکھا کہ اس اسکول میں ایک طالبِ علم
سید ہاشم علی کے سوا کوئی اور کتابیں نہیں پڑھتا۔
ہاشم علی صاحب کے والد کا تبادلہ نظام آباد
ہو گیا تو وہ بھی ان کے ساتھ نظام آباد چلے گئے
اور ساتویں سے نویں جماعت تک وہیں کے
ہائی اسکول میں تعلیم پائی۔ اسکول کے صدر مدرس
نادر خورشید مرزا تھے پھر اُن کی جگہ عبدالسلام صاحب
آگئے۔ یہ دونوں صدور مدرسہ نہایت بارعب تھے
اسکول کے سارے لڑکے اُن سے خوف زدہ رہتے
تھے۔ والد کے تبادلے کی وجہ سے وہ محبوب نگر
چلے گئے اور وہیں سے میٹرک کا امتحان کامیاب کیا۔
اسکول کے ہیڈ ماسٹر وینکٹ راؤ مانوی کر تھے
جن کا ڈسپلن اچھا تھا۔ اسکول کے اساتذہ میں
قابلِ ذکر کاظم علی صاحب (سائنس) نارائن راؤ صاحب
(انگریزی) حبیب احمد صاحب (ریاضی) ہدایت علی
صاحب (جغرافیہ) تھے۔ ہاشم علی صاحب کی فطری
ذہانت اور حصولِ علم کے شوق پر قابلِ ذکر اساتذہ
کے فیضِ تربیت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔
میٹرک کامیاب کرنے کے بعد ۱۹۳۸ء میں
ہاشم علی صاحب نے جامعہ عثمانیہ میں انٹرمیڈیٹ
(سائنس) میں داخلہ لیا۔ وہ "سی" ہاسٹل کے
چھ سال تک بورڈر رہ چکے ہیں۔ ۱۹۴۳ء میں صدر
عریفِ طعام (سینیئر فوڈ مانیٹر) اور ۱۹۴۴ء میں
صدر عریفِ مکان (سینیئر ہوز مانیٹر) رہے۔ جامعہ
عثمانیہ ۱۹۴ ء میں انٹرمیڈیٹ، ۱۹۴۲ء میں
بی۔ ایس۔ سی اور ۱۹۴۴ء میں ایم۔ ایس۔ سی
حیوانیات (زوالوجی) سے کامیاب کیا۔ اُس
زمانے میں داخلے کے لیے پرو وائس چانسلر اور
پرنسپل انٹرویو لیتے تھے۔ ہاسٹل کا خرچ صرف ۱۷
روپیہ ماہانہ تھا جس میں سے ۱۵ روپیے کھانے
کے لیے اور بقیہ دو روپیہ میں کمرہ کا کرایہ بجلی

بل ۔ دھوبی اور حجام کی خدمات شامل تھیں اور گرم
پانی ملا کرتا تھا ۔ اقامت خانے (ہاسٹل) کا فرنیچر
اور انتظامات بہت اعلیٰ درجے کے تھے ۔ ہاسٹل
کے موتوب (وارڈن) جناب شیو موہن لال صاحب
پروفیسر ہند و فلسفہ جامعہ عثمانیہ تھے ۔ اُس زمانے
میں لڑکے شرارتیں بھی کیا کرتے تھے لیکن غنڈہ گردی
نہیں ہوتی تھی ۔ کوئی ایک آدھ بے تکا سا لڑکا آ بھی
جاتا تو سینیر لڑکے اُس کو درست کر دیتے تھے ۔
ڈائننگ ہال اتنا صاف ستھرا اور باسلیقہ تھا کہ
اُس پر کسی اعلیٰ درجہ کی رسٹورنٹ کا شبہ ہو سکتا تھا ۔
دارالترجمہ کے باقاعدہ کام کرنے کی وجہ سے تقریباً
ہر مضمون کی اصطلاحات کا ترجمہ ہو چکا تھا ۔

یونی ورسٹی میں ہاشم علی صاحب جن اساتذہ
سے فیض یاب ہوئے اُن میں ڈاکٹر بی ۔ کے ۔ داس
صدر شعبۂ حیوانات ، ڈاکٹر ستیہ نارائن سنگھ ،
ڈاکٹر مہدی علی لکچرر زوالوجی ، نباتات کے صدر
شعبہ پروفیسر سعید الدین ، نباتیات کے ریڈر عبدالباری
صاحب ، ڈاکٹر عبدالسلام ، ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ
طبعیات کے پروفیسر وحید الرحمٰن صاحب ، ڈاکٹر
این ۔ رام لال ، سید احمد قادری صاحب شعبہ کیمیا
کے اساتذہ ہیں ۔ ڈاکٹر مظفر الدین (صدر شعبہ) کے
علاوہ محمود احمد خاں صاحب ، شاہ محمد صاحب
اور خلیل الرحمٰن صاحب قابلِ ذکر ہیں ۔

ہاشم علی صاحب نے ہوسٹل کے ساتھیوں میں
قابلِ ذکر اشتفاق حسین صاحب ، ڈاکٹر حفیظ قتیل
میر عابد علی خاں صاحب ایڈیٹر روزنامہ سیاست
جناب محبوب حسین جگر جوائنٹ ایڈیٹر روزنامہ سیاست
منظور مصطفیٰ صاحب ، سردار الہام صاحب اور
رکن الدین حسان صاحب قابلِ ذکر ہیں ۔ ڈاکٹر حفیظ
قتیل صاحب نے اس زمانے کے ساتھیوں کے
کیریکچر کھینچے ہیں یہ مخمس انھوں نے ہاشم علی اختر
صاحب کے لیے کہا تھا : ۔

چھلکتا ہے نگاہوں سے مری جودت کا پیمانہ
ہے میری عمر سے آگے مرے اشغال رندانہ
نگاہِ سطح بیں اکالے کلوٹے رنگ پر مت جا
میں ہر محفل کی شمع ہوں میں ہر شمع کا پروانہ
نزاعِ عقل و دل کی الجھنیں ہیں میرا افسانہ

یونی ورسٹی چھوڑنے کے تیس سال بعد بھی وہ اُس
زمانے کی یادوں کے جھروکوں میں سے جھانکتے
ہیں تو ڈاکٹر حفیظ قتیل کے یہ شعر انھیں یاد آتے ہیں : ۔

آہ وہ کالج کی رنگیں زندگی
اپنے موضوعوں کی وہ آشفتگی
اُن کا دل کش لطف ، جانبر بے رخی
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

ایم ۔ ایس ۔ سی کامیاب کرنے کے بعد وہ گورنمنٹ
سٹی کالج حیدرآباد میں زوالوجی کے لیکچرر مقرر ہوئے
میں نے ہاشم علی صاحب سے دریافت کیا کہ ٹیچر کی
حیثیت سے آپ کا کیا تجربہ رہا ہے ؟

ہاشم علی صاحب نے مسکراتے ہوئے ارشاد
فرمایا ٹیچر کی حیثیت سے اُن کو اپنے شاگردوں کے
بارے میں بہت اچھا تجربہ رہا ہے ۔ ان میں بعض
اب بھی اُن کے سرکاری عہدے کی وجہ سے نہیں

بلکہ شاگرد ہونے کی حیثیت سے ملتے ہیں۔ سعادت مندی اور گہری عقیدت مندی کا اظہار کرتے ہیں۔

ڈھائی سال تک وہ اس خدمت پر فائز رہے۔ اس زمانے میں ہائی اسکول اور کالج میں ایسے اساتذہ جمع تھے جنھیں اپنے مضامین پر کامل عبور حاصل تھا۔ احمد حسین خاں صاحب اور ڈاکٹر حسین ظہیر جیسے نامور و ممتاز ماہران تعلیم پرنسپلوں کے دور میں آپ نے اپنی ڈھائی سالہ ملازمت نہایت وقار کے ساتھ انجام دی اور تمام اساتذہ و طلبہ میں مقبول رہے ان کے ہم عصر اساتذہ میں پروفیسر ابوظفر عبدالواحد صاحب، پروفیسر سید محمد صاحب، احمد عثمانی صاحب، احمد عبداللہ صاحب، پٹواری صاحب، غلام محمود صاحب پروفیسر سراج الدین، ڈاکٹر مہدی علی، ڈاکٹر عبدالسلام مسٹر سبا حسین اور ہوش دار خاں صاحب قابل ذکر ہیں۔ مولوی غلام رسول صاحب لائبریرین تھے جنھوں نے ہاشم علی صاحب کو لاتعداد کتابیں پڑھنے کے لیے دیں۔

اُستاد کی حیثیت سے وہ اپنے طالبعلموں میں بہت مقبول تھے لیکن وہ اس پیشے سے زیادہ عرصہ تک وابستہ نہیں رہے اور ۱۹۲۷ء میں حیدرآباد سیول سروس (ایچ سی۔ ایس) کے مسابقتی امتحان میں شرکت کی اور بدرجہ امتیاز کامیابی حاصل کی جس کی بنا پر آپ کو "میر اکبر حیدری گولڈ میڈل" دیا گیا۔ [illegible] ۱۹۲۸ء میں آپ کو آئی۔ اے۔ ایس کے زمرے میں شامل کرلیا گیا۔

ایچ۔ سی۔ ایس کی تربیت تین سال کی مدت میں ہوتی تھی۔ پہلا سال سیول سروس ہاؤز میں بسر ہوتا تھا اور ٹریننگ کلاسیں صبح چھ بجے سے شام کے آٹھ بجے تک مسلسل ہوتی رہتی تھیں جس میں قانون کے بارہ مضامین 'بی۔ اے کے معیار کی معاشیات اور ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کے سال چہارم کی کتاب صحت عامہ (HYGIENE) کے علاوہ گھوڑسواری، رائفل پریکٹس اور پیریڈ کی شامل تھے ایک سال بعد ان سب مضامین کا امتحان ہوتا تھا۔ دوسرے سال ریاست حیدرآباد کے اُن تمام محکموں کی عملی ٹریننگ ہوتی تھی جن میں سیول سروس کے عہدہ داروں کو آئندہ زندگی میں کام کرنے کا موقع دیا جاتا تھا اور تمام متعلقہ محکمہ جاتی امتحان کامیاب کرنے ہوتے تھے دو سال کی ٹریننگ کے بعد "پروبیشنرز" (PROBATIONERS) کا مختلف محکموں کے لیے انتخاب عمل میں آتا تھا جن میں مال، فینانس، آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس، پولس، عدالت اور محکمہ ٹیر شامل تھے اس انتخاب کے بعد پروبیشنرز کو برطانوی ہند کے کسی صوبے میں مزید ٹریننگ کے لیے بھیجا جاتا تھا اور مال اور پولس کی ٹریننگ آئی۔ سی۔ ایس اور آئی۔ پی عہدہ داروں کے ساتھ ہوتی تھی۔ اس سال بھی برطانوی ہند کے وہ امتحان کامیاب کرنے پڑتے تھے جو حکومت ہند کے متعلقہ عہدہ داروں کے لیے ضروری ہوں۔ تین سال کے بعد ان کا تقرر عمل میں آتا تھا۔ چنانچہ ٹریننگ کے بعد ہاشم علی صاحب کا تقرر محکمہ گرداوری

کے مہتم (Custom Superintendent)
(حیدرآباد، اور بیدر) دوم تعلقدار (اورنگ آباد،
کنہ گوڑم، نزویڈ)، اسپیشل سرویس آفیسر برائے
قبایلی اور ہتریجن ترقی (ملبندو)، کلکٹر حصول اراضی
(حیدرآباد) کلکٹر اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ (سریکاکلم
اور کھمم)، معتمد گورنر (جناب بھیم سین سچر صاحب
اور جنرل شری نگیش صاحب)، ڈپٹی سکریٹری
(محکمہ جات بلدیہ، اور جی۔ اے۔ ڈی پولٹیکل)
ناظم محکمہ جات پروٹوکول، سیول ڈیفنس، محکمہ
تواضع HOSPITALITY اور محکمہ شکر SUGAR
رجسٹرار کوآپریٹیو سوسائٹیز، کمشنر (پوچم پاڈ پراجکٹ
اور کمانڈ ایریا ڈیولپمنٹ) پرنسپل سکریٹری اور اگریکلچرل
پروڈکشن کمشنر اور چیرمن کمیشن استعمال آب پاشی
جیسے جلیل القدر عہدوں پر فائز رہے۔

۲۵ر جنوری ۱۹۳۱ء میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری
زور کی مساعی سے ادارۂ ادبیات اردو کا قیام عمل
میں آیا تھا۔ جس زمانے میں ہاشم علی صاحب گورنر
آندھراپردیش کے معتمد تھے ڈاکٹر زور کے پاس
حاضر ہوا کرتے تھے۔ ڈاکٹر زور کی رحلت کے بعد
ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ کی خواہش پر آپ نے
۲۹ر جون ۱۹۷۵ء کو ادارۂ ادبیات اردو کی اعزازی
معتمدی قبول کی اور اس وقت سے اس خدمت کو
انجام دے رہے ہیں۔ گزشتہ سال ادارۂ ادبیات
اردو کی گولڈن جوبلی تقاریب ہاشم علی صاحب کی
شخصی دلچسپی کی وجہ سے نہایت شان دار پیمانے
پر منائی گئیں۔

۳۱ر اکتوبر ۱۹۸۲ء کو آپ بحیثیت چیرمن
برائے استعمال آب پاشی حکومت آندھراپردیش
کی جلیل القدر خدمت سے وظیفہ حسن خدمت پر
سبکدوش ہوئے یہ عہدہ اڈیشنل سکریٹری گورنمنٹ
آف انڈیا کے رتبہ کا تھا۔ آپ کو یہ اعزاز بھی حاصل
ہے کہ "حیدرآباد سیول سرویس" کے آپ آخری
نمائندے ہیں۔ ۲۵ر ڈسمبر ۱۹۸۲ء کو ہاشم علی
صاحب وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی کی خدمت
پر فائز ہوئے۔ جائزہ حاصل کرنے کے بعد
انھوں نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے قدیم اساتذہ پروفیسر
شیوموہن لال صاحب مرحوم، پروفیسر خلیل الرحمن صاحب
پروفیسر مہدی علی صاحب اور پروفیسر مہندر راج
سکسینہ صاحب کی قیام گاہوں پر پہنچ کر ان کی دعائیں
حاصل کیں۔ اس سے ہاشم علی صاحب کی اساتذہ
کے ساتھ گہری عقیدت اور سعادت مندی کا پتہ
چلتا ہے۔ وائس چانسلر شپ کے جائزہ کے بعد
کی ملاقات جو پروفیسر شیوموہن لال صاحب سے
ہوئی تھی اس کے دس دن کے اندر شیوموہن لال
صاحب کا انتقال ہوگیا۔ ہاشم علی صاحب نے
فرمایا "پروفیسر شیوموہن لال بڑے نیک آدمی تھے
اگر میں اُن سے ملاقات نہ کرتا تو زندگی بھر مجھ کو اس کا
ملال رہتا"

سید ہاشم علی صاحب کے نام کا جزو اختر
ہے میرے استفسار پر کہ کیا اختر آپ کا تخلص ہے؟
ہاشم علی صاحب نے چونک کر فرمایا نہیں یہ میرا عرف
ہے میں نے کبھی شاعری نہیں کی ہے۔ عابد علی خ

اور محبوب حسین جگر صاحبان نے اس عرف کو میرے
نام کے ساتھ چسپاں کر دیا تب سے اختر میرے
نام کا جزو بن گیا ہے۔

ہاشم علی اختر صاحب کی شادی ۱۹۴۸ء ار جون
کو بیرسٹر اکبر علی خاں صاحب کے بڑے بھائی
احمد علی خاں صاحب مرحوم انجینیر کی صاحبزادی
افتخار النساء بیگم صاحبہ (عرف وحید) سے ہوئی۔
شادی کے بعد انگریزی مقولہ (AND LEVE
HAPPILY EVER AFTER) آپ کی
زندگی پر صادق آتا ہے۔ آپ کی ازدواجی زندگی
مثالی کہی جا سکتی ہے۔ ہر بڑے انسان کی زندگی
کو کامیاب اور با معنی بنانے میں اس کی شریک
حیات اہم رول ادا کرتی ہے۔ ہاشم علی اختر صاحب
کی سرکاری زندگی کی سخت مصروفیات اور لمبے لمبے
دوروں کے باوجود ان کی رفیقۂ حیات نہایت
خوش دلی کے ساتھ گھر کے سارے مسائل کو خود
نبٹاتی رہیں جس کی وجہ سے ہاشم علی صاحب کو یکسوئی
کے ساتھ اپنے مفوضہ فرائض کو ادا کرنے کا موقع
مل سکا۔ ان کی رفیقۂ حیات کی زبان پر کبھی حرف
شکایت نہیں آیا۔ گھریلو انتظامات میں شاید ہی
ہاشم علی صاحب کو دخل دینے کی ضرورت پیش آئی ہو۔
ہاشم علی صاحب کے اوقات کار صبح ۹ تا ۵ شام اور
رات ۹ تا ۱۲ بجے ہیں۔ شام کے ۵ بجے سے رات
کے ۹ بجے تک آپ اہل خاندان کے لیے وقت نکال
لیا کرتے ہیں۔

ہاشم علی اختر صاحب کو خداوند کریم نے
دو لڑکیاں اور ایک لڑکا عطا کیا ہے۔ بڑی لڑکی سارہ
ہاشم صاحبہ بی۔ ایس۔ سی، بی۔ ایڈ ہیں ان کی شادی
فاروق سلطان صاحب سے ہوئی جو عثمانیہ یونیورسٹی
کے بی۔ ای ہیں۔ امریکہ سے انھوں نے ایم۔ بی
اے کامیاب کیا ہے موصوف امریکہ میں بحیثیت
انجینیر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ سارہ صاحبہ
بھی ایک امریکی اسکول میں پڑھاتی ہیں اور اپنے شوہر
اور بچوں کے ساتھ امریکہ ہی میں مقیم ہیں۔

دوسری صاحبزادی سیما ہاشم صاحبہ بی۔ ایس
سی (ہوم سائنس) ہیں ان کی شادی سید خواجہ رحیم اللہ
صاحب بی۔ ای (عثمانیہ) سے ہوئی ہے۔ سید خواجہ
رحیم اللہ صاحب نے امریکہ جا کر ایم۔ ایس کی ڈگری
حاصل کی۔ وہ اب امریکہ میں بحیثیت انجینیر کارگزار ہیں۔
سیما صاحبہ بھی ملازم ہیں وہ اس وقت ایک امریکن دواخانہ
میں بہ حیثیت ڈائیٹیشن (DIETITIAN) خدمات
انجام دے رہی ہیں۔

ہاشم علی اختر صاحب کے فرزند صدیق انور صاحب
نے ۱۹۷۳ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے بی۔ ای کی ڈگری
حاصل کی۔ امریکہ کی برکلے یونیورسٹی سے ایم۔ ایس
کیا اور وہیں ایک بڑی فرم میں بہ حیثیت پراجکٹ
انجینیر خدمات انجام دے رہے ہیں۔

ہاشم علی اختر صاحب سادگی پسند، خوش ذوق
اور زندہ دل انسان ہیں ان میں افسرانہ رعونت بالکل
نہیں ہے۔ محفلوں میں ان کی وجہ سے زندگی اور
رونق آجاتی ہے ان کی گفتگو شائستہ، دلچسپ اور
معلومات آفرین ہوتی ہے۔ اپنے لطیفوں اور مزاح

فقروں سے ایک زندہ دلی کی کیفیت اور فضا پیدا
کردیتے ہیں۔ اشعار کی برجستہ تحریف کرنے میں بھی
انھیں کمال حاصل ہے۔ ایک بار اردو مجلس کا جلسہ
ہاشم علی اختر صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا تھا
جس میں راقم الحروف نے ایک مقالہ اکبر کی شاعری پر
پڑھا تھا مقالہ میں اکبر کے اس شعر کا بھی ذکر تھا ؎

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

ہاشم علی اختر صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں اس شعر
کو تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ مزاحیہ انداز میں سنایا ۔
ہاسٹل میں رہنے والے لڑکے اس شعر کو یوں پڑھ سکتے ہیں ؎

ہم بھوک سے مرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ دال بھی دیتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

یہ شعر سُنا کر ہاشم علی صاحب نے محفل کو زعفران زار بنا دیا۔
جب اُن کے کسی دوست کی صاحبزادی کی شادی
"ٹرنک کال" پر طے پائی تب ہاشم صاحب کے ایک
بے تکلف دوست نے اُن سے دریافت کیا جناب
مونوگیمی، پولوگیمی کی اصطلاحات تو ہم نے سُنی ہیں اس
شادی کو کیا نام دینا چاہیے ۔ اس پر ہاشم علی صاحب
نے مُسکراتے ہوئے جواب دیا "ٹیلی گیمی"۔

ہاشم علی اختر صاحب اپنے آپ کو "فرمائشی ادیب"
خیال کرتے ہیں انھیں اتنی فرصت نہیں ملتی کہ اپنی
خواہش اور مرضی سے کوئی مضمون تحریر کریں آل انڈیا
ریڈیو حیدرآباد یا کسی ادارے نے فرمائش کی تو کسی
طرح وقت نکال کر مضمون قلم بند کر دیتے ہیں۔ آپ
کے نشریوں کے اکثر مسودے آل انڈیا ریڈیو
حیدرآباد میں رہ گئے ہیں۔ "قومی یکجہتی ۔ ایک
قومی ضرورت" کے عنوان سے ہاشم علی اختر صاحب
نے ایک کتاب لکھی جو ۱۹۷۰ء میں شائع ہوئی۔
یہی مضمون انگریزی میں بھی لکھا گیا ہے۔

کمانڈ ایریا اور آب پاشی (زرعی ترقی)
کے بارے میں آپ کے کئی علمی اور تحقیقی مضامین
ہندوستان اور بیرون ہند انگریزی جرائد میں
شائع ہوئے ہیں ۔ کمانڈ ایریا ڈولپمنٹ اور
آب پاشی کے موضوعات پر آپ کی دو کتابوں کے
مسودے تیار ہیں ۔ ایڈمنسٹریٹو اسٹاف کالج کی
طرف سے یہ دونوں کتابیں شائع ہونے والی
ہیں گورنمنٹ آف آندھرا پردیش کے زیر اہتمام آپ کی
"آب پاشی کے استعمال" پر مرتب کردہ رپورٹیں شائع
ہو چکی ہیں جو دو جلدوں پر مشتمل ہیں ۔ یہ رپورٹیں آپ نے
"چیرمن آف کمیشن ایری گیشن" کی حیثیت سے لکھی
ہیں ۔ ایشیاء میں آب پاشی پر یہ منفرد رپورٹ ہوگی۔
جس کی اشاعت کا تقاضا بیرونی ممالک میں بھی ہو رہا ہے۔

ہاشم علی اختر صاحب نے ہندوستان اور
بیرون ملک منعقد سیمناروں میں شرکت کی اور اپنے
مقالے پیش کیے جن میں قابلِ ذکر ورلڈ بینک ، فوڈ
اینڈ اگریکلچر آرگنائزیشن (روم) انٹرنیشنل رائس
ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ، اگریکلچر سوسائٹی (نیویارک)
اور فورڈ فونڈیشن کی جانب سے منعقد کردہ سیمنار
ہیں ۔ آب پاشی کے مسائل پر ورلڈ بینک F.A.O.
اور فورڈ فاؤنڈیشن کے وہ مشیر رہ چکے ہیں ۔ انڈونیشیا
کے آب پاشی پراجکٹ پر اپنی ایک رپورٹ انھوں نے

ورلڈ بینک کو بھیجی ہے۔ بیرونِ ملک آپ آٹھ بار تشریف
لے جا چکے ہیں۔ ۱۵ ممالک کی سیاحت کر چکے ہیں۔ سسکس
(Sussex) یونیورسٹی کی دعوت پر "انسٹی ٹیوٹ
آف ڈیولپمنٹ اسٹڈیز" میں تین ماہ فیلو کی
حیثیت سے اسٹڈی کی ہے اور ایک کتاب کا
مسودہ تیار کیا ہے۔

ہاشم علی صاحب کو اردو زبان اور اس کے
مسائل سے گہری دلچسپی ہے۔ ۲۶ رنومبر ۱۹۷۸ء
میں ایچ۔ ای۔ ایچ۔ دی نظامس اردو ٹرسٹ
کی جانب سے "آندھرا پردیش میں اردو کے بائیس سال"
کے عنوان سے ایک سمینار منعقد ہوا تھا جس میں ہاشم علی
صاحب نے "اردو کی بقا، ترویج اور ترقی کے
مسائل" کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا تھا۔ اس
مقالے میں بڑے اہم اور خیال انگیز سوالات اٹھائے
گئے تھے۔ وقت کی تنگی کی وجہ سے مقالے پر مفصل
بحث نہیں ہو سکی تھی۔ اس مقالے کی اہمیت کے
پیشِ نظر یہ تجویز پیش کی گئی کہ ایک سمینار اسی موضوع
پر منعقد کیا جائے چنانچہ اس موضوع پر ایک سمینار
ادارۂ سب رس کے زیرِ اہتمام منعقد کیا گیا جس کی
صدارت پروفیسر گیان چند جین صاحب، صدر شعبۂ
اردو، حیدرآباد یونیورسٹی نے کی۔

ہاشم علی اختر نے اس مقالے کو کلیدی خطبے کے
طور پر پیش کیا۔ مباحث میں کئی دانشوروں، اساتذہ
اور صحافیوں نے حصہ لیا اور اردو زبان کے مسائل کے
بارے میں بہت ہی کھل کر اظہارِ خیال کیا گیا۔ اس مقالے
کی اہمیت کے پیشِ نظر انجمن ترقی اردو کے ترجمان، ہفت روزہ
ہماری زبان میں اسے مکمل شائع کیا گیا تاکہ اردو تحریک
سے تعلق اور دلچسپی رکھنے والوں کی رہنمائی ہو۔

اردو ذریعہ تعلیم کے بارے میں ایک استفسار پر ہاشم علی
اختر صاحب نے بتایا کہ جامعہ عثمانیہ میں ساری تعلیم اردو ہی
میں ہوتی تھی۔ دارالترجمہ کے باقاعدہ کام کرنے کی وجہ سے
تقریباً ہر مضمون کی اصطلاحات کا ترجمہ ہو چکا تھا۔ اردو ذریعہ
تعلیم کی کامیابی میں کوئی شبہ نہیں ہے جامعہ عثمانیہ ہندوستان
کی پہلی جامعہ تھی جہاں ہندوستان میں اردو ذریعہ تعلیم کا کامیاب
تجربہ ہوا۔ حکومت کی سرکاری زبان اردو ہی تھی۔ لہٰذا سرکار کا کام کرنے
اردو مددگار ثابت ہوئی۔ اردو ذریعہ تعلیم آج کل کے
حالات میں شاید ملازمتوں کے حصول اور اپنے کام میں
اچھی کارگزاری کے لیے مددگار ثابت نہ ہو۔ اس زمانے
میں سیول سروس کے امتحانات کامیاب کرنے کے لیے
انگریزی ضروری تھی۔ انگریزی کی وجہ سے اردو ذریعۂ
تعلیم سے فارغ التحصیل امیدواروں کو کافی مشکلات
کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

ہاشم علی اختر صاحب نے بتایا کہ حالات کے
بدل جانے کی وجہ سے خود ان کے بچوں کی تعلیم انگریزی
میڈیم سے ہوئی۔ بچے غالب اور اقبال کو نہیں سمجھ
سکتے یہ ایک قسم کی "ثقافتی" "بے ٹنگی" (کلچرل
ڈی ٹیننگ) ہے امریکہ سے اب جو خطوط ان کے بچوں نواسے
نواسیوں کے پاس سے آتے ہیں انگریزی میں ہوتے
ہیں۔ اردو ہاشم علی اختر صاحب کی دانست میں اُس زبان کا
نام ہے جسے ہندوستان کے عام لوگ بولتے تھے ا
جو اس زمانے کے سرکاری رسم الخط میں لکھی جا
لگی تھی۔ سرکاری زبان کے دوسری زبانوں پر بہ

گہرے اثرات ہوتے ہیں چناں چہ اس وقت ہندوستان
میں شاید ہی کوئی ایسی زبان ہے جس میں انگریزی کے
الفاظ شامل نہ ہوں اسی طرح ہندوستان میں فارسی
چھ سو سال تک سرکاری زبان رہی جس کی وجہ سے تمام
ہندستانی زبانوں میں بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔
چناں چہ تلگو میں تقریباً دس ہزار اور تامل میں چار ہزار
الفاظ پائے جاتے ہیں۔

موجودہ حالات میں وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے
انگریزی زبان کو ضروری سمجھتے ہیں اس لیے کہ دنیا کے
کسی بھی مضمون پر انگریزی میں بڑی تعداد میں کتابیں مل
جاتی ہیں جب کہ کئی مضامین ایسے ہیں جن پر ہندوستانی
زبان میں کوئی کتاب نہیں ملتی۔ انگریزی اس وقت
بین الاقوامی زبان ہے۔ روس، جرمنی اور دوسرے
ترقی یافتہ ممالک بھی اس کی ضرورت کو محسوس کرتے ہیں
اور وہاں یہ زبان پڑھائی جاتی ہے۔ مقامی سرکاری
زبان کو ذریعۂ تعلیم بنایا جائے تو یہ کوشش ہونی چاہیے
کہ مادری زبان لازمی طور پر زبانِ دوم کے طور پر رکھی
جائے۔ برطانوی حکومت کے دور میں مدراس اور
آندھرا کے علاقوں میں اردو والوں کے لیے یہ سہولت
حاصل تھی۔ ایسے مقامات پر جہاں انگریزی زبان
کی تعلیم کی سہولت حاصل ہے انگریزی میں بھی تعلیم
ل کی جا سکتی ہے لیکن سرکاری زبان کو کبھی
انداز نہیں کیا جانا چاہیے ایسا کرنے سے حکومت
راس کے ہزاروں کارکنوں سے جن سے ہر شخص کو
بقہ پڑتا ہے ربط ختم ہو جاتا ہے۔ سرکاری زبان
، عدم واقفیت قومی دھارے میں شامل ہونے

میں رکاوٹ بن سکتی ہے۔

موجودہ زمانے میں طلبہ میں بڑھتی ہوئی ڈسپلن
شکنی کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے
کہا کہ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ طلبہ سیاست میں
حصّہ لینے لگے ہیں۔ آزادی کی جدوجہد کے زمانے میں
طلبا سیاست میں حصّہ لیتے تھے اس کے باوجود
اس وقت ڈسپلن شکنی نہیں ہوتی تھی بہ ظاہر یہ محسوس
ہوتا ہے کہ آج جو سیاست ہے اس میں اخلاقی قدریں
باقی نہیں ہیں اسی کی وجہ سے اس کا طلبہ پر بُرا اثر پڑتا ہے

آج کل اساتذہ طلبہ میں زیادہ دل چسپی
نہیں لیتے۔ بعض اساتذہ ایسے بھی ہیں جو اپنے
مضمون میں کمزور ہیں اسی لیے وہ طلبہ سے ڈرتے
ہیں۔ اس کے برخلاف وہ اساتذہ جو اپنے مضمون
پر حاوی ہیں اور پڑھانے میں مہارت رکھتے ہیں
اُن کی عزت آج کے دور میں بھی ہوتی ہے۔

طلبہ کے چھوٹے چھوٹے گروہوں سے اساتذہ
کو ربط پیدا کرنا چاہیے تاکہ باہمی تعلق برقرار رہے۔
ایک بڑے مجمع سے شخصی تعلق نہیں پیدا کیا جا سکتا
طلبا کے حالات کا جائزہ لینے کے بعد ہوسٹلوں، کالجوں
اور کھیل کے میدان میں اساتذہ کو خود جا کر شخصی ربط
پیدا کرنا چاہیے۔ اس کی وجہ سے کم از کم طلبہ کے
ظاہری اخلاق بہتر ہو سکتے ہیں۔ تیس سال قبل
جو سیاسی رہنما کا کردار تھا وہ اب نہیں رہا ہے
اس درجہ کے بے لوث اور اونچے کردار کے رہنما اب
نظر نہیں آتے جیسے آزادیٔ ہندوستان کی جدوجہد
میں ہم کو نظر آتے تھے۔ تعلیم، تربیت اور تمثیل کی غیر

موجودگی میں جو طلبہ کے عام معیار میں انحطاط ہے اس
کے لیے محض طلبہ کو ذمہ دار قرار دینا ٹھیک نہیں ہے
دیسے بھی تعلیم اتنی تیزی سے عام ہوئی ہے کہ بہت
سے لڑکے ایسے ہیں جو اپنے خاندان میں پہلے تعلیم یافتہ
ہیں اور اکثر دیہات کے طالب علم ہیں جن سے اخلاق
ور تہذیب کے معیار کی امید نہیں رکھی جا سکتی تاوقتیکہ
ساتذہ اس جانب خاص توجہ نہ کریں۔

تعلیمی نظام میں محض علم کی خاطر علم حاصل
کرنے کے چند کورسس ہیں مثلاً فلسفہ، تاریخ وغیرہ
ور بعض کورسس روزگار پر مبنی تعلیم (JOB -
ORIENTE) کے ہیں جیسے انجینئرنگ اور ڈاکٹری۔
لسفہ اور تاریخ کے مضامین کامیاب ہونے والے
لبہ کے لیے ملازمتوں کا حصول مشکل ہے اس لیے
اعلیٰ درجہ کے مسابقتی امتحانات میں جس قسم کے
سوالات پوچھے جاتے ہیں وہ شاید شمالی ہند کی
دچار یونیورسٹیوں کے علاوہ دیگر یونیورسٹیوں
کے عام نصاب سے مختلف ہیں۔ ہمارے ملک نے
صنعتی طور پر اتنی ترقی نہیں کی ہے کہ روزگار پر مبنی
رسس کے فارغ التحصیل تمام طلبا ملازمت حاصل
سکیں۔ اس لیے بہت سے لوگ اعلیٰ تعلیم حاصل
کرنے کے بعد جس احساس ناکامی (FRUSTRA
TION) سے دوچار ہوتے ہیں وہ اتنا شدید
نہ ہوتا اگر ان کی تعلیم کم درجہ پر ختم ہو جاتی اس لیے
کہ انھیں اپنے طالب علمی کے زمانے کے خوابوں کی
تعبیر نہیں ملتی۔

سید ہاشم علی اختر صاحب تدریس کا تجربہ
رکھنے کے علاوہ عصری تعلیمی مسائل پر گہری نظر رکھتے
ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ کامیاب ایڈمنسٹریٹر رہ چکے
ہیں۔ یقین ہے کہ ان کے دور میں عثمانیہ یونیورسٹی کو
حیاتِ نو ملے گی نہ صرف علمی معیار میں اضافہ ہوگا
[illegible]

رحمن جامی

نذرانۂ سخن

(جناب ہاشم علی اختر صاحب وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی ہونے
کی مسرت میں)

خندہ لب خندہ دہن ہاشم علی اختر بنے
زندگی کا بانکپن ہاشم علی اختر بنے

اعتماد خوئے گل حاصل انھیں ہے آج تک
صورتِ رنگِ چمن ہاشم علی اختر بنے

ہر گھڑی ہر مرحلے پر باکمال و بامراد
عزم و ہمت کی لگن ہاشم علی اختر بنے

کامیاب و کامراں ہوتے گئے ہر باب میں
کامیابی کا چلن ہاشم علی اختر بنے

ہر نظر ہے آپ کے نظم و نسق کی معترف
اہلِ دل کا حسنِ ظن ہاشم علی اختر بنے

قومی یکجہتی کا جیتا جاگتا کردار ہیں
ربطِ شیخ و برہمن ہاشم علی اختر بنے

شاعری دانشوری کی سرپرستی کے سبب
رونقِ بزمِ سخن ہاشم علی اختر بنے

ہے وجود ان کا مثال صورت دانش کدہ
ذات سے خود انجمن ہاشم علی اختر بنے

کارنامے ان کے عظمت کی نشانی بن گئے
عظمت ارضِ دکن ہاشم علی اختر بنے

جامعہ عثمانیہ کی سربراہی مل گئی
احترامِ علم و فن ہاشم علی اختر بنے

ان کے بارے میں کہا رحمن جامی نے بجا
حرمت و فخرِ وطن ہاشم علی اختر بنے

بہ مسرتِ تقرر جناب سید ہاشم علی اختر صاحب آئی اے ایس (ریٹائرڈ) بر خدمت وائس چانسلری عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن

قطعۂ تاریخ

شکر کردم چوں شنیدم مژدۂ نیکو پگاہ
آسماں گوہر بہار داز نجومِ جامعہ
مصرعۂ تاریخ صاحبؔ گفتہ ام روشن زمہر
بزمِ انجم تہ بر سرِ بابِ علومِ جامعہ

۱۹۸۲ء

صاحب حیدرآبادی

نظمِ تہنیت

مسرت کی گھڑی تقدیر لے آئی مبارک ہو
بجی پھر جھوم کر اک بار شہنائی مبارک ہو
خدا نے نیک ساعت تجھ کو دکھلائی مبارک ہو
یہ قدرت کی ہے یہ کارفرمائی مبارک ہو
مہکتے پھول کی مانند تیری زندگانی ہے
گلستانِ مسرت پر گھٹا چھائی مبارک ہو
ترے چھونے سے مہکی اور نکھر کر زلفِ اردو کی
تجھے مشاطگئ حسن رعنائی مبارک ہو
ہیں جتنے جہاں بلب ظلمات کے قرب و جوانب میں
تجھے اے خضرؔ رہ ان کی مسیحائی مبارک ہو
پلا دے سارے میخواروں کو دے کر بادۂ الفت
خراباتِ کہن کا جامِ مینائی مبارک ہو
وہی آغوشِ مادر جس نے تیری پرورش کی تھی
بصد ارماں ہوئی تیری تمنائی مبارک ہو
مبارک جامعہ کو تیرا ذوقِ بزم آرائی
تجھے یہ جوہرِ ذاتی و آبائی مبارک ہو
تقرر کی بہاریں بھی ہیں شامل ساتھ پنشن کے
زلیخا کی جوانی لوٹ کر آئی مبارک ہو
بنے ہاشم علی اختر ہیں وی۔ سی۔ شان سے صاحبؔ
عروسِ علم و فن کی مسند آرائی مبارک ہو

کے۔ کے کھلّر

شہیدِ آزادی بھگت سنگھ اور اردو

دل سے نکلے گی نہ مرکر بھی وطن کی الفت
میری مٹی سے بھی خوشبوئے وطن آئے گی

یہ وہ نغمہ ہے جو بھگت سنگھ نے پھانسی پر لٹکنے سے پہلے گایا تھا۔

یوں تو سرفروشی کی تمنا ہمیشہ ہی سے بھگت سنگھ کے دل میں موجود تھی لیکن ۲۳۔ مارچ ۱۹۳۱ء کی شام کو سات بج کر ۳۳ منٹ پر اس تمنا کی تکمیل لاہور سنٹرل جیل میں ہوئی اور بازوئے قاتل نے اپنا زور دکھایا۔ تین شہیدوں کی نعشوں کو جیل کی پچھلی دیوار توڑ کے ایک فوجی ٹرک میں بوریوں میں بند کرکے دریائے ستلج کے کنارے حسینی والا کے مقام پر پُل کے نیچے مٹی کے تیل سے جلادیا گیا۔ آدھ جلی نعشوں کو دریا میں پھینک کر پولیس کے افسر واپس لاہور چلے گئے۔ کیوں کہ صبح ہونے سے پہلے انھیں واپس پہنچنا تھا لیکن رات کے اندھیرے اور سناٹے نے بھی بھگت سنگھ کے ساتھ ہی دم دے دیا۔ گاؤں کے لوگوں نے فضا میں جب شعلے اور انگارے دیکھے تو جوق در جوق دریا کے کنارے پر جمع ہونا شروع ہوگئے۔ یہ خبر لاہور اور فیروز پور میں بجلی کی طرح پھیل گئی آدھ جلی لاشوں کو دریا سے نکالا گیا اور انھیں رسم و رواج اور عزت کے ساتھ آگ کے سپرد کیا گیا انقلاب زندہ باد اور بھگت سنگھ، راج گرو سکھ دیو زندہ باد کے نعروں کی گونجوں سے آسمان کانپ اٹھا۔ لیکن دیوتاؤں نے پھول برسائے۔ دریائے ستلج کا کنارہ ہندوستان اور پاکستان کی سرحد پر آج ایک تیرتھ ہے جہاں ہر راہ گیر اور مسافر سر تسلیم خم کرکے گذرتا ہے۔ بھگت سنگھ ایک فرد نہیں تھے بلکہ ایک تحریک تھے شمع آزادی۔ انقلاب کا امام کہا جاتا ہے بھگت سنگھ کا نام لیتے ہی بزدل، بزدل نہیں رہتا

۳۔ مارچ ۱۹۳۱ء کو لاہور سنٹرل جیل سے بھگت سنگھ نے اپنے چھوٹے بھائی کلتار سنگھ کو ایک چٹھی لکھی

عزیز کلتار۔

آج تمہاری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر بہت رنج ہوا۔ آج تمہاری بات میں بہت درد تھا۔ تمہارے آنسو مجھ سے برداشت نہیں ہوتے۔ برخوردار ہمت سے تعلیم حاصل کرتے جانا اور صحت کا خیال رکھنا'

رکھنا۔ اور کیا لکھوں چند شعر لکھے ہیں مزید کیا لکھوں۔
سُنو ؎

اُسے یہ فکر ہے ہر دم نیا طرزِ جفا کیا ہے
ہمیں یہ شوق دیکھیں اب ستم کی انتہا کیا ہے
کوئی دم کا مہمان ہوں اہلِ محفل
چراغِ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں
میری ہوا میں رہے گی خیال کی بجلی
یہ مشتِ خاک ہے فانی رہے رہے نہ رہے

اچھا اجازت۔ خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں حوصلے سے رہنا۔ نمستے۔ تمہارا بھائی بھگت سنگھ

ایک اور خط میں بھگت سنگھ نے کلتار سنگھ کو چند بڑے دردناک شعر لکھے تھے جن کا مطلب مندرجہ ذیل تھا۔

صبح کی کرنوں کو کون روک سکتا ہے۔ اگر تمام دنیا بھی ہماری دشمن ہو جائے تو کوئی طاقت بھی ہمیں نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ میری زندگی کے دن ختم ہو چکے ہیں۔ میں ایک شمع کی طرح صبح کی روشنی کی گود میں ختم ہو رہا ہوں۔ ہمارے ارادے اور خیالات بجلی کی کڑک کی طرح دنیا کو روشن کریں گے۔ اس حالت میں یہ مٹھی بھر مٹی برباد بھی ہو جائے تو ہمیں ڈر کیا بات ہے۔

عین پھانسی کے روز یعنی مارچ ۲۳، ۱۹۳۱ء بھگت سنگھ کے جیل سے بھاگنے کی بات بھی جیل میں اٹھی تھی اور اس کے بارے میں ان سے پوچھا گیا جواب میں انھوں نے لکھا تھا۔

جینے کی تمنا تو قدرتی طور پر سب میں ہوتی ہے اور وہ تمنا مجھ میں بھی ہونی چاہیے۔ میں اُسے چھپانا نہیں چاہتا۔ مگر میں قید ہو کر یا کسی پابندی کے تحت زندہ نہیں رہنا چاہتا۔ میرا نام ہندوستانی انقلاب میں ایک نشان بن چکا ہے انقلاب پارٹی کے اصولوں اور قربانیوں نے مجھے بہت اونچا کر دیا ہے۔ زندہ رہنے کی حالت میں، میں اس سے زیادہ اونچا نہیں جا سکتا۔ میرے ہنستے ہنستے پھانسی پر چڑھ جانے سے ہندوستانی مائیں اپنے بچوں کو بھگت سنگھ بننے کو کہا کریں گی۔ ملک پر قربان ہونے والوں کی تعداد اتنی بڑھ جائے گی کہ شاید انقلاب کے اس سیلاب کو روکنا ناممکن ہو جائے گا اور ان کی شیطانی توپوں کے بس کی بات نہ رہے۔

پھانسی سے بچنے کی میرے دل میں کوئی تمنا نہیں ہے مجھ سے زیادہ خوش نصیب کون ہوگا۔ مجھے آج کل اپنے آپ پر بہت ناز ہے اور میں اپنے آخری لمحوں کا بڑی بے تابی کے ساتھ انتظار کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ میرا آخری وقت اور قریب ہو جائے گا۔

درج ذیل گانا وہ اکثر گایا کرتا تھا۔ یہی گانا اُس نے عدالتوں میں گایا اور بسنتی چولا پہن کر پھانسی پر لٹک گیا۔

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے
وقت آنے پر بتا دیں گے تجھے اے آسماں
ہم ابھی سے کیا بتائیں کیا ہمارے دل میں ہے
اے شہیدِ ملک و ملت میں ترے اوپر نثار
اب تیری ہمت کا چرچا غیر کی محفل میں ہے

میر معظم حسین

حیدرآبادی تہذیب

مجھ سے خواہش کی گئی ہے کہ ہماری حیدرآبادی تہذیب کے متعلق کچھ کہوں۔ اس جلسہ میں میرے بہت سے دوست اور صاحب علم و فن موجود ہیں جن کی معلومات اس موضوع پر مجھ سے زیادہ ہیں اور وہ اس پر بہتر روشنی ڈال سکتے ہیں۔ لیکن محترم دوست ہاشم علی اختر صاحب اور میرے بزرگ نواب اکبر علی خاں کی بات ٹال نہیں سکتا۔ نواب صاحب خود ہمارے حیدرآبادی تہذیب کی اعلیٰ ترین مثال اور نمونہ ہیں۔

مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ تہذیب اور تمدن میں قریبی تعلق ہے بلکہ تہذیب تمدن کا ایک جز ہے اور ہماری حیدرآبادی تہذیب ہندوستان کے قدیم تمدن سے وابستہ ہے۔

تہذیب کو کسی عمارت کی طرح تیزی سے تعمیر نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی مثال ایک درخت سے دی جا سکتی ہے۔ زمین محنت سے تیار کرنی پڑتی ہے۔ بیج بویا جاتا ہے۔ پودا اُگتا ہے تو انتہائی حفاظت کرنی پڑتی ہے تاکہ وہ اپنے شباب و کمال کو پہنچے اور پھول اور پھل سے اس قطعہ زمین کو فیض پہنچائے۔ اور اگر ہم تہذیب کا ترجمہ کلچر کریں تو یہ لفظ خود CULTIVATE سے اخذ کیا گیا ہے جو اس کا ROOT WORK تصور ہوتا ہے۔ یہ تہذیب چمن بندی ہے۔ تہذیب کا تعلق اس معاشرہ کا INTELLUCTUL اور اخلاقی ماحول علوم و فنون مذہب و رسوم اور انسانیت سے ہے یہ سب اور بہت سی اور اہم چیزیں اس میں ہیں جو میراث کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ یہ میراث ایک بیش بہا خزانہ ہے جس کی قوت اور خصوصیت پشت در پشت اور ایک دور سے دوسرے دور تک چلی آتی ہے۔ اور جب تک قوم میں کمزوریاں خصوصاً اخلاقی کمزوریاں پیدا ہو جائیں اس تہذیب میں جان اور زندگی جولان کرتی رہتی ہے اس کو TRADITION اور HERITAGE بھی کہتے ہیں۔ ہماری بول چال، اٹھنا بیٹھنا، رسم و رواج یہ سب ہماری تہذیب میں شریک ہیں لیکن تہذیب کی جز اور بنیاد اخلاق اور انسانیت ہے۔

میرا یہ مطلب نہیں کہ حیدرآباد کی تہذیب دوسروں سے بہتر یا بالا ہے۔ کسی قسم کی برتری یا SUPER-IOTY مقصود نہیں۔ لیکن جیسے انگریزی میں کہتے ہیں DISTINCTION WITHOUT A DIFFERNCE یہ امتیاز اور خصوصیت حیدرآباد کو ضرور حاصل ہے

چوں کہ تہذیب کا قریبی تعلق تاریخ سے ہے۔ HIS-
TORICAL DEVLOPMENT کے سلسلہ میں اس موقع
پر اگر میں چند مثالیں حیدرآباد کی تہذیب کی پیش کروں
تو بے جا نہ ہوگا۔ سچ ہے: میراثِ پدر خواہی علم پدر آموز
ہماری تہذیب کی حرفوں میں تصویر کھینچنی مشکل ہے
اور اس پر میں اُس رنگ کے الفاظ کہاں سے لاؤں
ہمارے بزرگ جو حیدرآباد کی تہذیب کے روحِ رواں
تھے اُن کی جیتی جاگتی بولتی چالتی تصویر کھینچ دکھاؤں
۔یہی لوگ جنھوں نے حیدرآباد کو تہذیب کا گہوارہ بنایا۔
آزاد کے الفاظ میں ادب کی آنکھ ان کی متانت پر
نظر نہیں اُٹھا سکتی اور محبت کی آنکھ اُن کی پیاری
حالت سے نگاہیں نہیں ہٹا سکتیں۔ یہ وہ جلسہ ہے
جو شاہانِ سلف علماء، اُمرا و شرفا سے آراستہ ہے
معقول معقول بڈھے اور جوان اس محفل میں نیم جامہ
یا جامہ وار شروانیاں اور جامہ زیب کپڑے پہنے
دستار پگڑی باندھے بیٹھے ہیں کوئی کٹاری لگائے
ہے کوئی سیف کہن سال ہیں کہ جن کے بڑھاپے کو
سفید داڑھی نے نورانی کیا ہے اور اس پر خوش
مزاجی حال پوچھئے ہی نہیں۔ ایک طرف قطب شاہیوں
کے شاندار کارنامے اور مشہور بادشاہ اور صاحبِ کمال
نظر آتے ہیں تو دوسری سمت نظام الملک آصف جاہ
اوّل نے اپنا وطن بنایا۔ اور یہاں کے نامور بادشاہ اور
وہ اُمرا اور وفادار گروہ جو ان کے ساتھ دلّی سے
یہاں آکر حیدرآباد کو اپنا وطن بنایا اور یہاں کے
مقامی لوگوں کے ساتھ مل کر شیر و شکر ہو گئے۔ محبت
اور یگانگت اور یک جہتی کی بنیادیں ڈالیں اور ہر

عہد میں یہ مستحکم ہوتی گئیں۔ ہماری تہذیب ان ہی بزرگوں
کی عملی زندگی اور تاریخ کی دین ہے۔ اور اس میں
امیر غریب سب شریک ہیں دیکھیے اس تاریخی جلسہ
میں کس شان سے محمد قلی قطب شاہ اور بھاگ متی جلوہ گر نظر
آتے ہیں۔ ذرا دوسری طرف نظر ڈالیے ملک دکن اور
دلوں کے بادشاہ نواب محبوب علی خاں جلوہ افروز ہیں
داغ اور سروجنی نائیڈو کی شاعری سے مسرور ہو رہے
ہیں اور خود اپنے کلام اور عمل کے محبت، اور اتحاد و اتفاق
اور انسانیت کی بے نظیر مثال پیش کر رہے ہیں۔ اور
آگے دیکھیے سالار جنگ اولیٰ نظر آئیں گے جن کے
سر جدید حیدرآباد کا سہرا ہے اور جن کے پوتے سالار جنگ
سوم کے نوادرات کا جو میوزیم ہمارے شہر میں قائم ہے
عالمی شہرت پا چکا ہے۔ اب جس سمت نظر اٹھائیں گے
اس جلسہ میں اُمرا۔ روشن خیال عہدہ دار، والیان
سمستان اور حیدرآباد کے مشہور ہندو مسلمان گھرانوں
کے نمائندے دکھائی دیں گے جنہوں نے اپنے علم
اور سیاست اور وفاداری اور وضع داری سے
سے ہماری تہذیب کو مالامال کر دیا ان میں آپ مہاراجہ
کشن پرشاد کو دیکھیں گے جن پر حیدرآباد کو ناز ہے۔
اب اس بات میں سب کو اتفاق ہے کہ اردو کی تعلیم
موجودہ نے دکن میں ظہور کیا چناں چہ میر تقی میر نے بھی ایک
غزل میں اشارہ کیا ہے ؎

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے
معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

ولی کے ساتھ ہم نظم طباطبائی، مولوی عبدالحق، سروجنی
نائیڈو، سید حسین بلگرامی عزیز جنگ، ولا، نظامت جنگ،

اکٹر زور، جلیل، مخدوم اور وجد، شاذ تمکنت، کنول
رشاد کنول کو دیکھتے ہیں اور ذاکر حسین صاحب بھی تو
مارے ہی تھے۔ جناب صدر! میں نے تو صرف چند
ام لیے ہیں ورنہ ہمارے علماء ادیب و شعرا اور
ن داں کی فہرست سے ایک مکمل کتاب بن سکتی ہے۔
ن ہی کے اظہار خیال، اعلیٰ قابلیت اور اخلاص ملکر
دب کا جادو جگاتے ہیں۔ ان ہی بزرگوں کی زندگی اور
و علم کا ذخیرہ وہ چھوڑ گئے ہیں ہماری تہذیب کی میراث
ہے اور ہمارے CULTURE کی عکاسی کرتی ہے۔

آصف جاہ سابع کے عہد میں دوسری ترقیوں کے علاوہ
جامعہ عثمانیہ کی تعمیر اور اس یونیورسٹی میں اردو کا نظام
تعلیم ایک شان دار اور تاریخی کارنامہ ہے۔ آرٹس
ائج کو دیکھیے فنی لحاظ سے یہ عمارت اسلامی اور ہندوی
طرز تعمیر کا حسین امتزاج ہے۔

یہ تاریخی قلعہ گولکنڈہ اور اس کی دیواریں
در کھنڈر ہم سے بہت کچھ کہہ رہی ہیں اگر ہم سنیں۔
س وقت روح اللہ خاں شہنشاہ عالمگیر کا فوجی کمانڈر
ماہ کے زاید محاصرہ کے بعد قلعہ میں داخل ہوا تو
عبدالرزاق لاری جو قطب شاہیوں کے آخری بادشاہ
ابوالحسن کے جنرل تھے دس یا بارہ سپاہیوں کے
ساتھ مغل فوجوں کے ہجوم کا مقابلہ کیا ستر سے زیادہ زخم
لگے اور ایسی دلیری اور وفاداری کا ثبوت دیا جس کی
قدر اورنگ زیب نے بھی کی اور اپنے خاص اطبا سے
ان کا علاج کروایا۔ اسی طرح ابوالحسن نے بھی شاہانہ
دلیری متانت اور بردباری سے کام لیا۔ اس حادثہ میں
بھی آپ ہماری تہذیب کی جھلک پائیں گے جو شکست
کے خطرناک موقع پر اخلاق و انسانیت کو ہاتھ سے نہ جانے
دیا۔ ایوان دربار میں جب مغل افسر داخل ہوئے تو ابوالحسن نے
انھیں اپنے ساتھ دسترخوان پر بیٹھ کر کھانے کی دعوت دی۔
ان میں سے بہت سے جو بادشاہ کو گرفتار کرنے آئے تھے
بادشاہ کے اعلیٰ اخلاق سے شرمندہ ہوئے۔ پھر بادشاہ
نے اسی بردباری سے اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر شہزادہ عالم
اور عالمگیر سے ملاقات کی۔ آپ کو یاد ہوگا گزشتہ سال اسی
یوم محمد قلی قطب شاہ کے موقع پر نواب اکبر علی خاں نے اپنی
تقریر میں ایک واقعہ کی طرف توجہ دلائی تھی۔ کسی تنگ نظر
شخص نے محبوب علی بادشاہ سے جا کر کہا کہ آپ کے باورچی خانے
پر ہندو مہتمم کا رکھنا مناسب نہیں۔ انھوں نے حکم دیا کہ مہتمم
صاحب برقرار رہیں گے کیوں کہ سرکار کو ان پر پورا اعتماد ہے
اور وہ شخص جس نے تفرقہ اور شبہ اور فساد پھیلانے کی
کوشش کی تھی دربار سے نکال دیا گیا۔ یہ وہ بادشاہ تھے
جو ہندوؤں اور مسلمانوں کو اپنی دو آنکھیں تصور کرتے تھے۔

قطب شاہوں اور آصف جاہی حکم رانوں نے مل کر
کم و بیش چھ سو سال دکن پر حکومت کی اور یہاں کی تاریخ کی بڑی
خصوصیت یہ ہے کہ یہاں ایک ملی جلی گنگا جمنی تہذیب نے
جنم لیا جس کی ساخت میں یہاں کی آبادی کے مختلف عناصر
برابر شریک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں ہر زمانے میں
مختلف طبقوں میں اتحاد و ارتباط نظر آتا ہے کچھ عرصہ
قبل تک باہر سے آنے والے کو پتا نہیں چلتا تھا کہ کون ہندو
ہے اور کون مسلمان۔ لوگوں کی صورت اور معاشرت میں
بڑی حد تک یکسانیت پائی جاتی تھی۔ مجھے اپنے بچپن کا ایک
واقعہ یاد آتا ہے۔ ہم ارم منزل میں رہتے تھے۔ میرے چچا
نواب شاہ نواز جنگ بیمار تھے۔ ان کو دیکھنے ان کے عزیز

دوست راجہ نارائن پرشاد جو مہاراجہ کشن پرشاد کے قریبی رشتہ دار تھے تشریف لائے مجھ سے کہا گیا کہ ان کو موٹر سے اُتار کر اوپر لے آؤں۔ سیڑھیوں پر راجہ صاحب کا پیر پھسلا اور ان کی زبان سے بے ساختہ Spontaneously یا علی نکلا۔ اور پھر انھوں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ ۶۰ سال گزر گئے لیکن اب بھی میں اس واقعہ سے متاثر ہوں۔ حال ہی میں ہمارے ملک میں ہولی منائی گئی۔ جب ہم ارم منزل میں رہتے تھے محل کا بڑا حوض رنگ سے بھر دیا جاتا تھا اور فخر الملک کا خاندان اس تہوار کو اپنا سمجھ کر منایا کرتا تھا جاگیری سپاہی جو ارم منزل پر پہرہ دیتے تھے ان کے افسر سکھ تھے اسی طرح پانی اور بجلی کا انتظام سکھ ملازمین کے ہاتھ تھا اور اسی طرح حیدرآباد کے دوسرے گھروں میں بھی ہولی، دیوالی دسہرہ اور عیدین مسلم اور ہندو مل کر منایا کرتے تھے۔

محرم میں بی بی کے علم کو مہاراجہ کشن پرشاد ڈھٹی باندھا کرتے تھے اور عید کے موقع پر ہم سے ایسے ہی ملتے تھے جیسے دوسرے بزرگان خاندان ہم سے ملا کرتے تھے۔

جناب صدر۔ میں نے حیدرآباد کی تہذیب کے متعلق جو چند باتیں کہی ہیں یہ شاید اب ایک یاد ہو کر رہ گئیں ہیں ہماری تہذیب ڈاکٹر یوسف حسین کے الفاظ میں صدیوں کے تاریخی عمل کا نتیجہ ہے اور اس کی پرورش اور نشو نما اہل دکن کے دیرینہ رہن سہن میل جول سے وابستہ ہے۔ حیدرآباد کی تہذیب اور شہریت اور یہاں کی آب و ہوا کی اپنوں اور پرایوں سب نے تعریف کی ہے فرشتہ جو محمد قلی قطب شاہ کا ہمعصر تھا حیدرآباد کے متعلق لکھا ہے کہ یہ شہر ہندوستان میں بے مثل ہے۔ اسی طرح فرانسیسی سیاحوں میں TARENIER نے یہاں کے لوگوں کی سلیقہ مندی کو سراہا ہے خواص خاں کہتا ہے کہ اگر حسینانِ دکن کی ملاحت کا ذکر تفصیل سے کروں تو ان کی خوبیاں بیان کرنا میری دسترس سے باہر ہے یہ دکن یہ ہمارا شہر سب کو اپنا گرویدہ بنالیتا ہے۔ زمانے نے بہت سے ہیلٹے کھائے۔ حالات بدل گئے لیکن یہ تہذیب بہت کچھ کمزور ہونے کے باوجود باقی ہے اور باقی رہے گی جس طرح یہ ہمارا شہر باقی رہے گا اور انشاءاللہ پھر رشک جہاں بنے گا۔ یہ ہماری زمین ہے جس سے ہماری بہترین روایتیں صدیوں سے وابستہ ہیں اسی سے ہماری بزرگ ہستیوں نے جنم پکڑا اور آپ ہم سب اسی کے سپوت ہیں ؎

تیری اک مُشت خاک کے بدلے ؛ لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے
(یوم محمد قلی قطب شاہ کے افتتاحی اجلاس منعقدہ گولکنڈہ پر پڑھا گیا)

حسن الدین احمد

نواب میر محبوب علی خاں کے دور کے چند ادیب اور شاعر

نواب میر محبوب علی خاں آصفجاہ سادس کے بیالیس سالہ دور (۱۸۶۹ء تا ۱۹۱۱ء) کو سوا دو سو سالہ آصفیہ دورِ حکومت (۱۷۲۴ء - ۱۹۴۸ء) میں ویسے ہی امتیاز حاصل ہے جیسے کہ خلافتِ عباسیہ کے دورِ حکومت میں خلیفہ ہارون رشید کے دور کو۔ اس دور میں عوام کو امن و امان اور ذہنی سکون ملا اور متوسط [illegible] کو مالی خوش حالی اور فارغ البالی میسر آئی۔ [illegible] دور میں زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جس میں حیدرآباد نے غیر معمولی ترقی نہ کی ہو۔

مادری زبان میں ذریعہ تعلیم والی جامعہ کے قیام کا خیال اسی دور میں پیدا ہوا۔ شیخ احمد حسین رفعت یار جنگ اول مددگار معتمد مالگزاری نے ۱۸۰۵ء میں بہی خواہانِ ملک کے نام اپیل شائع کی جس میں مروجہ تعلیم کی خامیاں دکھا کر ایک جامع العلوم کے قیام کی تحریک کی گئی تھی۔ انھوں نے انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنانے کے متعلق یہ رائے دی کہ اگر انگریزی زبان کی تعلیم ضروری خیال کی جائے تو اس کا انتظام کیا جائے ورنہ ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے انگریزی زبان کا استعمال باعثِ تضیعِ اوقات ہے۔

اس کے سلسلہ [illegible] کے قیام کے تخیل میں سید جمال الدین افغانی کا بھی دخل معلوم ہوتا ہے۔ جمال الدین افغانی ستمبر ۱۸۷۹ء میں حیدرآباد آئے تھے۔ ۱۳ ستمبر ۱۸۸۳ء کو بلنٹ کی ملاقات سید جمال الدین افغانی سے پیرس میں ہوئی بلنٹ حیدرآباد آئے اور پھر کلکتہ گئے اور ۲ جنوری ۱۸۸۴ء کو انجمن اسلامیہ کلکتہ کی میٹنگ میں اسلامی یونیورسٹی کی تجویز پیش کی۔ جب بلنٹ دوسری مرتبہ حیدرآباد آئے تو ۲۲ اپریل ۱۸۸۵ء کو باغِ عامہ میں بڑا جلسہ ہوا، جس کی [illegible] عثمان علی خاں نے کی جن کی عمر اس وقت اٹھارہ سال تھی۔ نواب میر لائق علی خاں سالار جنگ ثانی بھی شریک تھے۔ اس جلسہ میں نظام یونیورسٹی قائم کرنے کی تجویز منظور ہوئی۔ یونیورسٹی کے قیام کی تحریک بھی اسی دور میں شروع ہوئی۔

دارالعلوم کے فارغ التحصیل طلبا جن میں محمد مرتضیٰ پیش پیش تھے اس تحریک کو فروغ دیا۔ محمد مرتضیٰ نے خیال انگیز مضامین لکھے ۱۹۰۳ء میں ایک کتاب روحِ ترقی لکھی اور

نظام قائم کرنے اور اردو زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دینے کی تجویز پیش کی و نیز مغربی زبانوں سے علوم و فنون کی کتابوں کے ترجمہ کے لیے دارالترجمہ قائم کرنے کی تحریک کی۔ مولوی نصیرالدین ہاشمی کے والد محمد عبدالقادر نے مخبر دکن میں ایک سلسلۂ مضامین بعنوان اصلاح تعلیمات حیدرآباد شروع کیا۔

حیدرآباد کی تعلیمی ترقی میں سروجنی نائیڈو کے والد کا بھی حصہ تھا۔ خود سروجنی نائیڈو کو اعلیٰ حضرت نواب میر محبوب علی خاں نے نواب سرورالملک کی سفارش پر اعلیٰ تعلیم کے لیے سرکاری صرفہ پر انگلستان بھیجا تھا۔

اس دور نے اعلیٰ معیار کے شاعر اور ادیب خاصی تعداد میں پیدا کیے۔ ان سب کا ذکر کرنا ممکن نہیں۔ جلیل مانکپوری، داغ دہلوی، فیض، وطن مہاراجہ کشن پرشاد، ضامن کنتوری، ترکی، محمد حسین آزاد حیدرآبادی اور بیسیوں شاعر اور ادیب ہیں جن میں سے بعض کے تعلق سے اہلِ اردو زیادہ جانتے ہیں اور اکثر کے تعلق سے کم جانتے ہیں۔ آج کی صحبت میں صرف چند نمائندہ شخصیتوں کے ذکر پر اکتفا کیا جائے گا۔

۱۔ ڈپٹی نذیر احمد ۱۸۷۷ء میں جب کہ ان کی عمر چھیالیس سال تھی حیدرآباد آئے۔ اس آمد [illegible] علمی شان بھی تھی اور سرکاری اعزاز کی آن بان بھی۔ [illegible] ایہ کہ انگریز حکمرانوں کا ایک طبقہ ہندوستانی زبانوں [illegible] مغربی علوم کو منتقل کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا [illegible] کوشش کی جا رہی تھی کہ ایسی کاوشوں کے لیے ترغیبی [illegible] مات بھی دیے جائیں۔ علم ہیئت کی ایک کتاب

کے اردو ترجمہ کے لیے ایک ہزار روپے کا اعلان کیا گیا۔ گیارہ ترجمے مقابلہ کے لیے آئے جن میں ڈپٹی نذیر احمد کا ترجمہ انعام کا مستحق قرار پایا۔ یہ ترجمہ تنقید و نظر ثانی کی غرض سے ریذیڈنٹ حیدرآباد کی وساطت سے سر سالار جنگ اور امیر کبیر محمد رفیع الدین خاں شمس الامراء ثانی کے پاس بھیجا گیا۔ جن کو علمی ذوق اپنے والد نواب فخرالدین خاں سے ورثہ میں ملا تھا۔ [سنگی چھاپہ خانہ یعنی لیتھو طباعت کی ابتداء جرمنی میں ہوئی تھی اور ۱۷۹۸ء م ۱۲۱۴ھ کے لگ بھگ یہ طریقہ ہندوستان میں رائج ہو گیا۔]

شمس الامراء کے سنگی چھاپہ خانہ کا شمار لیتھو طباعت کے اولین مطبعوں میں کیا جا سکتا ہے۔ مغربی علوم کی کتابوں کے ترجمے کرنے کی اولین منظم کوشش نواب فخرالدین خاں ہی نے کی تھی۔ دہلی کالج اور سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کی تحریکیں اس کے بعد کی ہیں۔

امیر کبیر اور سالار جنگ ہر دو نذیر احمد کی ذہانت و قابلیت سے بہت متاثر ہوئے۔ سالار جنگ ہمیشہ قابل اور لائق افراد کی تلاش میں رہتے تھے۔ چناں چہ انھوں نے سرسید کے ذریعہ نذیر احمد کی خدمات کو حیدرآباد کے لیے حاصل کرنے کی تحریک کی۔ اس وقت نذیر احمد اعظم گڑھ میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ اس طرح ان کی علمی قابلیت ہی ان کے حیدرآباد آنے کے لیے ذریعہ بنی۔

ڈپٹی نذیر احمد مدبر اور مصلحت بین تھے۔

انگریز سرکار میں ان کو اعلیٰ مقام حاصل تھا۔ ایک ایسی دیسی ریاست میں جس کا حکمران مسلمان ہو ان کو طلب کیا گیا تھا۔ نذیر احمد کی احتیاط پسندی کا تقاضہ تھا کہ وہ اس اعتماد کو متاثر نہ ہونے دیں جو انگریز سرکار نے ان پر کیا تھا۔ انھوں نے خود کا تعارف غرض مند کی حیثیت سے نہیں کروایا بلکہ ایک عالم با اعزاز شخص کی حیثیت سے۔ چناں چہ جب ان کو سرکاری خدمت کا پیش کش آیا تو اولاً یہ کہہ کر حیدرآباد آنے سے انکار کر دیا کہ میں ایک مضبوط حکومت کو چھوڑ کر ایک کمزور حکومت میں نہیں آتا۔ جب ادھر سے اصرار ہوا تو تنخواہ زیادہ طلب کی۔

شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد اپنی دینی اور ادبی خدمات کی وجہ سے ایک منفرد اور ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ سرکاری ملازمت کے ساتھ ساتھ انھوں نے اصلاحی ناولوں کے ذریعہ جو بیش بہا خدمات انجام دیں وہ اپنی آپ نظیر ہیں۔ تعزیرات ہند ضابطہ فوجداری و قانون شہادت کے اردو ترجمے ایسے شہ کار ہیں جن پر زبان اردو ہی نہیں فنِ ترجمہ بھی ناز کر سکتا ہے۔ ان کی وضع کردہ اصطلاحیں قانونی ادب کا جز بن چکی ہیں۔ ان کے ترجمے میں بیشتر قانونی اصطلاحات ایسی ہیں جن کو نہ صرف حرفِ آخر قرار دیا جا سکتا ہے بلکہ اصلی انگریزی اصطلاحات پر فوقیت دی جا سکتی ہے۔ ٹرانسپورٹیشن فار لائف Transportation for Life کے ترجمہ حبسِ دوام، بہ عبور دریائے شور اور ٹریس پاس Trespass کے ترجمہ مداخلت بیجا کا شمار ایسی ہی اصطلاحات میں ہے۔ پھر قرآن شریف کے بامحاورہ ترجمہ کو لیجیے جو دلی کی ٹکسالی زبان میں ہے یہ کہنا مشکل ہے کہ اس میں ادبیت زیادہ ہے یا مذہبیت۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ واحد ترجمہ ہے جس میں آپ کو دونوں چیزیں ملیں گی۔

۲۔ مولانا ظفر علی خاں ۱۸۷۱ء میں بہ مقام کوٹ میرٹھ (پنجاب) پیدا ہوئے۔ ان کے والد بڑے زمیندار تھے۔ ابتدائی تعلیم وزیرآباد اور پٹیالہ میں حاصل کی پھر علی گڑھ سے بی اے کر کے بمبئی گئے جہاں محسن الملک کے ساتھ معتمد خصوصی کی حیثیت سے ایک سال تک کام کیا۔ ۱۸۹۶ء کے اواخر میں مولانا شبلی بمبئی گئے تو ان سے حیدرآباد کے حالات سُنے اور ان کے مشورہ سے حیدرآباد گئے عزیز مرزا کی وساطت سے ہوم آفس میں مترجم ہو گئے ترقی کرتے کرتے بعض لیجسلیٹیو کونسل کے رجسٹرار قرار پائے داغ حیدرآباد میں تھے شاعری میں ان سے اصلاح لیتے رہے۔ ظفر علی خاں ایک کامیاب ادیب تھے شعر گوئی ابتدائی سن تمیز سے شروع کی شاعری میں مذہبی اور سیاسی عنصر غالب تھا۔ قلیل سے قلیل وقت میں کئی کئی سو شعر کہہ جاتے تھے۔

حبسیات۔ بہارستان۔ نگارستان اور چمنستان کلام کے مجموعے ہیں۔ سنہری گھونگا اور میری عینک انگریزی کے دو مختصر افسانوں کے ترجمے ہیں۔ معرکہ مذہب و سائنس انگریزی کی مشہور تصنیف

کا ترجمہ ہے۔

انگریزی سے منظوم ترجمے بھی کئے۔ سروجنی نائیڈو کی انگریزی نظم کا ترجمہ تاجدارِ دکن کے عنوان سے کیا۔ دوسرے منظوم ترجمے مدی کا راگ، دھوپ اور چاندنی۔ فراق روح و تن لائقِ ذکر ہیں۔ حیدرآباد کے قیام کے دوران ایک سیاسی نظم "ڈاکر نامہ" لکھی جو اردو ادب میں منفرد مقام رکھتی ہے۔ ظفر علی خاں حیدرآباد بڑی توقعات کے ساتھ حیدرآباد آئے تھے اور دل سے یہاں کی حکومت کو دیکھنے کے متمنی تھے جو بہت کچھ کرسکنے کی صلاحیت رکھتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر رہی تھی حیدرآباد کے اندرونی معاملات میں انگریزوں کا دخل بہت زیادہ ہو گیا تھا۔ کیسن واکر نے جو وزیر مالیہ تھے یہاں کی حکومت میں مضبوط مقام پیدا کرکے انگریز درآمد پالیسی کی پُرزور تائید شروع کی جس سے عہدہ داروں کے وقار کو ٹھیس لگ رہی تھی۔ . .
ظفر علی خاں کو جب یہاں کے حالات کچھ اور ہی نظر آئے تو انھوں نے مایوس ہو کر افرادِ حکومت کے خلاف اپنی شاعری کا حربہ استعمال کیا اور اُس وقت کے اربابِ اقتدار کا تمسخر کیا جو کیسن واکر کے مقابلہ میں کمزوری کا ثبوت دے رہے تھے۔ اس سے زیادہ اس بے چین طبیعت اور بے باک شاعر کر ہی کیا سکتا تھا۔ جب اپنے شدید احساسات کو خدایانِ مملکت تک نہ پہنچایا جاسکا تو شاعر نے ان کو عوام کی بارگاہ میں پیش کر دیا اور سندِ قبولیت حاصل کی۔

ڈاکر نامہ ۱۹۰۹ء میں لکھی گئی۔ اس پُرخلوص اور وفادارانہ کاوش کے صلہ میں ظفر علی خاں کو ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑا اور شہر بدری سہنا پڑا۔ جس کو انھوں نے قبول کیا لیکن جو کہنا تھا وہ کہہ گزرے اور اپنے تاثرات کو دوام بخشا اور اردو ادب کا سرا اونچا رکھا۔

ڈاکر نامہ کا شمار جوش ملیح آبادی کی انقلابی نظم "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب" یا سرور ڈنڈا کی مشہور مزاحیہ نظم "سنجیا ریڈی ماما" کے ساتھ کیا جاسکتا ہے۔ اول الذکر نظم میں تلخی ہے اور موخر الذکر نظم میں مزاح ہے جب کہ ڈاکر نامہ میں بھرپور طنز ہے۔

۳۔ مولانا عبدالحلیم شرر۔ ۱۸۶۰ء میں بمقام لکھنو پیدا ہوے۔ ابتدائی تعلیم عربی فارسی میں ہوئی۔ حدیث کا شوق غالب ہوا تو دہلی گئے اور محمد نذیر حسین محدث دہلوی کے مدرسہ میں رہ کر تعلیم حاصل کی۔ اسی زمانہ میں انگریزی سیکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ انیس سال کی عمر میں کلکتہ سے تعلق ترک کرکے لکھنو کی سکونت اختیار کی۔ صحافت سے طبعاً دلچسپی تھی۔ اخبار اودھ سے تعلق پیدا ہوا ۱۸۸۰ء میں اسی اخبار کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں شامل ہوے۔ خاص رنگ کے مضامین اس زور سے لکھنا شروع کیا کہ ملک بھر میں شہرت ہو گئی۔ ۱۸۸۲ء میں ہفتہ وار رسالہ محشر شائع کیا۔ اٹھارہ انیس نمبروں میں مسلسل صبح کا سماں دکھایا۔ قافیہ بندی اور رعایتِ لفظی کا ایک نیا اسلوب نکالا۔ تشبیہات و استعارات فارسی کے موزوں تھے مگر بندش انگریزی کی تھی۔

۱۸۸۲ء میں پہلی مرتبہ حیدرآباد آئے۔ چھ
یہ قیام کیا۔ ۱۸۸۷ء میں رسالہ دل گداز جاری
ا۔ اس میں ناول نویسی کا سلسلہ شروع کیا گیا۔
۱۸۹ء میں رسالہ مہذب جاری کیا۔ جس میں علمائے
سلف کی سوانح عمریاں قسط وار درج ہوتی تھیں۔
۱۸۹ء میں دل گداز اور مہذب بند کر کے حیدرآباد
پہنچے۔ اور دو سو روپے ماہوار پر سرکاری ملازمت
ول کی۔ ۱۸۹۵ء میں وقار الامراء نے اپنے فرزند
لی الدولہ کی مذہبی تعلیم کے لیے جو اس وقت ایم کالج
ں تعلیم پا رہے تھے انگلستان بھیجا اس دوران
نگریزی قابلیت بڑھائی اور فرانسیسی بھی سیکھی
۱۸۹ء کے اواخر میں حیدرآباد واپس ہوئے
ر تعلیمات میں مددگار ناظم مقرر ہوئے۔ بعض
انسیسی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا۔
۱۸۹۸ء میں حیدرآباد سے رسالہ دلگداز
دوبارہ جاری کیا۔ جناب سکینہؓ کی لائف کے سلسلہ
ں ردعمل ہوا تو گیارہ ماہ بعد ہی رسالہ بند کر دیا
ر لکھنو چلے گئے۔

۱۹۰۱ میں دوبارہ حیدرآباد طلب کیا گیا۔
۱۹۰ء میں لکھنو واپس ہو کر دلگداز پھر سے جاری کیا۔
بتیس سال کی عمر سے آخر دم تک لکھتے رہے۔
چھیالیس سال کے عرصے میں کبھی ان کے قلم کی سیاہی
خشک نہ ہوئی۔ بقول فراق گورکھپوری عمر بھر چین لیا
نہ چین دیا۔ ان کے پسندیدہ عنوانات مذہب، تاریخ
روایات اور اصلاحیں تھے۔ بقول ڈاکٹر زور مضامین
کے بعض شہ پارے ادب عالی کہے جا سکتے ہیں۔

۴۔ مہدی علی خاں اٹاوہ کے ایک معزز
خاندان سادات سے تھے۔ ۹ر دسمبر ۱۸۳۷ء کو
بمقام اٹاوہ پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم خانگی مکتب
میں ہوئی۔ ختم تعلیم کے بعد اٹاوہ کی کلکٹری میں دس
روپیہ ماہوار کی محرری پر تقرر ہوا۔ رفتہ رفتہ تحصیلدار
پھر ڈپٹی کلکٹری پر ترقی ہوئی۔ ۱۸۷۴ء میں
جب کہ ان کی عمر سینتیس سال تھی سر سید احمد خاں
کی سفارش پر سر سالار جنگ نے حیدرآباد میں سرکاری
ملازمت کی پیش کش کی۔ ابتداءً صدر محاسبی کی تنظیم
کا کام تفویض ہوا۔ ریاست کا بجٹ مرتب کیا جو مصر
کے بجٹ کے نمونہ پر تھا۔ پھر معتمدی مال پہ تقرر ہوا۔
سروے اور بندوبست کے کام کو انجام دلوایا محکمہ
بندوبست ان ہی کا قائم کیا ہوا ہے۔ انتظام مالگزاری
کے لیے اصول اور مبادیات قائم کئے۔ یہ کہا جائے تو
غلط نہ ہوگا کہ ریاست حیدرآباد کا نظم مالگزاری
جیسا کہ ۱۹۴۸ء تک تھا ان ہی کی وضع کردہ بنیادوں
پر قائم رہا۔ قحط کمشنر مقرر ہوئے۔ قحط کے متعلق
مبسوط رپورٹ مرتب کی۔ ۱۸۸۴ء میں فینانشیل
اور پولیٹیکل سکریٹری کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ ان
کی جگہ چراغ علی معتمد مالگزاری بنائے گئے۔ اسی
زمانہ میں محسن الملک کا خطاب ملا۔
حیدرآباد میں ان ہی کی کوششوں سے ۱۸۸۴ء
میں بجائے فارسی کے اردو کو سرکاری زبان قرار دیا
گیا۔ برطانوی ہند میں ۱۸۳۵ء میں فارسی کو ہٹا کر
اردو کو ثانوی سرکاری زبان کا درجہ دے دیا گیا تھا۔
مطالعہ کا بیحد شوق تھا۔ حیدرآباد قیام

کے دوران ہی علمی ذوق کی تکمیل کا سامان بہم پہنچایا۔
انگریزی سے نابلد تھے۔ لیکن انگریزی کتابیں پڑھوا
کر سنتے اور خاص کتابوں کا ترجمہ کروا تے۔ ان کے
مضامین میں انگریزی خیالات کی ترجمانی صاف نظر
آتی ہے۔ انھوں نے فکر کی پوری آزادی کے
ساتھ مضامین لکھے۔ ان کے مضامین ان کی وسیع
علمیت۔ روشنی طبع۔ استدلال پسندی اور سلجھے
ہوئے ذہن کے آئینہ دار ہیں عبارت بڑی شگفتہ
تھی۔ ان کی تحریر میں ادبیت کی شان پائی جاتی ہے
روانی فصاحت تسلسل بیان اور اثر پذیری ان کی
نمایاں خصوصیات ہیں۔ معرکہ کے خطیب تھے۔ ان کی
عام پر زور بیان اور عزم وہمت سے مرقع ہوا کرتی
تھیں۔ خوش بیانی بے مثالی تھی جو مخالف رجحان
رکھنے والوں کو بھی متاثر کرتی تھی۔ بڑے سے بڑے
مجمع کو قابو میں رکھنے کی صلاحیت موجود تھی۔ تقریر
میں عموماً ظرافت کی چاشنی ہوا کرتی تھی۔

۵۔ عماد الملک سید حسین بلگرامی کا شمار
حیدرآباد کی ایسی شخصیتوں میں کیا جا سکتا ہے جن کی بلند
پایہ علمی خدمات اور تعلیمی کارناموں پر سارا ہندوستان
ناز کرسکتا ہے۔ تعلیمی میدان کا کوئی گوشہ ایسا نہ
تھا جس میں انھوں نے اپنا کردار ادا نہ کیا ہو اور
اپنا لوہا نہ منوایا ہو۔

عماد الملک کا خاندان اودھ میں معزز رہا
ہے۔ ۱۶۔ اکتوبر ۱۸۴۴ء کو ضلع گیا کے قصبہ صاحب گنج
میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی پھر کلکتہ
اور ڈھاکہ میں عربی زبان میں نصاب نظامیہ کی تکمیل

کی۔ ۱۸۵۶ء میں انگریزی تعلیم شروع کی۔ ۱۸۵۹ء
میں فرانسیسی درس گاہ لامارٹی نیر میں شریک ہوئے۔
گریجویشن [illegible] لکھنو کے کیننگ کالج میں عربی
کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ سر سالار جنگ ۱۸۷۳ء
[illegible] گئے اور [illegible] دیتے ہوئے واپس ہوئے۔
[illegible] بلگرامی سے ملاقات ہوئی۔ سالار جنگ
نے حیدرآباد میں ملازمت کی پیش کش کی۔ حیدرآباد
میں مابین مہ کارین انگریزی مراسلت ان کے تفویض
تھی۔ ۱۸۷۶ء میں سر سالار جنگ نے یورپ کا سفر
کیا تو یہ بھی ساتھ تھے۔ سالار جنگ کے انتقال کے
بعد کونسل آف اسٹیٹ قائم ہوئی تو عماد الملک
اس کے معتمد کی حیثیت سے نو سال تک کارگزار
رہے کچھ عرصہ معتمد پیشی حضور نظام بھی رہے معتمد
امور متفرقات اور پھر ناظم تعلیمات ہوئے۔ تینتیس سال
تک اس خدمت پر رہے۔ دو سال تک انڈیا کونسل
کے رکن رہے۔ انگلستان کی آب و ہوا موافق نہ
ہونے سے مستعفی ہوئے۔ سر رشتہ تعلیمات کی
ضرورتوں کا لحاظ کرتے ہوئے مختلف علوم پر کارآمد
کتابیں موزوں ذی علم حضرات سے لکھوائیں۔ اس کے
علاوہ ان کی ایما سے بلند پایہ کتابیں لکھی گئیں۔
ان کا ایک بڑا کارنامہ دائرۃ المعارف کا قیام ہے۔
علوم اسلامیہ کی نادر و نایاب مخطوطات کی طباعت
و اشاعت کے لیے عماد الملک اور ملا عبد القیوم
نے مل کر ۱۸۸۸ء میں اس ادارہ کی بنیاد ڈالی۔
یہ ادارہ اس وقت تک قائم ہے بابائے اردو
مولوی عبدالحق نے ۱۹۵۹ء میں چند ہم عصر

میں یہ فرمایا کہ عماد الملک کی ایک بے نظیر علمی یادگار ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی جو درست نہیں ہے۔ نواب صاحب نے کتب خانہ آصفیہ کی بنیاد ڈالی۔ سید علی حیدر طباطبائی ایم اے کے پہلے مہتمم مقرر ہوئے۔ ۱۹۱۲ء میں انجمن ترقی اردو کا کام بابائے اردو مولوی عبدالحق کے تفویض ہوا تو انھوں نے صدارت کے لیے نواب عماد الملک کا نام پیش کیا جس کو مجلس انتظامی نے بالاتفاق منظور کیا۔

۶۔ عزیز جنگ ولا

۲۸/ ڈسمبر ۱۸۶۱ کو بہ مقام نلور پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق جنوبی ہند کے معزز اور ممتاز خاندان سے تھا۔ جو ۷۰۰ ہجری میں بصرہ سے کونکن آیا۔ اور نوائط کے نام سے مشہور ہوا۔ پرتگالیوں سے قبل سمندر پر اہل ہند کا تسلط اسی خاندان کی وساطت سے تھا اور بقول سلیمان ندوی انگریزی لفظ نیوی اسی خاندان کے نام سے ماخوذ ہے۔

حضرت ولا اپنے چچا کے ساتھ حیدرآباد آئے چودہ سال کی عمر میں سلک ملازمت میں داخل ہوئے تیس روپیہ ماہوار کی اہلکاری سے ترقی کرتے ہوئے بحیثیت کلکٹر وظیفہ حسن خدمت پر علحدہ ہوئے۔

علمی ذوق ولا کی فطرت میں ودیعت کیا گیا تھا۔ گوناگوں سرکاری مصروفیات کے باوجود اپنی زندگی کو منظم کیا اور اوقات کی اس انداز سے پابندی کی کہ فنون مختلفہ پر قابل قدر تحقیقی کتابیں بطور یادگار چھوڑیں۔ یہ مختصر مضمون ان بے شمار اور عظیم الشان علمی کارناموں کے بیان کا متحمل نہیں ہوسکتا اور نہ ان کا احاطہ کیا جاسکتا ہے۔ نہایت اختصار کے ساتھ صرف چند کا ذکر کیا جاتا ہے۔

"آصف اللغات" مبسوط فارسی اور اردو لغت ہے۔ یہ حضرت ولا کا ایسا کارنامہ ہے کہ اگر ان کے اور کارناموں کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو یہی لغت ان کے نام کو زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ یہ لغت سترہ جلدوں پر مشتمل ہے۔ سترہ جلدوں میں صرف "ج" تک کا احاطہ ہوا ہے۔ اسی سے اس کام کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔

"ولائے حافظ" حضرت ولا کی عمر کے آخری دنوں کا کلام ہے۔ ولا نے حافظ شیرازی کی ہر غزل پر دو دو اور تین تین غزلیں کہی ہیں۔ اپنی زندگی میں وہ ردیف "م" تک پہنچ سکے۔

"مجموعہ قوانین مال گزاری" پانچ جلدوں اور انڈکس پر مشتمل ہے اس میں مال گزاری کے جملہ قوانین و گشتیات و احکام اور سررشتہ آبکاری جنگلات۔ کروڑگیری۔ عطیات وغیرہ کے منظورہ احکام مع تشریحات درج ہیں۔

ترکاری کی کاشت (۱۹۰۱ء) کھجور کی کاشت (۱۹۰۴ء) اور انگور کی کاشت (۱۹۰۶ء) کبوتروں کے اقسام اور ان کی نگہداشت، غذا، بیماری علاج ان کے طبی قواعد سے متعلق مفید اور دلچسپ معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اردو میں یہ اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے۔

"اعظم العطیات" (۱۸۸۹ء) میں عطا، نقدی، معاش، جاگیرات و انعامات اور محکمۂ مال سے متعلق دیگر اصلاحات کی تشریح کی گئی ہے۔ راقم الحروف اور ضیاالدین احمد شکیب کی مشترکہ کوشش سے اس کتاب کے ایسے حصّوں کو حذف کرکے جو فی الحال غیر ضروری ہیں جدید ایڈیشن مرتب کیا گیا ہے اور یہ کتاب جامع العطیات کے نام سے ولا اکیڈمی نے شائع کی ہے۔

"تاریخ النوائط" (۱۹۰۴ء) خاندان نائط کی تاریخ ان کے رسوم و رواج معاشرت و مشاہیر خاندان کا تذکرہ ہے۔

۷۔ سید جلال الدین توفیق

لال بہادر شاستری پرائم منسٹر کی حیثیت سے پہلی مرتبہ حیدرآباد آئے تو انھوں نے ایرپورٹ پر یہ شعر پڑھا ؎

رہے سلامت جو خاکساری کبھی تو اپنی ہوا بندھے گی
کبھی تو اٹھیں گے گرد بن کر کبھی تو اونچا غبار ہوگا

۱۹۶۴ء کے حیدرآبادیوں میں بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ یہ شعر حیدرآباد کے ایک قابل فخر شاعر کا تھا جس شاعر کا جادو جمہوریہ ہند کے وزیر اعظم کے سر چڑھ کر بول رہا تھا وہ اس بات کا بہمہ وجوہ مستحق تھا کہ ۱۹۶۴ء میں اس کی سو سالہ سالگرہ منائی جاتی۔ اہل اردو کو تو یہ سعادت حاصل نہ ہوسکی لیکن شاستری جی نے یہ بات ظاہر کر دی کہ انھیں اُردو ادب سے کتنا گہرا لگاؤ ہے اور ساتھ ہی اپنی شخصیت اور انداز فکر کو بھی اُجاگر کر دیا۔

غزل جس کا یہ ایک شعر ہے توفیق نے ۱۹۰۷ء سے قبل لکھی تھی اقبال نے اسی غزل سے متاثر ہو کر مارچ ۱۹۰۷ء میں غزل لکھی جس کا مطلع ہے ؎

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدار یار ہوگا
سکوت ہے پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا

توفیق کی ایک غزل کا مطلع ہے ؎

سکوں آمیز ہے تانی ہے فرقت میں فغاں میری
ٹھہرتا ہے جو دل پہلو میں چلتی ہے زباں میری

اقبال نے اسی زمین میں ایک غزل لکھی جس کا مطلع ہے

نہیں منت کش تاب شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری

توفیق کی مشہور غزل کا مطلع ہے ؎

کبھی پردہ در ہوں میں راز کا کبھی ہوں میں پردۂ راز میں
کہ حقیقت اک مری مشترک ہے حقیقت اور مجاز میں

اقبال نے اس غزل سے متاثر ہو کر ایک غزل لکھی جس کا مطلع

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

اگر پروفیسر عبدالقادر سروری کا کہنا درست ہے تو اقبال کی یہ غزل توفیق کی بلندی کو نہیں پہنچ سکتی۔ توفیق اور اقبال ہم عصر تھے۔ تقریباً ربع صدی تک یعنی ۱۸۹۶ء سے جب کہ اقبال کی شاعری کی ابتدا ہوئی ۱۹۲۱ء تک جب کہ توفیق کا انتقال ہوا۔ دونوں نے مل کر شاعری کی ایک دور افتادہ خلوت پسند شاعر سے اقبال کا متاثر ہونا اہمیت کی بات ہے۔

۸۔ پروفیسر عبدالغفور شہباز (پیدائش ۱۸۵۸ء) نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سید طالب

سے حاصل کی۔ انگریزی پڑھنے کے لیے سکول میں داخل ہوئے۔ سید محمد جو مظفرپور میں رجسٹرار تھے اور ان کے بھائی شہباز کے سرپرست بن گئے۔ کلکتہ کے ایک اخبار دارالسلطنت سے منسلک ہوئے۔ جریدہ نمائش کے نام سے ایک اخبار بھی جاری کیا۔ کلکتہ قیام کے دوران جمال الدین افغانی سے جن کو انگریزوں نے مصر کی بغاوت فرو ہونے تک جلاوطن کر کے حیدرآباد پھر کلکتہ میں رکھا گیا تھا استفادہ کیا۔ افغانی کے علمی مضامین مقالات جمالیہ شائع کیے۔

شہباز بیک وقت انگریزی۔ اردو۔ بنگلہ فارسی اور عربی پر دستگاہ رکھتے تھے۔ انگریزی ادب سے لگاؤ تھا۔

شہباز نے ایک عرصہ تک اورنگ آباد کالج میں بحیثیت لکچرار خدمت انجام دی۔

شہباز نثر نگار ہونے کے علاوہ شاعر بھی تھے۔ انگریزی کی بعض مشہور و معروف نظموں کو اردو کا جامہ پہنایا۔ لانگفیلو کی نظم "دی سام آف لائف" کا ترجمہ "زمزمہ زندگی" کے عنوان سے کیا۔ سرے کی نظم کا ترجمہ آبِ رواں کے عنوان سے کیا۔ لے ہنٹ کی نظم ابو بن ادھم کا ترجمہ ابراہیم بن ادھم کے عنوان سے کیا۔ گولڈ سمتھ کی نظم دی ہرمٹ کا ترجمہ جوگی کے عنوان سے کیا۔ جوگی اردو شاعری میں ایک منفرد نظم ہے جس میں عربی اور فارسی الفاظ قطعاً استعمال نہیں کیے گئے۔ نہ تو ہی اس کی زبان سنسکرت آمیز بھی نہیں ہے۔ نظم کے لیے نہایت سادہ اور عام فہم ہندی بھاشا کا استعمال کیا گیا ہے۔ عام طور پر اس طرز کی پیروی

اگر نہیں کی جا سکی تو اس کی ایک ہی وجہ تھی کہ یہ کام مشکل تھا لیکن اگر اردو کو آسان بنانا ضروری ہے اور اگر اردو و ہندی کو ایک دوسرے سے قریب لانا مفید ہے تو اس قسم کے تجربے کرنا ناگزیر رہے گا۔

بقیہ "دکھنی ادب اور تہذیبی اقدار" صفحہ ۳۱ سے آگے

گلسری، چنگری اور مکری وغیرہ جیسے زیورات میں کیا ہے۔ اسی طرح محمد قلی قطب شاہ نے اپنے مرثیوں میں ہندوستانی پھولوں ترکاریوں اور پرندوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

دکھنی ادب میں ہندوستانیت کا یہ واضح حصہ اس دور کی اس ضرورت کی طرف اشارہ کرتا ہے جو سماجی اور سیاسی دونوں میدانوں میں شدید تھی۔ دکھنی ادب میں ہندوستانی ماحول دکھن کے حکمرانوں اور امرا کی کشادہ دلی مذہبی رواداری اور ان کی عوام دوستی کی طرف اشارہ کرتا ہے اور یہی دکھن کے ادب کو اسی دور کے دوسرے ادب سے ممتاز کرتا ہے۔

اپنے مختصر سے مضمون کو میں یہ کہتے ہوئے منزل اختتام تک لانا چاہتا ہوں کہ جو ادب ہمارا ورثہ ہے اس کا ہر جز ہمارا اپنا ہے۔ زبان، ماحول، تہذیبی پس منظر، احساسات، روایات، جذبات، زیورات، لباس وغیرہ۔ ادب کے جو جواہر پارے ہمارا ورثہ بنے ہیں ان کی اہمیت یوں بھی ہے کہ ان کے محرکات انسان دوستی رواداری اور کشادہ ذہنی سے عبارت ہیں جو اس دور کے سماجی اور تمدنی اقدار کے صحیح نقوش ہم تک پہنچاتے ہیں۔

صادق نقوی

دکھنی ادب اور تہذیبی اقدار

تہذیب و تمدن ادب اور تاریخ دو ایسی اصطلاحیں ہیں جن کی توضیح و تشریح زماں و مکاں کے حدود میں محصور ہوتی ہے۔ جغرافیائی حالات، سیاسی ضروریات، سماجی احساسات اور معاشی تصورات اس کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اس لیے کسی دور میں کسی مملکت کے رہنے بسنے والوں کی تہذیب و تمدن پر تنقید و تبصرہ محال نہیں تو مشکل ضرور ہوتا ہے۔

تہذیب صاف لفظوں میں آئین زندگی سے عبارت ہے۔ یہ انسان اور سماج کے درمیان طے پائے ہوئے چند اصول ہوتے ہیں جنہیں سمجھایا نہیں جاتا لیکن یہ سمجھے جاتے ہیں۔ چوں کہ تہذیب کے تقاضے فکر سے مربوط ہوتے ہیں اس لیے ان میں قیام نہیں پایا جاتا۔ یہ زمانے کے ساتھ بدلتے اور نظریات کے ساتھ تغیر پذیر ہوتے رہتے ہیں اسی لیے کسی دور کے تہذیبی اقدار کا عرفان اس دور کے ذہن کو سمجھنے کے بعد ہی حاصل ہوتا ہے۔ یہ تاریخ کی ایک حقیقت ہے کہ ہر دور میں دنیا کے ہر خطہ پر تہذیبی اقدار کی بنیادیں سماج کے ایک خاص طبقہ کا منصب ہوتی ہیں۔ یہ طبقہ اُمرا، مذہبی رہنماؤں، فوجی عہدیداروں یا سماج کے باعزت افراد میں سے کسی کا بھی ہو سکتا ہے۔ عوام کا کام سوچنا نہیں ہوتا عمل کرنا ہوتا ہے۔ وہ اسی راستے پر چلتے ہیں جن پر ان کو چلایا جاتا ہے۔ چلنے کی رفتار اور رخت سفر میں فرق ہوتا ہے لیکن راستے میں نہیں۔

اٹھارویں صدی سے قبل کی تاریخ میں تہذیبی اقدار کا دارومدار جس طبقے پر تھا وہ اشراف کہلاتا تھا۔ اُمرا کا یہ طبقہ، بادشاہ، بادشاہ کے رشتہ دار، جاگیردار اور مذہبی رہنماؤں پر مشتمل تھا۔ اسی طبقے کے ذہن کی عکاسی اس دور کی تہذیب کہلاتی تھی۔ لیکن جو بات اس دور کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے وہ اس طبقے کی دو جماعتوں کے درمیان ہونے والی ذہنی جنگ ہے۔ ہندوستان کی قدیم تاریخ برہمنوں اور راجپوتوں کے درمیان شدید اور مسلسل کشمکش کا افسانہ ہے جو مختلف ادوار میں مختلف صورتوں سے سامنے آیا۔ سولھویں صدی کے پہلے دہے میں جب شمالی ہندوستان پر مسلم حکمرانوں کی مملکت کی بنیادیں پڑیں تو یہ کشمکش علما اور اُمرا کے درمیان شروع ہوئی لیکن اس کشمکش کے حدود دربار کی چار دیواری تک محدود رہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں اسی دور سے ایک نیا موڑ آیا

ہندوستان کی سرحدوں میں در آنے والے مسلمان اس بات سے واقف تھے کہ باہر سے آنے والی ہر قوم کو ہندوستان نے یوں اپنایا تھا کہ دو ایک نسلوں کے گزرتے ہی وہ ہندوستانی سماج کا جز بن گئی تھیں۔ اُن کی تہذیب تمدن حتیٰ کہ مذہب بھی ہندوستانی ہو گیا تھا۔ آنے والے مسلمانوں کا ہندوستانی سماج سے فرار اسی خوف کا نتیجہ تھا۔ اُن کا غرور اور احساس برتری ان میں اور ہندوستانیوں میں ایک خطِ فاصل بن گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دو ایک بادشاہوں کے مختصر سے دور کو چھوڑ کر اکبر اعظم کے دورِ حکومت تک ہندوستانیوں کو مسلم حکمرانوں سے نہ کوئی دلچسپی تھی نہ ان کی وفاداریاں ان سے وابستہ رہیں۔ تخت پر ہونے والی تبدیلیوں سے انھیں کوئی واسطہ نہ رہا۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہوئی کہ ہندوستان میں بسنے والے ان دونوں مذاہب کے درمیان وہ مقامات تلاش کریں جہاں اتحاد ممکن ہو سکے۔ ہندوؤں میں بھگتی تحریک اور مسلمانوں میں صوفی تحریک کا آغاز یوں تو پہلے ہی ہو چکا تھا لیکن اس دور میں اس میں شدت پیدا ہوئی۔ تاریخی پس منظر کے اس مختصر سے جائزے کے بعد اگر آپ اُس دور کے ادب کا جائزہ لیں گے تو آپ کو یہ تبدیلیاں ادب میں واضح طور پر دکھائی دیں گی۔ تاریخ کے مقابل ادب کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ واقعہ سے زیادہ اُس واقعہ سے ذہنوں پر مرتب ہونے والے اثرات کا احاطہ کرتا ہے۔ اس لیے جہاں تاریخ واقعات بیان کر کے خاموش ہو جاتی ہے وہاں ادب واقعات سے انسانی ذہنوں پر مرتب ہونے والے اثرات کا عکس بناتا ہے بلکہ یوں بھی ہے کہ تاریخ اکثر مقامات پر مجبور ملتی ہے مثلاً سماج کے دو گروہوں کے درمیان جو ذہنی کشمکش ہوتی ہے وہ تاریخ کے احاطے میں نہیں آتی لیکن ادب اس کی عکاسی کرتا ہے اس لیے کسی بھی دور کے تہذیبی اور تمدنی ارتقا کو سمجھنے کے لیے اس دور کے ادب کا مطالعہ ضروری ہے۔ مضمون کو طوالت سے بچانے اور اپنے کو آج کے عنوان سے مربوط کرنے کے لیے میں تاریخ کے اس مختصر جائزہ کے پس منظر میں دکنی ادب سے دو اقتباسات پیش کرنا چاہتا ہوں۔

ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنی کتاب اردو مثنوی شمالی ہند میں کے صفحہ ۱۱۸ پر یوں لکھا ہے " اردو کا دکنی عہد مثنوی کا دور ہے غزل کا نہیں۔ قلی قطب شاہ اور ولی کے علاوہ دکن کے تمام مشاہیر شعرا مثنوی کے شاعر تھے۔ دکنی کا یہ پہلا شاعر نظامی ہے جس نے ۸۶۵ھ اور ۸۶۶ھ کے درمیان مثنوی کدم راؤ پدم راؤ لکھی۔ دکھن میں اردو کی ابتدا درویشوں کے سایۂ برکت میں ہوئی اس لیے دکھنی مثنویاں معرفت سلوک اور مذہبی عقائد پر مشتمل ہیں ان میں اشرف کی "نوسرہار" فیروز کی پرت نامہ، شاہ میراں جی شمس العشاق اور ان کے فرزند شاہ برہان الدین جانم کی مختصر مثنویاں اور شیخ خوب محمد چشتی گجراتی کی طویل مثنوی خوب ترنگ شامل ہے"

ڈاکٹر صاحب کی عالمانہ رائے میرے اس اس خیال پر مہر ثبت کرتی ہے کہ چودھویں اور پندرھویں صدی کے ذہن کی عکاسی اُس دور کے ادب میں نمایاں ہے۔ اس دور میں لکھی جانے والی اکثر کتابوں کا کینوس

اسلام رہا ہے۔ لیکن اسلام کے کینوس پر جو خاکے
ابھارے گئے وہ اُن ذہنوں کے بنائے ہوئے تھے
جو اس دور کے سماج کی نمائندگی کرتے تھے یہ بات خاص
طور سے مثنوی کے لیے کہی جا سکتی ہے مولانا شبلی نے
شعر العجم کی جلد چہارم کے صفحہ (۲۴۷) پر اسی خیال کا
اظہار کیا ہے لکھتے ہیں " مثنوی کی ہمہ گیری اور رجائیت
کا گو ہا ہر نقاد نے مانا ہے کیوں کہ اس میں کوئی تاریخی
واقعہ یا افسانہ بیان کیا جاتا ہے اس بنا پر زندگی اور
معاشرت کے جتنے پہلو ہیں سب پر تبصرہ ہو جاتا ہے
اسی لیے مثنویوں کا مطالعہ اس دور کے ذہنی سفر
کی عکاسی کرتا ہے۔

دکھنی اردو میں واقعات کربلا پر لکھی گئی
پہلی مثنوی شاہ اشرف کی نوسرہار ہے جو ۹۰۹ھ میں
لکھی گئی۔ یہ الگ بحث ہے کہ نوسرہار مرثیے کی تعریف
میں آتی ہے یا نہیں ڈاکٹر زینت ساجدہ اسے یقیناً
مرثیہ مانتی ہیں اور شاہ اشرف کو پہلا مرثیہ نگار تسلیم
کرتی ہیں لیکن ڈاکٹر رشیدہ موسوی کے خیال میں شہادت
نامے اور مرثیے میں بڑا واضح فرق ہوتا ہے اس لیے
شہادت نامہ کو مرثیہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن نوسرہار
کا ہندوستانی لب و لہجہ، مستعمل محاوروں کا استعمال اور
تشبیہہ اور استعاروں کا ہندوستانی مزاج اشرف کی
مثنوی کی وہ خصوصیات ہیں جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔
شہزادی زینب علیہ السلام کا سراپا ملاحظہ ہو ؎

زینب ہے اس کا نام ؛ نین سلونے جوبن بادام
زہد صاحب حسن و جمال ؛ زیبا موزوں صورت حال
تھا جانوں سورج پاٹ ؛ یا کہ جانوں چاند الاٹ
دانت تیسی تیسی جان ؛ جیسے ہیر بینہ کیری کھان
مرگاں جیسے لمبے بال ؛ چندر سورج جیسے گال
چاند پیشانی دانت تھا ؛ سبزہ رنگ اور موزوں قد

گولکنڈہ کے تقریباً ہر شاعر نے مرثیہ کہا ہے۔
اگرچہ کہ یہ مرثیہ مختصر ہوتے تھے۔ ڈاکٹر چراغ علی کی
تحقیق کے مطابق قطب شاہی دور میں ۲۱ شعرا
نے مرثیے کہے ان مرثیوں کی خصوصیت یہ ہے کہ
ان میں واقعات کربلا کو ہندوستانی پس منظر میں بیان
کیا گیا ہے اور اس دور کے تمدن کی عکاسی کی گئی ہے۔
مثلاً حضرت قاسم ابن حسن شہزادی فاطمہ کبریٰ سے
عقد کا تذکرہ خالص ہندوستانی ہے اس میں جو
رسم و رواج دردی نے بیان کیے ہیں وہ عرب کی
سرزمین پر کبھی بھی رائج نہیں تھے۔

منڈپ کون لگے تھام نیز تھام ؛ ہوئی تیغ چھا کر سلامٌ علیک
بندیا بسس سہ اسو تسلیم کا ؛ شجاعت کنگن کر سلامٌ علیک
اتھا سیس پر رحمت کردگار ؛ سہاباد چھتر سلامٌ علیک
صبوری کا خوشبو لگایا بدن ؛ برانی برابر سلامٌ علیک

منڈپ، کنگن، چھتر وغیرہ ہندوستانی چیزیں ہیں جو
عرب میں رائج نہ تھیں مرثیے کا مطالعہ ہمیں اس دور
میں شادیوں کے اہتمام و انتظام سے متعارف کرواتا
ہے۔ یہی نہیں بلکہ بعض مرثیوں کا مطالعہ ہمیں اس
دور میں استعمال ہونے والے زیورات اور اسباب
آرائش کا پتہ دیتا ہے مثلاً وجہی کے مرثیے ؎

کالی گوری چھپر بندی بیٹھی ہے جوبن کالندری
کالے لشان کالے بھوان کالی گلے میں گلسری

میں وجہی نے نیلم، لال، زمرد، موتی، وغیرہ کا استعمال
(باقی صفحہ پر دیکھیے)

ڈاکٹر حبیب ضیا

عہدِ آصفی کی علمی و ادبی خدمات

آصف جاہ اوّل نے ۱۱۳۶ھ / ۱۷۲۴ء میں سلطنتِ آصفیہ کی بنیاد رکھی۔ انھیں علم و ادب کا ذوق ورثہ میں ملا تھا۔ فارسی اور عربی زبان پر عبور رکھتے تھے اور فارسی میں شعر بھی کہتے تھے۔ اس وقت اورنگ آباد کے بڑے شعرا میں داود، سراج اور عاجز اساتذۂ سخن مانے جاتے تھے۔ عاجز کی مثنوی لعل و گوہر بہت مشہور ہے۔ گولکنڈہ اور بیجاپور میں نثر نگاری کی جو تحریک شروع ہوئی تھی آصف جاہ اوّل کے دور میں بھی برابر جاری رہی۔ صوفیائے کرام اس دور میں بھی تصوف کے مختلف موضوعات پر رسالے لکھتے رہے۔

آصف جاہ اوّل کے جانشیں نواب ناصر جنگ عربی، فارسی، ترکی اور سنسکرت زبان سے واقف تھے۔ شعر و سخن سے دلچسپی رکھتے تھے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔

خانوادۂ آصفی کے تیسرے فرمارروا نواب صلابت جنگ کا عہد زیادہ تر معرکہ آرائیوں میں گزرا۔ اس لیے وہ علم و ادب کی طرف کوئی خصوصی توجہ نہ دے سکے تاہم چوں کہ اردو شعر و ادب کا مذاق عام ہو چکا تھا اس لیے درباری سرپرستی کے بغیر بھی اس دور میں ادبی اور شعری کارنامے سرانجام پاتے رہے۔ اس دور میں شعرائے اردو کے متعدد تذکرے لکھے گئے۔ جن میں لچھمی نارائن شفیق کا تذکرہ چمنستان شعرا بہت مشہور رہے۔

آصف جاہ ثانی اپنے بھائی نواب صلابت جنگ کے جانشیں ہوے۔ انھوں نے اورنگ آباد کے بجائے حیدرآباد کو پایہ تخت بنایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اورنگ آباد کے علماء اور شعرا سب حیدرآباد آگئے۔ آصف جاہ ثانی نے سلطنت کے انتظام کے ساتھ ساتھ اردو شعر و ادب سے بے حد دلچسپی کا اظہار کیا۔ اس دور کے مشہور شعرا میں عزلت اور تجلی کے نام قابل ذکر ہیں۔

نواب سکندر جاہ آصف جاہ ثالث نے بھی اردو شعر و ادب کی سرپرستی کی۔ ان کے عہد میں ارسطو جاہ کی طرح مہاراجہ چندو لال کا دربار بھی دکن اور شمالی ہند کے شعرا کا مسکن بن گیا تھا۔ اسی طرح شمس الامراء نے بھی اردو زبان میں مختلف علمی کتابوں کو منتقل کر کے اردو کی بے نظیر خدمت انجام دی۔

نواب ناصر الدولہ آصف جاہ رابع بھی اپنے

آبا و اجداد کی طرح اردو زبان شعر و ادب کی سرپرستی کرتے رہے۔ اس دور میں حیدرآباد آنے والے شعرا میں میر احمد علی شہید، میر رضا علی، ذوالفقار علی خاں صفا اور عیسی خاں آفاق قابلِ ذکر ہیں۔

نواب افضل الدولہ بہادر آصف جاہ خامس بھی علم و فن کی سرپرستی کرتے رہے مختلف مدارس جو ریاست میں پہلے سے قایم تھے ان کی امداد و اعانت کے علاوہ بلدہ حیدرآباد میں نئے سرکاری مدارس قائم کئے۔ ان کے زمانے میں اردو ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے مختلف مدارس میں رائج ہو گئی۔ سلطنت آصفیہ کے سلاطین و امرا کی اسی اردو نوازی کے اثر سے ریاست میں اردو تصنیف و تالیف کا ذوقِ عام ہو چلا تھا۔

نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس کی ادب نوازی کا شہرہ سن کر داغ حیدرآباد آئے تو انھوں نے داغ کو اپنی استادی کا شرف بخشا۔ اعلیٰ حضرت اور امرائے سلطنت کی فیاضیوں کا شہرہ سن کر ہندوستان کے گوشے گوشے سے متعدد شعرا حیدرآباد چلے آئے۔ ان میں نظم طباطبائی کا اثر تھا کہ اس دور کے چند امرا نے بھی اس فن میں کمال پیدا کیا۔ جیسے مہاراجہ کشن پرشاد اچھے شاعر ہی نہیں، شعرا کے سرپرست بھی تھے۔

حیدرآباد میں اردو کی مقبولیت اور قدردانی کا شہرت سن کر باکمال شعرا ہی نہیں بڑے بڑے نثر نگار بھی حیدرآباد چلے آئے۔ ان میں پنڈت رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر، مولوی چراغ علی، نذیر احمد، سید علی بلگرامی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ آصفجاہ سادس کے دور کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو کو ایک فرمان کے ذریعہ سرکاری زبان قرار دیا۔

سلطنتِ آصفیہ کے آخری فرمان روا نواب میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع کا دور اردو کی معراج کا زمانہ بھی ہے۔ نواب میر عثمان علی خاں اپنے والد کے استاد نواب فصاحت جنگ جلیل سے اپنے کلام پر اصلاح لیتے تھے۔ شاعری کے ساتھ ساتھ انھوں نے نثر نگاری سے بھی خصوصی دلچسپی لی۔ حکمرانِ وقت کی اردو نوازی کے اثر سے عمائدینِ سلطنت میں بھی شعر گوئی اور شاعروں اور ادیبوں کی سرپرستی کا رجحان عام ہو گیا۔ چناں چہ اس دور میں مہاراجہ سرکشن پرشاد، نواب معین الدولہ، نواب لطف الدولہ، نواب تراب یار جنگ، اور نواب عزیز یار جنگ نہ صرف قادر الکلام شاعر تھے بلکہ شاعروں اور ادیبوں کی سرپرستی بھی کرتے تھے۔

عہدِ عثمانی کا زرّیں کارنامہ جامعہ عثمانیہ کا قیام ہے۔ ۱۸۸۵ء میں نواب میر محبوب علی خاں نے یونیورسٹی کا منصوبہ تیار کیا تھا مگر یہ منصوبہ پورا نہ ہو سکا ۱۹۱۷ء میں اعلیٰ حضرت نے فرمان کے ذریعہ جامعہ عثمانیہ کے قیام کی منظوری دی۔ جامعہ عثمانیہ نے ذہن و ادراک کی آزادی کے ذریعہ جو انقلاب پیدا کیا تھا وہ حیدرآباد کے ہر شعبۂ زندگی پر اثر انداز ہوا۔ مادری زبان میں تحصیل علم کی سہولتیں حاصل ہونے کی وجہ سے تشنگانِ علم کے قافلے جامعہ سے تعلیم حاصل کر کے [illegible]

میں جذب ہونے لگے۔ ان کے دماغ علوم و فنون کی روشنی سے منور تھے اور ان میں علم و ادب کی خدمت کا جذبہ تھا۔

جامعہ کے قیام کے بعد اردو میں نصابی کتابوں کی فراہمی کے لیے ایک دارالترجمہ قایم کیا گیا۔ جس میں مختلف علوم و فنون پر بے شمار کتابوں کا ترجمہ کروایا گیا ترجمے کے سلسلے میں وضع اصطلاحات کا مسئلہ بڑا کٹھن تھا؛ اس دشواری پر قابو پانے کے لیے مستند علماء اس دارالترجمہ سے منسلک رہے۔ ظفر علی خاں، عبدالماجد دریابادی، جوش، وحیدالدین سلیم، مولوی عبدالحق جیسے مشہور ادیبوں کے علاوہ مختلف علوم کے سربرآوردہ ماہرین مختلف شعبوں میں کام کرتے رہے۔

نواب میر محبوب علی خاں کے دور میں بعض اہلِ علم و فن نے یہ محسوس کیا کہ عربی اور فارسی کا نادر اور قیمتی سرمایہ تلف ہو رہا ہے۔ چناں چہ انھوں نے اس کے تحفظ کی بہت کچھ کوشش کی۔ لیکن انھیں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ اس سلسلے میں نواب فضیلت جنگ نے ایک ادارے کی بنا ڈالی جس کا نام دائرۃ المعارف رکھا۔ اس ادارے کو چلانے کے لیے ابتداء میں علماء اور مشائخین نے مدد دی۔ بعد میں امرا کی سرپرستی میں یہ ادارہ چلتا رہا لیکن اسے ترقی کا موقع آصف جاہ سابع کے زمانے میں ملا۔ نواب فضیلت جنگ بہادر نے آصف جاہ سابع کو اس ادارہ سے واقف کرایا۔ تو انھوں نے پانچ لاکھ روپے عطا کیے اور اس کی تنظیم و توسیع کے احکام صادر فرمائے۔

ابتداً اس کا تعلق براہ راست جامعہ عثمانیہ سے نہ تھا جس کی وجہ سے جامعہ کا عمل دخل اس پر نہ تھا لیکن ڈاکٹر نظام الدین کی سفارش پر اس کا الحاق جامعہ سے کر دیا گیا اور اس کی اصلاح اور ترقی کے لیے ایک کمیشن مقرر ہوا جس نے اس ادارہ کو مضبوط اساس پر قایم کرنے اور اس کو ترقی دینے میں مدد دی اس طرح دائرۃ المعارف کی وجہ سے علمائے اکرام کے نوادرات تلف ہونے سے بچ گئے۔ یہ عہد عثمانی کا سب سے عظیم کارنامہ ہے۔

آصف جاہ سابع کے علمی و ادبی کارناموں میں کتب خانہ جامعہ عثمانیہ کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام سے پہلے دارالعلوم کا ایک بڑا کتب خانہ تھا جس میں عربی اور فارسی کتابوں کا نادر اور قیمتی ذخیرہ موجود تھا۔ بعد میں اعلیٰ تعلیم سے متعلق کتابوں کا ذخیرہ جامعہ عثمانیہ میں منتقل ہو گیا۔ اسی وقت سے کتب خانہ جامعہ عثمانیہ کے ابتدائی نقوش ظہور میں آئے۔ جامعہ عثمانیہ کے کتب خانے کا شمار ہندوستان کے بڑے اور معیاری کتب خانوں میں ہوتا ہے۔

مختصر یہ کہ آصف جاہ سابع کی اردو نوازی اور ان کی علمی و ادبی سرپرستی کا ایک سرسری جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اردو زبان کا روشن ترین دور اعلیٰ حضرت کی عہد حکومت تھا۔ اس دور میں اردو نے دکن میں وہ عروج پایا جو ہندوستان کے کسی حصے میں اور کسی دور میں اس کو نصیب نہیں ہوا

نجیب رامش

○

اب جو معمولات کی ٹھنڈک سے اکتائے کوئی
جسم در جسم ایک صحرا ہے، کہاں جائے کوئی

کب تک اپنے عکس سے سر اپنا ٹکرائے کوئی
گرد بن کر گھر کے آئینے پہ جم جائے کوئی

رات بھر اپنے لہو میں خود کو نہلائے کوئی
کیا کرے اس سے جو پھر بھی کچھ نہ کہہ پائے کوئی

جل رہا ہے مصلحت کی آگ میں پیاسا بدن
سامنے ہی موج کی مانند لہرائے کوئی

کوئی خط اس سے مشابہ، کوئی عادت اس کی دین
میرے اندر میرا کیا ہے؟ کاش بتلائے کوئی

زندگی ہے یہ کہ گونگے آدمی کا خواب ہے
کتنا کہنا چاہے، پھر بھی کچھ نہ کہہ پائے کوئی

●●

مضطر صہبائی

○

کیا تعجب ہے جو خود سر ہو گئے
ننھے پودے، ب تناور ہو گئے۔

ذہن کے آنگن پہ پتھروں کا ہجوم !!!
اپنے گھر میں خود ہی بے گھر ہو گئے

جس کو دیکھو اس کا سینہ داغ دار
لو گلستاں اب تو گھر گھر ہو گئے

ان کا ماضی ہے نہ مستقبل نہ حال
وہ کہ جو مسحور محور ہو گئے

سانس ہی لی تھی، کہا تو کچھ نہ تھا۔
کیوں یہ آئینے مکدر ہو گئے

دیکھئے حالات کی نیرنگیاں
کیسے نازک پھول پتھر ہو گئے

وہ جنھیں مضطر غمساں سے پیار تھا۔
فاتحِ لفظِ مقدر ہو گئے

●●

اردو نامہ

وقار خلیل

اردو کی علمی ادبی تہذیبی خبریں

۵/مارچ: شنکرجی میموریل سوسائٹی کے زیر اہتمام آٹھواں شنکرجی ہند مشاعرہ مسٹر پی، وینکٹ سُبّیا مرکزی مملکتی وزیر داخلہ کی صدارت میں آراستہ ہوا۔ جناب ملک شاہ صدرنشین ریاستی قانون ساز کونسل اور ریاستی وزیر داخلہ مسٹر بی بھاسکر راؤ نے مہمان خصوصی کی حیثیت میں شرکت کی۔ پاکستانی شاعر محترمہ فہمیدہ ریاض کے علاوہ پروفیسر نریش، بیکل اُتساہی، نور اندوری، ایاز جھانسوی، یکتا گپتا شبنم، راج کماری سورج کلا سرور اور میزبان شعرا و شاذ تمکنت، علی احمد جلیلی، امیر احمد خسرو، خواجہ شوق، کنول پرشاد کنول، صلاح الدین نیر، رئیس اختر، فاروق شکیل اور عزیز النساء صبا نے کلام سنایا۔ جناب ثقلین حیدر نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

۶/مارچ: ادارۂ قلم اور آواز کی طرف سے ایوانِ اردو میں آخری آصفی حکمراں حضور نظام میر عثمان علی خاں آصف سابع کے عہدِ حکومت میں ادب اور ثقافت کی گراں قدر خدمات کو خراج ادا کیا گیا۔ اس ادبی محفل کی صدارت کاظم نواز جنگ نے کی۔ ڈاکٹر میر اکبر علی خاں سابق گورنر یوپی، جناب سید ہاشم علی اختر وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی، ڈاکٹر مغنی تبسم، ڈاکٹر بھن سورتی، ڈاکٹر سید عبدالمنان، محترمہ نیرہ کاوس نے مخاطب کیا۔ سکریٹری قلم اور آواز محترمہ سیدہ طینیہ بیگم نے نظامت کی اور مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ محترمہ اختر محبوب اور جناب احمد جلیس نے بھی اپنا تعاون دیا۔ مشہور موسیقار کوشل کمار نے کلام آصفِ سابع سنا کر داد پائی۔

○ جناب معلم عبیدی کے مجموعۂ کلام پروازِ نظر کی رسمِ اجرا کا جلسہ اردو گھر میں بصدارت ڈاکٹر سلیم اطہر جاوید منعقد ہوا۔ جسٹس سردار علی خاں نے رسمِ اجرا انجام دی جب سید ہاشم علی اختر وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی مہمان خصوصی تھے۔ ڈاکٹر مغنی تبسم، ڈاکٹر صفدر علی بیگ، ڈاکٹر ابوالفضل محمود قادری، ڈاکٹر عقیل ہاشمی، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، ملک الشعرا اوج یعقوبی نے معلم کی شاعری پر اظہارِ خیال کیا اور پروازِ نظر کی اشاعت پر مبارکباد دی۔ علی احمد جلیلی، راز عابدی اور غلام جیلانی صادق نے تہنیتی نظمیں سنائیں۔ صلاح الدین نیر نے نظامت کے فرائض انجام دیے اور معلم علی (بی اے علیگ) نے شکریہ ادا کیا۔

○ اردو آرٹس کالج، اورینٹل کالج، ممتاز کالج اور ممتاز یارالدولہ وقف کی طرف سے اردو ہال میں جناب سید ہاشم علی اختر وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی کا جلسۂ تہنیت پروفیسر حبیب الرحمن کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر منان، غلام یزدانی، محمد ابراہیم انجینیر اور دیگر حضرات نے جناب اختر کی حرکیاتی شخصیت کو عثمانیہ یونیورسٹی کے مستقبل کے لیے فالِ نیک قرار دیا۔ اور اس تقرر انتخاب پر مبارکباد پیش کی۔

۷/مارچ: انجمن عوامی مصنفین اور اربابِ قلم کی طرف سے پاکستانی

شاعرہ محترمہ فہمیدہ ریاض کو استقبالیہ دیا
گیا۔ جناب احسن علی مرزا نے صدارت کی۔
جناب قادر جاوید نے پاکستانی شاعرہ
کا تعارف کرایا۔ فہمیدہ ریاض نے
اپنا منتخب کلام سناتے ہوئے اپنے
ادبی اور سیاسی نظریات کی وضاحت کی۔

۱۲ر مارچ: مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی
کے زیر اہتمام سہ روزہ سلطان العلوم
صدی تقاریب کا افتتاحی اجلاس
اردو ہال میں بصدارت جناب آصف
پاشاہ سابق ریاستی وزیر منعقد ہوا۔
پروفیسر جی رام ریڈی وائس چانسلر
اوپن یونیورسٹی نے آخری آصفجاہی
حکمراں حضور نظام نواب میر عثمان علی خاں
کے ۳۶ سالہ دور کو تاریخ، ادب اور
ثقافت کا اہم زمانہ قرار دیا۔ میر اکبر علی خاں
سابق گورنر یوپی اور نواب کاظم نواز جنگ
نے بھی مخاطب۔ جناب مظہر قادری معتمد
تقاریب نے نظامت کی۔

○ ۱۱ بجے ایک سمینار بعنوان "تعلیم
انتظامیہ اور تہذیب عہد آصفی میں" بصدارت
پروفیسر تقی خاں بہ اشتراک عثمانیہ یونیورسٹی
منعقد ہوا۔ مسز میر معظم حسین، ڈاکٹر مغنی تبسم
ڈاکٹر دھریندر پرشاد، ڈاکٹر شمیم علیم اور
اسد اللہ سعید (آئی اے ایس) نے حصہ
لیا۔ ڈاکٹر انور معظم نے نظامت کے
فرائض انجام دے۔

○ ۸ بجے شب سلطان العلوم صدی
تقاریب کا اجلاس عام پرانی حویلی
میں جناب اکبر علی خاں سابق گورنر
اڈیسہ کی صدارت میں ہوا۔ مسز
غوث خاموشی، محمود انصاری
ایڈیٹر منصف، جلال الدین حامی
کامل، محمود پاشاہ قادری تخت نشین
سلیمان سکندر نے عہد آصفی پر
اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ کنول پرشاد
کنول، رحمن جامی، حسن طبسی نیر
اور غلام دستگیر رشید انے نظمیں سنائیں۔
جناب مظہر الحق قادری نے نظامت کی۔

○ جناب قطب سرشار کے مجموعۂ
کلام " انفس و آفاق " کی رسم اجرا
کی خوش گوار تقریب تلگو سخن ور مسٹر
جی شیشندر شرما کی صدارت میں
منعقد ہوئی۔ ڈاکٹر مغنی تبسم ریڈر
شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی نے
رسم اجرا انجام دی۔ انگریزی کی شاعرہ
راج کماری اندرا دیوی صدر ریاستی
سندری اکیڈیمی، جناب محمود انصاری
ایڈیٹر منصف، ڈاکٹر یوسف کمال
جناب مضطر مجاز، ڈاکٹر حبیب ضیا
اور جناب رؤف خیر نے سرشار کی
شعری صلاحیتوں پر روشنی ڈالی۔
وقار خلیل نے نظامت کی اور جمیل شیدائی
نے شکریہ ادا کیا۔

○ مولوی سید صدیق علی قادری ایڈیٹر
ہفتہ وار علم و عمل فرزند مولوی میر اشرف علی
کا بعارضہ قلب انتقال ہوا۔ جناب
قادری وضعدار اور حیدرآبادی
روایات کا مجسمہ تھے اور پابندی سے
اپنا ہفت روزہ نکالتے رہے۔ خدا
مغفرت فرمائے۔

۱۳ر مارچ: ریاستی وزیر تعلیم
مسٹر آنند گجپتی راجو نے سلطان العلوم
صدی تقاریب کے موقع پر منعقدہ
سمینار کو مخاطب کرتے ہوئے مغل اور
آصفی حکمرانوں کے دور کو سیکولر روایات
کا سرچشمہ قرار دیا۔ آندھرا پردیش میں
اقلیتوں کے مسائل پر منعقدہ اس
سمینار کی صدارت پروفیسر جعفر نظام
نے کی ڈاکٹر رحیم الدین کمال، مسٹر
ایم اے احمد جنرل سکریٹری ریاستی مسلم
ایجوکیشنل سوسائٹی، ڈاکٹر عبد القادر
عمادی، یوسف اعظمی اور جناب
نظام الدین احمد نے حصہ لیا۔ پروفیسر
سید سراج الدین نے نظامت کے
فرائض انجام دیے۔

○ محفل خواتین کا ادبی اجلاس محترمہ
ناز عبدر کی صدارت میں منعقد ہوا۔

بانو طاہرہ سعید اور بیگم غیاث صدیقی نے نثری تخلیقات پیش کیں اور خواتین شعرا نے کلام سنایا۔

۱۷ مارچ: اترپردیش اردو اکیڈیمی کے کل ہند ادبی انعامات برائے سال ۸۵ء کے بموجب حیدرآباد کے مصنفوں محترمہ عفت موہانی کو ان کے ناول اور پرنسپل غیاث الدین کی کتاب نغمیات پر ایک ایک ہزار روپیے اور ہم شعرا سعید شہیدی، خورشید جنیدی، زور آغائی اور ڈنکر راؤ دیشمکھ کے شعری مجموعوں نیز اکرام جاوید کی کہانیوں کے مجموعہ نیصر سرمست اور ڈاکٹر یوسف کمال کی مطبوعات پر فی کس ۵ سو روپیے کے ادبی انعامات دیے گئے۔ ادارۂ سب رس تمام مصنفین کو اس ادبی اعزاز پر مبارکباد پیش کرتا ہے۔

○ جامعہ عثمانیہ کے شعبہ اسلامک اسٹڈیز کی طرف سے سہ روزہ سمینار جناب سید ہاشم علی اختر وائس چانسلر کی صدارت میں منعقد کیا گیا۔ افتتاحی خطبہ پرنس مفخم جاہ بہادر نے پڑھا اور مسلم ممالک سے ہندوستان کے بہترین تعلقات اور ہندوستانی تہذیب پر اسلامی افکار کے اثرات کو روشن کیا۔ سمینار کے دیگر شرکا میں مسرز پروفیسر رشید احمد خاں، پروفیسر دشال سنگھ، پروفیسر منظور عالم پروفیسر مشیر الحق، پروفیسر حسن عسکری کاظمی، شاہد علی عباسی، اصغر اشرف اور ڈاکٹر عقیل حیدر عابدی قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر انور معظم صدر شعبہ اسلامک اسٹیڈیز نے نظامت کی اور ڈاکٹر سلیمان صدیقی نے شکریہ ادا کیا۔

۱۹ مارچ: سلطان العلوم صدی تقاریب کے سلسلے میں ایک سمینار عہد عثمانی میں طب یونانی پر حکیم عبدالحمید دہلوی متولی ہمدرد وقف کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ریاستی وزیر تعلیم مسٹر رام منی ریڈی کے علاوہ حکیم عبدالرزاق، حکیم عبدالوہاب ظہوری، حکیم عزیز احمد مجددی، طبیبہ ام الفضل نے مخاطب کیا۔ ۹ بجے شب مشاعرہ یادِ سلطان الشعراء بہ مقام پرانی حویلی منعقد ہوا۔ جناب شاہ عالم خاں نے صدارت کی مسرز سعید شہیدی، امیر احمد خسرو، کنول پرشاد کنول، خیرات ندیم، نواب ہاشم جاہ، راشد آذر، مسعود صدیقی خواجہ شوق، صلاح الدین نیر، محمد منظور احمد، ناصر کرنولی، فیض الحسن خیال، صادق نقوی، رئیس اختر علی الدین نوید، رحمٰن جامی اور عزیز النساء صبا نے کلام سنایا۔ معتمدی کے فرائض صلاح الدین نیر نے انجام دیے۔

۲۰ مارچ: سلطان العلوم صدی تقاریب کا اختتامی اجلاس ادبی محفل پر ہوا۔ پروفیسر ڈاکٹر غلام عمر خاں صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ نے ادبی محفل کی صدارت کی۔ عہد عثمانی کے ادب، آرٹ اور کلچر پر مسرز ڈاکٹر یوسف سرمست، ڈاکٹر عقیل ہاشمی، سیدہ طیبہ بیگم نواب غلام عمر خاں، مصطفیٰ علی فاطمی، حامد لطیف ملتانی اور سعید صدیقی نے مقالے سنائے۔ رئیس اختر نے نظم پیش کی۔ جناب مظہر قادری نے معتمدی کی اور شکریہ ادا کیا۔

۲۴ مارچ: حلقۂ ارباب ذوق (انٹا) اور دو ٹرسٹ لائبریری کا ماہانہ ادبی اجلاس ڈاکٹر یوسف سرمست کی صدارت میں ہوا۔ جناب یوسف اعظمی لکچرار انوار العلوم کالج نے محترمہ بانو طاہرہ سعید کی کہانیوں کے مجموعہ "خونِ جگر" پر ادبی تبصرہ سنایا۔ محفلِ شعر میں غیاث صدیقی، وقار خلیل، بانو طاہرہ سعید، تاج کریم نگری اور منظور احمد معتمد حلقۂ ارباب ذوق نے کلام سنایا۔

۲۰ مارچ : ادارۂ ادبیات اردو کے زیر اہتمام ۱۲ واں یوم قلی قطب شاہ بمقام گنبد محمد قلی واقع گولکنڈہ پر منعقد ہوا۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت مسٹر کے دھوریڈی چیف جسٹس آندھرا پردیش نے کی۔ ڈاکٹر رحیم الدین کمال، پروفیسر سید سراج الدین اور معتمد اعزازی ادارہ جناب سید ہاشم علی اختر (وائس چانسلر جامعہ عثمانیہ) نے قطب شاہی عہد کے ادب اور کلچر پر مخاطب کیا۔ مسٹر رمن راج سکسینہ معتمد یوم محمد قلی نے خیر مقدمی خطبہ پڑھا۔ محمد قلی اور آصف سابع کا کلام مشہور موسیقار کوشل کمار نے سنایا۔ کیپٹن عباس عابدی نے محمد قلی کا مرثیہ پڑھا۔ صلاح الدین نیر نے نذرانۂ سخن ادا کیا۔ عزیز احمد خاں وارثی کی قوالی ہوئی۔ اس تقریب میں پاکستانی نقاد ڈاکٹر جمیل جالبی نے بھی شرکت کی۔ اختتامی اجلاس سے پہلے ادیبوں شاعروں کا اجتماعی ظہرانہ ہوا اور ایک مشاعرہ سعید شہیدی کی صدارت میں عمومی دلچسپی کا باعث بنا۔ اس مشاعرہ میں منوہر لال بہار، بشیر وارثی، محمد منظور احمد، احمد اللہ حسینی احمد، حبیب حیدرآبادی، اکبر یوسفی، راجہ لال راجہ، عتیق الرحمٰن، اظہر اسحٰق ملک، منیر الزماں نیر اور یوسف بہر نے کلام سنایا۔ وقار خلیل نے دکنی غزل سنائی اور نظامت کے فرائض انجام دیے۔ جناب رمن راج سکسینہ نے شاعروں کا خیر مقدم کیا اور پاٹ لک و مشاعرہ کے انعقاد پر مبارک باد پیش کی۔

○ اردو گھر (انجمن ترقی اردو شہر حیدرآباد) میں ریاستی چیف منسٹر مسٹر این ٹی راما راؤ اور کشمیر کے وزیر اعلیٰ جناب ڈاکٹر فاروق عبداللہ کا پُرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ ریاستی چیف منسٹر نے اس موقع پر کہا کہ تلگو کی طرح اردو کو بھی ریاست میں اس کا مستحقہ مقام دیا جائے گا۔ ڈاکٹر فاروق نے کہا کہ مسلمانوں کی زبان قرار دینے سے اردو کے فروغ میں رکاوٹ ہوگی۔ اردو گھر کے بانی ٹرسٹی جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست نے ہر دو چیف منسٹروں کا خیر مقدم کرتے ہوئے اردو گھر ٹرسٹ کی سرگرمیوں کو روشن کیا اور ریاستی چیف منسٹر کو اردو زبان سکھانے کا ان کی خواہش پر اپنی طرف سے پیش کش کیا۔ نواب مفخم جاہ کے علاوہ معززین نے اس تقریب میں شرکت کی۔ مسٹر منوہر راج سکسینہ منیجنگ ٹرسٹی نے شکریہ ادا کیا۔

۳۰ مارچ : روزنامہ سیاست کے زیر اہتمام پاکستان کے نامور نقاد اور محقق ڈاکٹر جمیل جالبی نے اردو گھر میں "ہندو پاک کے جدید تحقیقی رجحان" پر پہلا توسیعی لکچر دیا۔ پروفیسر گیان چند جین صدر شعبہ اردو سنٹرل یونیورسٹی نے صدارت کی۔ ابتداً جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست نے "سیاست توسیعی لکچر" کا تعارف کرتے ہوئے ڈاکٹر جالبی کو خوش آمدید کہا اور بتایا کہ سال میں دو بار ملک کے نامور دانشوروں کے توسیعی لکچر کا اہتمام کیا جائے گا اور ہر سال انھیں کتابی صورت میں شائع بھی کیا جائے گا۔ ڈاکٹر مغنی تبسم کنوینر نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔

۳۱ مارچ : یوم محمد قلی قطب شاہ کا ادبی اجلاس ایوانِ اردو میں بصدارت جناب امجد علی خاں سکریٹری نظامس ٹرسٹ منعقد ہوا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی مہمان خصوصی تھے۔ ڈاکٹر جالبی کے علاوہ ڈاکٹر یم ایل نگم، ڈاکٹر انور معظم، ڈاکٹر حبیب ضیا، ڈاکٹر رحمت علی اور پروفیسر سید سراج الدین نے قطب شاہی ادب، دکنیات اور عہد عثمانی کے کلچر پر مقالے سنائے۔ ڈاکٹر مغنی تبسم

شکریہ ادا کیا اور وقار خلیل نے نظامت کی۔
ایوانِ اردو میں جناب افتخار احمد بشر
مجموعہ کلام "ترکش بشر" کی رسم اجرا
ب سید ہاشم علی اختر وائس چانسلر
نیہ یونیورسٹی نے انجام دی۔ ڈاکٹر
ل جالبی نے صدارت کی۔ ڈاکٹر مغنی تبسم
ڈاکٹر یعقوب عمر نے بشر کی نظم نگاری
راج ادا کیا۔ وقار خلیل نے معتمدی کی
ہے شب بزم محمد قلی قطب شاہ کا سالانہ
عرہ ایوانِ اردو میں بصدارت جناب
دین محمد سکریٹری نظامس جیاریٹیبل ٹرسٹ
ستہ ہوا۔ صدر مشاعرہ نے انگریزی
ں سنائیں اور مسز سعیدہ شہیدی،
پرشاد کنول، منوہر لال بہار، ڈاکٹر
تبسم، امیر احمد خسرو، وقار خلیل،
رح الدین نیر، رئیس اختر، فیض الحسن
ڈاکٹر محمد علی اثر، محمد منظور احمد، خواجہ
وق، صادق نقوی، بشیر وارثی، بانو طاہرہ
سعید، صاحب حیدرآبادی، کیپٹن عباس
عابدی، رحمٰن جامی، یوسف اعظمی، رضا
وصفی اور پاکستانی شاعر واجد علی شاہ
واجد نے کلام سنایا۔ جناب محمد منظور احمد
شریک معتمد ادارۂ ادبیات اردو نے
نظامت کی۔

○ سنٹرل یونیورسٹی حیدرآباد کے شعبہ
اردو کی طرف سے ڈاکٹر جمیل جالبی کا
پُرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ پروفیسر
گیان چند جین نے صدارت کی۔
ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے خیر مقدمی
خطاب کیا۔ ڈاکٹر مجاور حسین رضوی نے
جالبی صاحب کی ادبی خدمات کو خراج تحسین ادا کیا۔

برگِ غزل

از۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر

چند تاثرات

"آپ نے تحقیقی اور تنقیدی کام تو بہت کئے ہیں لیکن برگ غزل شائع ہو کر سامنے نہ آتی تو آپ کی شخصیت تشنۂ تکمیل رہ جاتی۔ آپ کا شاعرانہ ذوق نہایت پاکیزہ اور صاف ستھرا ہے۔ اشعار میں تاثر کے ساتھ دلکشی بھی پائی جاتی ہے۔ میں اس شعری تخلیق پر آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ اُمید ہے آئندہ اور تخلیقات بھی سامنے آئیں گی۔"

Regd. H ..

The "SABRAS" Urdu Monthly

rgan of "Idara-e-Adabiyat-e-Urdu", Aiwan-e-Urdu, Hyderabad-500 004. (A. P

National Fine Printing Press Charkaman Hyd

سن اجراء: ۱۹۳۸ء

فون نمبر ۳۸۴۷۴۹

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد

مدیر اعزازی مغنی تبسم

معاون مدیر وقار خلیل

جلد (۴۳) مئی ۱۹۸۳ء شمارہ (۵)

قیمت فی پرچہ ۲ روپے

ادارۂ ادبیات اردو: پنجہ گٹہ روڈ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

زر سالانہ

۳۰ روپے

کتب خانوں سے

۲۵ روپے

بذریعۂ رجسٹری ۴۵ روپے

بیرونی ملکوں سے

	ہوائی ڈاک سے	بحری ڈاک سے
مشرق وسطیٰ	۱۰ ڈالر	۴ ڈالر
امریکہ	۱۶ ڈالر	۶ ڈالر
پاکستان، برما، سیلون	۸ ڈالر	۱/۲ ۳ ڈالر
انگلستان	۷ پونڈ	۳ پونڈ

فہرست

سید علی اکبر ایڈیٹر، پبلشر، پرنٹر، پبلشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان، حیدرآباد ۲ [illegible] ۵۰۰۰۰ شائع کیا

عابد علی خان

(اداریہ روزنامہ سیاست حیدرآباد)
مورخہ ۶/ مئی ۱۹۸۳ء

ادارہ ادبیات اُردو حیدرآباد ایک کتب خانہ ہی نہیں بلکہ دکنی ادب، تاریخ اور مخطوطات، فرامین اور نادر نقشوں وغیرہ کا ایک مرکز اور میوزیم ہے جس کے ذخیرے سے دکن کی (۱۰۰) سالہ ادب اور تاریخ کی کڑیاں ملائی جا سکتی ہیں۔ حیدرآباد میں دائرۃ المعارف اور سالار جنگ کتب خانہ جیسے نادر ادارے بھی ہیں۔ مگر دکنی ادب ریسرچ کا واحد مرکز ادارہ ادبیاتِ اُردو ہے۔ ڈاکٹر زورؔ مرحوم نے صرف سنگ و خشت کی عمارت نہیں بنائی بلکہ دکنی پر کام کرنے والوں کو اپنے ساتھ لیا۔ ان کا کام اتنا سراہا گیا کہ غلام محمد صاحب جب وزیرِ فینانس حیدرآباد تھے اور جو بعد میں پاکستان کے گورنر جنرل بنے انہوں نے کہا تھا کہ زورؔ صاحب میں چاہتا ہوں کہ خزانۂ عامرہ کا دروازہ آپ کے لئے کھول دوں۔ لیکن زورؔ صاحب نے پیسے پر کام کو ترجیح دی۔ حیدرآباد کی ۵۰ سالہ تاریخ میں سب سے بڑی اُردو کانفرنس ڈاکٹر زورؔ نے ہی ۱۹۴۲ء میں منعقد کی۔ جس میں غیر منقسم ہندوستان کی چالیس سے زیادہ شخصیتیں شریک تھیں جن میں قابلِ ذکر سر شیخ عبدالقادر، سر محمد یعقوب، خواجہ حسن نظامی، جگر مراد آبادی کے علاوہ سجاد ظہیر بھی پہلی مرتبہ حیدرآباد آئے تھے۔ نواب زین یار جنگ جوان دنوں بڑی شخصیت تھے اس کانفرنس کے صدر استقبالیہ تھے اور ہم مندوب قصر بشیر باغ میں ٹھہرایا گیا تھا۔ زورؔ صاحب نے ترقی پسند ادب کا مجھے سکریٹری بنایا۔ یہ میرے لئے بڑا اعزاز تھا حتیٰ کہ سب رس کے خصوصی ترقی پسند ادب نمبر پر زورؔ صاحب نے مرتب کنندہ کی حیثیت سے میرا نام لکھوایا۔ شاید میری زندگی کا موڑ یہیں سے شروع ہوا۔ زورؔ صاحب کام کرنے والوں کا ایک قافلہ بناتے تھے انہوں نے مجھے بھی اس قافلہ میں شریک کر لیا تھا۔

زورؔ صاحب مرحوم کے بعد یہ ادارہ حکومت کی ۴ ہزار معمولی گرانٹ کی امداد کے علاوہ دیگر تمام ذرائع سے محروم ہو گیا تھا۔ گزشتہ سال مسٹر ہاشم علی اختر سکریٹری ادارے نے اس گرانٹ کو ۶ ہزار کرانے میں کامیابی حاصل کی۔ ہاشم صاحب ادارہ کی گولڈن جوبلی بڑے شاندار پیمانے پر منانا چاہتے تھے تاکہ ادارے کا احیاء ہو۔ لیکن مالی مشکلات حائل تھیں۔ ان دنوں میں چار تمام مالیہ کے اجلاس میرے گھر پر ہوا کرتے تھے۔ ادارہ کے نامساعد حالات کے باعث یہ طے کیا گیا کہ ادبی ٹرسٹ کا مشاعرہ اس سال ادارہ ادبیات اُردو کے لئے منعقد کیا جائے۔ عوام کو جب ادارے کا حال معلوم ہوگا۔ دستِ تعاون بڑھے گا اور ادارے کیلئے ایک ٹرسٹ بن جائے گا جس کے منافع سے ادارہ کی مالی مشکلات کسی حد تک دور ہو سکیں گی۔

مشاعرہ کے اعلان کے بعد میں نے اس ادارہ کے نادر مخطوطات، نقشوں اور فرامین کے تحفظ کے بارے میں بعض صاحبانِ نظر سے گفتگو کی۔ انہوں نے یہ تیقن دیا ہے کہ وہ ائیر کنڈیشنڈ، حفاظت اور مائیکرو فلم کے جدید طریقوں سے ان نادر خزانوں کے تحفظ میں مدد کریں گے۔ آج ادارہ بڑی خراب مالی حالت میں ہے۔ جو محقق اسے دیکھتا ہے پہلے اس کے تحفظ کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہتا ہے کہ ان نادر کتابوں اور مخطوطات کو اگر نقصان پہنچے تو ہم ذمہ دار قرار دیئے جائیں گے۔ زورؔ صاحب سے کسی نے پوچھا تھا کہ ادارۂ ادبیاتِ اُردو پر آپ نے گنبد کیوں بنایا ہے؟ انہوں نے کہا تھا کہ آئندہ اگر کوئی خراب وقت آئے تو اس گنبد کو دیکھ کر یہ سمجھ لیں کہ یہ کچھ اہم جگہ تھی۔ زورؔ صاحب نے شاید ادارے کے مستقبل کا اندازہ لگا لیا تھا۔ لیکن وہ حاضر کی نسل ان فریضہ بھی جانتی ہے۔ جب ان کمیٹی ادارۂ ادبیاتِ اُردو کو جنوبی ہند میں ریسرچ سنٹر بنانے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ اور انشاء اللہ یہ تجویز عملی جامہ پہنے گی۔ گجرال کمیٹی نے مرکزِ خوشنویسی کے قیام کا جو مشورہ دیا تھا اُردو بورڈ نے ڈھیر سب سے پہلے اسی ادارے میں کام شروع کرنے کے مشورے دیئے ہیں۔ آج عوام کے سامنے اُردو کی تاریخ ہے جو دکن کی تاریخ اور دکھنی ادب ہے اس خزانے کے تعلق سے انہیں اپنا فرض یاد دلا رہی ہے۔ ادارہ کے لئے ایک لاکھ کا ٹرسٹ صرف ایک

[illegible]

محمد ہدایت اللہ
نائب صدر جمہوریہ ہند

ادارۂ ادبیات اردو

روایت اور خدمات

(گولڈن جوبلی تقاریب ادارۂ ادبیات اردو کے موقع پر کی گئی تقریر)

ادارۂ ادبیات اردو کا میں شکر گزار ہوں کہ اس کی پُرخلوص دعوت پر مجھے یہاں آنے کا موقع ملا ہے۔ میں عرصے سے اس ادارے کے بارے میں اکثر سنا کرتا تھا مگر جب بھی حیدرآباد آیا کبھی ایسا موقع نہیں ملا کہ میں یہاں تک پہنچتا۔ پچھلے چند برسوں میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور اور اُن کے ساتھیوں نے اسے اتنا بڑھایا کہ اب یہ ادارہ ہندوستان بھر میں مشہور ہے۔ اس کی شہرت علمی ادبی تحقیقی اور تنقیدی مطبوعات کے ذریعے ملک کے کونے کونے میں پہونچ گئی ہے۔ گذشتہ نصف صدی میں تقریباً ہر شعبۂ حیات سے متعلق یہاں کام ہوا ہے۔ شعرا و مصنفین، سائنس، تاریخ دکن، خوشنویسی، تعلیم نسواں و اطفال سبھی اس میں شامل ہیں۔ اس ادارے کا ایک بڑا کتب خانہ بھی ہے۔ ان سب سے ایک ہی چیز سامنے آتی ہے کہ اس ادارے نے اپنے منصوبوں میں آنے والے زمانے کا خیال رکھا ہے۔

محمد قلی قطب شاہ اور ولی دکنی کی اس سرزمین کو یہ فخر حاصل ہے کہ یہاں ہمیشہ اردو کی نشو و نما ہوتی رہی ہے۔ تہذیب و تمدن، علم و شرافت، اتحاد و اخلاص کا ماحول یہاں ایسا نظر آتا ہے جیسا دیگر شہروں میں کم دیکھنے میں آتا ہے۔ یہ شہر ہندوستان کا مرکز کئی معنوں میں ہے۔ یہی سبب ہے کہ حالی نے کہا تھا۔

خالی دکن میں آکے یہ عقدہ کھلا کہ ہم
ہندوستاں میں رہتے ہیں ہندوستاں سے دور

ہمارے ان شعرا و ادبا کو جگہ دی جن کو شمال میں سکون حاصل نہ تھا۔ ان میں رتن ناتھ سرشار، محمد حسین آزاد، عبدالحلیم شرر، مولانا نذیر احمد، شبلی نعمانی، مولوی عبدالحق، خواجہ الطاف حسین حالی، شاہ نصیر، داغ یہ سب حیدرآباد میں یا تو رہے یا کچھ عرصے قیام کیا صرف شیخ امام بخش ناسخ نے راجا چندو لال کے بلاوے پر انکار کر دیا۔ ذوق نے بھی یہاں آنے سے انکار کیا اور کہا

ان دنوں گرچہ دکن میں ہے بڑی قدر سخن
کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

آج میں نے بھی انجمن ترقی اردو کے جلسے میں اردو زبان کی تاریخ سے متعلق کچھ کہا تھا اور اردو کے نامی شاعروں اور نثر لکھنے والوں کا تذکرہ کیا تھا۔ اب وہ سب کچھ میں یہاں دُہرانا نہیں چاہتا۔ دہلی، لکھنؤ اور حیدرآباد اردو کے مسکن تھے۔ اردو کی نشو و نما میں کیا مسلمان کیا ہندو، کیا سکھ مذہب کے لوگ سب شامل رہے ہیں۔ اردو زبان کا حسن اسی میں ہے کہ اس میں میل ملاپ اور پیار کی وہ فضا رہی ہے جس کی بدولت یہ زبان وجود میں آئی اور اس کو قائم رکھنے میں سب کا ہاتھ تھا۔ اب اگر اردو کو آگے بڑھنا ہے تو ہمیں یہی رویہ باقی رکھنا ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ اردو کی ترقی اسی وقت ہو سکتی ہے جب وہ عوام میں پھیلے، مگر اب عوام سے اس کو الگ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ دہلی اور لکھنؤ کی اردو میں بھی فرق تھا۔ مولانا حالی نے اپنے مقدمہ شعر و شاعری میں لکھا ہے۔

"شجاع الدولہ کے زمانے سے سعادت علی خاں کے وقت تک اردو کے تمام نامور شعرا کا جمگھٹا لکھنؤ ہی میں رہا۔ یہاں تک کہ میر، سودا، سوز، جرأت، مصحفی، انشا، [illegible] وغیرہ اخیر دم تک وہیں رہے اور وہیں مرے [illegible]

ان کے طرز بیان کا اثر بہت کم پایا جاتا ہے۔ ظاہرا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب دلی بگڑ چکی اور لکھنؤ سے زمانہ موافق ہوا اور دلی کے اکثر شریف خاندان اور ایک آدھ کے سوا تمام نامور شعرا لکھنؤ نکل گیا جا رہے اور دولت و ثروت کے ساتھ علومِ قدیمہ نے بھی ایک خاص حد تک ترقی کی۔ اس وقت پورا طور پر اہلِ لکھنؤ کو ضرور یہ خیال پیدا ہوا ہوگا کہ جس طرح دولت اور منطق و فلسفہ وغیرہ میں ہم کو فوقیت حاصل ہے اسی طرح زبان اور لب و لہجہ میں بھی ہم دلی سے فائق ہیں۔۔۔۔ بول چال میں ہندی الفاظ رفتہ رفتہ ترک اور ان کی جگہ عربی الفاظ کثرت سے داخل ہونے لگے۔ یہاں تک کہ سیدھی سادی اردو امرا اور اہلِ علم کی سوسائٹی میں متروک ہی نہیں ہو گئی بلکہ جیسا کہ ثقات سے سنا گیا ہے معیوب اور بازاریوں کی گفتگو سمجھی جانے لگی اور یہی رنگ رفتہ رفتہ نظم و نثر پر بھی غالب آگیا۔"

مولانا حالی نے جس بات کی تشریح کی ہے وہ اب بھی صحیح آرہی ہے۔ اب اردو داں ہندی کو نظر انداز کر کے اردو کو پھر بگاڑ رہے ہیں۔ مولوی عبدالحق صاحب نے لکھا ہے:

"اس زمانے میں عربیت کا رنگ جو غالب ہوتا جاتا ہے وہ اس سے (میر اور ان کے ہم عصر شعرا کے کلام کی فارسیت سے) کچھ کم نہیں ہے۔ ان بزرگوں نے تو پھر بھی یہ کیا کہ جہاں کثرت سے فارسی الفاظ اور محاورے اور فارسی ترکیبیں داخل کیں وہاں بہت سے الفاظ کو اپنا کر لیا اور اپنی صرف و نحو کے خراد پر چڑھا کر اردو بنا لیا لیکن آج کل یہ کوشش کی جاتی ہے کہ عربی الفاظ اور ترکیبوں کو جوں کا توں رکھا جائے ایسا نہ ہو کہ یہ مقدس الفاظ اردو صرف و نحو کے چھو جانے سے نجس ہو جائیں۔ ان بزرگوں نے زبان کو بنانے اور وسیع کرنے کی کوشش کی اور بہت بڑا احسان کیا مگر آج کل لوگ ان کی تقلید کو ننگ سمجھتے اور ان کی کوششوں کو "غلط العام" سے تعبیر کرتے ہیں حالانکہ وہ صحیح اصول پر چل رہے تھے اور ہم باوجود ہم دانی کے زبان کی اصل ترقی و نشو و نما کے گر سے ناواقف ہیں۔ ایک دوسرا فریق جو فارسی، عربی کے مقبول الفاظ نکال کر ان کی جگہ غیر مانوس ثقیل سنسکرت کے الفاظ ٹھونسنا چاہتا ہے، اسی ناسمجھی میں مبتلا ہے۔ ہماری رائے میں یہ دونوں زبان کے دشمن ہیں۔"

میری بھی یہی رائے ہے اور میں نے انجمن ترقی اردو کے جلسے میں اپنی اس رائے کا اظہار بھی کیا تھا۔ عربی اور فارسی کا استعمال کتنا جائز سمجھا جائے اس کو میر تقی میر نے نکات الشعرا میں لکھا ہے اور میری رائے میں ضروری ہے کہ اس پر عمل کیا جائے۔ میر تقی میر فرماتے ہیں:

"حرف و فعل فارسی بکار برند و این قبیح است۔۔۔ اگر ترکیبات فارسی می آرند اکثر ترکیب کہ مناسب زبان ریختہ می افتد آن جائز است و این را غیر شاعری داند، ترکیبے کہ مانوس ریختہ نمی باشد آن معیوب است و دانستن این نیز موقوف سلیقۂ شاعری است و مختار فقیر ہمیں است، اگر ترکیب فارسی موافق گفتگوئے ریختہ بود مضائقہ ندارد۔"

میں نے میر تقی میر، مولانا حالی اور مولوی عبدالحق بابائے اردو کے حوالے سے کچھ باتیں انجمن ترقی اردو کے سامنے کہیں اور اس تقریر میں ان کا خود کہا ہوا آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔ ان دو تقاریر سے اردو کی ترقی کی راہ، جو مجھ فقیر نے بتائی ہے امید ہے کہ غور کے قابل سمجھی جائے گی۔

مجھے یقین ہے کہ ادارۂ ادبیات اردو جیسا عظیم اور پرانا ادارہ اس سلسلے میں بہت بڑا حصہ لے گا اور لے رہا ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ بہت خوبی اور تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ امید ہے کہ جس طرح اس ادارے نے نصف صدی میں ترقی کی ہے اس ترقی کی رفتار کم نہ ہو گی۔

میں اس پچاسویں سالگرہ کے جشن کا افتتاح کرتے ہوئے دعا گو ہوں کہ یہ ادارہ دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرے اور پہلے سے زیادہ کامیابی حاصل کرے۔

(مجموعہ مضامین تقدیر و تعبیر سے)

(مجموعہ مضامین "تقدیر و تعبیر" سے)

ڈاکٹر حسینہ جلیلی

دکھنی ادب میں تحقیق کے مسائل

دکھنی ادب کی بازیافت کو تقریباً نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ ہوتا ہے اور اس عرصہ میں دکھنیات پر بہت زیادہ اور بہت اچھا کام ہوا ہے۔ چنانچہ دکھنی ادب کی تاریخ کی گم شدہ کڑیوں کو ربط و تسلسل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ مصنفین کے حالاتِ زندگی کو تحقیق و جستجو کے ساتھ منظرِ عام پر لایا گیا ہے۔ اور ادب پاروں کی قدر و منزلت کو تنقیدی تدوین کے تحت جانچا گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود دکھنی ادب کے محققین کو روزِ اوّل سے جو مسائل درپیش تھے وہ ہنوز باقی ہیں۔ اور کسی بھی مصنف کے حالاتِ زندگی کو پیش کرنے یا کسی ادب پارے کے متن کی ترتیب کے لئے اب بھی ہفت خواں طے کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ سب سے پہلا مسئلہ تو یہ ہے کہ آج بھی دکھنی ادب کا ایک قابلِ لحاظ ذخیرہ ہماری پہنچ سے باہر ہے۔ کیونکہ خانگی کتب خانوں اور مختلف درگاہوں سے متعلق کتب خانوں تک ہماری رسائی نہایت دشوار طلب ہے۔ اور اگر کسی طرح ہم وہاں تک پہنچ بھی جائیں تو مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے مخطوطات اتنے کرم خوردہ اور ناقص حالات میں ملتے ہیں کہ ان سے خاطر خواہ استفادہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے علاوہ جو مخطوطات بیرونِ ملک کتب خانوں میں محفوظ ہیں انکی دستیابی بھی جوئے شیر لانے کے مترادف ہے اگر بالفرض محال مطلوبہ نسخے کی فوٹو کاپیاں یا میکرو فلم ہمیں حاصل بھی ہو جائے تو فوٹو کو ڈیولپ کرنے یا میکرو فلم کو پروجیکٹر کے ذریعہ پڑھنے کا بھی مناسب انتظام ہمارے یہاں نہیں ہے۔ مجموعی طور پر تحقیقی کام کو دو بڑے زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

الف۔ مصنف کے حالاتِ زندگی اور ادبی کارنامے۔

ب۔ ادب پارے کے متن کی ترتیب و تدوین۔

اب صورتحال یہ ہے کہ عموماً بڑے سے بڑے مصنف کی زندگی کے حالات تاریخ میں موجود نہیں اور اگر کسی تذکرے یا تاریخ میں کسی فن کار کا ذکر ہو بھی تو نہایت سرسری اور برائے نام۔ اب محقق کے لئے اس کے سوائے کوئی راستہ نہیں جاتا کہ وہ خارجی و داخلی شہادتوں کی مدد سے ہی سوانح مرتب کرنا شروع کرے داخلی شہادتوں میں خود مصنف کے بیانات کو بڑی حد تک مستند قرار دیا جا سکتا ہے جو وہ کبھی واضح طور پر اور کبھی اشارے کنائے میں انہیں تصنیف کے مختلف حصوں میں موقع محل کے لحاظ سے پیش کر دیتا ہے۔ اس کی بہترین مثال وجہی کا فارسی دیوان ہے جس سے وجہی کی زندگی کے بیشتر ڈھکے چھپے گوشے ہمارے سامنے آگئے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس شہرۂ آفاق شاعر کی تاریخِ پیدائش و تاریخِ وفات کے لئے ہمیں قیاسات

بھی کاسہارا لینا پڑتا ہے۔ ترقیمہ کی عبارتیں بھی عموماً مصنف کا نام، کتاب کا نام، مصنف کا سماجی رتبہ اور سن تصنیف جیسے اہم امور پر روشنی ڈالنے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ لیکن بعض اوقات یہ عبارتیں اتنی مبہم اور الجھی ہوئی ہوتی ہیں کہ کئی دوسرے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ اکثر صورتوں میں الحاقی عبارتیں بھی مصنف اور تصنیف کے تعلق سے کافی غلط فہمی اور متنازعہ صورت حال پیدا کر دیتی ہیں۔ اس کی عمدہ مثال تاج الحقائق کا وہ نسخہ ہے جس کا اندراج سالار جنگ لائبریری میں تصوف واخلاق 124/33 کے تحت ہے۔ اس نسخے میں ابتدائی عبارت سے پہلے درج ہے۔

"کلام میراں جی شمس العشاق کہ کلام وجیہ الدین بزبان دکھنی۔"

اور ابتدائی عبارت میں لکھا ہے۔

"کتاب تاج الحقائق، روائح الحقائق، سراج الحقائق"

جبکہ اسی نسخے کے خاتمے کی عبارت اس طرح ہے۔

"تمت الکتاب معنون ملک الوہاب المسمیٰ سب رس تصنیف میراں جی شمس العشاق"

اب تحقیق کے لئے یہ ایک پیچیدہ مسئلہ بن جاتا ہے کہ اس کتاب کا نام آیا سب رس سمجھا جائے یا تاج الحقائق اور پھر یہ کہ یہ کتاب میراں جی شمس العشاق کی ہے یا وجیہ الدین کی؟ وجیہ الدین سے مراد وجیہ الدین گجراتی ہیں یا کوئی اور بزرگ۔ ویسے زبان اور اسلوب کی بنیادوں پر اسے اسد اللہ وجہی کی تصنیف قرار دیا جا چکا ہے۔ حالانکہ احتیاط کا تقاضہ تو یہی ہے کہ اب بھی اس ضمن میں قطعیت سے کوئی حکم نہ لگایا جائے۔

اسی قسم کا ایک مسئلہ اس وقت بھی پیدا ہوتا ہے جبکہ ایک ہی مصنف کی پیدائش یا وفات کی تاریخ مختلف تذکروں میں مختلف دی گئی ہو۔ جیسے میراں جی شمس العشاق کا سنہ وفات محبوب ذی الشمس میں ایک جگہ ۲۵ شوال ۹۰۷ھ ہے اور دوسری جگہ ۲۵ شہر شوال ۹۱۰ھ لکھا ہے۔ اس کے برخلاف برکات الاولیا میں تاریخ وفات ۲۲ ربیع الاول ۱۰۸۴ھ درج ہے جبکہ برہان الدین جانم نے اپنے والد میراں جی شمس العشاق کی وفات پر جو مرثیہ قلم بند کیا ہے اور اس میں وہ اشعار جس میں تاریخ وفات کا ذکر ہے اس طرح ہیں۔

" تاریخ حضرت سال نو سو اس پر اگلے بھی دو
دین مدت دفات یہ سنو جے کچھ حکم الٰہی کا
ارلع نسقوں یوں سال ماہے کون شوال ہے
رحلت کئے اس حال ہے جے کچھ حکم الٰہی کا "

بعض محققین نے سن وفات کے مصرعے کی قرأت اس طرح بھی کی ہے۔ ع

" تاریخ حضرت سال نو سو دو اس پر اگلے بھی دو"

اب محققین کے لئے ایک طویل عرصے تک یہ مسئلہ درپیش رہا کہ آیا محبوب ذی الشمس میں دی ہوئی دونوں تاریخوں میں سے کسی ایک تاریخ کو درست مانیں یا پھر برکات الاولیائی تاریخ کو ٹھیک سمجھا جائے۔ جبکہ مرثیہ میں شامل اس مصرعہ کی قرأت میں بھی اختلافات ہیں جس میں وفات کا ذکر ہے۔ علاوہ ازیں بعد کے مصرعہ میں ارلع نسقوں سے کیا مراد لی جائے۔ بہر حال تذکرہ نویسوں کی لاپرواہی اور راہسم عبارت کی قرأت میں اختلافات کے باعث ایک بڑی مدت تک میراں جی کی وفات کا سن ایک معمہ بنا دیا اور محققین کو دعوت فکر دیتا رہا۔

مذکورہ مرثیہ کے بعد کے اشعار میں وفات کا

دن پنجشنبہ بتایا گیا ہے۔ اسی طرح اکثر تاریخی مادوں اور
ہسم سنین کے ساتھ ماہ اور دن کی بھی وضاحت کی جاتی ہے
ہز سنین عام طور پر ہجری اور بعض اوقات فصلی میں
یئے جاتے ہیں۔ اس قسم کے مسائل کا حل اسی لئے اور
ی کٹھن ہو جاتا ہے کہ ہمارے یہاں ایسے کیلنڈرز
سانی سے دستیاب نہیں ہوتے جو دن اور ماہ کی
ضاحت کے ساتھ کم از کم پچھلے پانچ سو سال کا احاطہ
رتے ہوئے ہجری، فصلی اور عیسوی کی سنین کی بہ
ک وقت نشاندہی کریں۔

اب جہاں تک ادب پارے کے متن کی تدوین
کا سوال ہے۔ تو یہاں بھی کئی مسائل درپیش ہیں۔ اس سلسلے
میں ایک بڑی دشواری تو وہی ہے جو پہلے بیان کی جاچکی
ہے۔ یعنی خانگی کتب خانوں اور بکھری ہوئی حالت
بیرون ملک تک پھیلے مخطوطات کی توضیحی فہرست کی
عدم دستیابی! اسی لیئے ہم کسی بھی تصنیف کے تعلق سے
وثوق سے کہنے کے موقف میں نہیں ہوتے کہ اس کے
کتنے نسخے کس حالت میں اور کہاں کہاں موجود ہیں۔
چنانچہ آئے دن یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ مرتب نے نہایت
جانفشانی سے دستیاب شدہ نسخوں کی مدد سے
متن ترتیب دیا ہے اور ساتھ ہی بڑی محنت اور جستجو
کے ساتھ مصنف کی سوانح بھی پیش کر دی ہے لیکن
جیسے ہی اس کا مقالہ زیور طبع سے آراستہ ہوا
اسی تصنیف کے دیگر نسخوں اور مصنف کی سوانح کے تعلق
سے اہم دستاویزات کی نشاندہی شروع ہو جاتی
ہے۔ اب مرتب کو جن ذہنی اذیتوں کا سامنا کرنا پڑتا
ہے اور ناقدین کے میزان نقد و ہنر پر اس
کے مقالے کی جو قدر و قیمت مقرر کی جاتی ہے
اس سے تو وہی واقف ہو سکتا ہے جس نے بھی اس
پرخار وادی کو سر کیا ہو۔ اس افسوسناک
صورتحال کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ہم ایک ہی دشت
کی پیمائش کرنے والوں کے درمیان تعاون اور ہمدردی
کا جذبہ عنقا ہے۔

متن کی ترتیب کے دوران ایک مرحلہ وہاں بھی
درپیش رہتا ہے۔ جب ہم بیاضوں سے مواد حاصل
کرنا شروع کریں۔ اب جہاں تک بیاضوں میں شامل
ادب پاروں کا تعلق ہے تو یہاں محقق کو نہایت محتاط
رویہ اپنانا پڑتا ہے کیونکہ اکثر کاتبین ایک شاعر کا کلام
نقل کرتے کرتے بغیر کسی وضاحت کے دوسرے شاعر
کا کلام نقل کر دیتے ہیں اکثر مستقل تصانیف کی
صورت میں بھی کاتبوں سے ایسی فروگزاشتیں ہوئی
ہیں جس کی وجہ سے اکثر شعراء کا کلام ہم تک مشکوک
حالت میں پہنچا ہے۔ اس کی ایک مثال عبد اللہ
قطب شاہ کا کلام ہے۔ گو کہ عبد اللہ قطب شاہ کا نامکمل
دیوان ترتیب دیا جاچکا ہے مگر محتاط طرز عمل رکھنے
والے محققین کا ایک گروہ اب بھی گمان کرتا ہے کہ عبد اللہ
قطب شاہ کے دیوان میں اس کے قریب کے دور کے کسی
اور شاعر کا کلام بھی شامل ہو گیا ہے۔

ایسی تصانیف جن کے سر دست صرف دو ہی نسخے دستیاب
ہوں ان کے متن کی ترتیب میں بھی کافی احتیاط برتنی پڑتی
ہے۔ جیسا کہ قطب مشتری کے متن کی ترتیب کے وقت
مولوی عبد الحق کے پیش نظر صرف دو ہی نسخے تھے اور
ایک نسخے میں کئی صفحات پر مشتمل نامعلوم حصہ موجود تھا۔
جسے اس وقت مولوی صاحب نے ضمیمے کے تحت پیش کر دیا
تھا۔ لیکن اگر اب قطب مشتری کے متن کو دوبارہ

ترتیب دینے کا بیڑہ اُٹھایا جائے تو مرتب کے لئے وہ زائد حصّہ جو مولوی عبدالحق نے ضمیمے کے تحت پیش کر دیا تھا۔ اس وقت تک الجھن کا باعث بنا رہے گا جب تک کہ قطب مشتری کا ایک اور نسخہ حاصل نہ ہو جائے۔ اب ایسے ادبی شہ پارے جن کے صرف ایک ہی ایک نسخے منظرِ عام آئے ہوں۔ جیسے کلیاتِ غواصی یا ملک خوشنود کی ہشت بہشت تو ان کے متن کی صحت کے ساتھ ترتیب اور زیادہ دشوار طلب ہوگی اور اس سلسلے میں ساری ذمہ داری صرف مرتب ہی کے سر رہے گی۔

منظوم تصانیف کے مرتب کو اور کئی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے بیشتر دکھنی شعراء کے یہاں حرف کا گرنا، حرکات و سکنات میں ردّ و بدل کر دینا معمولی بات سمجھی جاتی ہے۔ بعض اوقات لفظ لکھا جاتا ہے پورا مگر اسے حذف کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ دوسری جانب ساکن الفاظ کو متحرک اور متحرک الفاظ کو ساکن کر دیا جاتا ہے۔ اور یہ ساری باتیں دکھنی شعراء کے یہاں ضرورتِ شعری میں داخل ہیں۔ اسکے علاوہ دکھنی مصنفین ہائے ہوز اور ہائے مخلوط، یائے معروف اور یائے مجہول میں بھی عموماً تفریق کے عادی نہیں۔ ایسے الفاظ جن کو ایک ہی لہجے میں ادا کرنا چاہیئے۔ جیسے بولیا، سنیا، گریا وغیرہ اکثر ان کو ٹکڑوں میں ادا کیا جاتا ہے جیسے بول یا، سن یا، گر یا وغیرہ۔ اور یہ ساری چیزیں نثر سے زیادہ نظم کے متن کی ترتیب کے وقت ایک سنگین مسئلہ بن جاتی ہے۔

اکثر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ نسخے کی قدر و قیمت بڑھانے کی خاطر ان کے سنہ کتابت میں مالکین خود چاہی ترمیم کر لیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک بڑا ادبی جرم ہے جس کی سزا محقق کو اس طرح بھگتنی پڑتی ہے کہ جب بھی ایسے سنہ کتابت کے تعلق سے اس قسم کا شبہ ہو تو دوسری شہادتوں کے ساتھ کاغذ اور روشنائی کو بھی بہ نظرِ غائر جانچتے ہوئے نسخے کی قدامت اور کتابت کے قریبی سن کا اندازہ لگائے۔

دکھنی ادبیات کی تحقیق میں ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ ہمارے اکثر محققین مسائلِ تصوف سے پوری طرح واقف نہیں۔ حالانکہ کسی بھی خانوادے کی مجموعی طور پر ادبی خدمات کا جائزہ یا فردِ واحد کے ادبی کارناموں کا محاکمہ اس وقت تک ناممکن ہے جب تک ان مخصوص خانوادوں کے مرکزی افکار، نظامِ تصوف اور مخصوص اصطلاحوں سے پوری طرح واقفیت حاصل نہ ہو یہی وجہ ہے کہ اکثر رسائل کا غلط انتخاب نظامِ تصوف پر پوری توجہ نہ دینے کی بناء پر ہی ہوا ہے۔

زبان کی وسعت اور ارتقاء کا صحیح طور پر اندازہ اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ ادب پارے میں شامل روز مرّہ اور محاوروں کا بھی مطالعہ کیا جائے اور یہ ایک دشوار گزار مرحلہ ہے۔ کیونکہ ہمارے اکثر محققین دکھنی زبان کے روز مرّہ محاروں اور ضرب الامثال کے حقیقی پس منظر اور محلِ استعمال سے پوری طرح واقف نہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ ڈاکٹر حسینی شاہد نے اپنی کتاب "شاہ امین الدین علی اعلیٰ حیات اور کارنامے" میں اس جانب خاص توجہ دی ہے۔ لیکن اس واحد مقالے سے مجموعی طور پر دکھنی ادبیات کا یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ محمد اکبرالدین صدیقی جیسے ماہر دکھنیات کی نگرانی میں دکھنی روز مرّہ محاروں اور ضرب الامثال پر باقاعدہ تحقیق

(باقی صفحہ ۲۹ پر)

کے۔ کے۔ کھلّر

داغ دہلوی

جن لوگوں نے داغ کو دیکھا اور سُنا ہے ان میں حضرت بیخود دہلوی کو نمایاں اور ممتاز مقام حاصل ہے۔ ان کے مطابق داغ کے کلام کی مقبولیت کا یہ حال تھا کہ جو غزل رات کو مشاعرے میں پڑھتے تھے۔ صبح کو کوچہ و بازار میں لوگوں کی زباں پر ہوتی تھی۔ اکثر شاعر داغ کی مقبولیت سے جلتے تھے۔ ان میں سے ایک نے تو سرِ راہ ٹوک کر کہا۔ حضرت آپ کا اور میرا آج فیصلہ ہو جانا چاہیئے۔ میں اچھا شعر کہتا ہوں یا آپ۔ داغ نے کہا۔ حضرت شعر تو اچھا آپ ہی کہتے ہیں لیکن لوگ میرے ہی شعر پسند کرتے ہیں تو میں کیا کروں ؟

داغ کے غزل پڑھنے کا انداز انوکھا تھا۔ شاید ہی کوئی ایسا مشاعرہ دلّی میں ہوا ہو جسے داغ نے نہ لوٹا ہو۔ بیخود کہتے ہیں کہ مشاعرہ میں "داغ ہمیشہ تحت اللفظ غزل پڑھتے تھے۔" فصاحت زبان کی بلائیں لیتی تھی۔ الفاظ موتیوں کی طرح ڈھلتے چلے آتے تھے۔ شعر اس خوبی سے ادا کرتے تھے کہ سننے والے کے سامنے نقشہ کھنچ جاتا تھا۔ میں نے ان سے بہتر غزل پڑھتے کسی کو نہ سُنا۔" ان کے سامنے کبھی کسی کی غزل کامیاب نہ ہوتی تھی۔ آخر عمر میں مشاعرہ میں خود غزل پڑھنی چھوڑ دی تھی۔ کسی اور سے پڑھوا دیتے تھے۔ طبیعت میں نفاست تھی۔ عطر کا بہت شوق تھا۔ ظہر کے وقت بیسن مل کر اوپر کا جسم دھلتا تھا۔ پھر سارے جسم پر عطر ملا جاتا تھا۔ اس کے بعد ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد ایک کرتہ پاجامہ روز بدلا جاتا تھا۔ جسم قدرت نے ایسا بنایا تھا کہ لباس زیب دیتا تھا۔ دلّی کے شرفاء کا لباس لوہارو وضع کی ٹوپی۔ نیچی چولی کا انگرکھا۔ سیدھی تراشی کا پاجامہ رامپور جانے سے پہلے قیام دلی کے دوران یہی لباس تھا۔ حیدرآباد جا کر اچکن یا شیروانی۔ پاؤں میں ڈیڑھ حاشیہ کا جوتا، انگریزی جوتا بھی خوب جچتا تھا۔ کبھی کبھی پگڑی بھی استعمال کرتے تھے۔ حقّہ کا خوب شوق تھا۔ پیچوان پیتے تھے۔ اور چلم کسی وقت ٹھنڈی نہ ہوتی تھی۔ شطرنج اور چوسر خوب کھیلتے تھے۔ غضب کا حافظہ تھا۔ موسیقی کے ماہر تھے۔ ستار اتنا اچھا بجاتے تھے کہ سننے والے دنگ رہ جاتے تھے آواز میں بے انتہا درد تھا۔

داغ دہلوی نواب شمس الدولہ کے بیٹے تھے۔ دلّی کے لال قلعہ میں تعلیم پائی اور سن ستاون کے انقلاب کے بعد رامپور چلے گئے تھے۔ یہاں نواب یوسف علی خان کے سلوک نے انہیں اتنا متاثر کیا کہ وہیں کے ہی ہو کر رہ گئے۔ نواب رامپور کے انتقال کے بعد ۱۸۸۶ء میں انگریزوں نے درباری شعراء کے وظیفے بند کر دیئے، تو داغ نے رامپور چھوڑ دیا۔ ؎

ہے عجیب شہر مصطفیٰ آباد — اس کو رکھنا مرے خدا آباد
سب اسے رامپور کہتے ہیں — ہم تو آرام پور کہتے ہیں
خیر تو آپ کی مناتے ہیں — جس کا کھاتے ہیں اس کا گاتے ہیں

رامپور چھوٹا تو حیدرآباد پہنچے۔ جہاں میر محبوب علی خان

یعنی نظام حیدرآباد نے وہ عزت بخشی کہ اپنا سیاسی صلاح کار بنا لیا۔ حیدرآباد میں داغؔ نے دلی کی شاعری کے چراغ روشن کئے۔ دکھنی زبان پر فریفتہ تھے۔ اس زبان کے شعر گھنٹوں سنتے رہتے تھے۔

داغؔ کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے فارسی اور عربی کے بوجھل الفاظ کا استعمال نہیں کیا۔ اُردو میں ایسے سلیس، سادہ اور آسان شعر لکھے کہ سارے ہندوستان میں اس کی دھوم مچا دی۔ ؎

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغؔ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

ان کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ سارے ہندوستان میں ان کے شاگرد ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ مولانا احسن مارہروی اور علامہ اقبالؔ جیسے باکمال ان کے شاگردوں میں تھے۔ اُردو شاعری کو مقبول، عوام پسند اور دلوں سے قریب لانے میں داغؔ دہلوی اور ان کے شاگردوں نے جو نمایاں حصّہ لیا ہے ابھی اس کا بھرپور جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔ اُردو زبان پر داغؔ کے جو احسانات ہیں ان کے شمار کا وقت آگیا ہے

داغؔ اس زمانے کی یادگار ہیں جب اُردو ادب وقت کے تقاضوں کو سمجھ کر ہوا کے رُخ کو پہچان رہا تھا۔ سرسیّد احمد، حالیؔ، شبلیؔ وغیرہ اُردو ادب کا رُخ موڑ رہے تھے۔ لیکن یہ نیا رنگ سخن ابھی عام نہیں ہوا تھا۔ ادبی ادب و شاعری میں داغؔ دہلوی، امیرؔ مینائی، جلالؔ لکھنوی اور اسیرؔ لکھنوی کا سکّہ چل رہا تھا۔ حالانکہ ان کی شاعری میں اس بدلے ہوئے نظام اور زمانے کا ذکر نہیں ہے۔ لیکن ان لوگوں نے اپنی صلاحیتوں سے زبان کو جس حد تک سنوارا اور نکھارا ہے اس سے اُردو ادب کا ہر طالب علم واقف ہے۔ صنائع و بدائع، تشبیہ و استعارہ روزمرّہ اور محاورہ، فصیح و غریب الفاظ سے متعلق ان کے مباحث نے اُردو میں ایک ایسی جاندار روایت کی بنیاد ڈالی جس نے زبان کو بے حد فائدہ پہنچایا۔ لغت اور زبان کے اُصولوں پر بھی کئی کتابیں لکھی گئیں۔ اس طرح قدیم رنگ اسی شان و شوکت سے قائم رکھا۔ جیسے جدید اُردو ادب ذہنوں پر چھانے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ قدیم رنگ صرف جام اور ساقی کا رنگ ہی نہیں تھا۔ عاشق، معشوق اور شمع اور پروانے کے رنگ تک محدود نہیں تھا نہ اس میں الفاظ کا گورکھ دھندا تھا۔ نہ تعقیدوں کی بھرمار۔ نہ اس میں ہنگامہ آرائی نہ سیاسی گرم جوشی۔ نہ اپنی طرح کی شاعری تھی جس کا انداز نرالا تھا۔

شوخی و ظرافت داغؔ کا وہ چلکتا ہوا جوہر تھا جس کی آب و تاب آج تک باقی ہے۔ ان کا خلق و عادت کی یہ خوبی ان کی تعلیم زندگی پر ایسے چھائی ہوئی تھی کہ بات بات سے شوخی اور فقرے فقرے سے ظرافت ٹپکتی تھی۔ مرزا غالبؔ کی طرح داغؔ کو اپنی اس فطرت سے فائدے بھی ہوئے۔ مثال کے طور پر اپنی اس زندہ دلی کے باعث وہ غم اور الم کو آسانی سے جھیل لیتے تھے اور اپنی ہر مصیبت کو ہنسی مذاق میں ڈال دیتے تھے۔ ہر بحث و مباحثہ میں حصّہ لیتے تھے۔ ایک دفعہ رامپور میں نواب کلب علی خان کی موجودگی میں لفظ "سانس" پر بحث چھڑ گئی۔ اس لئے کہ دلیؔ میں سانس مذکر سمجھا جاتا ہے اور لکھنؤ میں مؤنث۔ دلیؔ اور لکھنؤ کے شعراء دونوں موجود تھے۔ امیرؔ مینائی اور داغؔ دہلوی بھی تھے۔ جب بحث کافی طول پکڑ گئی اور کسی نتیجہ پر نہ پہنچی تو نواب صاحب نے داغؔ کو مخاطب کرکے کہا۔ داغؔ صاحب آپ بھی کچھ فرمائیے۔ استاد جواباً بولے "حضور میرا فیصلہ یہ ہے کہ مؤنث کا سانس مؤنث اور مذکر کا سانس مذکر سمجھا جائے۔" ■

حمید الماس

۶ چھ نظمیں

① اندیشۂ لمساں

ناخنوں میں
انگلیوں میں
گرد تھی
میرے ہاتھوں کی لکیریں بھی نظر آتی نہ تھیں
صاف پانی میں ڈبو کر
میں نے اپنے ہاتھ دھوئے ہیں ابھی
خشک ہو جائیں گے خود ہی
ہے یہی بہتر کہ
کوئی مسئلہ پیدا نہ ہو
پھر کسی رومال کا — !

② ہماری پہچان

شہر شور انگیز میں
تم جو آؤ تو
ہماری جستجو مشکل نہیں
امتیازاً عرض ہے
ایک ہی تنہا نشاں
جس کے دروازے کھلے ہوں
بس اسے سمجھو
ہمارا ہی مکاں — !

③ زندگی

یوں بھی ہو سکتی ہے
اپنی زیست کی تعریف جیسے
چھینک سی محسوس ہو
آئے نہیں

④ کمزوری

میں نے کل اُسکو پکارا تو وہ انجان رہی
آج جب اسکی ضرورت ہے نہ قربت کی تمنا
میرے پہلو میں وہ ایستادہ ہے
گدگداتی ہے مجھے برق صفت ہاتھوں سے
گنگناتی ہے وہی گیت
جو الماس کی کمزوری ہے !

⑤ نظم کے روپ

بند کمرے کے سرد گوشے میں
کتنی سرگوشیوں کے بعد کہیں
فکر
لفظوں میں ڈھل کے نظم بنی
اور وہ نظم جس کی رگ رگ میں
تھا شجاعت کا گرم گرم لہو
اب تو یہ سوچنا ہے
ہاتھوں میں
کاسۂ فکر ہو کہ یا تلوار ...!

⑥ سوال

خدا
میری جھولی مسرت سے بھر دے
خدا
پھر بتا
اس کرم کے عوض
تیرا ناچیز بندہ
تجھے کون سی چیز دے
کیا کرے
وہ تہی تلب ہے !

سیدہ طیبہ بیگم

عہدِ آصفی کے ادب میں خواتین کا حصہ

سیدہ طیبہ بیگم کو ادبی ذوق ننہیال سے ورثہ میں ملا۔ یہ نانا عماد الملک بہادر، نانی طیبہ بیگم اور والدہ سکینہ بیگم رحمت اللہ جیسی علم دوست ہستیوں نے حیدرآباد کے خالص علمی اور ادبی ماحول میں بلاواسطہ اور بالواسطہ طور پر انکے ذہن کی آبیاری کی۔ انکی حساس فطرت نے جو کچھ زندگی میں دیکھا اور حاصل کیا افسانوں کا روپ دے دیا۔ طالب علمی سے کہانیاں لکھنی شروع کیں۔ مانٹی سوری ماڈل پرائمری اسکول میں ڈرامائکس میں حصہ لیتے لیتے ڈرامے، فیچر اور کہانیاں لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ ریڈیو پر بچوں کے پروگراموں میں حصہ لیتی رہیں اور خود اپنی کہانیاں، فیچر اور ڈرامے پیش کرتی رہیں۔ محبوبیہ گرلز اسکول اور ویمنس کالج کی تعلیمی اور تہذیبی سرگرمیوں میں حصہ لیتی رہیں۔ ان ہی دنوں مختلف رسالوں اور اخباروں میں انکی کہانیاں، مضامین اور افسانے چھپتے رہے۔ لیکن "خوب تر" کی جستجو میں انکی بہت سی کہانیاں انکی کاپیوں میں ہی دفن رہیں اور چھپ نہ سکیں۔ ۱۹۵۵ء میں مجموعہ جوہی کی ڈالی "بچوں کیلئے" اپنی والدہ اور نانی کی کہانیوں کو مرتب کیا۔ ۱۹۷۵ء میں پاکستان میں شوہر کے انتقال نے ذہنی صلاحیتوں کو غم و اندوہ کے طوفان میں بہا دیا۔ اس سانحہ نے کچھ اقتصادی ذمہ داریاں بھی لا ڈالیں۔ نندی ایجوکیشنل انسٹیوٹ، ویلہم گرلز اسکول (دہرہ دون) اور سینٹ پال ہائی اسکول (حیدرآباد) میں کچھ سال پڑھاتی رہیں۔ LIC اور سنڈیکیٹ بینک کے لیے بھی اپنی خدمات پیش کیں۔ علیگڈھ کے قیام کے دوران بیشتر رفاہی کام انجام دیئے۔ ادبی اور سماجی تنظیمیں قائم کیں۔ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے طلباء اور خواتین و بچوں کی مختلف سرگرمیوں میں عملی حصہ لیتی رہیں۔ ۱۹۷۵ء میں انٹرنیشنل ویمنس ایئر کا مڈل بھی دیا گیا۔ رفاہی، سماجی اور ادبی خدمات کے سلسلے میں علیگڈھ میں انہیں مختلف ایوارڈز اور کلرز بھی عطا کیے گئے۔

حیدرآباد آنے پر "محفلِ خواتین" سے وابستہ ہو کر معتمدی کے فرائض انجام دیئے۔ ساؤتھ انڈیا اردو اکیڈیمی کے شعبۂ خواتین کی معتمد مقرر ہوئیں۔ "قلم اور آواز" کے نام سے بحیارہ بلز پر اردو تنظیم کی بنا ڈالی۔ (ادارہ)

عہدِ آصفی کے محبوب بادشاہ نواب میر محبوب علی خان کی سرپرستی میں اردو کا مستقبل شاندار تھا

حیدرآباد کی تہذیب اس کا مزاج، اسکی سوچ اور فکر سب پر اُردو کی گہری چھاپ تھی۔ اہلِ علم و فن نے گوشے گوشے میں علم کی شمعیں روشن کر رکھی تھیں۔ مشاعروں کا سماں ہوتا تھا اور ہر خاص و عام میں شعر و سخن کا ذوق تھا۔ خود بادشاہ شعر کہتے اور "آصف" تخلص فرماتے تھے۔ حضرت داغ سے تلمذ حاصل تھا۔

لیکن ۱۹۱۱ء میں جب آصف جاہ سابع نواب میر عثمان علی خان تخت نشین ہوئے تو حیدرآباد تہذیب و تمدن کا ضامن اور علم و فن کا سرچشمہ بن گیا تھا۔ یہ زمانہ اُردو زبان و ادب کی ترقی کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا اور بلاشبہ "عہدِ زرّیں" کہلانے کا مستحق بھی۔ ۱۹۱۹ء میں جب جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں آیا تو اس گنجینۂ علم و فن میں دور دور سے علم کے پروانے کھنچے چلے آئے۔ شاعروں اور ادیبوں نے عروسِ دکن کو بیش بہا جواہر پاروں سے سنوارا۔ نوخیز ادیبوں اور شاعروں کو نئی جولان گاہیں ملیں۔ اُردو زبان کو ذریعۂ تعلیم بنا کر جامعہ نے دنیا بھر کے علوم اُردو زبان میں منتقل کیئے۔ اور اس کا دامن علمی، فنی اور تیکنیکی اصطلاحات سے بھر دیا۔ حیدرآباد کے علمی و ادبی کارناموں میں جن لوگوں نے نمایاں طور پر حصّہ لیا اُن میں نواب عماد الملک بہادر، نواب فضیلت جنگ، عبدالحلیم شرر اور عزیز مرزا قابلِ ذکر ہیں جن کی کوششوں کے سبب دائرۃ المعارف، دارالترجمہ، کتب خانہ آصفیہ اور جامعہ نظامیہ ظہور میں آئے۔ رفتہ رفتہ مختلف سائنسی مجالس کا قیام بھی عمل میں آیا۔

آصفِ سابع کی سرپرستی اور علم و ادب میں دلچسپی کے باعث اُن کی قدردان رعایا نے انھیں "سلطان العلوم" کا خطاب دیا۔ بقول جناب حبیب الرحمٰن صاحب "بیسویں صدی کے نصف اوّل میں اُردو زبان و ادب کی ترقی و توسیع کے تعلق سے جن افراد کے نام لئے جاتے ہیں ان میں نواب میر عثمان علی خان آصفِ سابع کا نام ہمیشہ سنہرے حرفوں میں لکھا جائے گا۔"

آصفِ سابع خود بھی شعر کہتے اور "عثمان" تخلص فرماتے تھے۔ حضرت فصاحت جنگ جلیل سے تلمذ رہا۔ سراج، نظم طباطبائی اور کشن پرشاد جیسے نامور شاعروں نے کلام میں نگینے جڑے۔ قصیدے، مثنوی، غزل، نظم جملہ اصنافِ شاعری میں شعراء کی نازک خیالیاں فضاء میں تحلیل ہوئیں تو کیا وجہ تھی کہ حیدرآباد کی نسوانی دنیا علم و ادب کے اس سرچشمہ سے سیراب نہ ہو۔!

آصفِ سابع نے پہلی بار طبقۂ نسواں کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی۔ یہ وہ دور تھا جب ہر جگہ انقلاب رونما ہو رہے تھے۔ سیاسی، سماجی، علمی، ادبی، تہذیبی اور صنعتی ترقی کے لئے جد و جہد کا آغاز ہو رہا تھا۔ آصفِ سابع کی دوربین نگاہوں نے خواتین کی بیداری کا حل تلاش کر لیا۔ جہالت، توہم پرستی اور تعصّبات کے پردوں کو گرا کر انہوں نے خواتین کے لئے تعلیم ضروری قرار دی۔ اور تعلیم کے مواقع فراہم کیئے۔ زنانہ مدارس کھولے اور جامعہ عثمانیہ کے ساتھ کلیہ اناث بھی وجود میں آیا جو آج زنانہ کالج یا ویمنس کالج کہلاتا ہے۔

اس طرح خواتین کا احساسِ بیداری جاگا تعلیمی اور تمدنی حالت میں نمایاں فرق ہوا۔ اور انہیں اپنی خوابیدہ صلاحیتوں کے اُجاگر کرنے کا موقع ملا۔ محبوبیہ گرلز اسکول اور نامپلی زنانہ اسکول کے ذریعہ جس کی بنیاد میر محبوب علی خان کے عہد حکومت میں ڈالی گئی تھی۔ لڑکیوں کی تعلیمی حالت سنبھلنے لگی۔ اسکول کے بعد وہ زنانہ کالج اور جامعہ

عثمانیہ سے بی۔ اے، ایم۔ اے اور سائنس کی ڈگریاں لینے لگیں۔ قدامت پرستی کو خیرباد کہہ کر لڑکیوں نے طرزِ جدید پہ اپنی زندگی کو ڈھالنا شروع کیا۔ عمل کے ہر میدان میں کود پڑیں۔ جب علم نے سنوارا تو ادب کے خزانے بھی ان کے رشحاتِ قلم سے بھرنے لگے۔ تعلیم کی روز افزوں ترقی تہذیب و تمدن کے مینار بھی روشن کرتی چلی جو خواتین گھر کی چار دیواری میں موتی بکھرتی تھیں وہ بھی پردے سے باہر آئیں۔ اور پھر وہ ہوا جو اب تک نہ ہوا تھا۔ نسوانی فکر و جذبات نے اُردو ادب میں دلآویزی پیدا کردی۔ معاشرت کو سنوارنے کی باتیں عمل کی حد تک پہنچیں۔ خواتین اپنے حقوق حاصل کرنے میں کوشاں ہوئیں اور قومی تحریکوں میں حصّہ لینے لگیں۔ اور پھر دکن دیس کی خواتین مردوں کے شانہ بہ شانہ زندگی کے سفر پہ رواں دواں ہوئیں۔ نئے راستے بنتے گئے تو منزلیں ملتی گئیں۔ نئے آفاق پیدا ہوتے گئے۔ سراج طباطبائی اور شاد کی شعلہ نوائیوں کے ساتھ خاتون شعراء کی رنگیں بیانیاں عہدِ آصفی کے ادبی ماحول میں رنگ بھرنے لگیں۔ دکن کی چہیتی اور عظیم شاعرہ بشیر النساء بیگم بشیر کا احساسِ تشکر و عقیدت پھول بن کر شہرِ عثمان پر برسنے لگا۔ ؎

نہ پوچھ اسکی حقیقت کہ آج کیا ہے دکن
وقارِ ہند کا باعث بنا ہوا ہے دکن
وہ کوہِ نور، وہ ہیرے نہ ہوں بھی تو کیا غم
جواہراتِ ادب سے بھرا ہوا ہے دکن!
معاشرت میں، تمدن میں اور ہر اک فن میں
ترقیوں کے منازل پہ آگیا ہے دکن
یہ فیض ہے شہِ عثماں کی حکمرانی کا
کہ یادِ عظمتِ رفتہ دلا رہا ہے دکن

بشیر

عہدِ آصفی سے قبل حیدرآباد کی سیاسی، معاشرتی اور سماجی حالات ایسے نہ تھے کہ عورت پردہ سے باہر آکر اپنا لوہا منوا سکتی یا اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے آواز اٹھا سکتی۔ پرانے رسم و رواج کی بیڑیاں ان کے پیروں میں کھڑکھڑا رہی تھیں۔ توہمات میں گھری ہوئی خواتین چڑھتے ہوئے سورج اور پھیلتے ہوئے اجالے سے مستفید نہیں ہوسکتی تھیں۔ زندگی کے تقاضوں سے بے تعلق انکی سوچ و فکر گھر کی چار دیواری سے آگے نہ بڑھ سکتی تھی۔ طبقہ نسواں کی اس زبوں حالی اور محرومیوں نے محترمہ طیبہ بیگم بلگرامی کے احساس کو جھنجھوڑا۔ طیبہ بیگم مرحومہ آصفِ سابع کے اتالیق نواب عماد الملک بہادر کی صاحبزادی تھیں جو عالم اور مفکر ہونے کے علاوہ حامیانِ اُردو اور تعلیم نسواں میں سے تھے۔

طیبہ بیگم نے نامپلی گرلز اسکول سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مدراس یونیورسٹی سے ۱۹۰۷ء میں گریجویشن کیا۔ یہ پہلی مسلم خاتون تھیں جنہوں نے بی۔ اے۔ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ اُردو، فارسی، عربی اور انگریزی میں مہارت رکھتی تھیں۔ شستہ علمی ماحول میں انہوں نے اپنا ادبی سفر شروع کیا۔ اپنے ادبی مضامین، ناول اور فکر انگیز تقاریر کے ذریعہ انہوں نے سماج اور معاشرے کی خرابیوں، جمود و جہالت اور دقیانوسی رسم و رواج سے خواتین کو چھٹکارا دلانے کا بیڑہ اٹھایا۔ غریب لڑکیوں اور خواتین کی علمی، اخلاقی اور معاشی حالت کو درست کرنے ۱۹۱۳ء میں "انجمن خواتینِ اسلام" کی بنیاد ڈالی جسے آج بھی ان کی صاحبزادیاں معصومہ بیگم اور سکینہ بیگم سنبھال رہی ہیں۔

تصنیف و تالیف علمی خدمات کا نچوڑ ہیں۔

کسی ملک و قوم کے دماغی اور ذہنی ارتقاء کے معیار کا اندازہ
ں دور کی تصانیف و تالیفات سے ہی ہوتا ہے۔ اس دور
کی معاشرت اور تمدن کی بہترین عکاسی طیبہ بیگم نے اپنے
ناول "انوری بیگم" میں کی ہے۔ ان کا دوسرا ناول
"حشمت النساء" بچوں کے مستقبل کو سنوارنے کا ایک
کامیاب تجربہ ہے۔ "اسرار سلیمانی" انکے ترجموں کا
مجموعہ اور "رسائل طیبہ" ان کے مضامین کا مجموعہ ہے جسے
ادارۂ ادبیات اُردو نے شائع کروایا ہے۔ اپنے ناولوں
مضامین، ترجموں اور تقاریر کی وجہ سے مرحومہ نے دنیائے
ادب میں ایک خاص مقام پیدا کر لیا۔ چنانچہ یہ پہلی مسلم
خاتون تھیں جنھوں نے دورِ آصفی میں ادب کے ذریعہ ایک خوبصورت
انقلاب برپا کر دیا۔

حیدر آباد کی تاریخ اپنی خواتین کی بیداری اور
ترقی کا دلچسپی سے مشاہدہ کر رہی تھی۔ ادب و ثقافت منتظر
تھا کہ نسوانی تحریر اور قومی تحریک کے جادو کیسے سر
چڑھ کر بولتے ہیں!

صغرہ بیگم ہمایوں مرزا کی عورتوں کے مسائل سے
دلچسپی نے انہیں طیبہ بیگم بلگرامی (بیگم افسر یوجنگ) کے
ساتھ ملکر پردہ نشین خواتین کے اندھیرے راستوں میں اجالے
پیدا کرنے کی لگن پیدا کر دی تاکہ وہ اپنی منزل خود پہچان
سکیں۔ چنانچہ وہ "انجمن خواتینِ اسلام" کی سکریٹری بن گئیں۔
پھر "انجمن خواتین دکن" کے قیام پر اس کی صدر بن گئیں۔

صغرا بیگم ایک سلجھی ہوئی ادیبہ اور شاعرہ تھیں
اُردو ادب کو انہوں نے "موہنی"، "زہرہ"، "آوازِ غیب"
"بی بی طوری کے خواب" "سفینۂ نجات" "پند و نصائح"
"مشیرِ نسواں" اور "سرگزشت ہاجرہ" جیسی کتابیں دیں۔
مختلف سفر نامے لکھے۔ "النساء" اور "زیب النساء" نامی دو
رسالے جاری کر کے لڑکیوں اور خواتین کے مسائل پیش کیے

شاعری کا بھی ذوق تھا۔ حیا تخلص کرتی تھیں اور استاد جلیل
سے تلمذ حاصل رہا۔

ان دونوں خواتین نے جذبِ دل اور زورِ قلم سے
طبقۂ نسواں کو "خودی کی بلندی" اور "پروازِ فکر" کی
دعوت دی۔

اس ضمن میں میں اگر بلبلِ ہند مسز سروجنی نائیڈو
کا ذکر کروں تو بے جا نہ ہوگا۔ دکن کی یہ وفادار اور قابل
فخر بیٹی نے گو انگریزی زبان میں گیت گائے لیکن اُردو
زبان اور شاعروں اور اُردو مصنفوں کی سرپرستی بھی کی۔
اقبال، جوش، حفیظ اور امجد کے کلام کی قدر داں
تھیں۔ انہوں نے اُردو میں دھواں دار تقاریر بھی کیں۔
نیشنل کانگریس کی رکن بنکر جیل کی سختیاں بھی جھیلیں
بعد میں کانگریس کی صدر بھی رہیں۔ عہدِ آصفی کی ایک عزیز
خاتون کے یہ کارنامے بے شک حیدر آباد کے لئے طرۂ امتیاز ہیں۔

۱۹۲۹ء میں ادارۂ ادبیاتِ اُردو کے زیرِ سرپرستی اُردو
نسوانی دنیا میں علمی و عملی سرگرمی اور علم و ادب کا صحیح
سنجیدہ اور سلجھا ہوا ذوق پیدا کرنے کی غرض سے جب "شعبۂ
نسواں" قائم کیا گیا تو اسکی مجلس عاملہ کی صدر محترمہ رابعہ
بیگم انوار اللہ تھیں جنکی علمی و ادبی صلاحیتوں کا چرچہ تھا
اُردو فارسی اور عربی کی تعلیم گھر پر ہوئی۔ اخلاقی اور اسلامی
نظمیں لکھتی رہیں۔ "سوتیلی ماں" ان ہی کے قلم کی رہین منت
ہے۔ انکے خیالات سلجھے ہوئے پاکیزہ ہوتے ہیں۔ کئی عرصے تک
آپ محبوبیہ گرلز اسکول میں اُردو اور فارسی بھی پڑھاتی رہیں۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ کی شریکِ حیات تہنیت
النساء بیگم نے بھی اُردو ادب میں اپنی دلکش تخلیقات سے ایک نمایاں
مقام پیدا کیا۔ یہ پرانی تہذیب کی دلدادہ ہیں۔ غزل کے پیرائے
میں نعت اور قصیدے لکھتی رہیں۔ اپنے وارداتِ قلبی کو بے ساختہ
وار پیش کرتی ہیں۔ کلام خلوص و تاثر سے بھرپور اور عشقِ رسول

سے لبریز ہوتا ہے۔ لطافت اور موسیقی ان کے ہر شعر سے ٹپکتی ہے۔ "ذکر و فکر" "صبر و شکر" اور "تسلیم و رضا" انکے نعتیہ کلام کی قندیلیں ہیں۔ بقول آغا حیدر حسن "ہر نعت ایک چراغ ہے۔ کیا چراغ جس کی اللہ میاں قرآن میں تعریف فرماتے ہیں کہ نور کی قندیل ہے اور اس میں زیتون کے تیل کا چراغ روشن ہے۔ زور بیگم کی نعتوں کی قندیلیں حرم نبوی میں نظر آتی ہیں۔ اللہ یہ اتنے سارے روشن حسین چراغ ان کے پاس کہاں سے آئے؟"

آغا صاحب تہنیت النساء بیگم کو "زور بیگم" کہا کرتے تھے جنھوں نے ادارہ کے قیام کے دوران اپنے شوہر کا خلوص دل سے ہاتھ بٹایا ہے۔

سکینہ بیگم رحمت اللہ نواب عماد الملک کی نواسی اور محترمہ طیبہ بیگم بلگرامی (خدیو جنگ) کی دوسری صاحبزادی ہیں۔ محبوبیہ گرلز اسکول سے سینیئر کیمبرج کیا۔ اُردو فارسی اور انگریزی میں مہارت رکھتی ہیں۔ مضمون نویسی اور افسانہ نگاری میں شہرت حاصل کی جدید و قدیم رجحانات کا خوشگوار امتزاج رکھتی ہیں۔ سخن فہمی اور سخن سنجی کے ساتھ شعر گوئی کا بھی شوق ہے۔ سکینہ تخلص کرتیں۔ اور سید علی حیدر نظم طباطبائی سے تلمذ لیتی رہیں۔ انداز بیان سلیس پُر اثر اور شستہ ہے۔ ادارۂ ادبیات اُردو کے شعبۂ نسواں کی معتمد اور رسالہ "سب رس" کی مجلس ادارت کی رکن رہیں۔ "نذرِ دکن" کے نام سے خواتین کی قلمی کاوشوں کو کتابی صورت دی اور "رسائل طیبہ" میں اپنی والدہ کے مضامین و تقاریر کو شائع کیا۔ انکے افسانے اور تقاریر ریڈیو سے بھی نشر کئے گئے۔ غریب عورتوں کو تعلیم کے ساتھ انہوں نے دست کاری اور کشیدہ کاری بھی سکھائی۔ ادارہ کی طرف سے تعلیم بالغان کا سلسلہ شروع ہوا تو اس میں دلچسپی لی۔ گرلز گائیڈ کی کمشنر رہیں۔ نسوانی کانفرنسوں، جلسوں اور انجمنوں میں شریک رہیں۔ دواخانۂ عثمانیہ میں آنریری کارکن کی حیثیت سے مریضوں کی دیکھ بھال بھی کی۔ فنونِ لطیفہ سے بھی دلچسپی رہی۔ اپنے علمی اور سماجی کاموں کے سبب مقبول رہیں۔ فی الحال "انجمن خواتینِ اسلام" اور "مدرسہ فوقانیہ نسواں معظم جاہی مارکٹ" کا کام سنبھال رہی ہیں۔

بشیر النساء بیگم بشیر حیدرآباد کی علمی، ادبی اور تہذیبی زندگی کی روحِ رواں تھیں۔ کوئی ادبی محفل ایسی نہ تھی جہاں بشیر کے نغمے نہیں گونجتے تھے۔ بشیر کی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ اُردو، فارسی پر عبور حاصل تھا۔ کم عمری سے ہی مزاج شاعری کے لئے موزوں ہو گیا۔ کسی سے اصلاح نہیں لی۔ ۱۹۲۷ء سے شاعری کا آغاز کیا۔ نظم، غزل، قصیدے، نعت، مسدس لکھتی رہیں۔ قوم کو فلاح کی راہ دکھائی۔ اور ناسازگار حالات سے واقف کرایا۔ حیدرآباد کی تہذیب کی دلدادہ اور اسلامی معاشرت کی نمائندہ رسالے "دکن دلیس"، "خدمتِ نسواں" اُردو زبان اور شاعری بشیر کی ادبی سرگرمیوں اور چاہت بھری زندگی کے چار مینار تھے جنکے اطراف انکی زندگی پروانہ وار گھومتی رہتی۔

بشیر کی ذات ماضی کی شاندار روایات کی امین اور عہد نو کے لئے اقدار اور تقاضوں کی پاسبان تھی۔ انکا معاشرے میں عورت کو صحیح مقام کے نہ ملنے پر ان کا دل کڑھتا تھا۔ ؎

عورت کے دم سے کہتے ہیں نظمِ حیات ہے
مجبور کیوں زمانے میں پھر اسکی ذات ہے؟

عورتوں کے حقوق کی انہوں نے پُرجوش سفارش کی۔ بشیر مجسم شعریت تھیں۔ انکی شاعری لطافت و پاکیزگی نسوانی وقار، اعلیٰ اقدار اور قومی جذبات محبت سے معمور تھی۔

اُلفت اگر ہو آپ کو ہندوستاں سے
غافل نہ آپ ہو کبھی اُردو زباں سے
اس دورِ کشمکش میں ہوئی نیم جان ہے
للہ سنبھالئے کہ یہ اپنی زبان ہے

دو زبانوں سے انہیں عشق تھا۔ ایک جگہ لکھتی ہیں۔

زباں کی قدر میں خود اپنی قدر دانی ہے
زباں کے رشتے سے مربوط زندگانی ہے
زباں نہ ہو تو ادب کا کوئی وقار نہیں
ادب نہ ہو تو زباں کا زباں کا کہیں شمار نہیں
مجھے یقین ہے جب تک ہے یہ دکن باقی
رہے گی اُردو کہ اُردو کا ہے وطن باقی

اقبال کے فلسفۂ حیات سے متاثر رہیں۔ انکے
اشعار پر اکثر اقبال کے اشعار کا دھوکہ ہوتا ہے۔ شاعری
ساتھ نثر نگاری کا بھی شوق تھا۔ انکا شعری مجموعہ "آبگینہ"
نے" ادارہ ادبیاتِ اُردو نے ۱۹۴۸ء میں شائع کیا جس
حسن الدین احمد کے الفاظ میں "بندشوں کی دلکشی خیال
بلندی، فکر کی گہرائی اور الفاظ کی موزونیت
اشعار میں ایک خاص رنگ تغزل پیدا کر دیا ہے۔"
بشیر ادارہ کے شعبۂ نسواں کی شریک معتمد رہیں۔
کے انتقال پر ڈاکٹر زورؔ نے یہ کہہ کر خراج عقیدت
پیش کیا۔ "اُردو شاعری کو کسی نے خیالی نزاکت، کسی
جذباتی جدت دی مگر بشیرؔ نے سب سے بڑا احسان
ہے۔ اس نے اُردو کو شرافت سے نوازا۔"

نوخیز ادیب و شاعر خواتین کی ہمت افزائی کے لئے
محفلِ خواتین" کے نام سے ادبی انجمن قائم کرنے کی جو تجویز محترمہ
طاہرہ سعید نے رکھی تھی۔ اسکی داغ بیل پڑی تو صدارت
لئے محترمہ عظمت عبدالقیوم کے نام کا انتخاب عمل میں آیا
دیں صرف خواتین ہی اپنی تخلیقات پیش کرتی ہیں۔ "نزول

کی رات" محفلِ خواتین کے تحت خواتین کے مضامین و شاعری
کا حسین مُرقع ہے۔ راقم الحروف کو اس محفلِ خواتین
کی معتمد رہنے کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔ اس وقت محترمہ
فاطمہ عالم علی اسکی معتمد ہیں۔ اور محترمہ زینت ساجدہ
اسکی نائب صدر ہیں۔ عظمتؔ کا کلام بھی انکے نام ہی کی طرح
عظیم اور پاک و صاف ہے۔ شاعری کا ذوق ورثہ میں
ملا۔ عظمتؔ تخلص کرتی ہیں۔ "رگِ گل" اور "زیرِ گل" انکے
پاکیزہ خیالات اور ستھرے ذوق کی غمازی کرتے ہیں۔
"رگِ گل" پر اُتر پردیش اُردو اکیڈیمی ایوارڈ بھی مل چکا
ہے۔ عظمتؔ کی شاعری کے لئے نیاز فتحپوری لکھتے ہیں۔
"عظمتؔ کی غزلیں عاشقانہ رنگ کی ہیں لیکن نہایت پاکیزہ
ان کے اشعار سے انکی بلند قدرتِ فکر کا اندازہ ہوتا ہے
عظمتؔ کی شاعری پر انکے تخلص کا بڑا گہرا اثر پڑا ہے"
ہر دیں آگرہ جہاں ایک شہنشاہ کے غم نے زلفِ
شبانہ کے غم میں ایک مقدس آنسو کو جنم دیا تھا۔ اُسی شہر
میں نے اصفہانی خاندان میں آنکھیں کھولیں۔ لکھنؤ میں تعلیم
پائی۔ طہران میں ازدواجی رشتہ میں منسلک ہوئیں۔ اور پھر
حیدرآباد کو اپنا وطن بنالیا۔ یہ ہیں محترمہ بانو طاہرہ
سعید۔ تاج محل کے ماحول میں پلنے والی روح کو شاعر
ہی ہونا تھا۔ بانو کا کلام بلند ترین اقدار کی عکاسی کرتا ہے۔
کلام میں سادگی، سلاست اور جذبات کی فراوانی ملتی ہے
فکر و فن کی بلندیاں اور دلنوازی ملتی ہے۔ اکثر اشعار میں
صوفیانہ رنگ جھلکتا ہے۔ نظم اور غزل دونوں پر دسترس
رکھتی ہیں۔ رباعی قطعے اور سونٹ بھی لکھتی ہیں۔ اُردو فارسی
اور ہندی کے حسین امتزاج کو اپنے کلام میں سمو کر اپنا
ایک منفرد مقام پیدا کر لیا ہے۔ ایرانی نژاد ہونے کے
باوجود اُردو سے انہیں بے انتہا پیار ہے۔ رفیعہ قیصر
شہر اورنگ آباد کی ہیں۔ اُردو کو اپنے خون دل سے سینچا۔ سلیم پیکر

ہمارا نام بھی ہے خاندانِ اُردو میں
جلائے ہم نے بھی اُسے طاہرہ سخن کے چراغ

نگینے'، 'ہدیۂ طاہرہ'، 'برگِ سبز'، 'گلِ خونچکاں'، شیاں ہمایا'، 'مہکتے ویرانے' انکے شعری مجموعے ہیں۔ سات دہ بت' اور 'خونِ جگر' نثر نگاری کے نمونے ہیں۔ گریزی سے اُردو میں منظوم ترجمے بھی کئے ہیں جنکا نام "مثبت لی" ہے۔ "دلِ شب" فارسی کلام کا مجموعہ ہے۔ انکے چند شعر پیش ہیں۔ ؂

نشترِ غم کی چبھن ہو تو غزل ہوتی ہے
دل کے زخموں میں جلن ہو تو غزل ہوتی ہے
یوں تو ہونٹوں کا تبسم بھی ہے اِک قوسِ قزح
ان کے ماتھے پہ شکن ہو تو غزل ہوتی ہے
گنگناتا ہے کوئی وجد میں آتا ہے کوئی
محفلِ اہلِ سخن ہو تو غزل ہوتی ہے

خدیجہ بیگم نورالحسن ڈرامہ نگار ہیں۔ بچوں کے لئے مختلف ڈرامے لکھے اور پیش کئے جن میں "نور جہاں"، "تانا شاہ" اور "دسترخوان" قابلِ ذکر ہیں۔ ماڈل پرائمری اسکول کی ہیڈ مسٹریس رہ چکی ہیں۔ بچوں کو ڈراموں کے ذریعہ تاریخ سے روشناس کرانے کا انکا یہ ڈھنگ قابلِ ستائش ہے۔

عہدِ آصفی کی ان قابلِ ذکر خواتین کے علاوہ اس دور کی دیگر خواتین میں عصمت سلطانہ بیگم، سارہ بیگم، رقیہ بیگم، آمنہ ہارون خان شیروانی، قیصری بیگم بیسی نندی، پادشاہ بیگم صوفی وغیرہ بھی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ چند ایک نام میرے علم میں نہ آسکے ہوں جن کے لئے میں معافی کی خواستگار ہوں۔

ہندو خواتین نے بھی اُردو ادب کو اپنے خیالات سے مزین کیا ہے جن میں مسز برکت رائے، رتن کندن لال، تلسی مانک رام اور شیل بالا قابلِ ذکر ہیں۔ جن کا مختصراً ذکر کر رہی ہوں۔

رتن بنارس سے حیدرآباد آئیں۔ گھر کا ماحول خالص علمی تھا۔ محبوبیہ اسکول سے تعلیم پانے کے بعد رینا ٹی ہائی اسکول سے بی۔ اے، بی۔ ایس۔ سی، اور ایم۔ ایس۔ سی کیا۔ فنونِ لطیفہ اور شاعری کا بے حد شوق تھا۔ غزل اور نظم دونوں لکھتی رہیں۔ انکی شاعری میں آمد تھی۔ تحریر سادہ اور مؤثر تھی۔

مسز برکت رائے نے گھر ہی پر اُردو، فارسی اور انگریزی کی تعلیم پائی۔ ملکی و سماجی کاموں سے دلچسپی کے علاوہ مضمون نگاری اور شاعری بھی ان کے محبوب مشغلے رہے۔ بچوں کے لئے بھی نظمیں لکھتی رہیں۔ نظموں کا مجموعہ "بچوں کے بتاشے" بچوں میں مقبول رہا۔

تلسی کشمیر سے جب حیدرآباد آئیں تو یہیں بس گئیں۔ تعلیم اُردو، ہندی اور انگریزی میں ملی۔ اسکے بعد پونہ مشن اسکول میں شریک ہوئیں۔ لیکن گھر پر اُردو، فارسی جاری رہی۔ پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے۔ کیا۔ تلسی کو اُردو ادب اور شاعری کا خاص ذوق تھا۔ چھوٹی بحر میں بھی لکھتیں۔ نمونہ ہے۔ ؂

سجدۂ شوق کو کیا قیدِ مقام
کر لیا سجدہ جدھر یاد آیا!
کس قدر آنکھ سے نکلے آنسو
جب بھری شام کو گھر یاد آیا

شیل بالا حیدرآباد کے کوی راج کنول پرشاد کنول کی شریکِ حیات ہیں۔ آگرہ کی تھیں۔ لیکن اندور میں ابتدائی تعلیم پائیں۔ بنارس یونیورسٹی سے بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ کرکے حیدرآباد آئیں۔ اُردو ہندی میں افسانے اور نظمیں لکھتی رہیں۔ حیدرآباد اور اورنگ آباد کی نشرگاہوں سے انکی چیزیں نشر ہوتی رہیں۔ شاعری سلیس اور ستھری

انکی ایک نظم "کسکو بھولوں کیا یاد کروں" ہندوستانی شاعری کا رسیلا نمونہ ہے۔

جامعہ عثمانیہ نے جن خواتین ادیب اور شعراء کو اُردو زبان و ادب کی خدمت گزاری کے لائق بنایا۔ ان میں نوشابہ بیگم نوشابہ، جہاں بانو نقوی، لطیف النساء بیگم، نعیم النساء بیگم، نجم النساء، قمر النساء، القدلیق فاطمہ المتین، زینت ساجدہ، رفیعہ سلطانہ، فاطمہ عالم علی خان اور سلطانہ شرف الدین قابلِ ذکر ہیں۔ نئی نسل کی لکھنے والیوں میں جیلانی بانو، آمنہ ابوالحسن، عفت موہانی، رفیعہ منظور الامین اور سیّدہ جعفر ہیں۔ اور آپ اجازت دیں تو کہوں کہ راقم الحروف بھی ان ہی کی ہمعصر رہی ہے۔

ان خواتین کے کلام و نثر میں قدیم معاشرت کی عکاسی بھی ملتی ہے اور جدید خیالات کی ترجمانی بھی۔ عشق و محبت کی داستانوں اور گل و بلبل کی حکایات میں شیریں بیانی اور جدّت آفرینی ملتی ہے تو طرزِ جدید کی نثر نگاری اور شاعری میں ملک و قوم کو بیدار کرنے اور نئی منزلوں کو ڈھونڈنے کے پیام ملتے ہیں۔ ان میں تغزل بھی ہے، تصوّف بھی، یاس و حرماں کی تصویریں بھی ہیں سرور و مسرت کے نغمے بھی۔ بلند خیالی، سادگی، ندرت و [illegible] انکی تحریر کی خصوصیات ہیں۔

ان سب خواتین کا مختصراً ذکر کرتی چلوں۔..

نوشابہ خاتون نوشابہ — امروہہ میں پیدا ہوئیں پھر حیدرآباد آئیں۔ ابتدائی تعلیم و تربیت گھر پر ہوئی۔ سنہ۱۹۲۴ء میں جامعہ عثمانیہ سے بی۔ اے۔ کیا۔ جامعہ کی پہلی گریجویٹ تھیں۔ گریجویشن کے بعد زنانہ کالج میں اردو، فارسی اور انگریزی کی لکچرار رہیں۔ شاعری کا ذوق رکھتی تھیں۔ کلام میں سادگی اور سلاست تھی۔ غزلیں کم لکھتی تھیں۔ نظم کو نئے سانچوں میں ڈھالتی رہیں۔ انکی نظموں کا مجموعہ "موجِ تخیل" ہے۔

جہاں بانو نقوی رائچور کے ایک ضلع میں پیدا ہوئیں۔ نامپلی گرلز اسکول سے میٹرک اور جامعہ عثمانیہ سے بی۔ اے کیا۔ [illegible] ہائی اسکول میں اُردو پڑھاتی رہیں۔ پھر گوشہ محل مڈل اسکول میں صدر معلّمہ کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ پھر محبوبیہ گرلز اسکول منتقل ہوئیں۔ اور اسی زمانے میں ایم۔ اے۔ کیا اور زنانہ کالج شعبۂ اُردو میں لکچرار بنیں۔ لکھنے کا شوق طالب علمی سے تھا۔ "شہاب" "ساقی" وغیرہ میں لکھتی رہیں۔ انکی کتابیں "رفتارِ خیال" "خطرناک" "بر لبِ ناہید" جو خطوط نویسی کا بہترین نمونہ ہے اور "محمد حسین آزاد" قابلِ ذکر تصانیف ہیں۔ انگریزی افسانوں کا بھی اُردو میں ترجمہ کیا۔ ہر قسم کے موضوعات پر طبع آزمائی کرتی رہیں۔ نثر میں شاعری کرتی تھیں اور شاعری کا بھی بہت اچھا ذوق تھا۔ تشبیہیں اچھوتی، استعارے نازک ہوتے تھے۔ اور عبارت دلکش اور دل آویز۔ نئی نسل کے لکھنے والیوں کی ذہنی تربیت میں ان کا بڑا حصّہ رہا ہے۔ سب رس کے شعبۂ خواتین کی مجلسِ عاملہ میں رکن کی حیثیت سے کام بھی کرتی رہیں۔ علمی اور ادبی سرگرمیوں میں پیش پیش رہتی تھیں۔

لطیف النساء بیگم نے جامعہ عثمانیہ سے ایم۔ اے حاصل کیا۔ شاعرہ اور انشاء پرداز تھیں۔ [illegible] کی تہذیبی خرابیوں کو درد بھرے پیرائے میں قلمبند کرتی تھیں۔ "شہاب" "رہبر دکن" اور "پیام" میں ادبی اور تاریخی مضامین لکھتی رہیں۔ سب رس میں بچوں کے لئے اصلاحی اور علمی نظمیں لکھیں۔ "دل کا غنچہ" ان کا ادبی شاہکار ہے جو تاریخ ادبیات میں یادگار رہے گا۔ سب رس کے شعبۂ نسواں میں مجلسِ عاملہ کی رکن بھی تھیں۔ اندازِ بیان پُرجوش ہوتا تھا۔

ڈاکٹر زینت ساجدہ بھی رائچور میں پیدا ہوئیں بسنہ ۱۹۲۴ء
[illegible]ں جامعہ عثمانیہ سے ایم۔ اے۔ کیا اور زنانہ کالج میں لکچرار
مقرر ہوئیں۔ اُردو کالج، پوسٹ گریجویٹ کالج اور آرٹس کالج میں
بھی پڑھاتی رہیں۔ اب نظام کالج کے شعبۂ اُردو میں ریڈر ہیں۔
انکی تعلیمی اور ادبی خدمات کے اعتراف میں انکے شاگردوں
نے ۱۹۶۱ء میں جشن زینت ساجدہ بھی منایا تھا۔ انہیں ۶۹ء
کا بہترین ٹیچر کا ایوارڈ حکومت ہند کی طرف سے
ملا ہوا ہے۔ ۱۱، دلوا، صدر شعبۂ اُردو عثمانیہ یونیورسٹی کے عہدہ پر فائز ہیں
(۱۱ ادا ۹۰)
علم و ادب کا ستھرا ذوق رکھتی ہیں۔ مطالعہ بے
حد وسیع ہے۔ انکے طنزیہ اور سنجیدہ مضامین، خاکے
اور افسانے مختلف رسائل میں چھپ چکے ہیں۔ دکنی ادب میں
[illegible] ہیں۔ اشرف بیاپوری کی "نوسرہار" پر جس محنت، لگن
اور انہماک سے انہوں نے تحقیق کا کام کیا ہے اس کے صلے میں
انہیں پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری دی گئی ہے۔
زینت ساجدہ کی کتاب "حیدرآباد کے
ادیب" حصہ اول و دوم مصنفین و شعراء کی سوانح خاکے
اور انکی تحریر کے نمونے ہیں جسے ساہتیہ اکیڈمی نے
شائع کروایا ہے۔ انکی تصانیف میں "جلترنگ" افسانوں کا مجموعہ
ہے "مہب دل خواتی" اور "ہمارا عہد" بچوں کے لئے لکھی
[illegible] ہیں۔ "کلیات جری" ہندی میں اور "ہندی کے ۵ [illegible]" اور
[illegible] کی تاریخ" راما راجیہ کے تعاون سے شائع ہو چکی ہیں۔
انداز بیان شگفتہ اور رواں ہوتا ہے۔ ریڈیو سے بھی ان کی
تقاریر نشر ہوتی رہی ہیں۔ ساہتیہ اکیڈمی کی رکن بھی ہیں
اور انجمن ترقی اُردو کی ارکان عاملہ میں شریک ہیں۔ کل ہند
اُردو کانفرنس کی سکریٹری بھی رہ چکی ہیں۔ اُردو دنیا کی مختلف
ادبی سرگرمیوں میں حصہ لیتی ہیں۔ مصنفین اور شاعروں کے مجموعوں
پر دیباچے اور پیش لفظ بھی لکھتی ہیں۔ حیدرآباد کی مانی
جانی ادیبہ ہیں۔

رفیعہ سلطانہ نے جامعہ عثمانیہ سے ایم۔ اے۔ کی ڈگری
حاصل کی۔ ڈاکٹر زور کی شاگرد رہ چکی ہیں۔ طالب علمی سے
لکھنے کا شوق تھا۔ مختلف رسالوں میں لکھتی رہی ہیں۔ دکھنی
ادب پر تحقیق اور تنقیدی کام کرتی رہیں۔ اور علمی ادبی
مضامین لکھتی رہیں۔ ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد
زنانہ کالج میں فارسی کی لکچرار ہوئیں۔ جامعہ عثمانیہ کی صدر
شعبہ اُردو رہیں۔ اور جامعہ کی تخلیقی سرگرمیوں میں پیش پیش
رہیں۔ "کچے دھاگے" انکے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ ان کی
کتاب "اُردو نثر کا آغاز و ارتقاء فورٹ ولیم کالج سے
پہلے" پاکستان سے شائع ہوئی ہے۔ "اُردو ادب کی ترقی
میں خواتین کا حصہ"، "کلمات الحقائق" اور "کلیات احسان"
انکی تحقیقی پرانی کتابیں ہیں۔ تنقیدی مضامین کا مجموعہ
"فن اور فنکار" ہے۔ "حیدرآباد فرخندہ بنیاد" پر
بھی انہوں نے کتاب لکھی ہے۔ کئی ریسرچ اسکالرز انکی زیر
نگرانی پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کر چکی ہیں۔ "دود چراغ محفل" ان
کے ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ آج کل رفیعہ سلطانہ ڈین فیکلٹی آف
آرٹس جامعہ عثمانیہ ہیں۔
سلطانہ شرف الدین نے ۱۹۱۴ء اور ۱۹۵۰ء کے
درمیان جامعہ عثمانیہ سے بی۔ اے، بی۔ ایڈ اور ایم۔ اے
ایم۔ ایڈ کی ڈگری حاصل کی۔ لکھنے کا شوق ابتداء ہی سے
تھا۔ "شہاب"، "رومان"، "سب رس" اور "مجلہ عثمانیہ"
میں افسانے اور مضامین چھاپتی رہیں۔ ڈاکٹر زور کی ایما
پر بچوں کے لئے "نظیر اکبرآبادی" پر کتاب لکھی۔
"فن تعلیم" پر کئی چھوٹے چھوٹے مضامین مختلف
اخباروں میں شائع ہوئے۔ "خواجہ حسن نظامی" پر حال
ہی میں ایک مضمون "آجکل" میں چھپ چکا ہے۔ انکے سوا
آغا حیدر حسن پر لکھے گئے انگریزی مضامین کو اُردو کے قالب
میں ڈھالا۔ ملک راج آنند کی کہانیوں کے ترجمے بھی کئے

شاعری کا بھی شوق رہا اور ترنم سے شعر پڑھتی رہیں ایک صاحبِ طرز ادیبہ ہیں۔ لیکن لکھنے میں تساہل برتتی ہیں شاید یہی وجہ ہے کہ انکی کہانیوں اور مضامین کی کوئی کتاب منظرِ عام پر نہ آسکی۔

ملازمت کی ابتداء پرائمری اسکول سے کی۔ پھر ہائر سکنڈری اسکول اور اس کے بعد Comprehensive college of Education میں اُردو طریقۂ تعلیم پر لکچرار مقرر ہوئیں۔ چادرگھاٹ کالج فار بوائز کی ہیڈ مسٹرس بھی رہیں۔ فی الحال چھوٹے بچوں کے لئے "ودیا دیپ" اسکول چلا رہی ہیں۔

فاطمہ عالم علی جناب قاضی عبدالغفار صاحب جرنلسٹ اور ایڈیٹر "پیام" کی صاحبزادی ہیں۔ جن کا تعلق مراد آباد سے تھا۔ قاضی صاحب کے ساتھ حیدرآباد آئیں تو یہیں کی ہو رہیں۔

فاطمہ نے زنانہ کالج سے تعلیم حاصل کی۔ اُردو ادب سے موروثی لگاؤ رہا چنانچہ مضامین، انشائیے اور خاکے لکھتی رہیں۔ مختلف رسائل میں انھوں نے اپنے رشحاتِ قلم چھپوائے۔ لیکن کسی کو کتابی صورت نہیں دی۔ اندازِ بیاں شُستہ ہے۔ زبان پر لکھنؤ کا گہرا اثر ہے۔ دلچسپ اور حسین پیرائے میں لکھتی ہیں۔ "محفلِ خواتین" کی معتمد ہیں۔ ویمنس انڈسٹریل کوآپریٹیو سوسائٹی کی نائب صدر اور ویمنس فیڈریشن کی سکریٹری ہیں۔

جیلانی بانو نے نئی نسل کی لکھنے والی خواتین میں ناول اور افسانوں کے ذریعہ شہرت حاصل کی ہے۔ ہندوستان کے ادبی حلقوں میں مقبول ہیں۔ بدایون کے علم دوست گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں۔ علامہ حیرت بدایونی ۱۹۲۰ء میں جب حیدرآباد آئے تو یہیں بس گئے۔ والد کی وسعتِ نظر، بذلہ سنجی اور علمی تبحر کا اثر جیلانی بانو پر پڑنا قدرتی بات تھی۔

بانو کی تعلیم ابتداء میں گھر پر ہی ہوئی۔ بی۔ اے عثمانیہ سے کیا۔ اور ایم۔ اے۔ جامعہ (دہلی) سے بانو نے اپنا ادبی سفر ۱۹۴۸ء سے شروع کیا۔ پہلے فلمی موضوعات پر لکھتی تھیں۔ رفتہ رفتہ افسانہ نگاری پر مائل ہوئیں۔ سماجی اور سیاسی حقیقتوں کو موضوع بنا کر دل کو چھو لینے والی کہانیاں لکھتی ہیں۔ ان کا افسانوی مجموعہ "روشنی کے مینار" پاکستان سے شائع ہوا ہے۔ ناول "ایوانِ غزل" پر ساہتیہ اکیڈمی نے ایوارڈ عطا کیا ہے۔ "نروان" (افسانے) "جگنو اور ستارے" (ناولٹ) "دلیپ کا سفر" (ناولٹ) اور "پرایا گھر" (افسانے) انکی دوسری تصانیف ہیں۔ ان کی کچھ کہانیوں کا "کدارم" کے نام سے تلگو زبان میں ترجمہ ہوا ہے۔ نیشنل بک ٹرسٹ کے لئے ملیالم کہانیوں کا ہندی سے اُردو میں ترجمہ کر چکی ہیں۔ انکی ایک کتاب "ہاتھ" ہندی میں چھپ رہی ہے۔ امرتا پریتم نے ان کے ایک ناولٹ اور چند افسانوں کو پنجابی زبان میں لکھا ہے۔ مرہٹی زبان میں بھی انکی کہانیوں کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ "ایوانِ غزل" اور کچھ کہانیوں کو روسی زبان میں بھی لکھا گیا ہے۔

آمنہ ابوالحسن کی کہانیاں بھی مختلف رسائل میں چھپ چکی ہیں۔ ان کے تین افسانوی مجموعے چھپ چکے ہیں۔ "تم کون ہو؟" (ناول)

عفت موہانی کا تعلق لکھنؤ سے ضرور ہے مگر رہتی ہیں حیدرآباد میں۔ نسوانی رسائل میں مضامین اور ناول لکھتی رہی ہیں۔ متعدد ناول قسط وار "رسالہ حریم" لکھنؤ کے سالنامے سے شائع ہونے کے بعد نسیم بک ڈپو لکھنؤ سے کتابی شکل میں شائع ہوئے ہیں۔ تقریباً ۴۴

۲۵ ناول لکھ چکی ہیں۔ جن میں "درد آشنا"، "تقدیر"، "شرارت"، "داغِ دل" اور "آہوں کے گیت" بھی ہیں۔ عفت موہانی کا اسلوب سادہ سیدھا اور تحریر پختہ اور شگفتہ ہے۔

رفعیہ منظور الامین ابھرتی ہوئی ڈرامہ نویس ہیں۔ ان کی قلمی کاوشیں مختلف رسائل کی زینت بن چکی ہیں، اور ریڈیو پر بھی پیش ہوتی رہتی ہیں۔ اندازِ بیان سلجھا ہوا اور شگفتہ ہے۔

ڈاکٹر سیدہ جعفر کی تحریریں ہندو پاک میں خاص مقام پیدا کر چکی ہیں۔ دکھنیات پر انہوں نے تحقیقی کام کیا ہے۔ ترقی اردو بورڈ کے تحت "کلیات محمد قلی قطب شاہ" پر تحقیق کی ہے۔ ڈاکٹر زور کی خواہش پر شاہ تراب کی سیرت و سوانح "من سمجھاون" کے نام سے قلمبند کیا ہے۔ "مسکوۃ الجنۃ" صوفیائے کرام پر لکھے ہیں۔ جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ اردو میں ریڈر ہیں۔ اور پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی نگراں بھی۔

ناشکری ہوگی اگر اس ضمن میں میں مرحوم نصیر الدین ہاشمی کا نام نہ لوں جنہوں نے خواتینِ دکن کے ادبی کارناموں کو اپنی کتاب "خواتینِ دکن کی اردو خدمات" کے ذریعہ دنیائے ادب سے روشناس کرایا اور انکی ادب نوازی کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔

عہدِ آصفی میں علم و ادب میں دکن کی خواتین نے جو اہم رول ادا کیا ہے اور جو ادبی، سماجی اور تہذیبی خدمات انجام دی ہیں وہ تاریخِ زبانِ اردو کا ایک روشن باب ہے۔ ■

(دکنیات پر منعقدہ سمینار گولڈن جوبلی تقاریب ادارہ کے موقع پر پڑھا گیا مقالہ)

"مت سہل ہمیں جانو" ص ۲۲ سے آگے

سب کو رسالے کتابیں اور مخطوطات دینے کے بعد وہ کچھ دیر اپنی کرسی پر براجمان ہوتے، پھر سراج الدین صاحب سے ملنے کے لیے "ایوان" کے دوسرے حصے میں پہنچ جاتے، کبھی میں نے ان کو بحث کرتے ہوئے یا کسی کے خلاف کہتے ہوئے نہیں سنا۔ معاملہ ان کا نہیں کسی دوسروں کا ہوتا اور بات کچھ تلخ ہو جاتی تو مسکراتے ہوئے اپنی جگہ لوٹ آتے ایک بجتے ہی وقار صاحب (وقار خلیل) دندناتے آتے ... کیا ہے انصاری صاحب بھوک نہیں لگی؟ ایک بج رہا ہے، ان کے الارم کے ساتھ ہی انصاری صاحب اٹھ کھڑے ہوتے، چلتے چلتے دریافت کرتے کہ مزید کچھ اور کتابوں کی تو ضرورت نہیں، پھر وہ کھانے سے فارغ ہو کر جب لوٹتے تو لوٹا ہاتھ میں ہوتا، اور اور وضو بنانے میں مصروف، اب کمرے سے اقامت اور نماز کی آوازیں آنے لگتیں ۳½ اور ۴ کے قریب وہ روانگی کی تیاری کرنے لگتے۔ بس یوں سمجھیے کہ گھڑی کی سوئیوں کی ہدایت پر وہ عمل پیرا تھے، کبھی دیر سے آتے اور نہ دیر تک ٹھہرتے، بہت ہی اصولی آدمی تھے، احتیاطاً اُن سے جب دریافت کیا جاتا کہ انصاری صاحب کیا کل آپ آئیں گے؟ تو کہتے کہ ہاں روز آتا ہوں سوائے ۵ تاریخ کے، اس لیے کہ اُس روز مجھے وظیفہ ملتا ہے، دیکھیے کبھی آپ ۵ تاریخ کو نہ آنا۔

ڈاکٹر لئیق صلاح

مت سہل ہمیں جانو......!

تازہ اخبار دیکھتے ہی بیرونی خبروں سے زیادہ ملکی خبروں کی طرف توجہ مبذول ہو جاتی ہے۔ اور اس سے زیادہ اپنی ریاست اور اپنے شہر کا حال جاننا چاہتے ہیں۔ لیکن ان سب سے پہلے جس کالم پر ہماری نظر پڑتی ہے "وہ ہے" انتقال ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ کون چھوٹ گیا اور کون ابھی قیدِ ہستی کی مصیبت جھیل رہا ہے اپنے شہر سے دُور ہوں تو اس کالم کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ اخبار ہاتھ میں لیتے ہی، غالب کا وہ شعر یاد آتا ہے ؎

نفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو؟

ایک دن انہی کالموں میں ایک خبر نظر سے گزری کہ رمیض الدین انصاری کا انتقال ہو گیا۔ چند ہفتے قبل ہی ملاقات ہوئی تھی، بھلے چنگے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ کمزور دکھائی دے رہے تھے اور عمر کا تقاضا بھی تھا لیکن موت اپنے آہنی پنجے میں دبوچنے والی ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ "انصاری صاحب" کو لوگ ان کے اصلی نام سے زیادہ نام کے دوسرے جزو سے زیادہ پہچانتے تھے۔

ادارۂ ادبیاتِ اردو سے ان کی شخصیت کا جدا کرنا اتنا ہی مشکل تھا، جتنا کہ پانی سے شکر، ان کا وجود ادارہ میں بالکل گم ہو گیا تھا۔ انصاری صاحب کو میں اس وقت سے جانتی ہوں جب میں ایم۔اے۔ میں پڑھا کرتی تھی۔ پرانے رسالوں کے فائل اگر کہیں ترتیب و سلیقہ کے ساتھ مل سکتے ہیں تو وہ واحد جگہ ادارہ ہی ہے۔ ڈاکٹر زور کے بعد اُس ذمہ داری کو انصاری صاحب نے بڑی خوبی سے سنبھالا ہے۔ مطبوعات کی فہرست میں سے ایک نوٹ تیار کر کے جوں ہی انصاری صاحب کو دیا جاتا بڑی تیزی کے ساتھ وہ تمام رسالے لیے ہمارے سامنے آکھڑے ہوتے، کبھی ہم کو اُن سے یہ شکایت کرنے کا موقع ہی نہیں ملا کہ انصاری صاحب ہم نے فلاں رسالے کے لیے کہا تھا، آپ نے نہیں دیا، اور ہمارا کام ادھورا رہ گیا جب ہم نے ریسرچ میں قدم رکھا، اس وقت اُن سے اور بے تکلف ہو گئے چناں چہ بعض اوقات کوئی کتاب یا رسالے کو... CATALOGUE میں ڈھونڈھنا مشکل ہوتا تو وہ ذمہ داری بھی انھیں ہی سونپی جاتی کبھی خدا کے اُس نیک بندے نے یہ نہیں کہا کہ یہ کام میرا نہیں مسکراتے ہوئے ہر کام کی ذمہ داری سنبھالتے جس طرح الماریوں میں رسالے اور کتابیں انصاری صاحب

کی منتظر رہا کرتیں، اُسی طرح فہرستوں میں بھی اُنھیں
تلاش کرنے وقت نہ ہوتی، فوری ڈھونڈھ کر بتلاتے
کہ آپ کی طلب کردہ کتاب یا رسالہ اس صفحہ پر اور
اس نمبر پر ہے، دیکھ کر بیں خجالت ہوئی کہ اتنی ورق
گردانی کے باوجود، ہماری نظریں وہاں تک کیوں نہ پہنچیں
انصاری صاحب کو میں نے کبھی بگڑتے نہیں دیکھا
ہمیشہ ایک ہلکی سی مسکراہٹ چہرے پر بکھری رہتی۔
" ادارہ " کا چوکیدار عبداللہ بھی، ڈاکٹر زور ہی کے
زمانے سے ادارہ کی خدمت انجام دے رہا ہے۔
وہ بھی نرم خو ہے۔ لیکن کبھی کبھی کوئی بات ناگوار
گزرتی تو وہ اپنا دکھڑا سنانے انصاری صاحب
کے پاس پہنچ جاتا، کبھی کام کی زیادتی کا شکوہ ہوتا
تو کبھی ان کی کارگزاریوں کی ستایش نہ کرنے کا
گلہ، وہ اس کی باتوں کو بڑے غور سے سنتے، بہت
ہی خلوص اور نرمی کے ساتھ اُسے سمجھانے کی کوشش
کرتے، بعض لوگ اپنے آپ کو ہردلعزیز بنانے کی
خاطر آگ کو اور بھڑکایا کرتے ہیں۔ مگر وہ اس کے
ساتھ ہمدردانہ تعاون کرتے ہوئے، معاملے کو
رفع دفع کرنے کی سعی کرتے۔

ادھر پچھلے چند سالوں سے انصاری صاحب
کو اپنی ضعیفی اور کمزوری کا احساس زیادہ ہو چلا
تھا۔ چناں چہ وہ کہا کرتے تھے کہ میں نے کئی دفعہ
بورڈ کے آگے اپنا استعفیٰ رکھا، لیکن بورڈ نے ہر
مرتبہ میری درخواست مسترد کردی۔ اور ہمیشہ یہی
اصرار کہ ڈاکٹر زور سے کیے ہوئے وعدے کو
نباہیں۔ بالآخر وہ مجبور ہو کر یہ کہنے لگے تھے کہ
کم از کم میری مدد کے لیے ایک اسسٹنٹ کا تقرر
کیا جائے، ذمہ داریوں کو سنبھالنے کا میں اہل نہیں رہا
لیکن آخر دم تک انھوں نے بانی ادارہ سے کیے گئے
وعدے کی پابندی کی۔ معاشی حالت تو انصاری صاحب
کی کافی اچھی تھی، بچے باہر تھے۔ ان لوگوں نے بار بار ان
سے گزارش کی کہ وہ ملازمت چھوڑ دیں، اور گھر پر
آرام سے رہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انصاری
صاحب نے مالی وسائل کے حل کی خاطر نہیں بلکہ بے لوث
جذبے کے تحت کام کرتے رہے۔ بورڈ والوں کو اس
بات کا پورا پورا احساس تھا کہ انصاری صاحب کے
بغیر "کتب خانے" کا چلنا دشوار ہے۔ آج جب کہ انصاری
صاحب ہم میں نہیں تو اکثر یہ خیال ہوتا ہے کہ واقعی جس کی
حفاظت کے لیے انھوں نے جتنی تن دہی سے کام کیا تھا
کیا وہ کتب خانہ، اب بھی اسی حالت میں رہے گا۔
لیکن افسوس اس بات کا ہوتا ہے کہ ایسے فرض شناس
کارکن کی دنیا بہت کم قدر کرتی ہے۔ ادارہ کی طرف سے
اُن کا تعزیتی جلسہ منایا جانا چاہیے تھا، اس طرح اُن کے
خلوص کا حق ادا تو نہ ہوتا، مگر پھر بھی خدمات کا اعتراف
تو ہو جاتا

انصاری صاحب میں بلا کی انکساری تھی۔ کبھی
انھوں نے اپنے آپ کو بڑا آدمی نہیں سمجھا ایک صاحب
عارضی طور پر انصاری صاحب کے تعاون کے لیے رکھے
گئے تھے۔ مجھے اس کا تو علم نہیں کہ وہ پھر غائب کیوں ہو گئے
لیکن تیور یہ بتلاتے تھے کہ نبھاؤ مشکل ہے۔ ایک روز
انھوں نے انصاری صاحب سے کہا کہ کتابیں ہر روز
کیوں اسکالرس کے پاس لے جائیں۔ ان کو یہاں آکر

ینا چاہیے، خواہ وہ پروفیسر ہی کیوں نہ ہوں۔؟ ہم کو اپنی پوزیشن کا خیال رکھنا چاہیے۔ انصاری صاحب نے نہایت سادگی سے میرے سامنے یہ بات بیان کی کہ موصوف کے کیا خیالات ہیں؟ میں نے کہا انصاری صاحب آپ کتابیں پہنچاتے بھی ہیں تو ہم سب کی نظروں میں آپ کی وہی عزت ہے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، دوسرے اگر نہ پہنچائیں بھی تو آپ کے رتبے کو نہیں پہنچ سکتے۔ آپ کی شخصیت ہی سب کچھ ہے، لانے اور نہ لانے کا سوال ہی نہیں۔

ادارہ والوں سے ایک شکایت ہے کہ وہ اسکالر کے لیے کوئی علاحدہ کمرہ نہیں رکھتے۔ خوش نویسی کرنے والی طالبات بھی اسی درانڈے میں بیٹھتی ہیں، اور اسکالر کو بھی وہیں بیٹھ کر اپنے کام سے نمٹنا رہتا ہے۔ وہ کام سے زیادہ باتیں، اور قہقہوں میں مصروف رہا کرتی ہیں۔ انصاری صاحب کو یہ بات ناگوار محسوس ہوتی تھی، ایک ٹھنڈی سی ڈانٹ خود پلاتے، لیکن جب ان کا نالہ بے اثر ثابت ہوتا تو دھیرے سے ہمارے پاس آتے، اور کہنے لگتے "بی بی" آپ خاموش رہتی ہیں۔ نہ جانے آپ کے کام میں کس قدر ہرج ہو رہا ہے ڈانٹ دیا کیجیے۔ ایک اور لیکچرار صاحبہ آتی ہیں، وہ تو خوب ڈانٹ ڈپٹ کرتی ہیں۔ جواباً مجھے کہنا پڑتا ہے کہ انصاری صاحب غلطی ان بے چاروں کی نہیں اس لیے مجھے ڈانٹنا اچھا نہیں لگتا۔ اس کے ذمہ دار وارباب اقتدار ہیں۔ ان معصوموں نے دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے، سب مجھ سے بے تکلف ہیں، دشمنی کیسے کروں؟ آپ یہی بات بورڈ کے ارکان تک پہنچا دیں تو مناسب ہے۔ تو تب انصاری صاحب کا عارضی غصہ ٹھنڈا ہو جاتا، وہ مسئلہ کی یکسوئی کی طرف متوجہ ہو جاتے۔

بعض اوقات تو انصاری صاحب سے میں نے ایسے کام لیے، جن کی ذمہ داری، اُن پر عائد نہ ہوتے ہوئے بھی، وہ اپنا فرض سمجھ کر ادا کیا کرتے تھے۔ جیسے ایک مرتبہ دو بزرگ، کتب خانہ آئے، پڑھتے ہوئے وہ سگریٹ نوشی بھی کر رہے تھے، ان میں سے ایک نے برجستہ یہ اشعار پڑھے ؎

زتمباکو بجز دودے نہ دیدم ؞ کشیدم بارہا سودے نہ دیدم
بجز تاریکئی ماحولِ محفل ؞ خدارا بہبودے نہ دیدم

میں نے انصاری صاحب سے خواہش کی کہ وہ اشعار لکھ لائیں وہ بلا کسی تامل کے نوٹ کرنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

انصاری صاحب اس قدر مخلص ہونے ہوئے بھی، فرض کے آگے کبھی اپنے اصول سے ہٹے نہیں۔ ادارہ کی کتابوں سے صرف کتب خانے ہی میں، استفادہ کیا جا سکتا ہے، گھر لانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ کبھی بھی انصاری صاحب نے خلافِ اصول کرنے کی جرأت نہیں کی۔ اخلاص اپنی جگہ لیکن "فرض" کی حیثیت اُن کے یہاں مسلّم تھی۔

انصاری صاحب کے انتقال کے بہت دن بعد ادارہ گئی خصوصاً وہ حصہ جہاں انصاری صاحب بیٹھا کرتے تھے، بہت سونا سونا لگا، آتے ہی وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتے اور پھر اپنی شیروانی کو کمرے میں ٹانک دیتے، ٹوپی بھی سر سے اُتر جاتی، اور وہ اپنے منتظرین کی خواہشات کی بجا آوری میں لگ جاتے

(باقی صفحہ ۲۲ پر دیکھیے)

غزلیں

محسنؔ جھنجھانوی

چہروں کا سمجھ آنا دشوار ہی ایسا ہے
یا آئینہ خانہ کا کردار ہی ایسا ہے

بجھتا ہے نہ جلتا ہے چندن کا ہرا جنگل
اپنے ہیں سُلگنے کا آزار ہی ایسا ہے

ہر جنس دکاں اپنا خود مول چکاتی ہے
چپکے سے گزر جانا، بازار ہی ایسا ہے

ہے راکھ سفینہ کی میرے بھی کنارے پر
تم یہ نہ سمجھ لینا اس پار ہی ایسا ہے

خود بیچنے لگتا ہے احساس کا گونگا پن
بے بولتے لفظوں کا اظہار ہی ایسا ہے

کھل جاتی ہے اپنوں کو ذہنوں کی دیانت بھی
محسنؔ قد و قامت کا بازار ہی ایسا ہے

قاضی انصار

اچھی نہیں ہے دوستو! اقرار کی روش
مجھکو تو لگ رہا ہے گنہگار کی روش

اقرار کی روش، کبھی انکار کی روش
کیا کشمکش میں آن پڑی پیار کی روش

چونکا دیا ہے مجھکو بھی جس نے وقت پر
مشکوک لگ رہی ہے صلاح کار کی روش

اب بات بات میں ہے سیاست، منافقت
کچھ میرے دوستوں میں ہے مردار کی روش

ہر مسئلہ حیات کا لفظوں میں حل کریں
بدلی ہے ہم نے اس لئے اشعار کی روش

عبدالقوی سیفؔ

تم کو دیکھا تو پھر دوا نہ ہوا
چھوڑ کر خود کو میں روانہ ہوا

خوف ہوتا ہے پاس جانے سے
آئینہ دیکھ کر زمانہ ہوا

لے گیا نقش پا بھی اپنے ساتھ
آدمی ایسے کچھ روانہ ہوا

موت بھی رہ گئی ہے منہ تکتے
زندگی تیرا بھی بھلا نہ ہوا

بات کیا ہے کہ بڑھ گئے ناخن
اور پھر زخم بھی ہرا نہ ہوا

آئے گا کس پہ بعد سیفؔ بتا
تو بھی اے وقت بے ٹھکانہ ہوا

حلیمہ فردوس

دانا و دیوانہ

کیا دانا، کیا دیوانہ، کیا فرزانہ سب ایک ہیں۔ جو نہ کرتا رہے گا وہ آخر تک بھی اس حقیقت کو نہ سمجھے گا کہ وہ دانا ہے یا دیوانہ۔ دانا آپ کا رفیق ہے تو دیوانا آپ کا رقیب۔ ایک سے آپ مصافحہ کرتے ہیں تو دوسرے سے کتراتے ہیں۔ یہ آپ کی دانائی نہیں دیوانگی ہے۔

ایک شخص کس منزل پر دانا رہتا ہے اور کس منزل پر دیوانہ آپ کیا جانیں۔ آپ اسے اس لیے دانا کہتے ہیں کہ اس نے آپ کی مرضی اور امید کے مطابق کام کیا۔ جہاں احتجاج شروع ہوا۔ تہذیب کا دامن کھسکنے لگا۔ اخلاق کی دیواریں منہدم ہونے لگیں، امید کے پھول مرجھانے لگے، لگام ہاتھ سے چھوٹتی نظر آئے، آپ کا عتاب کارگر ہوا نہ آپ کا عذاب تو آپ نے بس اسے دیوانہ کا نام دیا۔ کتنا نادان ہے انسان۔ جن اشاروں کو خود سمجھ نہیں پاتا۔ جن حرکات سے وہ لطف اندوز نہیں ہو سکتا اپنی ناکامی کا ذمہ دار اس شخص کو قرار دیتا ہے جسے دیوانہ کہتے ہیں۔ رات کو پستی کی اور دن کو عروج کی علامت قرار دیا جاتا رہا ہے۔ یہ دراصل ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ رات کبھی دن میں تبدیل ہوتی ہے تو کبھی دن رات کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ بس اسی طرح دانا کبھی دیوانہ ہوتا ہے تو دیوانہ کبھی دانا۔ جنت کی مانوس فضا سے نکل کر دنیا کی غیر مانوس فضا میں قدم رکھنے کے بعد اس شخص پر دیوانگی ہی تو طاری ہو گئی تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر پھیلی ہوئی زمین پر نظر اٹھائے ہوئے شجر و حجر، تپتی ہوئی صحرا کی ریت، سائیں سائیں کرتے ہوئے جنگل کو دیکھ رہا تھا۔ کیا وہ دیوانہ نہیں تھا۔ اب بھی گواہ ہیں وہ جانور جن کی کھال اس کا لباس اور جن کا گوشت اس کی غذا تھی۔ غار کے پتھر اس بات کے شاہد ہیں کہ آج کا دانا کبھی دیوانہ بھی تھا۔ وقت کی گردش نے اسے دانا بنایا۔ آج کا دانا تاریخ کے اوراق انسائیکلوپیڈیا کی کتابوں میں اپنے پرانے احوال پڑھ کر کیا دیوانہ نہیں بن جاتا۔ وہ آرکیالوجیکل میوزیم میں جا کر اپنی پچھلی زندگی کو اس قدر دیوانگی سے دیکھنے لگتا ہے کہ وہ خود شوکیس میں رکھا ہوا کئی سال پرانا نمونہ نظر آنے لگتا ہے۔ یہی وہ منزل ہے جہاں دیوانہ اور فرزانہ کا فرق مٹ جاتا ہے۔

دیوانہ اپنے من کا موجی ہوتا ہے۔ شرافت، مروت، مصلحت، موقع پرستی، مکاری جیسے سفلہ جذبوں سے وہ بالکل پاک ہوتا ہے۔ اس کا مقام فرشتوں سے بھی بلند ہے۔ حور و ملائک بھی اس کی عظمت کے معترف ہیں۔ دیوانگی میں اطاعت کے

ساتھ شطنیت بھی ہوتی ہے۔ آدم کے دیوانے پن نے جنت کی نعمتوں کو ہیچ گردانا اور خیر و شر، نیکی و بدی کے لمحوں کو پسند کیا۔ عرشِ معلیٰ سے تحت الثریٰ (مراد زمین) کا سفر کیا۔ اسی دیوانگی نے کبھی وہ خواہش کی جس کی بدولت کوہِ طور خاک کا ڈھیر بن گیا۔ اسی دیوانے پن نے کبھی اپنے لختِ جگر کو خدا کی راہ میں ذبح کیا تو کبھی اپنے آپ کو نارِ نمرود کے حوالے کیا۔ عرب والوں نے جسے دیوانہ کہا خدا نے اُسے چاہ کر پھر عرشِ معلیٰ پر بلایا۔ یہ فرش سے عرش کا سفر دانا کا نہیں دیوانہ کا ہے۔

بے خبری کو دیوانگی کہتے ہیں "انا الحق" دیوانگی کا ثبوت ہے اور یہی سلوک کی منزل بھی۔ فنا فی اللہ اور بقا باللہ کا مقام صرف دیوانے کو حاصل ہوتا ہے "یوریکا" "یوریکا" کا نعرہ لگاتا ہوا حمام سے ایک دیوانہ ہی باہر آسکتا ہے چاہے وہ "عرشمیدس" ہی کیوں نہ ہو۔ نروان ایک بے خبر، جنگل میں بیٹھنے والے تپسوی کو مل سکتا ہے۔ مذہب، سائنس، فلسفہ اور ادب ان داناؤں کے نام سے مزین ہیں جو اپنے شوق کے ہاتھوں دیوانے ہوتے ہیں۔ نیوٹن کی دیوانگی نے "کششِ ثقل" کے راز کو ہویدا کیا تو غالبؔ کی دیوانگی نے خلوت کو انجمن سمجھا۔

دیوانہ کا اپنا معیار ہوتا ہے۔ اس کا فرمایا ہوا مستند ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ زمانہ کو اپنا ہم خیال بنا لیتا ہے۔ دیوانے مجنوں نے لیلیٰ سی سیاہ فام کو دنیا کی حسین ترین عورت قرار دی۔ تاریخ دیوانوں کے کارناموں سے بھری پڑی ہے۔ ایک شہزادے کی دیوانگی نے محبت کے تخت و تاج کو ٹھکرایا تو دوسرے شہزادے کے دیوانہ پن نے محبوبہ کی یاد میں وہ محل تعمیر کروایا جسے لوگوں نے دنیا کا

ساتواں عجوبہ قرار دیا۔ جو بھی چیز دسترس سے باہر ہو جاتی تو اُسے دیوانگی کہتے ہیں۔ دیوانی آگ وہ ہے جس کے شعلے آسمان سے باتیں کرتے ہیں جو پل کے پل میں وسیع و عریض جنگل کو خاکستر کر دیتی ہے۔ سمندر کی لہروں کا دیوانہ پن یہ بسے بسائے شہر کو اجاڑ کر رکھ دے۔ دیوانہ کی دنیا محدود نہیں رہتی وہ اپنی دنیا آپ بناتا ہے دانا کا پیالہ بڑا سطحی ہوتا ہے اور دیوانہ خوب سے خوب تر کی جستجو میں آگے بڑھتا چلا جاتا ہے وہ ستاروں سے آگے کے جہاں کا سراغ لگانا چاہتا ہے۔ آگے بڑھنے کی یہی خواہش ایک غریب ملک کو بھی دیوانہ بنا دیتی ہے اس لیے ملک زمین پر رہنے والوں کو بھوکا، ننگا رکھ کر ستاروں پر کمندیں ڈالنے کے لیے کروڑوں روپیہ ضائع کرتا

دیوانہ کا مقام داناؤں سے برتر ہے۔ د[illegible] کئی مراحل سے گزر کر اس مقام پر پہنچتا ہے جہاں دا[illegible] رسائی نہیں۔ اس کی ہمت، اس کے حوصلے اپنی مثال آپ ہیں۔ دانا وہ بزدل ہے جس کی ہنسی پر بھی روایات کی زنجیریں پڑی رہتی ہیں تو جس کی خوشیوں پر آداب کے پہرے۔ دل جو چاہے وہ نہیں کرتا۔ ماحول جو چاہتا ہے اس کے احکام بجا لاتا ہے۔ جب کہ دیوانہ خاموش محفلوں میں قہقہے لگاتا ہے تو مسکراتی محفلوں میں زار و قطار آنسو بہاتا ہے۔ دانا اس کی ہنسی کو قابلِ رحم سمجھتا ہے جبکہ دیوانہ اس قدر خود دار ہوتا ہے کہ وہ کسی رحم طلب نگاہوں کا بھی احسان لینا نہیں چاہتا۔ وہ بے لوث خدمت کرتا ہے اور وہ بھی شاذ و نادر۔ دانا اپنی خدمت ایک فرض کے تئیں مشینی طور پر ادا کرتا ہے۔

ایک دیوانہ دوسرا بندر۔ دونوں [illegible]

دیوانوں کے اطراف ہمیشہ ان داناؤں کا گھیرا ہوتا ہے جو صحیح معنوں میں دیوانے ہوتے ہیں۔ دیوانہ اور رِند دونوں استغنائی منزل پر پہنچ کر اوروں کو دیوانے بنانے کے لیے وہ حرکتیں کرتے ہیں جسے دانا سر بازار نہیں کر سکتا۔

پاگل خانہ دیوانہ کا مسکن ہے۔ اس آزاد دنیا میں دانا اور دیوانہ کی پہچان مشکل ہے۔ یہاں پہنچ کر دانا دیوانگی کی باتیں کرنے لگتا [illegible] عقل مندی کا مظاہرہ کرتا [illegible] ماحول میں ہوتا ہے [illegible] ہستیاں پاگل خانے سے باہر آتی ہیں انھیں دنیا بھی ایک پاگل خانہ نظر آتی ہے۔

دانا دیوانہ کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ ایک نصیحت کرتا ہے تو دوسرا عمل۔ دانا کے دل و دماغ، ظاہر و باطن میں تضاد ہوتا ہے۔ اس کے برعکس دیوانہ میں تضاد نام کی کوئی شئے نہیں ہوتی جو اپنے آپ سے مخالفت نہیں کرتا وہ دیوانہ ہے جو زمانے سے مفاہمت کر کے اپنے آپ سے مخالفت کرے وہ دانا ہے اپنے آپ کو دھوکا دینا دانا کی سرشت ہے۔ اور دیوانہ دھوکہ کے نام سے بھی واقف نہیں ہوتا۔ دانا کی دنیا جھوٹ، مکاری، فریب سے آباد ہے۔ وہ اپنی خرابیوں سے اپنا تحفظ کرتا ہے۔ دنیا کے اس مکروہ پہلو سے دیوانہ مفاہمت نہیں کر سکتا۔ اس لیے اس کا چہرہ ہمیشہ حقارت اور نفرت انگیز تاثرات کا مظہر ہوتا ہے۔ دیوانہ مصلحت پسندی کا دشمن ہوتا ہے۔ وہ دنیا اور دنیا والوں کو ہیچ گردانتا ہے۔ بے نیازی، استغنائی اس کی رگ رگ میں بسی ہوتی ہے۔ اس میں خوف و تردد کا نام کو نہیں ہوتا۔ وہ ہمت اور حوصلہ کا علمبردار ہوتا ہے۔ کسی کے تحفظ کے لیے وہ چلتی ریل سے کود پڑتا ہے، بھڑکتے ہوئے شعلوں سے کسی کو بچا لاتا ہے۔ انہونی کو ہونی میں تبدیل کرنا اُس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ گرمی کی حدت، موسم سرما کی یخ بستہ ہوائیں اُس کی ہمت پر انگشت بہ دنداں رہ جاتی ہیں۔

دیوانے کے نزدیک معاشرہ ایک بے معنی لفظ ہے۔ احتجاج سے اس کا خمیر گوندھا ہوا [illegible] اس لیے وہ قانون کی پابجائی نہیں کرتا۔ کسی کی رہبری یا رہنمائی کو اپنی توہین سمجھتا ہے۔ دل سے بڑھ کر اس کا رہنما نہیں ہوتا۔ جذبات کی اطاعت اس کا شعار ہے۔ عقل کی ہرزہ سرائی سے وہ بیزار نظر آتا ہے۔

انجام سے بے پرواہ ہو کر قدم اٹھانا اس کی اولین صفت ہے۔ اس کے نزدیک ماضی، حال، مستقبل کی اہمیت نہیں۔ جو لمحے اُسے حاصل ہیں وہی اس کی امانت ہیں۔ دیوانہ کسی چیز کی تمنا نہیں کرتا۔ اس لیے خواب بھی نہیں دیکھتا اس کی سرشت میں شکست کا تصور حرام ہے۔ زندگی کے چند لمحوں کو اسیر کر کے فنا ہو جانا اس کا مقصدِ حیات ہے۔ اور یہی جاودانی کی دلیل بھی

بقیہ "دکھنی ادب میں تحقیق کے مسائل" صفحہ ۲۷ سے

کام کر ملتا ہے۔ بہرحال علم و ادب کے ان اُلجھے ہوئے گیسوؤں کو سنوارنے کا نام ہی تحقیق ہے جس سے کسی محقق کو مفر نہیں۔ میں نے اس مضمون میں دکھنی ادب کے صرف چند مسائل کا سرسری جائزہ لیا ہے۔ اُمید ہے کہ ماہرین دیگر مسائل پر بھی روشنی ڈالیں گے۔

وقار خلیل

نقد و نظر

(تبصرے کیلئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہے۔ ادارہ کا مبصر کی رائے سے اتفاق ضروری نہیں)

نام کتاب: "انقلاب ۱۸۵۷ء: تصویر کا دوسرا رُخ"۔ تحریکِ آزادی کے جذبہ و ولولہ کو دلوں پر مرتسم کرنے

ترجمہ: شیخ حسام الدین۔ دیمائی سائز: ۱۲۰ صفحات، قیمت: ۶/- روپے، ناشر: اتر پردیش اُردو اکیڈمی، لکھنؤ

اُتر پردیش اُردو اکیڈمی نے "تحریکِ آزادی کا ادب" سلسلہ وار شائع کرنا شروع کیا ہے اور زیرِ نظر کتاب اس سلسلے کی [illegible] کڑی ہے۔ ڈاکٹر محمود الٰہی صدر مجلسِ انتظامی یو۔پی۔ اکیڈمی نے پیش لفظ میں تحریکِ آزادی کے ادب کی اشاعت پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ ۱۸۵۷ء ہماری جنگِ آزادی کا انتہائی وسیع اور جرأت آزما نقطۂ آغاز ہے، اس جنگ کے تقدس کو طرح طرح سے داغدار کیا گیا۔ زیرِ نظر کتاب مغربی اہلِ قلم مسٹر ایڈورڈ ٹامس کی روشن فکر کا کارنامہ ہے۔ اس کی دو قسطیں ستمبر ۱۹۲۷ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کے "الہلال" میں پہلی بار شائع ہوئیں۔ پوری کتاب کا ترجمہ شیخ حسام الدین امرتسری نے کیا ہے۔ مولانا عبدالرحیم خان یوسف زئی جو مجاہد آزادی رہے ہیں، ترجمہ پر نظرِ ثانی کرکے بیش قیمت مقدمہ سپردِ قلم کیا ہے اور بتایا ہے کہ ۱۸۵۷ء کا انقلاب جن اسباب کی بناء پر ہوا ان کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان کو انگریز راج کی بدترین غلامی سے نجات دلاکر آزادی و خود داری کو پھر سے حاصل کیا جائے اور اس جد و جہد میں ہندوستان کے تقریباً تمام باشندے شریک تھے۔ مصنف نے دنیا کے سامنے ہندوستان کی جنگِ آزادی سے متعلق مفید معلومات کا بیش قیمت ذخیرہ تاریخی حقائق کی روشنی میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ غدر، اسکے اثرات اور پھر نتائج پر اس کتاب میں مندرج واقعات

میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس مفید کتاب کا شمار آزادیٔ ہند سے متعلق کلاسیکی لٹریچر میں ہوتا ہے۔ اور نئی نسلوں کے لئے ہر آئینہ مفید قرار پا[illegible]

نام کتاب: "انتخابِ [illegible]" [illegible]
صفحات (۱۰۸)، قیمت: ۴/- روپے، ناشر: اتر پردیش اُردو اکیڈمی قیصر باغ۔ لکھنؤ۔

حسرت موہانی کا شمار اُردو کے اساتذۂ سخن اور تحریکِ آزادی کے صفِ اوّل کے قائدین میں ہوتا ہے۔ وہ بے باک مقرر اور اُصولوں کے پابند صحافی اور حریت کے نقیب تھے۔ انکی غزلیہ شاعری حُسن و رومان کا عطر مجموعہ تھی۔ اور حسیّ کی منفعت انکی وطن دوستی اور افتادِ طبع کی رمز شناس۔ ۱۹۰۳ء میں "اُردوئے معلّی" جاری کیا اور اُردو شعراء کے کارناموں کو بقائے دوام عطا کی۔ اس جریدہ نے ہندوستانی سیاست اور ثقافت کی رہنمائی کا فرض بھی عطا کیا اور کانگریس کے پرچم تلے جد و جہدِ آزادی کے قافلے کو تیز گام بنایا۔

حسرت نے ۱۹۲۸ء میں روزنامہ "مستقل" جاری کیا۔ جو ۹ مہینے تک پابندی سے نکلا کیا۔ پھر دو روزہ اور سہ روزہ اور ہفت روزہ ہوگیا۔ اور جنوری ۱۹۳۲ء میں ماہنامہ بنا دیا گیا۔ مولانا حسرت نے "مستقل" کے ذریعۂ قومی اور ملی شعور کو عروج عطا کرنے میں اہم کردار عطا کیا ہے۔ اس کے اداریئے ان کی حق گوئی اور بے باکی کا واضح اظہار رہے ہیں جن کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ الفاظ کے کاغذی پیرہن میں شرارے جمع کردیئے

ئے ہیں۔

جریدہ "مستقل" سے اس کتاب کے مرتب جناب حامد علی
حسرت سے تحریر ادارئیے؛ فائیلوں کی تلاش بسیار کے بعد
ریخی حوالوں اور اپنے معلوماتی مقدمہ" کے ساتھ شائع کر دیئے ہیں
کے مطالعہ سے صحافت میں حسرت کی انفرادیت، انکا خلوص فکر،
مس اور حق گوئی آشکار ہوتی ہے، اور اس امر کا اندازہ ہو
تا ہے کہ ہندوستان اور ہندوستانیوں کی فلاح و بہبود ہمیشہ
کے پیش نظر رہی، حسرت باغی مزاج محب وطن تھے اور انکی
فن ایمانداری اپنی مثال آپ تھی۔ بقول حامد علی "جب بھی
گریز حکمرانوں، کسی غیر ملک کی حکومت، کسی جماعت یا فرد
کی ریشہ کار یا حکمت عملی کو حسرت نے ناپسند کیا تو بغیر کسی مروت
ن یا زمانہ سازی کے واضح طور پر اپنے خیالات کو ظاہر کیا۔
نے حلیف و حریف میں بھی امتیاز نہیں کیا۔ آج کی ہندوستانی
ت کو حسرت کے ان اداریوں کے بین السطور میں پیدا پنہاں
یوں کو اپنے لئے نشان راہ بنانا چاہیئے۔ اس اعتبار سے
رنمبرہ "انتخاب مستقل" دائمی سچائی اور بے باکی کا بے نہایت
کارنامہ ہے اور یو۔پی۔ اکیڈمی قابل مبارکباد قرار پاتی ہے

کتاب "مشاعرۂ زنداں" پیش لفظ: ڈاکٹر محمود الٰہی۔
: اتر پردیش اردو اکیڈمی۔ قیصر باغ، لکھنؤ۔ صفحات (۸۰)
یمائی سائز۔ قیمت: ۴ روپے ۵۰ پیسے۔

اردو میں زندانی ادب کا وافر سرمایہ ملتا ہے "مولانا
" سے لے کر سجاد ظہیر تک دانشور اہل قلم احباب نے
زرنگ میں ادبی شاہکار تخلیق کر کے اردو زبان کی مرکیاتی
قیمت انجام دی ہے۔ زیر نظر کتابچہ اپنے موضوع کی
مثال ہے۔ اردو شاعری اور مشاعروں نے ڈاکٹر محمود
کے تحریر کے مطابق ہماری مشترکہ تہذیب کو سجایا سنوارا
ہے۔ جنگ آزادی میں اردو نے کردار ادا کیا ہے وہ انھیں
ہم عصر زبانوں میں امتیازی نشان عطا کرنے کیلئے کافی ہے۔
اس کی خدمات کا سلسلہ جیل کی چار دیواری کے اندر بھی جاری تھا۔

"مشاعرۂ زنداں" نامی اس کتابچہ میں آگرہ ڈسٹرکٹ
جیل میں نظر بند سیاسی قائدین، علماء اور قوم پرست شعراء
کے چار طرحی مشاعروں کی روداد کو روزنامہ "زمیندار" لاہور
۱۹۲۲ء کے فائیلوں سے یکجا کر کے شائع کیا گیا ہے۔
آزادی کے متوالوں نے حب وطن سے سرشار ہو کر
اپنے سلک سخن نے گوہر مرداریدنوک قلم پر نقش کر کے آزادی
کی تاریخ تسلیمند کی تھی اور ان ۳۵ برسوں میں صاحبان اقتدار
زبان اردو کو اس جائز مقام نہ دلا سکے۔ تعجب ماضی کی اس لذیز
حکایت کا مطالعہ قاری پر اچھے نقوش مرتسم کرنے کا باعث
بنے اور اردو کے دن پھریں ہماری یہی آرزو ہے۔ "مشاعرۂ زنداں"
میں احمق پھپھوندوی، عارف ہوی، فراق گورکھپوری اور کئی شعراء
کا کلام مشاعرہ کی رپورٹ کے ساتھ درج ہے۔ ابتداً جوش
ملیح آبادی کی ایک لاجواب نظم شامل کی گئی ہے، جس کے مطالعے
سے جوش کی وطن دوستی، سامراج دشمنی اور حریت شعاری
منکشف ہوتی ہے۔ ان شعراء قید فرہنگ نے ملک کی آزادی
کے لئے اپنے فکر و فن کو وقف کر کے جو کارنامے انجام دیئے ہیں
انہیں نئے حالات میں نئی نسلوں تک پہنچانے کیلئے یو۔پی اکیڈمی
نے مفید اور مختصر کتابوں کی اشاعت کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ عام
اردو والوں کو بھی اس سے استفادہ کرنا چاہیئے۔

نام کتاب "ضلع جگت": مصنف: کشن پرشاد شاد۔
ڈیمائی سائز۔ (۸۴) صفحات۔ قیمت ۲/۵۰ روپے۔
ناشر: اتر پردیش اردو اکیڈمی۔ قیصر باغ۔ لکھنؤ۔

کسی بھی زبان کی عوامی مقبولیت میں اسکے روزمرہ،
محاوروں، ضائع بدائع کے علمی و شعری اظہار کو بنیادی اہمیت
حاصل رہی ہے اردو زبان اور شاعری کی روز افزوں مقبولیت

(باقی صفحہ نمبر ۔۔ پر)

مشتاق حیدرآبادی

ادبی ٹرسٹ کا مقصدی ہند پاک مشاعرہ

(آنکھوں دیکھا حال اور انتخاب مشاعرہ)

۷ / مئی ۱۹۸۳ء کو ۹ بجے شب بمقام وسیع و عریض نمائش میدان ادبی ٹرسٹ کا ۱۸ واں کل ہند و ہند پاک مشاعرہ منعقد ہوا۔ شائقین کا ریکارڈ توڑ ہجوم اور بانیان مشاعرہ کے مثالی نظم و نسق اور شہر غزل کے سخن فہموں کی داد و پسند کے منظر و پس منظر میں اس مشاعرہ سے ۸۵ ہزار روپے کی آمدنی ہوئی۔ جسے جنوبی ہند کے ریسرچ سنٹر ادارہ ادبیات اردو کے ٹرسٹ کے لئے عطیہ کے طور پر دیئے جانے کا اعلان تالیوں کی گونج میں اختتام مشاعرہ سے قبل جناب مظہر راج سکسینہ رکن ادبی ٹرسٹ نے کیا۔

اردو دوست حیدرآبادی مرکزی وزیر توانائی و پٹرولیم جناب پی۔ شیو شنکر نے اس یادگار مشاعرے کی صدارت کی۔ ۱۰ ہزار سے زائد باذوق سامعین نے رات دیر گئے تک مہمان و میزبان شعراء کو پوری دل جمعی سے سنا، اور خوب خوب داد دی۔ جناب ثقلین حیدر (کلکتہ) نے برجستہ لطائف اور دلچسپ اشعار کے سہارے نظامت کے فرائض نہایت خوبی سے انجام دیئے۔

مرکزی وزیر داخلہ جناب پرکاش چند سیٹھی نے بہ حیثیت مہمان خصوصی شرکت کی اور حیدرآباد کے ادبی اور سیکولر روایات کو زبردست خراج تحسین ادا کرتے ہوئے کہا کہ اردو ہماری زبان ہے اور سیکولر روایات کی پاسدار، اس کا شعری سرمایہ اسکی مقبولیت ہے۔ نئے حالات میں یہ زبان اندرون ملک ہی نہیں سوویت یونین، امریکہ اور برطانوی ممالک میں بھی ارتقائی مدارج طے کر رہی ہے۔ آپ نے جامعہ عثمانیہ کے اردو کردار کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ اس درسگاہ نے اردو کو اعلیٰ تعلیم کے لئے منتخب کرکے علاقائی اور ملکی زبانوں کے فروغ کی اولین مثال قائم کی ہے۔ جناب سیٹھی دہلی کے شنکر و شاد مشاعروں اور حیدرآباد میں نصف صدی قبل مہاراجہ سرکشن پرشاد کی دیوڑھی کے مشاعروں کا تذکرہ کرتے ہوئے ادبی ٹرسٹ کے سالانہ مقصدی اور مقبول عوام جنوبی ہند کے مثالی سالانہ مشاعروں کو قومی یکجہتی کا روشن نمونہ قرار دیا اور کہا کہ جناب عابد علی خان ایڈیٹر سیاست و بانی ادبی ٹرسٹ کی کوششوں سے حیدرآباد میں اردو زبان و ادب اور تہذیب کی مثالی ترقی ہو رہی ہے۔ موصوف نے جناب عابد علی خان کی اچانک علالت اور مشاعرے میں عدم شرکت پر گہرے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے انکی عاجلانہ صحت یابی کی تمنا ظاہر کی اور ہزاروں سامعین نے آمین کہا۔

صدر مشاعرہ جناب پی. شیو شنکر نے فصیح اُردو میں تقریر کرتے ہوئے مسٹر سیٹھی کا اُردو کے شہر میں خیر مقدم کیا
د... ویمنری کی رسم اجراء انجام دی۔ اور کہا کہ اُردو زبان یگانگت اور مفاہمت کی زبان ہے اور میرے حیدرآباد کو اس
...ت کا فخر حاصل ہے کہ یہ شہر صدیوں سے اُردو کا گہوارہ رہا ہے۔ یہاں مختلف زبانوں میں لسانی اتحاد بھی فروغ پاتا رہا۔
جناب شیو شنکر نے مشاعرہ کے معزز مہمان جناب سید ہاشم علی اختر وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی کی طرف اشارہ کرتے
ہوئے کہا کہ میں اپنے استاد کی موجودگی میں اُردو میں تقریر کرتے ہوئے جھجھک محسوس کر رہا ہوں۔ موصوف نے اپنی مختصر
اور شاداب و شگفتہ تقریر میں مرکزی حکومت کے ان اقدامات پر بھی روشنی ڈالی جن کے ذریعہ ترقی اُردو بورڈ، اُردو
...سیدیمیاں زبان، ادب اور کلچر کے فروغ میں اہم کردار ادا کر رہی ہیں۔ جناب شیو شنکر نے اُردو شاعری کی زبردست
قوت کو متحدہ اور آزاد ہندوستان سے مربوط اور منسلک قرار دیا اور کہا کہ اُردو ہی وہ زبان ہے جو ملک کو متحد
اور مستحکم بنانے میں اہم حصہ ادا کر سکتی ہے۔ اس طرح اُردو کا فروغ ایک خوشحال ہندوستان کی تعمیر کے مترادف ہے۔

جناب سید ہاشم علی اختر (معتمد ادارۂ ادبیات اُردو) نے ابتداً وزراء اور مہمان پاکستانی شاعر
حضرت شان الحق حقی کی تہنیت کی اور مرکزی وزیر داخلہ جناب سیٹھی کو اہل حیدرآباد کی طرف سے چارمینار کا
ماڈل پیش کیا۔ جناب منوہر راج سکسینہ نے جناب عابد علی خان بانی و معتمد ادبی ٹرسٹ کی طرف سے خطبۂ استقبالیہ پڑھا
اور ادبی ٹرسٹ کے مقصدی مشاعروں کا تعارف و تذکرہ کرتے ہوئے بتایا کہ اب تک ٹرسٹ کے مشاعروں سے ۰۰لاکھ
روپے جمع کئے گئے، جن سے اُردو کے تعلیمی، ادبی اور تہذیبی اداروں کی اعانت کی گئی۔ اُردو ماڈل اسکول اور اُردو
گھر ایسے کار آمد اُردو مراکز ادبی ٹرسٹ کی اعانت سے اُردو کے فروغ اور استحکام کا کام انجام دے رہے ہیں۔
ادبی ٹرسٹ کے مشاعرے حیدرآباد کی مشترکہ تہذیب کی تجدید کا سالانہ قومی جشن بن گئے ہیں۔ مشاعرہ کی ابتدائی معمول
کارروائی ڈاکٹر مغنی تبسم رکن ادارۂ ادبیات اُردو و کنوینر مشاعرہ نے انجام دی۔ ٹھیک ۱۰ بجے مشاعرہ روشن
ہوا اور مائک جناب ثقلین حیدر نے سنبھالا۔ اس مشاعرے میں پاکستان کے جناب شان الحق حقی کے علاوہ
مہمان شعراء حضرت خمار بارہ بنکوی، جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، پروفیسر معین احسن جذبی، جناب فنا
نظامی، محترمہ ساجدہ قزلباش، جناب آغا قزلباش، جناب شاہد فیضی، محترمہ روپا مہتا نغمہ اور جناب نور اندوری
کے علاوہ میزبان شعراء حضرت سعید شہیدی، جناب شاذ تمکنت، جناب علی احمد جلیلی، جناب امیر احمد خسرو،
جناب کنول پرشاد کنول، جناب راشد آذر، جناب خواجہ شوق، جناب نقی علی خان ثاقب، جناب صلاح الدین نیر،
جناب رحمٰن جامی اور محترمہ عزیز النساء صبا نے کلام سنایا۔ ذیل میں اس مشاعرے سے انتخاب ہدیہ ناظرین
کیا جاتا ہے۔

رحمٰن جامی۔ اِک ذرا نزدیک سے گزری خوشی ــ دُور سے ہر غم کا اندازہ ہوا
جب گناہوں سے ہوا میرا گزر ــ تب تری رحمت کا اندازہ ہوا

نور اندوری۔ عشق میں جان دے دینا آسان تو ہے ــ ہاں مگر اِک ذرا حوصلہ چاہیئے

میرا گھر اُجڑے یا اُجڑے گھر آپ کا — آندھیوں کو تو بس راستہ چاہیئے

صلاح الدین نیّر۔ تمام شہر ہے پیاسا دھواں دھواں منظر — یزید اپنے مقابل ہے کیا کیا جائے
بہت سے ڈوبنے والے تھے بچ گئے نیّر — ہمارا گھر لبِ ساحل ہے کیا کیا جائے

شاہد فیقی۔ یہ تیری انجمنِ خاص کی نوازش ہے — پڑے ہیں شیشۂ و ساغر اِدھر اُدھر کتنے
ذرا تم اپنے محل سے تو جھانک کر دیکھو — تمھارے شہر میں اُجڑے ہوئے ہیں گھر کتنے

عزیز النساء صبا۔ فصلِ گل بھی گلشن میں آ نہیں سکی اب تک — پھول بھی نہیں مہکے آپ کے نہ آنے سے

روپا مہتا نغمہ۔ تنہائیوں کے پھول ہیں غم کی بہار ہے — اجڑے ہوئے دلوں کا یہ اُجڑا دیار ہے
گزرا تھا کا۔ واں کوئی اس دل کی راہ سے — آنکھوں میں اس کی یاد کا اب تک غبار ہے

نقی علی خاں ثاقب۔ محسوس کر سکو تو کرو زندگی کا حسن — چھونے کی ان دنوں تو روایت نہیں رہی
خود کو نگاہِ دہر سے کیسے چھپائیے — سر پر ردائے شب بھی سلامت نہیں رہی
عجلت نہ کیجیے سوچ کے دروازہ کھولیئے — مانوس دستکوں میں مروت نہیں رہی

امیر آغا قزلباش دہلوی۔ بادل ہو تو برسو کبھی بے آب زمیں پر — خوشبو ہو اگر تم تو بکھر کیوں نہیں جاتے
تم راہ میں چپ چاپ کھڑے ہو تو گئے ہو — کس کس کو بتاؤ گے کہ گھر کیوں نہیں جاتے
ہر بار ہمیں ہیں ہدفِ سنگِ ملامت — الزام کسی اور کے سر کیوں نہیں جاتے

خواجہ شوق۔ کہاں ہوش ہے جنکو وہ دیوانے سے لگتے ہیں — حقائق زندگی کے آج افسانے سے لگتے ہیں
شرافت کے لبادے جب اُتر جاتے ہیں جسموں سے — تو یہ گنجان شہر، آباد ویرانے سے لگتے ہیں

ساحرہ قزلباش۔ کوئی رفیقِ سفر ہے نہ راہبر کوئی — اِک ایسی راہ میں کب سے کھڑے ہیں ہم تنہا
ہماری طرح بچھڑ کر کسی سے راہوں میں — کوئی دکھا دے ذرا چل کے دو قدم تنہا
کچھ اس طرح سے گزاری ہے ساحرہ ہم نے — ہمارے ساتھ زمانہ تھا اور ہم تنہا

راشد آذر ۔ یہ نہ سمجھو زندگی میں اک خلا رہ جائے گا ۔ تم نہ آؤ گے تو دروازہ کھلا رہ جائے گا
یاد میری جب بھی آئے گی خلش بن جائے گی ۔ بھول جاؤ گے تو دل میں درد سا رہ جائے گا
سب فنا ہو جائے گا بس اک صداقت کے سوا ۔ میں تو مٹ جاؤں گا میرا نقشِ پا رہ جائے گا

شان الحق حقی ۔ میں خرابِ راہِ حرم سہی تو ہیں بتکدے میں بھرے بھرے
وہ چراغِ خانۂ دلبری وہ صنم منوہرے سانورے

یہ جنونِ دل، یہ سرورِ سر ترے آستانے کی دین ہے
مری منزلیں، مری رہگزر ترے آستاں سے بھی تھیں پرے

وہ مرے خیال کا پھول ہیں کہ جہاں سے آتے ہیں یہ ستم
مرے وہم سے بھی ہے کچھ ادھر، مری یاد سے بھی کہیں پرے

وہ چراغِ شوق جو گل ہوا تو جہانِ دل ہی بدل گیا
وہ نظارہ گم وہ نظر نہیں کوئی کیوں جیے، کوئی کیا کرے

امیر احمد خسرو ۔ وفا، خلوص، محبت، بجا، درست مگر ۔ بتائیے کہ ہے یہ ذکر کس زمانے کا
کلی کی طرح ہر اک زخمِ دل چٹکنے لگا ۔ خیال آیا جو محفل تری سجانے کا
میں آدمی ہوں تو پھر کیوں مری تلاش میں ہے ۔ ہر ایک درد، ہر اک حادثہ زمانے کا
چلا ہے جانبِ مقتل جو مسکراتا ہوا ۔ وہ شخص لگتا ہے خسرو مرے گھرانے کا

ن نظامی ۔ تو چاہے تو بھر دے داتا تو چاہے تو خالی رکھ ۔ اور کہیں دامن پھیلانا میرے بس کی بات نہیں
کل کانٹوں سے ملتی تھی خود بادِ صبا آ کر ۔ اور آج گزرتی ہے پھولوں سے بھی کترا کر
دیوانہ بنا دے گی تجھ کو تری تنہائی ۔ دنیا سے نہ مل لیکن، آئینہ تو دیکھا کر
جلوہ ہو تو جلوہ ہو، پردہ ہو تو پردہ ہو ۔ توہینِ تجلی ہے چلمن سے نہ جھانکا کر

احمد جلیلی ۔ احباب کے خلوص سے جب واسطہ پڑا ۔ شیشہ تو میں نہیں تھا مگر ٹوٹنا پڑا
پھولوں کا حق تو ہم پہ بہرحال تھا مگر ۔ کانٹوں میں بھی کچھ اپنا لہو بانٹنا پڑا
جینے کی کس کو دیجیے اس عمر میں دعا ۔ ہر بار اٹھا کے ہاتھ یہی سوچنا پڑا
مل تو گئی حیات کی منزل مگر علی ۔ ہر حادثہ سے اپنا پتہ پوچھنا پڑا

معین احسن جذبی۔

ہمارے درد کا طوفان کہاں کہاں نہ اٹھا — یہ شور آپ جہاں چاہتے وہاں سنتے
کسی کا رنج، کسی کا الم، کسی کا ملال — اب اور کیا تھا جو ہم زیرِ آسماں سنتے
زندگی ہے تو بہ ہر حال بسر بھی ہوگی — شام آئی ہے تو آئے کہ سحر بھی ہوگی
دل اگر دل ہے تو ہیں راہ پہ لے جائے گا — دردمندوں کی وہی راہ گزر بھی ہوگی

شاذ تمکنت۔

بہت ہجوم تھا تعبیر کی دکانوں پر — ہمیں تھے ورنہ کوئی جنسِ خواب کیا لیتا
فرات آج رواں ہے یزید پیاسا ہے — یہ پیاس کوئی بجھا کر ثواب کیا لیتا
جسے ورق ورق چہرہ چہرہ یاد ہو شاذ — بھلا وہ آدمی درسِ کتاب کیا لیتا

سعید شہیدی۔

دینے والا بے طلب دیتا رہا — میں نے دامن اپنا پھیلایا نہیں
کیا کشش ہوگی عدم آباد میں — جانے والا لوٹ کر آیا نہیں
جانے کس نے دی دریچہ دل پر صدا — میں نے اس کا نام بھی پوچھا نہیں

خمار بارہ بنکوی۔

دوسروں پر اگر تبصرہ کیجئے — سامنے آئینہ رکھ لیا کیجئے
حسن جب مہرباں ہو تو کیا کیجئے — عشق کی مغفرت کی دعا کیجئے
عقل و دل اپنی اپنی کہیں جب خمار — عقل کی سنئے دل کا کہا کیجئے
رات کٹی تو کیا کٹی بڑھ گئی اور تیرگی — صبح کے خواب دیکھئے، صبح کو بھول جائیے
جلتے گھروں کی روشنی شہروں کو جگمگا چکی — اب تو خدا کے واسطے دل کے دیئے جلائیے
سب ہیں دماغ کے مرید پیروِ دل نہیں کوئی — آج کے دور میں خمار کس کو غزل سنائیے

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر۔

ہم رندِ خرابات بڑھاپے میں جواں ہیں — اور اُن پہ جوانی میں جوانی نہیں آئی

"ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ کے نام کے ساتھ ساتھ کب سے میں "ادارۂ ادبیات اردو" کا نام سنتا رہا تھا۔ زہے نصیب کہ اس ادارے میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ در و دیوار کو دیکھا، مخطوطات و مطبوعات پر نظر ڈالی۔ تصاویر و فرامین اور نوادر کو بیک نظر دیکھا۔ جی خوش ہوا۔ اور ایک روحانی بالیدگی حاصل ہوئی۔"

انتظار حسین، ۱۷ / اپریل ۱۹۸۳ء

اردو نامہ

وقار خلیل

اردو کی علمی ادبی تہذیبی خبریں

یکم اپریل: حیدرآباد لٹریری فورم کا ادبی اجلاس ڈاکٹر مغنی تبسم کی صدارت میں منعقد ہوا۔ پاکستانی نقاد اور محقق ڈاکٹر جمیل جالبی نے بحیثیت مہمان خصوصی ادبی و شعری روایات پر عالمانہ خطاب کیا۔ ڈاکٹر انور معظم نے ڈاکٹر جمیل کی تصنیف "پاکستانی کلچر" پر سیر حاصل تبصرہ سنایا۔ پروفیسر غلام عمر خاں صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی نے جالبی صاحب کی دکھنیات شناسی کو خراج ادا کیا۔ جناب علی ظہیر نے نظامت کی۔

● اقلیم ادب کی طرف ادبی محفل میں ڈاکٹر جمیل جالبی کے فکر و فن پر، ڈاکٹر مغنی تبسم، ڈاکٹر مجاور حسین رضوی مصلح الدین سعدی اور رحمت یوسف زئی نے ادبی انٹرویو کیا۔ پروفیسر سید سراج الدین نے صدارت کی۔ جناب عابد علی خاں ایڈیٹر "سیاست" مہمان خصوصی تھے۔

● ریاستی چیف منسٹر مسٹر ین، ٹی راما راؤ نے اخبار والوں کو بتایا کہ حکومت نے ملک الشعراء (تلگو، اردو) اور استھانہ ودوان کے عہدوں کو

فی الفور برخواست کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ اعزاز شاہی اور جاگیردارانہ روایت کی نشان دہی کرتے ہیں۔

۲/اپریل: شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کی طرف سے ڈاکٹر جمیل جالبی کا پُرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ پروفیسر غلام عمر خاں نے صدارت کی۔ جناب جالبی نے ادبی اور تحقیقی رجحانات اور نقاطِ نظر پر خطاب کیا۔ ڈاکٹر یوسف سرمست نے شکریہ ادا کیا۔

● ریاستی انجمن ترقی اردو کی طرف سے اردو ہال میں جناب جمیل جالبی کے اعزاز میں عصرانہ ہوا۔ موصوف نے پاکستان میں ادبی سرگرمیوں پر اظہارِ خیال کیا۔ ڈاکٹر حسینی شاہد معتمد انجمن نے خیر مقدمی تقریر کی اور مسٹر سرنیواس لاہوٹی شریک معتمد نے شکریہ ادا کیا۔

۴/اپریل: جناب میر اکبر علی خاں سابق گورنر اتر پردیش نے ریاستی اورینٹل گرایجویٹ اسوسی ایشن کے زیر اہتمام، سرکاری زبان کنونشن کا افتتاح کرتے ہوئے آندھرا یونیورسٹی میں تلگو اور عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو کو اہم موقف دینے کا مطالبہ کیا۔ اردو کے تعلیمی اور سرکاری موقف اور مسائل پر اس کنونشن میں،

مسرز جوالامکھی (تلگو شاعر)، محمود انصاری ایڈیٹر "منصف"، چندر سری واستو ڈائرکٹر اردو اکیڈیمی منوہر راج سکینہ (انجمن) اور اعجاز قریشی نے حصہ لیا۔

۷/اپریل: حلقۂ ارباب ذوق (نظامس اردو ٹرسٹ لائبریری) کا ماہانہ اجلاس پروفیسر سراج الدین کی صدارت میں ہوا۔ جناب علی احمد جلیلی نے شجاع خاور کے مجموعہ کلام "دادِ بیں" پر عالمانہ تبصرہ سنایا۔ جناب محمد منظور احمد سکریٹری نے نظامت کی اور شکریہ ادا کیا۔

۸/اپریل: عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ صحافت کی طرف سے ایک سمینار "ریاست میں علاقائی صحافت کا رول" کے زیر عنوان جناب سید ہاشم علی اختر وائس چانسلر کی صدارت میں منعقد ہوا۔ بزرگ تلگو صحافی مسٹر ین دینکٹیشور راؤ، ڈاکٹر اے آر بی منیر ریاستی محکمہ اطلاعات، صدر شعبہ صحافت پروفیسر بشیر الدین، مسٹر جی ایس بھارگو (انڈین ایکسپریس) اور مسٹر محمود انصاری ایڈیٹر "منصف" نے حصہ لیا۔ مقررین کا عمومی تاثر یہ رہا کہ ریاست کے اردو اخبارات کا معیار دیگر علاقوں کے اخبارات سے بدرجہا بہتر ہے اور ملک میں صحافت کا مستقبل ہندوستانی زبانوں کے اخبارات سے وابستہ ہے۔

۹/اپریل: شہر ادب کا ماہانہ

مشاعرہ جناب راز عابدی کی صدارت میں ہوا۔ قدیم کتب نگر کے شعراء نے کلام سنایا۔ یوسف ناظم نے معتمدی کی۔

۱۱/اپریل: ادارہ ترقی ادب کا غیر معمولی اجلاس گاندھی بھون میں اس کے صدر جناب کے یم خاں کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اور ایک قرارداد کے ذریعہ ریاستی حکومت سے اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیئے جانے کے تعلق سے آرڈیننس جاری کرنے کا مطالبہ کیا گیا اور نئے تعلیمی میقات سے قبل اردو اساتذہ، مدارس ان کی عمارتوں، تعلیم اور نصابی کتب کے خاطر خواہ انتظامات کیلئے اقدامات میں سرعت پیدا کرنے پر زور دیا گیا۔

۱۲/اپریل: ادبی انجمنوں "فردوسِ ادب" اور "خاصانِ ادب" کی طرف سے جناب خاور نوری کی دیرینہ ادبی و شعری خدمات کو "اردو گھر" میں خراج ادا کیا گیا۔ ڈاکٹر مغنی تبسم نے صدارت کی۔ حضرت سعید شہیدی، ڈاکٹر اشرف رفیع، ڈاکٹر محمد علی اثر، ڈاکٹر عقیل ہاشمی، جناب صادق نقوی اور جناب راحت عزمی نے خاور نوری کی شعری صلاحیتوں پر مضامین سنائے۔ مہمان شاعر ڈاکٹر احسن رضوی کا اس محفل میں خیر مقدم بھی ہوا۔

۱۳/اپریل: ادارہ تنظیم اردو اور ہفتہ روزہ کامن نیوز کی طرف سے دبستانِ سیماب کے شاعر راد ھاکرشن سہگل دہلوی کے خیر مقدم میں شعری محفل منعقد ہوئی۔ جناب محمود انصاری ایڈیٹر منصف نے صدارت کی۔ جناب منوہر راج سکینہ اور امجد باغی نے مخاطب کیا۔ یوپی اکیڈیمی سے انعام ملنے پر خورشید جنیدی اور زور آغائی صاحبان کی گلپوشی کی گئی۔ سرز سہگل، جنیدی، زور، بشیر وارثی، ڈاکٹر راہی، وقار خلیل، جہاں دار افسر، منوہر لال بہار، مجلل اظہر، ظریف، راج لال راجہ اور مہمان شاعر عبد القادر ادیب (بنگلور) نے کلام سنایا۔ فیاض الدین صابری معتمد تنظیم اردو اور معین فیاضی (ایڈیٹر کامن نیوز) نے خیر مقدم اور شکریہ ادا کیا۔

۱۴/اپریل: زندہ دلانِ حیدرآباد کی ۱۵ ویں سالانہ سہ روزہ تقاریب کا ریاستی وزیر لیبر مسٹر یم راجیندر راؤ نے افتتاح کیا۔ محفل لطیفہ کے اس باغ و بہار اجلاس میں رشید قریشی، مجتبیٰ حسین، ڈاکٹر احمد اللہ خاں، اظہر افسر، مصطفےٰ علی بیگ، اسلم فرشوری، بالا پرشاد گوڑ، دولت رام، ذہانت علی بیگ، حاجی بشیر احمد اور کنوینر طالب خوندمیری نے لطائف و ظرائف سنائے اور داد حاصل کی۔

● جناب امان اللہ خاں رکن اسمبلی نے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ اردو کو دوسری سرکاری زبان قرار دینے کا، اعلان کرے۔

۱۵/اپریل: زندہ دلانِ حیدرآباد کے نکاہی اجلاس کا جناب سید ہاشم علی اختر وائس چانسلر، یونیورسٹی نے افتتاح کیا اور مہمان خصوصی افسانہ نگار اُمیٹر جناب انتظار حسین (پاکستان) نے صدارت کی۔ محترمہ جیلانی بانو، جناب رشید قریشی، جناب بھارت چند کھنہ، جناب نریندر لوتھر، جناب مجتبیٰ حسین، محترمہ شفیقہ فرحت (بھوپال)، جناب پرویز یداللہ مہدی، جناب فضل جاوید (بھوپال) جناب مسیح انجم، جناب برہان حسین اور ڈاکٹر حبیب ضیاء (کنوینر) نے طنز و مزاح سے عبارت شگفتہ مضامین سنائے۔ صدارتی اور افتتاحی مضامین نے خصوصی توجہ پائی۔

۱۶/اپریل: شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی اور اسٹوڈنس ویلفیر اسوسی ایشن کی طرف سے منعقدہ، بین کلیاتی تحریری و تقریری مقابلوں میں حصہ لینے والوں کو محترم بیگم ہاشم علی اختر وائس چانسلر نے انعامات تقسیم کئے۔ جناب وائس چانسلر نے صدارت کی۔ ڈاکٹر یوسف سرمست ریڈر شعبۂ اردو نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔

● روزنامہ "سیاست" کی طرف سے "اردو گھر" میں پاکستانی مہمان افسانہ نویس جناب انتظار حسین کے ساتھ ایک شام کا اہتمام کیا گیا۔ جناب نریندر لوتھر نے صدارت کی۔ انتظار حسین صاحب کے علاوہ محترمہ جیلانی بانو اور جناب عوض سعید نے

نئی کہانیاں سنائیں جبکہ جناب مجتبیٰ حسین نے انتظار حسین پر اپنا دلچسپ خاکہ سنایا۔ ڈاکٹر مغنی تبسم نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔

● جناب انتظار حسین نے آرٹس کالج عثمانیہ یونیورسٹی میں جدید افسانے پر توسیعی لکچر دیا۔ ڈاکٹر مغنی تبسم نے فاضل دانشور کا تعارف کرایا۔

● زندہ دلان حیدرآباد کا کل ہند مشاعرہ نواب شاہ عالم خاں صدر تعلیمی کمیٹی انوار العلوم ایجوکیشنل سوسائٹی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ہلال رامپوری، شمسی مینائی، ساغر خیامی، ناظر انصاری، مختار یوسفی، دلکش آفریدی اور میزبان شعراء علی صاحب میاں، حمایت اللہ، مصطفیٰ علی بیگ، پاگل عادل آبادی، بمباٹ، سرپٹ، برگس اور ناظم مشاعرہ طالب خوندمیری نے کلام سنایا۔

● نیرنگ ادب کا ادبی و شعری اجلاس جناب اظہر افسر کی صدارت میں منعقد ہوا۔ شاغل ادیب نے فکاہیہ اور شعراء ادج یعقوبی، محسن جلگانوی، راز عابدی، عبدالکریم ماہر نے کلام سنایا۔

۱۷/ اپریل: اردو اکیڈیمی، آندھرا پردیش کی طرف سے تیسرا مخدوم ادبی ایوارڈ برائے تنقید ایک نمائندہ جلسہ میں ڈاکٹر وحید اختر ریڈر شعبۂ فلسفہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کو دیا گیا حافظ ابو یوسف صدر اکیڈیمی نے اس خوشگوار تقریب کی صدارت کی جبکہ سردار علی خاں نے ڈاکٹر اختر کو ایوارڈ کی رقم دس ہزار روپے، سند توصیف اور شال نذر کی۔ جناب چندر سریواستو ڈایرکٹر / سکریٹری اکیڈیمی نے خیر مقدمی خطاب کیا۔ جناب اختر حسن نے توصیف نامہ سنایا۔ مسرز کے ایل چھندرا، منوہر راج سکسینہ، محمود انصاری، اکرام جاوید اور اعجاز قریشی نے مخدوم اور وحید اختر کے فکروفن پر اظہار خیال کرتے ہوئے مخدوم ادبی انعام پانے پر وحید اختر کو مبارکباد پیش کی۔ ڈاکٹر وحید اختر نے مخدوم کو زبردست خراج عقیدت ادا کرتے ہوئے اکیڈیمی کا شکریہ ادا کیا اور ادب و تنقید کے مسائل پر لکچر بھی دیا۔

● حیدرآباد لٹریری فورم نے جناب انتظار حسین کے خیر مقدم کا اہتمام کیا۔ جناب عوض سعید نے صدارت کی۔ ڈاکٹر مغنی تبسم علی ظہیر اور یوسف اعظمی صاحبان نے انتظار حسین کی کہانیوں پر اظہار خیال کیا۔ بانو طاہرہ سعید نے نذرانۂ سخن پیش کیا انتظار حسین نے کہانی سنائی۔ غیاث متین نے معتمدی کی۔

۱۸/ اپریل: ریاستی انجمن ترقی اردو کی طرف سے جناب انتظار حسین کو استقبالیہ دیا گیا انجمن کے عہدہ داروں پروفیسر حبیب الرحمن، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، ڈاکٹر منان، ڈاکٹر حسینی شاہد اور جناب سرخواس لاہوتی کے علاوہ ادیبوں اور شاعروں نے شرکت کی۔

۱۹/ اپریل: ممتاز عالم ڈاکٹر محمد غوث سابق لائبریرین شعبۂ مخطوطات عثمانیہ یونیورسٹی کا ۷۵ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا، خدا مغفرت فرمائے۔

۲۱/ اپریل: حیدرآباد کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کی طرف سے ڈاکٹر وحید اختر کو مخدوم ادبی ایوارڈ ملنے کی مسرت میں ایک نمائندہ تہنیتی جلسہ جناب اختر حسن مددگار معتمد ریاستی اردو اکیڈیمی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر مغنی تبسم، شاذ تمکنت، عوض سعید یوسف اعظمی اور محسن علی صاحبان نے وحید اختر کے فکروفن پر اظہار خیال کرتے ہوئے مبارکباد پیش کی۔ ڈاکٹر وحید اختر نے ادبی رجحانات پر خطاب کیا اور اپنا کلام سنایا۔ حسن فرخ نے کارروائی انجام دی اور تدبیر زماں نے شکریہ ادا کیا۔

۲۲/ اپریل: ادارہ ادبیات اردو کیلئے ایک لاکھ روپے کے ٹرسٹ کا ادبی ٹرسٹ نے کل ہند مشاعرہ کے ذریعہ قیام عمل میں لانے کا جو اعلان کیا ہے اس سے متاثر ہوکر جناب تادر جاوید سکریٹری انجمن عوامی مصنفین نے ۱۰۱ روپے کے عطیہ کا روزنامہ سیاست میں پیش کیا ہے۔ جس کا ادبی حلقوں میں خیر مقدم کیا جا رہا ہے۔

۲۴/ اپریل: بزرگ شاعر اور جامعہ عثمانیہ کے سپوت جسونت رائے ضیاء مؤلف نج کا انتقال ہوگیا۔ گزشتہ دنوں ضیاء کے مجموعۂ کلام "قوس قزح" کی رسم اجراء انجام پائی تھی۔ جناب

ضیاء حیدرآبادی تہذیب اور علم دوستی کا مثالی نمونہ تھے ہوا بخشے، ان کے صاحبزادہ مسٹر جگجیون استھانہ سحر سے ادارہ "سب رس" اظہار تعزیت کرتا ہے

● جناب طیب انصاری لکچرار، گورنمنٹ کالج گلبرگہ نے ادارہ ادبیات اردو کے ٹرسٹ کیلئے ادبی ٹرسٹ کی اپیل پر ۱۰۱ روپے عطیہ دیتے ہوئے عثمانیہ یونیورسٹی کے پروفیسروں، اسکالروں اور اردو دوستوں سے اس امر کی خواہش کی کہ وہ ملک کے اہم ریسرچ سنٹر کے مالیہ کو مستحکم بنانے میں ادبی ٹرسٹ سے تعاون کریں۔

۲۵/اپریل: اردو گھر میں، جناب طیب انصاری کے سفرنامہ، "گلبرگہ سے گلمرگ تک" کی اشاعت پر جلسۂ تہنیت حیدرآباد کرناٹک فرینڈس اسوسی ایشن کی طرف سے بصدارت جناب سید ہاشم علی اختر وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی منعقد ہوا۔ جناب عابد علی خاں اڈیٹر سیاست، جناب شاہ عالم خاں مہمانان خصوصی تھے۔ ڈاکٹر مغنی تبسم، جناب لسن کمال سابق ایم ایل اے کرناٹک اور جناب صادق نقوی نے جناب طیب کی ادبی خدمات اور تعلیمی انہماک پر اظہار ستائش کرتے ہوئے سفرنامہ کی، اشاعت پر مبارکباد دی محفل شعر میں سعید شہیدی، علی احمد جلیلی، صلاح الدین نیر، صاحب حیدرآبادی، صادق نقوی، رئیس اختر، اور صدر مشاعرہ ڈاکٹر مغنی تبسم نے کلام سنایا۔ جناب امجد حسین جدا نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور جناب رئیس اختر نے نظامت کی۔

۲۹/اپریل: ادبستانِ دکن کی طرف سے حضرت صفی اورنگ آبادی کی یاد میں سالانہ ادبی اجلاس جناب عابد علی خاں اڈیٹر سیاست کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جناب محبوب حسین جگر جناب منوہر راج سکینہ، جناب وقار صدیقی، جناب غلام یزدانی اور جناب عبدالحفیظ محفوظ نے حضرت صفی کی شاعری اور ان کے عہد پر مقالے پڑھے۔ جناب محمد منظور احمد نے شکریہ ادا کیا۔ جناب سید عبدالقیوم نے نظامت کی۔

۳۰/اپریل: ادبستانِ دکن کی طرف سے نعتیہ مشاعرہ جناب خواجہ شوق کی نگرانی میں منعقد ہوا۔ یحییٰ جمیل نے معتمدی کی۔ تلامذہ صفی کے علاوہ ممتاز شاعروں نے بارگاہ رسالت میں نذرانۂ سخن پیش کیا۔

● نئے لہجے کے شاعر جناب اشرف رفیع کا مجموعہ کلام "بوند بوند روشنی" کی جناب ہاشم علی اختر وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی نے رسم اجرا انجام دی۔ مسٹر کے لی لال سابق اڈیشنل چیف سکریٹری نے صدارت کی۔ جناب اختر حسن، جناب محبوب حسین جگر، مسٹر چندر سری واستو، مسٹر شنیندر شرما، راجکماری اندرا دیوی دھن راج گیر، اعجاز قریشی اور جمیل شیدائی نے اشرف کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے مبارکباد دی۔ سرفراز شاہد نے معاصر شاعر پر نظم سنائی۔ حسن فرخ نے خوشگوار تقریب کی کارروائی انجام دی۔

نقد و نظر ص ۱۳۱ سے آگے

میں اس زبان کے محاوروں، روزمرہ اور ضلع جگت کو بھی کلاسیکی اور عصری ہر اعتبارات سے خاص مقام حاصل رہا ہے اتر پردیش اردو اکیڈمی نے حیدرآباد کے صوفی شاعر، عہد آصفی کے وزیر اعظم، دکنی اور ہندوستانی کلچر کے مثالی کردار مہاراجہ سرکشن پرشاد کے اہم رسالہ "ضلع جگت" کا دوسرا آفسیٹ ایڈیشن شائع کر کے اہم ادبی خدمت سرانجام دی ہے۔ دیباچہ میں مہاراجہ مرحوم نے "ضلع اور جگت" کی لغوی اور لسانی اہمیتوں کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "دلی اور لکھنؤ میں جب اردو نے نشو و نما پائی اور اس میں طرح طرح کی کونپلیں پھوٹیں، اس پیاری زبان میں جب شگوفہ کاری کی گئی تو خوش مذاق ظریفوں اور رنگین مزاج شوخ طبعوں نے اس پر ضلع جگت کی بھی ایک خوشنما بیل چڑھائی جس سے اس چمن کی بہار بڑھ کر ایک سے ہزار ہو گئی۔ ہر بات میں لطیفہ اور ہر فقرہ میں لفظ ذو معنین ہو۔ اس میں علاوہ تفریح و دلچسپی کے اعلیٰ درجہ کی طبیعت داری، ذہانت اور زبان کے محاورات و کنایات و اشارات پر عبور و مہارت پائی جاتی ہے۔ اس کتاب میں (۲۶) عنوانوں کے تحت ضلع جگت کی مثالیں دی گئی ہیں۔ اردو کے ابتدائی ناولوں، ڈراموں اور افسانوں میں "ضلع جگت" کی خوش فعلیاں قاری کو متوجہ کرتی رہی ہیں۔ فکشن کے نئے تجربوں میں ضلع جگت کو رواج دیا جا سکتا ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ کلاسیکی اعتبار سے مفید ہے ●

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد

مدیر اعزازی — مغنی تبسم

معاون مدیر — وقار خلیل

جلد (۴۳) جون ۱۹۸۳ء شمارہ

قیمت فی پرچہ ۲ روپے ۲۵ پیسے

ادارۂ ادبیات اردو، پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد

زرِ سالانہ

۲۵ روپے کتب خانوں سے ۳۰ روپے

بیرونی ملکوں میں

ہوائی ڈاک سے — بحری ڈاک سے

مشرق وسطیٰ ۱۰ ڈالر — ۴ ڈالر

امریکہ ۱۶ ڈالر — ۶ ڈالر

بذریعہ رجسٹری ۴۵ روپے

پاکستان، برما، سیلون ۸ ڈالر — ۳ ½ ڈالر

انگلستان ۷ پونڈ — ۳ پونڈ

فہرست

سید علی اکبر ایڈیٹر، پبلشر، پرنٹر نے عقیل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان میں چھپوا کر حیدرآباد ۵۰۰۰۰۴ سے شائع کیا۔

اپنی بات

جشنِ وحید کی ہماہمی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ وہ شدید علالت کا شکار ہو گئے اور ان کی صحت کے بارے میں تشویش ناک خبریں آنے لگیں۔ آخر موت کے ظالم ہاتھوں نے انہیں ہم سے چھین لیا۔

وحید صاحب شائستہ اور نفیس آدمی تھے۔ وہ زندگی کے عاشق اور اس کے ہزار شیوہ حسن کے پرستار تھے۔ مظاہرِ فطرت ہوں یا انسان کی صناعی وہ ہر شئے میں لطافت اور نزاکت کے متلاشی رہتے تھے یہی جمالیاتی ذوق اور احساس ان کی شاعری کا جوہر بن گیا تھا۔ یوں ان کے کلام میں تجربے کی پیچیدگی اور گہرائی نہیں ملتی۔ وہ یک رخی مشاہدے اور یک طرفہ احساس کے شاعر تھے لیکن ان کے ہاں ہر جذبہ بہت سبک اور لطیف بن کر شعر کے سانچے میں ڈھل جاتا تھا۔

کارزارِ خیر و شر میں وہ خیر کے طرفدار تھے۔ انہوں نے بدی کے پھول نہیں کھلائے۔ بدی اور شر سے انھیں نفور تھا۔ لیکن نفرت کے اظہار کو بھی وہ تہذیب اور شائستگی کے منافی سمجھتے تھے۔ انھوں نے نیکی اور خیر کی مدح سرائی کو اپنا شعار بنایا۔ وحید صاحب کے نزدیک خیر اور حسن میں کوئی بھید نہیں تھا۔ ان کی جمال پرستی اپنا ایک نظامِ اخلاق رکھتی ہے۔ جس میں خیر کے لئے حسین ہونا شرطِ اولین ہے۔ وحید نے جمال بینی پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ حسن کو الفاظ کی گرفت میں لا کر دوام بخش دیا۔ زبان کے کوہستان میں مجسمے تراشے، آوازوں کے رنگوں سے نقش و نگار بنائے۔ ایلیا اور اجنتا کی طرح ان کی شاعری بھی ایک تہذیبی نگار خانہ ہے۔ وحید کا کلام اپنی مخصوص انفرادیت کے ساتھ اُردو شاعری کا سرمایۂ عزیز بنا رہے گا۔ وحید صاحب کی وفات ایک ایسا سانحہ ہے جس پر حسن اور شاعری ہمیشہ ماتم کناں رہیں گے۔

مغنی تبسم

ڈاکٹر رحیم الدین کمال

جدید ہندوستان میں اردو کی بقا اور ترقی کی تہذیبی ضمانتیں

ملک کی تقسیم کے بعد سے ایک عرصہ تک محبان اردو پر ایک طرح کی مایوسی اور پژمردگی کی فضا چھائی رہی۔ کسی کو یہ یقین نہیں آتا تھا کہ اردو ہندوستان میں باقی رہے گی۔ اس خیال کی وجہ سے اردو کے بعض شیدائیوں پر برسوں حزن و ملال کی کیفیت طاری رہی۔ بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ ان میں سے بعض اس کرب و اضطراب کی وجہ سے زیادہ دن زندہ بھی نہ رہ سکے

میں اس وقت بھی اردو زبان و ادب اور اردو تہذیب کی بقاء اور مستقبل کے بارے میں مختلف رائے رکھتا تھا اور آج میری یہ رائے ہے کہ اردو زبان و تہذیب کے ساتھ جدید ہندوستان کا مستقبل اس طرح جُٹ گیا ہے کہ ایک کے بغیر دوسرے کا تصور بھی ممکن نہیں ہے۔ ذیلی بر اعظم کو اگر ایک رشتے میں منسلک کرنے والی کوئی قدر ہے تو وہ اردو تہذیب ہی ہے میں اپنے اس استدلال کو تاریخی، لسانی، تہذیبی اور سماجیاتی بنیادوں پر ثابت کروں گا۔

یوں تو آزادی کے بعد سے اب تک ناسامد حالات اور غیر تو غیر خود اردو زبان و تہذیب کی ترقی اور اس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے اس کی تاب و توانائی اور سخت جانی کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

ہندوستان ہمیشہ سے باہر سے آنے والی قوموں کی آماجگاہ رہا ہے ناگا، منڈا، دریا داڑی (دراوڑی) آریائی، یونانی ایرانی، افغانی، شاکا (تاتاری) ہن، ابھیر، عرب، ترک اور یورپی قومیں یکے بعد دیگرے ہندوستان میں آتی رہی ہیں یورپی قوموں کے علاوہ جو یہاں آیا وہ بس یہیں کا ہو رہا۔ انہوں نے اس ملک کو بہت کچھ دیا اور اس سے بہت کچھ لیا بھی ہے۔ اس میل ملاپ اور کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف تہذیبی، معاشرتی اور سیاسی ادارے بنتے اور بگڑتے رہے۔ ناگاؤں نے نو وارد منڈا قوم کے لیے جگہ خالی کردی اور پیچھے ہٹ گئے۔ اسی طرح جب دریا داڑی قومیں آئیں تو منڈا قوم نے بھی پیچھے قدم ہٹا لئے اور دریا داڑی قومیں سندھ پنجاب، ہریانہ اور گجرات کے ایک حصے پر پھیل کر دریاؤں کے دامنوں میں بستیاں آباد کیں۔ جب آریاؤں کا دباؤ بڑھا تو دریا داڑی قومیں خشکی اور تری کے راستوں سے اڑیسہ، آندھرا پردیش، کرناٹک، کیرالا اور ٹامل ناڈو میں پھیلیں اور اپنی جگہ آریاؤں کے لئے خالی کردیں۔ یہ عمل صدیوں جاری رہا۔

قوموں کے اختلاط سے نئی نسلیں پیدا ہوئیں۔ آریاؤں کو لین دین میل ملاپ، تعاون و اشتراک کی یہ روایتیں زندگی کیلئے ضروری بن گئی تھیں کچھ زیادہ پسند نہ آئیں اور انہوں نے اپنی تہذیبی لسانی اور نسلی انفرادیت کو برقرار رکھنے کے لیے ایک طرف آریاورت کی داغ بیل ڈالی اور اپنے درون کے زر و بت؟ مضبوط کرلئے اور دوسری طرف بیرونی سطح پر مختلف جاتیوں میں انسانوں کو تقسیم کر دیا برہمنوں کو برتری ... دریا داڑی مفتوحہ قوموں کو سب سے نچا ... ن اعلیٰ اور ادنیٰ جاتیوں کے درمیان ملے جلے ... اور دلتیں بن کر زندگی کے معاملات چلاتے رہے۔ اس کے دو نتائج نکلے۔

ایک طرف تو بہتہ معاشرہ پیدا ہوا۔ دوسری طرف ...

زبان مختلف مرحلوں اور حادثوں سے گزر کر ایک علمی اور معیاری زبان تو بن گئی مگر اس عمل سے اس کا رشتہ عوام سے ٹوٹ گیا اور قواعد و اصولوں کے شکنجے میں جکڑ گئی۔ اس قید و بند کے خلاف سب سے پہلے ملک کے شمال مغربی حصے میں انقلابی آوازیں بلند ہوئیں اور چودھویں مرحلے پر مہاویر نے جین مت کا فلسفہ بلند کیا۔ اس کے ساتھ ہی بہار کے علاقے سے گوتم بدھ اُٹھے۔ جین اور بدھ متوں میں کئی قدریں مشترک تھیں۔ بدھ مت نے سنسکرت کے بجائے پالی کو جو عوامی بولی تھی اپنا لیا۔ اگر جین اور بدھ متوں کا سماجیاتی نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان دونوں مذہب والوں نے آزادی کی آواز اٹھائی تھی اور آزادیٔ فکر اور احترام انسانیت کا درس دیا تھا۔ یہ سب صدیوں کے تاریخی جدلیاتی DIOTICTICAL عمل کا نتیجہ تھا۔

اس طرح ہندوستان کی تہذیب دو دھاروں میں بٹ گئی۔ ایک دھارہ تہذیبی تحفظ کی علامت بن گیا اور دوسرا دھارا ترقی و تبدیلی کی نشانی بن گیا۔ اس عرصے میں اور قومیں بھی ہندوستان میں داخل ہوئیں۔ یہ قومیں تقریباً سب کی سب وسط ایشیا سے آئی تھیں۔ شاکا بھی نسلاً تاتاری ہی تھے۔ انہوں نے ہندوستان کے ایک وسیع حصے پر اپنی حکومت قائم کی۔ انکے ساتھ ان کی زبانیں بھی آگئیں۔ ان کی زبانوں میں لچک بھی تھی اور جذب و قبول کی خوبی بھی تھی۔ ان کی لچکدار زبان نے سنسکرت، پالی اور ان سے پیدا ہونے والی پراکرتی زبانوں سے نئے نئے الفاظ، خیالات اور محاورے اپنے اندر سمونا شروع کیا۔ اسکے خلاف جب بدھ مت پر بھی برہمنی اثرات کا غلبہ ہوا اور خود گوتم بدھ کی مورتیوں کی پوجا ہونے لگی تو پالی بھی سنسکرت کی طرح قواعد و اصول کے شکنجوں میں پھنس گئی اور عوام سے اس کا رشتہ بھی ٹوٹ گیا۔

نئی قوموں کی زبانوں میں لین دین سے وسعت پیدا ہونے لگی اس کے خلاف سنسکرت اور پالی بند زبانیں بن گئیں اور ہندوستان کے ایک بڑے علاقے میں نئی قوموں کی زبان آپ بھرنش بولی جانے لگی۔ جب ان کی مرکزی حکومت ٹوٹ گئی اور دوسری کئی نئی قومیں داخل ہوئیں تو آپ بھرنش نے علاقائی زبانوں سے میل کھا کر ایک نیا روپ اختیار کیا۔ ہر جگہ اس علاقے کی مناسبت سے ایک علیحدہ نام سے پکاری جانے لگی۔ کہیں وہ اودھی تھی کہیں پنجابی اور کسی جگہ سندھی کہلائی۔ اس علاقائی خصوصیات کے باوجود ان زبانوں کی ساخت اور الفاظ کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ان سب میں مشترک تھا۔ ان واقعات کے تجزیے سے چند نتائج اخذ کئے جاسکتے ہیں۔ اول تو یہ کہ ہندوستان کے تہذیبی اور فکری دھاروں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک دھارہ تو تحفظ کی علامت بن گیا تھا۔ اور دوسرا دھارا ترقی اور تبدیلی کی نشاندہی کرتا تھا۔ اس سے یہ بھی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ ہندوستان میں زبانوں سے تہذیب و سیاست کا رشتہ بہت قریبی اور گہرا ہے۔ کبھی تو ایک تہذیب ایک نئی زبان کے بنانے کا سبب بنی ہے اور کبھی ایک نئی تہذیب ایک نئی زبان اور نئی سیاسی وحدت کے پیدا کرنے کا باعث ہوئی ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ زبان و تہذیب ایک دوسرے کو اس طرح متاثر کرتے ہیں کہ اس سے زبان میں وسعت اسلوب میں دلکشی اور ادب میں ترقی تہذیب میں تاب و توانائی پیدا ہوتے ہیں۔ تیسرا اہم نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اردو جیسا کہ عام خیال ہے سنسکرت سے نہیں بنی بلکہ اس کی تشکیل میں آپ بھرنش کی تعمیری اور انقلابی روح کارفرما رہی ہے اردو کے مورخوں نے اس کے تہذیبی پس منظر پر بہت کم توجہ کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو زبان کی تاریخیں نامکمل نہیں تو تشنہ ضرور ہیں۔

مسلمانوں کے ہندوستان میں داخل ہونے سے پہلے یہاں ایک نئی طرز فکر کا آغاز ہو چکا تھا۔ شمال مغربی علاقوں میں ناتھ پنتھیوں کا زور تھا۔ اس تحریک کی دو خصوصیات ہمارے نقطۂ نظر سے اہمیت رکھتی ہیں: ایک تو یہ کہ انہوں نے

میل جول سے بننے والی ان گھر یلو لیکن ترقی پذیر زبان کو اپنا لیا تھا جو دوسرے مسلمانوں کے وہ مخالف تھے۔ اس طرح نئے عقاید اور افکار کا آغاز ہوچکا تھا۔ یہاں کے مقامی باشندوں نے میل جول اشتراک و تعاون کی نئی راہیں نکال لی تھیں بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ معاشرتی تہذیبی اور لسانی ارتباط و اختلاط سے دو تین سو سال کے اندر اندر ایک نئی زبان کا ہیولیٰ تیار ہوچکا تھا اس کا ذہن روح عصر، اثباتی فکر اور اشتراک و تعاون کے جذبات سے مملو تہذیب سے بندھ گیا تھا۔ آئندہ دور میں اردو زبان کی آبیاری ان ہی سوتوں سے ہوتی رہی۔ ہندوستان پر جب آل سبکتگین کے حملے شروع ہوئے تو اس وقت تک یہ ملک سیاسی افراتفری کا شکار ہوچکا تھا۔ آپسی لڑائیاں عام ہوگئی تھیں برہمنوں نے راجپوتوں سے ایک قسم کا سمجھوتہ کرکے انہیں اپنے معاشرہ کا ایک جزو بنالیا تھا تاکہ وہ حکومت اور ملک کی مدافعت کی ذمہ داری سنبھال سکیں۔ لیکن وہ خود آپس کے جھگڑوں کی وجہ سے چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ گئے تھے۔

اب یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ محمود غزنوی نے اپنی فوج میں ہندوستانی سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد شامل کرلی تھی ان کی چھاؤنیاں غزنی اور اس کے نواح میں ہندوستانی طرز پر تعمیر ہوئی تھیں۔ ان کی زبان آپ بھرنش تھی جس پر علاقائی اثرات پڑے تھے۔ اور پراکرتی زبانوں کے بے شمار الفاظ پہلے ہی شامل ہوگئے تھے۔ غزنی کی زبان فارسی تھی لیکن اس میں بے شمار عربی اور ترکی الفاظ داخل ہوگئے تھے۔ ہندوستانی فوجیوں نے اپنی زبان میں فارسی ترکی اور عربی الفاظ غیر شعوری طور پر داخل کرنا شروع کیا جب پنجاب سندھ ملتان اور میرٹھ اور نواح دہلی تک کے علاقے اس کی سلطنت میں داخل ہوگئے تو اسی رواج کو اور تقویت پہنچی۔ اس طرح ہندوستانیوں کی زبان کی اساس پر ایک نئی زبان جس کا ڈول پہلے ہی سے ڈالا جاچکا تھا زیادہ نکھر کر سامنے آئی۔

اس سلسلے میں چند باتیں غور طلب ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس نئی زبان کے بولنے والے ہر علاقے میں ہندوستانی تھے۔ یہ لوگ اثباتی طرز فکر کے حامل تھے۔ اردو زبان کی ساخت اور اس میں ہندوستانی زبانوں کے الفاظ کی بہتات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اگر کوئی ترک ایرانی یا عرب اس زبان کو بناتا تو اس کی ساخت اور لہجہ دوسرا ہوتا۔ بلکہ اس کی ساخت ترکی عربی یا فارسی زبانوں جیسی ہوتی۔ پنجابی گجری اور دکھنی زبانوں کے مطالعہ سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ عربی فارسی اور ترکی الفاظ کا املا ابتداً بالکل بدلا ہوا تھا۔ ع کی جگہ الف، ط کی جگہ ت اور ص کی جگہ س، ق کی بجائے ک کا استعمال عام تھا۔ غرض اس طرح کی اور مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ اس سے بھی یہی بات ظاہر ہوتی ہے کہ ہندوستانی زبانیں بولنے والے ہندوؤں نے عربی فارسی اور ترکی الفاظ کو اپنی زبان میں داخل تو کرلیا لیکن اس کا املا اور لہجہ نہیں لیا۔

شمال مغرب سے آنے والے مسلمانوں میں ترکوں کا غلبہ تھا زندگی کے بارے میں ترکوں کا نقطۂ نظر اثباتی تھا۔ انہوں نے جدت سے کام لیا اور مقامی جدت پسندوں سے اشتراک عمل کیا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کئی نئی چیزیں عالم وجود میں آئیں ترکوں میں وسعت نظر تھی وہ دوسروں کی اچھی چیزوں کو اپنانے میں کمال رکھتے تھے۔ امیر خسرو ان ہی جدت پسندوں میں سرفہرست ہیں۔ انہوں نے بے شمار ایجادیں محض اس وجہ سے کیں کہ وہ زندگی پر بھی نقطۂ نگاہ رکھتے تھے۔ اردو زبان و ادب اسی اثباتی اور تعمیری نقطۂ نگاہ کا بہترین حاصل ہے۔ اسی منجدھار سے اردو تہذیب نکھرتی ہے۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہوجاتی ہے کہ اردو زبان کی تشکیل ہی میں ایک خاص طرز فکر اور نقطۂ نگاہ کو دخل رہا ہے۔ اس طرز فکر اور نقطۂ نگاہ کی تعبیر اردو زبان کا عالم وجود میں آنا ممکن نہیں تھا ایک اور بات یہ بھی گرہ میں باندھ رکھنے کے قابل ہے کہ ترک مسلمانوں کی نظر اسلامی قدروں پر اس کے ظاہر سے زیادہ تھی۔ چنانچہ وسط ایشیاء سے ہندوستان آنے والے صوفیوں نے

اس ملک کے مختلف حصوں میں جو گراں قدر کارنامے انجام دیئے ان کا ذکر تحصیل حاصل ہے۔

ان صوفیوں نے سب سے پہلے اردو زبان کو اپنایا اس کی وجہ محض یہ تھی کہ یہ عوام کی بولی تھی۔ عوام کی بولیاں بے حد قوت واثر رکھتی ہیں اردو زبان کی تشکیل ہندوستانی تہذیب کے اس دھارے کے مطابق ہوتی ہے جو ترقی تبدیلی اور وسعت آفرینی کی جان بخش خصوصیات کا حامل ہے۔ اس کا رشتہ عوام کی جدت، ندرت اور قدرت سے بندھا ہوا ہے اردو زبان کی یہی خصوصیت ہے کہ اس نے درباروں میں باریابی اور مقبول شاعروں اور عالموں کے خون جگر سے سیراب ہونے اور ان کے جوشش حیات اور ولولوں سے فیض پانے کے باوجود عوام سے اپنا رشتہ منقطع نہیں کیا۔ اس کے مقابل یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ سنسکرت اور پالی عالموں اور قاعدہ دانوں کی سرپرستی سے ایسی بدرست ہوئیں کہ ان کے ہاں عوام سے تعلق رکھنا ایک عیب بن گیا اور اس طرح وہ بندھ زبانیں بن گئیں اور عوام کی مقبولیت سے محروم ہو گئیں۔ اس کے خلاف، ادیبوں، عالموں اور شاعروں نے اردو زبان کی تراش خراش کتر بیونت کے ذریعہ جو اصلاحیں کیں اس کا چلن اسی وقت عام ہوا جب کہ عوام نے ٹکسال میں مہر قبول ثبت کی۔ جن پر یہ مہر ثبت نہ ہوئی وہ الفاظ محاورے ترکیبیں چلن سے خارج ہو گئے۔

اردو زبان کی یہ بھی خوبی ہے کہ اس کو جہاں سے جس قدر ملا۔ اس نے اس سے فائدہ اٹھایا اس سلسلہ میں دکھنی سلطنت کی ابتداء اور دکھنی زبان و تہذیب کے فروغ اور اس دور کے مختلف ادبی تجربوں کا ذکر نہ صرف دلچسپ ہے بلکہ میرے اپنے نقطۂ نظر کو ثابت کرنے کے لیے ضروری بھی ہے۔

محمد تغلق دلی میں سریر آرائے سلطنت ہوا تو اس وقت تک ہندوستان کے مسلمانوں کی حکومت کئی مرحلوں سے گزر چکی تھی دلی تاتاریوں کی زد میں تھی مسلمانوں کی مرکزی خلافت کمزور پڑ چکی تھی۔ محمد تغلق پر شریعت پسند عالموں کا دباؤ تھا۔ اس بیدار مغز انسان میں بلا کی جدت اور ندرت تھی ایک جدت خیال یہ تھی کہ ایسی سلطنت کی داغ بیل ڈالی جائے جو مقامی افکار اور عزائم پر قائم ہو، مقامی باشندے اس میں شریک رہیں۔ اس سے پہلے التمش نے ایک کمزور عباسی خلیفہ سے خلعت محض اس لیے حاصل کی تھی کہ ہندوستانی حکومت کو سند مل جائے۔ لیکن محمد تغلق نے ملکی افکار اور عزائم پر سلطنت قائم کرنے کی پہل کی اس کو دلی کے علماء سے سخت مقابلہ کرنا پڑا۔ اس نے یہ منصوبہ بنایا کہ علما کے حلقۂ اثر سے دور تاتاریوں کے حملے کی زد سے باہر دولت آباد میں ایک نئے دارالخلافے کی نئے عزائم اور امنگوں کے ساتھ بنیاد رکھی جائے۔ اس طرح ایک نئی طرز فکر کا آغاز ہوا یہ منصوبہ یوں پورا ہوا کہ اس کے امرائے صدہ نے جن میں اکثر الباری قبیلوں کے ترک تھے دکن میں بہمنی سلطنت قائم کی اور گجرات میں ظفر خاں نے ایک آزاد مملکت کی بنیاد رکھی امرائے صدہ ترک تھے وہ خلجیوں ہی کے زمانے سے دکن کی طرف آنے لگے تھے جلال الدین خلجی کو وہ ترک نہیں مانتے تھے ان کا ایک بہت مضبوط انتظامی نظام دکن میں قائم تھا۔ دکن کی طرف رخ کرنے والے امراء کے ساتھ صوفیوں درویشوں اور اہل حرفہ کی ایک بڑی تعداد بھی تھی۔ ان کے ساتھ ان کی زبان اردو بھی تھی۔ اردو نے دکن پہنچ کر ایک نئی سلطنت کے ساتھ آزاد فضاؤں میں فروغ پایا۔ جس نئے خیال نے ایک نئی سلطنت کا آغاز کیا تھا اسی ندرت خیال نے اردو زبان کو درباری مرتبہ دیا اور یہ فارسی کی بجائے علم ادب اور انشا کی زبان بن گئی۔ یہی حال کم و بیش گجرات کا ہوا۔ اردو دکن میں دکھنی کے نام موسوم ہوئی اور گجرات میں گجری بنی۔ جس طرز فکر کو عام طور پر دکھنی تہذیب کا نام دیا جاتا ہے وہ دراصل یہی منہاج فکر ہے۔ اس کے دکن میں ملتے ہیں اور گجرات میں بھی۔ یہ زبان شمال اور جنوب

دکن و گجرات میں مشترک بن کر تیزی سے ترقی کرنے لگی۔ صوفیوں نے اسے دلوں کو صاف کرنے اخلاق کو سنوارنے اور ایمان کو پختہ کرنے کا کام لیا۔ قوالی موسیقی اور شاعری درباری کاروبار اور زندگی کے عام معاملات کا وسیلہ بنی۔ اس میں تاب و توانائی بھی پیدا ہوئی اور وسعت و گہرائی بھی جب گجرات کو مغلوں نے فتح کر لیا تو یہاں کے ادیب شاعر عالم صوفی دکن کی طرف نکل آئے۔ دکن کی پانچوں سلطنتوں میں اردو برابر ترقی کر رہی تھی۔ اردو زبان و ادب پر دکن کی سرزمین میں ہندستانی روایات، افکار، اساطیر، راگ، راگنیوں اور سُروں کا اچھا اثر پڑا 'ناتھ پنتھیوں' بھگتوں اور ترگن وادیوں کی فکر اور عقیدہ کے آثار اس میں ملتے ہیں۔ بھجن کے لیے جو مخصوص راگ راگنیاں تھیں ان کے سانچوں میں شعر ڈھلنے لگے۔ قاضی محمود دریائی کا کلام اس خصوصیت کا حامل تھا مختلف راگ راگنیوں اور سُروں کے مطابق ترتیب پایا تھا۔ خوب محمد چشتی نے خوب ترنگ میں عرب و عجم کا سنگم بنانے کا ایک نیا تجربہ کیا۔ یہ روایت آگے چل کر دکن کی شاعری اور ادب کے مزاج کو بدلنے کا باعث بنی۔ اس منزل پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہندی روایات، اساطیر رمزیات صنمیات سے سیر ہو کر اردو ایک نئے سرچشمہ کے لیے بے چین تھی۔ محمود دریائی اور کام دھنی کی زبان و بیان نے آئندہ کے ارتقا کے لیے نئے راستے کھول دیئے۔ جب گجرات کی سلطنت ٹوٹی تو اس زبان و بیان نے دکن پہنچ کر نیا نکھار پیدا کیا۔

اس سلسلہ میں گولکنڈہ اور بیجاپور کی ادبی خصوصیات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔ گولکنڈہ فارسی روایات کا نمائندہ بنا۔ اس میں ہندی کا رسیلا پن اور رچاؤ سمویا ہوا تھا۔ بیجاپور ہندی روایات کا حامل تھا اور ایک طویل عرصہ تک یہی روایت برقرار رہی۔ لیکن غواصی کی سفارت کے بعد گولکنڈہ کی فارسی روایات کو قبولیت ملنے لگی۔

دکن میں اردو یعنی دکنی ادب کے ارتقاء اور ادبی تجربوں کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دکنی زبان میں ہندی کے بوجھل اور ان گھڑ الفاظ کو سبک، چمکدار اور سڈول لفظوں اور لہجوں میں ڈھال لیا جاتا ہے۔ اس طرح زبان شستہ اور نکھر کر نکھر جاتی ہے۔ اردو ہندی روایات، صنمیات، رمزیات، راگ راگنیوں اور سُروں سے آشنا ہو کر اور نکھر آتی ہے۔ اس کے قالب میں اب فارسی روح داخل ہو کر ایسا خوشگوار امتزاج پیدا کرتی ہے کہ اس میں ایک نئی دلکشی اور حسن پیدا ہوتا ہے۔ اور اس کا اسلوب بیان اور بھی پُر وقار بن جاتا ہے۔

ہر چند دکنی تہذیب کا فروغ دکنی کے پانچوں سلطنتوں میں ہوا لیکن اس طرز فکر کو دکنی کی حدوں میں بند کر دینا اس کی عظمت کو گھٹا دینے کے مترادف ہے۔ سیاسی بندشوں نے ابھرتی ہوئی لہروں کو کچھ عرصہ کے لیے روک دیا تھا۔ لیکن جب اورنگ زیب نے دکن فتح کر لیا اور اورنگ آباد کو اپنا مرکز بنا لیا تو یہ لہریں دکن سے اٹھیں اور اورنگ آباد میں جذب ہوتی رہیں۔ اور پھر ایک مرتبہ اورنگ آباد دکن اور شمال میں ارتباط پیدا کرنے کا ذریعہ ثابت ہوا۔ اورنگ آباد کو اردو تہذیب کے بنانے سنوارنے اور ٹوٹے رشتوں کو جوڑنے میں ایک خاص حیثیت حاصل رہی ہے۔

اردو ادب کے ارتقاء میں دکن کا حصہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ اس نے ہندوستان کی سرزمین سے وہ سب کچھ حاصل کر لیا جو یک رنگی یک جہتی ترقی شیرینی اور اثر آفرینی کے لیے ضروری تھا۔ ولی کے بعد شمال و جنوب کے رشتوں کے جڑ جانے کی وجہ سے ریختہ کا دور شروع ہوا تو وہ سب کچھ جو جنوبی ہند کے ادبی تجربوں کا حاصل تھا۔ ریختہ کا حصہ بنا اور یہاں سے اردو ادب کے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔

اردو زبان اور ادب کا جدید دور فورٹ ولیم کالج سے شروع ہوتا ہے۔ دلی کالج، علی گڑھ سائینٹفک سائٹی

اور اورینٹل کالج لاہور سے گذر کر دارالترجمہ کے کام اور عثمانیہ یونیورسٹی کے عظیم الشان تجربے پر ختم ہوتا ہے۔ اس دور کی چند باتیں قابلِ غور ہیں :

اردو زبان میں سادہ اور روزمرہ لکھنے کا ڈھنگ شروع ہوا۔ مقفیٰ اور مسجع عبارت ترک کردی گئی۔ جدید طرز پر لغت اور قواعد تیار ہوئے۔ لکھنؤ کے تکلف اور تصنع کی تحریک مزور اٹھی لیکن پنپ نہ سکی۔ اردو زبان کی یہ خوبی بھی ہے کہ وہ تصنع اور تکلف سے پاک ہے۔ وہ تحریک جس کے زیر اثر عربی فارسی کے بے شمار الفاظ لئے گئے تھے بلکہ ان کا تلفظ بھی عربی اور فارسی قاعدہ کے مطابق ہونے لگا تھا چند روزہ ثابت ہوئی۔ یوں بھی یہ تصنع اور تکلف اردو مزاج کے مطابق نہ تھا یہی حال لکھنؤ کی شاعری کا ہوا۔ ناسخ نے جو اثر پیدا کرنے کی کوشش میں لکھنؤ نے جو غلو کیا تھا وہ دیرپا ثابت نہ ہوا۔ البتہ ان کوششوں سے اردو زبان کو یہ فائدہ پہنچا کہ اس کے اسلوب میں یہاں بھی معنویت پیدا ہوگئی اور زبان کی تراش خراش اور کتر بیونت کے بعد چند ایسی مفید اصلاحیں ہوئیں کہ اس سے زبان اور بھی شستہ اور پرکار بن گئی۔

جس زمانے میں اردو زبان میں یہ تحریک اٹھی تھی وہ دراصل ایک دور انحطاط تھا۔ ایک زندہ قوم کی اولوالعزمی ولولہ انگیز خیالات کا فقدان تھا۔ جب دلی اور لکھنؤ کے دربار اٹھ گئے اور سرسید نے قوم کی قیادت کا بیڑا اٹھایا تو سرسید اور ان کے ساتھیوں نے اردو زبان و ادب اور تہذیب میں ایک تازہ روح پھونک دی۔ اور ان میں ایسی تازگی اور رونق پیدا ہوئی کہ ایک مختصر سے عرصے میں اردو دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی ہم پلہ بن گئی۔ اردو زبان کو ہندی فارسی اور ترکی کی طرح انگریزی زبان اور افکار سے بھی فائدہ پہنچا چونکہ اس میں ربط آفرینی INTEGRATION کی صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود تھیں اس نے دنیا کی مختلف تہذیبوں سے ایسی خصوصیات لیں جو اس کے مزاج کے مطابق تھیں

اور اس کے فروغ میں مدد ہو سکتی تھیں۔ ان خصوصیات کو کس طرح اپنایا کہ اردو میں ان کی اصلیت کا پتہ لگانا مشکل ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اردو زبان تخلیقی خصوصیات کی بھی حامل ہے۔ اس نے نہ صرف دوسری تہذیبوں کو اپنایا اور باہم مربوط کیا بلکہ بعض نئی خصوصیات کی تخلیق بھی کی۔ اس کے تخلیقی کارنامے فورٹ ولیم کالج، سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ، دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی اور جامعہ عثمانیہ کی صورتوں میں جلوہ گر ہوئے۔ اردو کا جدید دور مشرق و مغرب کا سنگم ہے جدید حالات نے ان خطوط پر معلومات میں اضافہ اور نئے ذوق کی تربیت ہوئی۔ اس طرح ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

فورٹ ولیم کالج، دلی کالج، سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کی بدولت ایسے روشن خیال بالغ نظر صاحب بصیرت پختہ کار اور باعمل صاحب کردار افراد پیدا ہوئے کہ سارے ہندوستان میں ایک عظیم انقلاب برپا ہوا۔ فورٹ ولیم کالج دلی کالج اور اورینٹل کالج لاہور نے درسی اور مطالعہ کی کتابوں کی فراہمی کا کام انجام دیا اس سے ہمارے ادب میں بیش بہا اضافہ ہوا۔ سائنٹفک سوسائٹی دارالترجمہ اور جامعہ عثمانیہ نے اردو زبان میں علوم و فنون کا اضافہ کیا۔ اس طرح علوم و فنون جو غیر اور نامانوس زبانوں میں صدیوں سے بند تھے وہ آزاد ہوئے۔ علوم و فنون کے ایک نئے اسلوب اور طرز بیان کا اضافہ ہوا۔ زبان سائنٹفک بنی۔ نہ صرف زبان و ادب اس سے متاثر ہوئے بلکہ ہماری فکر کے سانچے بھی بدلے ہماری تخلیقی صلاحیتیں ابھریں۔ ہم کو اس طرح ذہنی آزادی میسر آئی اور نقال کی لعنت سے بچ گئے۔ زبان اپنی خودی اور ذات کو پہچاننے کا ذریعہ بنی۔ ہماری شخصیتوں میں نکھار آیا۔ خود اعتمادی سے ہماری امنگیں بڑھیں۔ کام کرنے اور آگے بڑھنے کے جذبات پیدا ہوئے۔ اس پس منظر میں اقبال ہندوستان کے افق پر نمودار ہوتا ہے۔ غالب، سرسید، حالی اور شبلی کے بغیر نہ تو اقبال کا نمودار ہونا ممکن تھا اور نہ ہی وہ

آئندہ آنے والی نسل کو کوئی جاں بخش پیام دے سکتا تھا۔

میں نے اپنے مقالے میں صرف اردو زبان و ادب کی چند تحریکوں کا ذکر کیا ہے۔ صوفیوں کا تذکرہ بہت ہی سرسری ہے۔ اہلِ فکر اور اہلِ رائے جنہوں نے اردو ادب کو متاثر کیا۔ کم جگہ پا سکے۔ صوفی بزرگوں کا ایک طویل سلسلہ ملتا ہے جنہوں نے ہمارے ادب اور تہذیب کی قدروں کی بڑی جاں فشانی سے حفاظت کی ہے۔ اس کے فروغ کے لئے اپنا سوزِ جگر دیا ہے اردو تہذیب کی قدروں نے ہماری ذات میں ایک قلندرانہ شان پیدا کی ہے۔ ان کے بغیر ہم بے نفسی اور بے باکی کی ان رفعتوں کو چھو نہ سکتے۔ اور نہ ہی علم و مجاہدے کی آزمائشوں سے گزر کر نکھرتے۔ رواداری، بردباری تحمل اور صبر کی دولت سے ان ہی کی بدولت ہم مالا مال ہوئے۔ تعصب اور تنگ نظری کے عیبوں سے پاک رہے ہیں۔ ہمارے دلوں میں انسانوں کی خدمت گزاری، ملت و قوم کی تعمیر، ملک کی ترقی کے جذبات اور امنگیں بیدار ہوئیں یہ سب کچھ اردو تہذیب کی دین ہے۔

انگریزی دورِ حکومت کا اثر دوسری علاقائی زبانوں کی بہ نسبت اردو زبان و ادب اور تہذیب پر کم پڑا ہے۔ اس میں انگریزی اور یورپی تہذیبوں سے تعمیری عناصر ضرور جذب کئے ہیں مگر دوسروں نے یا تو انگریزی اثر کو ایسا قبول کیا کہ وہ اپنی ذات اور خودی سے غافل ہو گئے اور تعالی کی یا پھر ماضی کی طرف لوٹ گئے۔ یہ دونوں صورتیں قوموں کی ترقی کے لیے مضر ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انہوں نے غیروں کے علم و حکمت صنعت و حرفت کو اس طرح لیا کہ دوسروں کی زندگی میں جو فساد پیدا ہوا تھا اس کے یہ بھی شکار ہو گئے۔ اردو تہذیب میں اس فساد سے بچنے کی خوب صلاحیتیں ہیں۔ یہ خصوصیات اس کے کامیاب مستقبل کی ضامن بھی ہیں۔

اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ جدید ہندوستان کی تعمیر و ترقی کے کیا تقاضے ہیں اور وہ اس کام میں کن مرحلوں سے دوچار ہے۔ ہندوستان کل جائے نو بنو کا ایک دلکش اور حسین گلدستہ ہے۔ یہ مختلف تہذیبوں اور قوموں کی روایات کا ایک حسین مرقع ہے۔ جدید ہندوستان کے اساسی دستور کے بنانے میں ہمارے بزرگوں نے چند اہم پہلو رکھے ہیں۔ ایک بات تو یہ ہے کہ دستوری قانون کے ذریعہ جو تخیلات، خیالات اور تصورات داخل کئے ہیں اور چند نئے اداروں کی بنیادیں رکھی ہیں۔ وہ ہندوستان کے لیے غیر مانوس ہیں ان کا تصادم ملک کے تصورات او تخیلات سے ہوتا لازمی ہے۔ اس کا ایک نتیجہ تو یہ ہوا کہ ہندوستان میں جمہوریت ملکی روایات اور خیالات خاص طو ذات پات کے جھگڑوں کی وجہ سے ایک خاص نہج پ چل رہی ہے۔ اس کی بنیادیں ابھی تک مضبوط نہیں ہو سکیں اس کے ساتھ ہی ساتھ مختلف اسباب کی بنا پر ملک لسانی بنیادوں پر تنظیم جدید تو ہوئی لیکن اس سے نئے مسائل بھ پیدا ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ہندوستان کی تاریخ شاہد کہ یہاں کی سلطنتوں اور حکومتوں کے بننے اور بگڑنے ہمیشہ زبان و تہذیب اثر انداز ہوئے ہیں۔ دکن میں بہمنی کی لسانی بنیادوں پر تنظیم ہوئی تو اس سے خود بہمنی سلطنت کے ٹوٹنے اور لسانی صوبوں کے آزاد ہونے کا راستہ کھلا جب کبھی ہندوستان میں مرکزی حکومت کمزور ہوئی تو علا اور لسانی جذبات ابھرے اور انہوں نے اپنی چھوٹی چھو سلطنتیں قائم کرلیں۔ ہندوستان کے جدید دستور کا یہی تھا کہ لسانی بنیادوں پر ملک کی تنظیم ہوتی لیکن اس ہندوستان کی عظمت اور وحدت کو دھکا نہ لگتا۔ اس وقت جو علاقائی تحریکیں اُٹھ رہی ہیں ان کا یہ رجحان قوی ہوتا جا رہا ہے۔

ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی نے ایک ووٹ کے فرق سے ہندی کو اردو کے مقابلے میں قومی زبان بنا دیا۔ تاریخی فیصلہ ہندوستان کی عظمت اور وحدت کے لیے مف تھا یا نہیں اس کا صحیح اندازہ تو صرف مستقبل کا مور

کرے گا۔ لیکن گذشتہ تیس یا بتیس سال میں ہندی کو قومی زبان بنانے کے فیصلہ سے جو مسائل پیدا ہوئے ہیں ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ صحیح خطوط پر کام نہیں ہو رہا ہے اول تو ہندی والوں نے اپنا رشتہ سنسکرت سے اتنا قریبی اور گہرا جوڑ لیا ہے کہ ہندی رفتہ رفتہ سنسکرتی روایات میں ڈھل رہی ہے۔ اور وہ دن دور نہیں کہ ہندی بھی سنسکرت کی طرح ایک بند زبان بن جائے گی اور اس کو صرف لسانی تجربہ کرنے والے اور اصطلاحیں بنانے والے ہی سمجھ سکیں گے نہ تو زندگی کی امنگوں سے اس کا کوئی تعلق ہوگا اور نہ ہی وہ سچی محبت و اخلاص کے جذبات سے متاثر ہو سکے گی۔ خود ہندی ریاستوں میں بھی صرف ہندی پنڈت ہی اسے پڑھ اور سمجھ سکتے ہیں۔ بول چال سے بھی اس کا رشتہ ٹوٹ رہا ہے اگر ہندی والے اپنے طریقے بدل ڈالیں تو پھر اردو ہندی کا مسئلہ ہی ختم ہو جائے گا۔ اور ایک ہی زبان کے دو روپ ہونگے ورنہ مجھے ڈر ہے کہ رفتہ رفتہ موجودہ ہندی سنسکرت اور پالی کی طرح کتابوں میں بند ہو جائے گی۔ پالی پہلے ایک عوام کی زبان تھی لیکن جب اس نے سنسکرت کی طرح علم و دانش کی اصطلاحوں اور قواعد کی بندشوں میں اپنے آپ کو جکڑ لیا تو عوام سے اس کا رشتہ ٹوٹ گیا اور وہ ایک کتابی زبان بن کر رہ گئی۔ ہندی والوں کو اس مثال پر کھلے دل سے غور کرنا چاہیئے۔

ہندی والوں نے سنسکرت روایات کو جو تحفظ کے جذبات سے مملو ہے اپنا رشتہ جوڑ لیا ہے اس سے ہندی والوں کے ڈر اور کمتری کے احساس کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس طرح تحفظ کی یہ تحریک ہندوستان کی تہذیب کے دوسرے دھارے یعنی ترقی اور تبدیلی کے جاں بخش اصولوں سے اس طرح متصادم ہو گئی ہے کہ اس کے جینے کے لالے پڑ جائیں گے۔ یہ سب کچھ ہندی والوں کی کم نظری اور تاریخی حقیقت سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ تصنع اور بے عملی سے زندگی میں تازگی نہیں آ سکتی۔ اردو والوں کو اس سے سبق لینا چاہیئے اور سادگی اور پرکاری کو اپنا نشانِ راہ بنانا چاہیئے اور ماضی کی بجائے مستقبل پر نظر رکھنا چاہیئے۔ میں نے اپنے اس مضمون میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہندوستانی تہذیب کے دو متصادم دھاروں میں اردو نے ترقی تعمیر نو اور انقلاب کے دھارے کو اپنایا ہے۔ اور یہ بات اس کی سرشت میں اس طرح داخل ہے کہ اردو کو ان سے الگ کیا جائے تو اردو کی ہیئت اور اس کا مزاج ہی باقی نہیں رہ سکتے جذب و کشش اشتراک و تعاون میل جول اور لین دین محبت اور اخلاص یکجہتی اور یکرنگی کی خصوصیات اردو کی گھٹی میں پڑی ہیں۔ اس کا مزاج ہی ان عناصر ترکیبی سے بنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گذشتہ تیس سال کے دوران اردو دشمنی عدم سرپرستی اور اپنوں کی بے رخی اور تساہل کے باوجود زندہ اور سلامت ہی نہیں بلکہ باکرامت بھی رہی ہے۔

اردو والے ایک اور حقیقت کو بھی بھول بیٹھے ہیں۔ اردو بولنے والے، اردو ادب کے شیدائی اور اردو تہذیب کے برتنے والے ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ مختلف ملکوں میں اردو زبان اور تہذیب کے قلعے ملتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ذوق کی تسکین یا اپنی ضروریات کی تکمیل اور اپنے بچوں کی تعلیم سہولت کی غرض سے اردو زبان و ادب کی انجمنیں بنا رکھی ہیں۔ ہماری اردو تحریکوں کا رخ بین الاقوامی ہونا چاہیئے۔

بین قومی سطح پر ایک اردو دانش گاہ کا قیام وقت کی اہم ضرورت ہے۔ ہماری اردو سے محبت کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کام پر فوری توجہ کریں اور ایک بین قومی اردو کانفرنس کے ذریعہ اس تحریک کو پروان چڑھائیں۔ ایسی جامعہ کے بنانے میں بے شمار احتیاطیں ملحوظ رکھنی ہوں گی تاکہ یہ عصری ضروریات کو پورا بھی کر سکے۔ یہ مضمون بجائے خود ایک علحدہ موضوع ہے۔

گذشتہ چند دنوں سے اخبار 'سیاست' میں اس نکتہ پر بحث چل رہی ہے کہ مسلمانوں کے بچوں کی تعلیم کا ذریعہ اردو ہو یا انگریزی۔ یہ بحث میری نظر میں بعد از وقت ہے۔ یہ ہونا

پہلے ہی یہ بات مسلم ہو چکی ہے کہ بچوں کی انفرادیت اور شخصیت کی کلی نشو و نما اور ان کی اپنی شناخت کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے تہذیبی ورثہ سے کما حقہ واقف ہوں بلکہ ان میں اپنے تہذیبی ورثہ میں اضافہ کرنے کی بھی صلاحیت ہونی چاہیئے۔ اسلئے ہم نے ان تعلیمی اداروں کی حد تک جو ہماری رہنمائی میں چل رہے ہیں۔ بہت غور و خوض کے بعد ایک لسانی پالیسی بنائی ہے۔ ہمارے نزدیک موجودہ حالات میں یہ لسانی پالیسی بہت ضروری بھی تھی اور چند سال کے تجربے کے بعد ہم اس کو اطمینان بخش بھی پاتے ہیں۔ ہمارے اداروں میں ہر طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی مادری زبان سے کما حقہ واقف ہو، اس میں ادبی اور علمی زبان کے سمجھنے اور اس معیار پر لکھنے کی صلاحیت پیدا ہونی چاہیئے تاکہ وہ نہ صرف ادبی، علمی اور تہذیبی ورثہ سے واقف ہو سکے۔ بلکہ اس میں اضافہ بھی کر سکے یعنی اس میں اس معیار کی زبان کے لکھنے کی بھی صلاحیت ہونی چاہیئے۔ جہاں تک قومی زبان کا تعلق ہے۔ اس کے متعلق اردو والوں کے لیے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ یعنی ہندی اردو کا ایک لازمی جزء ہے۔ ہندی کے بغیر اردو کی تکمیل ہی نہیں ہو سکتی۔ اس لیے ہندی کا اتنا جاننا ضروری ہے کہ وہ بہ آسانی قومی ضرورتوں کی تکمیل کر سکے۔ علاقائی زبان کو دفتری اور کاروباری اغراض کے لیے سیکھنا ضروری ہے۔ انگریزی یا کسی جدید مغربی زبان میں سائنسی اور ٹکنالوجیکل سطح پر مہارت پیدا کرنی چاہیئے۔ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہماری نئی نسلیں نئے نئے شعبوں میں کام کر کے اپنا نام پیدا کریں، ہم سائنس اور ٹکنالوجی کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

مجھے امید ہے کہ میری صاف گوئی پر مجھے معاف کیا جائے گا۔ اردو کے اداروں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے اپنے کاموں کے میدان اس طرح متعین کریں کہ وہ ایک دوسرے سے متصادم نہ ہوں بلکہ اشتراک و تعاون زبان و تہذیب کے شعبے میں کام ہوتا رہے۔ اور کام کرنے والوں میں اتحاد و تعاون بڑھ سکے۔ شخصی مفاد اور انا کو بے لگام ہونے نہ دیں جمہوریت کا تقاضہ یہ ہے کہ ہر فرد کو کام کرنے کا موقع ملے۔ اور ان کو کام میں کامیابی اور کامرانی کی مسرت بھی حاصل ہو، ہر با صلاحیت انسان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنی تخلیقی اور تعمیری صلاحیتوں کو روبہ کار لائے اس لیے ایسے مواقع فراہم کرنا محبت اور اتحاد کو بڑھانے کا ایک اچھا ذریعہ ہو سکتا ہے۔

اردو والوں کو یہ بھی جان لینا چاہیئے کہ اردو صرف مسلمانوں ہی کی میراث نہیں ہے۔ دوسرے مذہب کے اردو دوستوں کو قریب کرنے اور ان کی طرف تعاون اور دوستی کا ہاتھ بڑھانے کے مواقع ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔

اردو اعلیٰ خیالات انقلابی عزائم تعمیری اور تخلیقی جذبات جدت و ندرت کی امنگوں کے سہارے ترقی کرتی رہی ہے۔ اگر ہم اردو کو زندہ رکھنے اور ترقی کرنے کا سامان بہم پہنچانا چاہتے ہیں تو یہ ضروری ہے کہ ہم اعلیٰ افکار، بصیرت افروز خیالات اور انقلاب آفریں ولولوں اور جدت پسند امنگوں سے اردو ادب کا دامن بھر دیں تاکہ دوسری زبانوں والے اردو کو اس کے اعلیٰ اور ارفع تخیلات اور افکار کی وجہ سے پڑھنے پر مجبور ہوں اور خود اردو والوں میں زندگی کی تازگی اور تنوع برقرار رہے۔

بغیر عمل کے خوش کن خیالات اردو کے مزاج اور کردار سے مطابقت نہیں رکھتے۔ ہندوستان ہمارا ملک ہے۔ اس کی ترقی تعمیر اور خوش حالی سے ہم کو لگاؤ ہے۔ اردو والے ہندوستان کے کسی ایک علاقے میں بند نہیں ہیں۔ اس لیے ملک کی یکجہتی اتحاد و ترقی سے اردو والوں کی دلچسپی فطری بات ہے۔ اس کو نظر انداز نہ کیجئے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ علاقائی زبانوں اور ان کی امنگوں سے بھی پوری دلچسپی لینا ضروری ہے۔ تاکہ آپ کو ان سے علحدگی کا احساس نہ رہے۔ یہ سب کام بہت استقلال متانت اور بردباری سے سرانجام دینے کے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ وقت کی ایک چنوتی (CHALLENG) کو سمجھیں گے۔ اور اس کیلئے ہر قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔

●●

ڈاکٹر یوسف سرمست

اِنشائیہ

انشائیہ کیا ہے؟ یہ بتانا مشکل ہے یوں کہا جاسکتا ہے کہ جو مضمون ومقالہ نہیں ہوتا وہ انشائیہ ہوتا ہے۔ مضمون میں بڑے مرتب اور منظم انداز میں اظہار خیال کیا جاتا ہے۔ مقالے میں دلیل اور استدلال بھی ضروری ہے کیونکہ مقالے میں دلیل کے بغیر کوئی دعویٰ نہیں کیا جاسکتا۔ انشائیہ ان دونوں کے برخلاف ربط و تنظیم کی پرواہ کرتا ہے نہ دلیل وحجت کو جگہ دیتا ہے یوں سمجھیئے یہ مکمل فن پارہ ہوتا ہے۔ اس کی اختراعی اور انوکھی نوعیت بنیادی اہمیت رکھتی۔ اس کی اہمیت بھی افسانہ، غزل کی طرح ہوتی ہے یعنی وہ بھی تخلیقی ادب میں داخل ہے۔

انشائیہ نگاری چونکہ فنکاری ہوتی ہے اس لئے اصولوں اور ضابطوں کی اس میں پابندی نہیں ہوتی، جی ہاں فن کار اصولوں کا پابند نہیں البتہ اصول وآئین فن کار کے پابند ہوتے ہیں۔ فن آزاد ہوتا ہے۔ جو اصولوں اور ضابطوں کی زنجیروں میں جکڑی جاسکے وہ فنکاری نہیں صناعی ہوگی۔ فنی کارنامے کی تکرار ممکن نہیں، تجلی کیلئے تکرار کب ممکن ہے۔ فن کار فن سے علاحدہ ہی نہیں کیا جاسکتا وہ فن کے ساتھ وجود میں آتا ہے۔ اس لئے ہر فن کار منفرد ہے اگر اس کی انفرادیت اتنی بلند بانگ نہیں تو وہ ابھی فن کے اعلیٰ درجے پر پہنچا نہیں اصل میں اصول وضوابط نقش پا ہے، وہ نشان ہیں جو فن کار اپنی تخلیقی منزلیں طے کرتے ہوئے چھوڑ جاتے ہیں۔

انشائیہ کی تعریف کرنا اپنی ناکامی کو دعوت دینا ہے لیکن ناکامی کے خوف سے کچھ نہ کرنا ناکامی سے بدتر بات ہے یوں بھی ناکامی کو نباہ لیا جائے تو ناکامی سے کام لینے کا سلیقہ آجاتا ہے۔ بہر حال (ESSAY) کا لفظ انگریزی میں اب کافی وسیع معنوں میں استعمال ہونے لگا ہے۔ بنیادی طور پر اس کے معنی کوشش وکاوش کے تھے۔ شاید اس میں کسی موضوع کے تعلق سے اپنی صلاحیتوں کی آزمایش کا مقصد ہو یا ایسی کوشش وکاوش جس سے موضوع کے تعلق کا احاطہ ہو جائے۔ اور موضوع بحث پر مختلف زاویوں سے روشنی پڑ سکے۔ اردو میں پرسنل اسے (PERSONAL ESSAY) کے لئے انشائیہ کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور صرف انہی معنوں میں اس کا استعمال ہونا بھی چاہیئے۔ انشائیہ کا مقصد ومحرک اپنی ذات، شخصیت کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ "میں" بھی عجب چیز ہے جب اسے چھپایا جاتا ہے تو یہ ظاہر ہوئے نہیں رہتا اور جب ظاہر ہو جاتا ہے تو اپنے ہی قابو سے نکل جاتا ہے۔ انشائیہ میں "میں" کا اظہار ہوتا ہے اور اسے قابو میں بھی رکھنا ہوتا ہے۔ اس فن

وجاد مونٹین نے ایسے SELF PORTRIAT
ذاتی یا شخصی تصویر کہہ کر سب کچھ کہہ دیا ہے۔
انشائیہ میں شخصی زاویہ نگاہ کو مرکزی حیثیت حاصل
ہے۔ انشائیہ نگار کے پردے میں ذاتی پسند یا
ناپسند، محبت، نفرت، اپنا ذوق، اپنا شوق، اپنے
معتقدات اور توہمات ظاہر کرتا جاتا ہے یہ صنف
ادب اپنی ذات کے آزادانہ اظہار کا ذریعہ ہے انشائیہ
پر جب تک انشائیہ نگار کی شخصیت چھا نہیں جاتی،
اس وقت تک انشائیہ نہیں بنتا۔ شخصیت کی جلوہ گری
ہی جان بھی ہے اور ایمان بھی ذاتی جذبات، احساسات
ذاتی تجربات اور مشاہدات اس میں بیان کیے جاتے
ہیں۔ کوئی بات، کوئی خیال کوئی چیز یا موضوع انشائیہ
نگار کی شخصیت کو چھیڑ دیتی ہے۔ اس کے خیالات کے
رو کو راستہ دکھاتی دیتی ہے۔ اور انشائیہ نگار
اس رو میں چل نکلتا ہے اسے دماغ کی آزاد ترنگ
بجا طور پر کہا گیا ہے۔ غیر رسمی انداز اور آزادانہ روش
انشائیہ کی پہچان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انشائیہ نگار بھی
ہو تو دوسرے کے ہی نہیں اپنے بھی کرتوت مزے
لے لے کر سناتا ہے۔

انشائیہ نگار کی آزادی میں کوئی چیز حائل نہیں
ہوتی یہ اور بات ہے کہ وہ صرف موضوع کے احاطہ
میں گھومتا ہے۔ انشائیہ کو رشید احمد صدیقی نے بجا
طور پر غزل سے مشابہ قرار دیا ہے۔ غزل میں چیدہ
خیالی ملتی ہے۔ یہی حال انشائیہ کا ہے۔ غزل میں ردیف
قافیہ کی پابندی کر کے شاعر جتنا چاہے بہک سکتا
ہے۔ انشائیہ نگار بھی موضوع کی پابندی کرتے ہوئے
جو چاہے کہہ سکتا ہے۔ اصل بہکنا اور بہکانا، بہلنا بہلانا
انشائیہ نگار کا کام ہے۔ انشائیہ نگار جب ہوش و
میں آتا ہے بہک جاتا ہے تاکہ وہ ہمیں سلا سکے۔

وہ عقل کی باتیں نہ کر کے عقل مندی کی بات
کر جاتا ہے انشائیہ نگار اصل میں ایک مہذب
بے تکلفی کی فضا پیدا کرتا ہے ایک ایسی دوستانہ
فضا جس میں وہ اپنے دل کی باتیں، اپنے جی کی باتیں،
کہہ سکے۔ انشائیہ میں مکالمے کا اہتمام کیے بغیر ایک
خیالی کہنے والا اور ایک خیالی سننے والا ہوتا ہے۔
یہی وجہ ہے کہ بعض خطوط میں جب وہ کسی ایک
موضوع کے تعلق سے ہوتے ہیں انشائیہ کا رنگ و
آہنگ پیدا ہو جاتا ہے اور بعض انشائیوں میں خطوط
کا سا لطف و کرم۔

انشائیے کی صنف میں اسی لئے تقرب و
تقریب کا انداز ہوتا ہے، مخلصانہ اور دوستانہ
فضا ہوتی ہے۔ اس فضا میں نظر کی گنجائش تو ہوتی
ہے نظریہ سازی کی نہیں، انشائیہ نگار عالم تو
ہو سکتا ہے اور ہوتا بھی ہے لیکن علمیت کا بوجھ لادتا
ہے نہ لادنے کی کوشش کرتا ہے، اسی لئے نہ
تو وہ ناصح ہوتا ہے نہ واعظ۔ وہ دوزخ سے
ڈراتا ہے، نہ جنت کا لالچ دیتا ہے ایک مخلص
اور عقل [illegible] دوست کی طرح جب ضرورت پڑتی
ہے ان کی طرف اشارے ضرور کر دیتا ہے وہ
مسلسل اور مربوط انداز بیان اختیار کیے بغیر پتے
کی باتیں کہتا جاتا ہے۔ اسی وجہ اس کی وضاحت میں
بھی اشاریت ہوتی ہے اور اشاریت میں بھی وضاحت۔
انشائیہ ایک غیر منظم فن پارہ ہوتا ہے جس میں،
اختصار کے ساتھ عدم تکمیل کا احساس ہوتا
ہے۔ انشائیہ میں دل نشینی کی بھی کیفیت ہوتی ہے
اور آہستہ روی کے ساتھ جذبے و جوش کی شدت۔
شدت احساس میں انداز بیان کی نرمی لاشعوری
افراز میں شعور و آگاہی کا رچاؤ [illegible] گندہ خیالی

میں خیالات کی شیرازہ بندی۔ لئے دیئے رہتے ہوئے بھی کھل کھیلنے کا انداز۔ یہ متضاد اور تصادم اور تضاد کے انشائیے میں موجود رہتے ہیں

انشائیہ نگار کے پاس موضوعات کی کمی نہیں ہوتی وہ ذرّے سے لے کر سورج تک کسی بھی چیز کو موضوع بیان بنا سکتا ہے شرط یہ ہے کہ اس میں ذاتی اور انفرادی تجربات اور ان سے حاصل ہونے والی، دانائی اور بینائی پوری طرح موجود ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب انشائیہ نگار شاعر کی طرح حد درجہ حساس ہو اور تاثر میں خوشنما رنگ پیدا کرنے کا ہنر جانتا ہے شگفتگی اور شادابی انشائیہ میں لازمی اور ضروری ہے۔ اسلوب بیان میں بھی اور اندازِ فکر میں بھی۔ لیکن اس کے باوجود، دقیق موضوعات اور فلسفیانہ نکتے انشائیہ میں زیر بحث آ جاتے ہیں لیکن ان کی گہرائیوں میں جا کر الجھنا اور الجھانا انشائیہ نگار کا مقصد نہیں ہوتا۔ البتہ سلسلۂ بیان میں دلی تاثرات کو ظاہر کرنے کے لئے وہ ان خارزاروں سے بھی ہنستا کھاتا گزر جاتا ہے۔

انشائیہ نگار کے لئے موضوعات کی قید ہوتی ہے نہ کسی خاص نظم و ضبط، ترتیب و تسلسل کے ساتھ ان پر خیال کرنا، وہ طرز بیان کی لڑی میں خیالات کے موتی چمکاتا ہے یہ موتی الگ الگ ہوتے ہیں لیکن ایک دوسرے سے جڑے ہوئے بھی ہوتے ہیں ان میں اندرونی خیالات و تاثرات کی آب و تاب میں خارجیت کا بے رنگ دھاگا پوشیدہ طور پر دوڑتا ہے۔ انشائیہ نگار دل کے قریب پاسبان عقل کو رکھتا ہے۔ لیکن پاسبانی کے لئے، حکمرانی کے لئے نہیں۔ انشائیہ میں دلی جذبات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے۔ اور عقلی دلائل کو دل کی کسوٹی پر کس کے دیکھا جاتا ہے۔ انشائیہ نگار دوسرے ہی کو نہیں اپنے کو بھی پرکھ سکتا ہے

سے نہیں چوکتا۔ وہ فلسفی نہ ہوتے ہوئے بھی فلسفیانہ بصیرت رکھتا ہے۔ زندگی کو بازیچۂ اطفال نہ سمجھتے ہوئے بھی اس کا تماشا کرتا اور کرواتا ہے۔ وہ تنقید سے ہتھیار کا بھی کام لے سکتا ہے اور ڈھال کا بھی۔ وہ زندگی اور انسانی فطرت کے گہرے مطالعے پر اپنی بات کو استوار کرتا ہے۔ اس کی کڑوی بات بھی آسانی کے ساتھ حلق سے نیچے اتر جاتی ہے۔ کیونکہ اس کی ہر بات میں خلوص کے ساتھ ہمدردی بھی ہوتی ہے اور شگفتگی کے ساتھ خوش طبعی بھی۔

انشائیہ نگار زمین کی بات کہ ہو آسمان کی اپنے زورِ قلم، زورِ بیان اور اندازِ فکر سے اسے بے حد پُراثر بنا دیتا ہے وہ اپنے موضوع کی پاسداری کے باوجود اپنے موڈ کے تابع ہوتا ہے۔ انشائیہ نگار کو کسی سہارے کی ضرورت نہیں، مہدی افادی نے سرسید، حالی، شبلی اور آزاد کا موازنہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ان میں سے سوائے آزاد کے ہر ایک کو کسی نہ کسی سہارے کی ضرورت ہے۔ کسی کے لئے معقولات ضروری ہے۔ کوئی منقولات کے بغیر نہیں چل سکتا۔ کوئی تاریخ کو اپنا سہارا بناتا ہے اور کوئی مذہب کے بغیر نہیں چل سکتا لیکن افادی کے الفاظ میں آقائے اردو آزاد کو کسی سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ افادی کی بات پوری طرح اس لئے صحیح ہے کہ بنیادی طور پر انشائیہ نگار ہیں۔

اور افادی بھی یہی کچھ ہیں اور یوں ایک انشائیہ نگار نے دوسرے انشائیہ نگار کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے انشائیہ نگاری کی سب سے بڑی خصوصیت بیان کر دی ہے۔

انشائیہ نگار کی سب سے اہم شرط یہ ہے کہ

باقی ص ۲۰ پر دیکھئے

جیلانی بانو

کچھ چائے کے بارے میں

بعض قنوطی فلسفیوں کا ایک یہ مشغلہ ہوتا ہے کہ
، مختلف چیزوں کا اثر زندگی میں تلاش کریں۔ مثلاً
ستیا پھل کا اثر جدیدیت پر — سرخ مرچ کا اثر اُردو
اعری پر اور کرکٹ کا اثر ہارٹ کے مریضوں پر —
، ان قنوطی فلسفیوں میں اپنے آپ کو شامل کرنا نہیں
ہتی۔ لیکن اسکے باوجود میں نے اکثر بیکاری میں چائے اور
المی سیاست کے باہمی تعلق پر غور کیا ہے۔ کیونکہ تمام خطرناک
نصوبوں اور عالمی امن کی تمام کوششوں کا انحصار اچھی
ن ہوئی چائے پر ہوتا ہے۔ اور دنیا کے تمام اہم طے نہ
سکنے والے مسائل کی وجہ یہ تھی کہ ان مسائل کے حل کرنے
الوں کو انکی پسند کی چائے نہیں ملی۔ دنیا میں آج تک ایسی
وئی کانفرنس ہوئی نہ میٹنگ، جس میں مقررین نے چائے
پیئے بغیر اظہارِ خیال کیا ہو۔ بات چاہے ایٹم بم بنانے کی
ہو یا کسی ملک سے دوستی کی پینگیں بڑھانے کی۔ اس کا حل
پائے کی پیالی ہی میں دستیاب ہوتا ہے۔

ابھی حال ہی میں ایک ڈاکٹر نے یہ انکشاف کیا ہے
نہ چائے دل کو فائدہ پہنچاتی ہے۔ اس ڈاکٹر نے اپنی دانست
میں، پر دل کو ایک مژدہ سنایا ہے۔ حالانکہ چائے پینے
والے پہلے ہی یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ چائے نہ صرف دل کو فائدہ
پہنچاتی ہے بلکہ پینے والی تمام چیزوں میں جیب کے لئے بھی
فائدہ مند ہے۔ کیونکہ چائے کی ایک خاصیت یہ ہے کہ دوسرا
پلائے اور آپ پئیں تو جسم میں فرحت اور تازگی کی لہر سی دوڑ
جاتی ہے۔

جن لوگوں نے چائے کے مقابلے میں آئسکریم کو کھڑا کرنے
کی کوشش کی انہوں نے مُنہ کی کھائی۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ
جس طرح گرم چائے گرم موسم میں اور بھی مزہ دیتی ہے۔ ٹھنڈی
آئسکریم کو سرد موسم میں دیکھ کر ہی کپکپی آجاتی ہے۔ اور پھر
چائے جہاں محفل کو جگاتی ہے، آئس کریم سُلانے کے کام
آتی ہے۔ چنانچہ آپ نے غور کیا ہوگا کہ آئس کریم کھاتے وقت
بڑے سے بڑا مُنہ زور نقاد بھی چُپ سادھ لیتا ہے۔ زبان
لڑکھڑانے لگتی ہے۔ اپنے مطلب کو صرف اشاروں سے ادا
کرنے پر اکتفا کر لیتا ہے۔ اسی لئے مصلحت پسند حضرات دو
پارٹیوں میں صلح کرانا چاہتے ہیں تو فوراً آئسکریم سامنے رکھ
دیتے ہیں۔ بس سارے گرما گرم اختلافات آئسکریم کے سلاخی
کی طرح پگھلتے چلے جاتے ہیں۔ سنا ہے ایک خاتون اپنے
بیٹے کیلئے لڑکی پسند کرنے آئیں تو لاکھوں کے جہیز کا مطالبہ
ساتھ لے کر آئیں تھیں۔ مگر دور اندیش سمدھن نے ایک
کے بعد ایک آئسکریم کے اتنے کپ انکے حلق میں اُتارے کہ

بیچاری ٹھنڈے ہونٹ بند کئے انکے سارے کے سارے عطایے قبول کر کے گھر آگئیں۔

اس کے برخلاف چائے نہ صرف فضا کو گرم کرتی ہے بلکہ لڑائی جاری رکھنے کے دوران بطور ہتھیار کام آتی ہے۔ اسی لئے جو جھگڑے سرحد میں طے نہ پا سکیں وہ چائے خانوں میں نبٹائے جاتے ہیں۔

اب ذرا دور تک دیکھئے، جب چائے نہیں تھی تو سرمایہ داری تھی نہ کمیونزم۔ ترقی پسندی تھی نہ جدیدیت۔ دنیا نہایت سرد بلکہ گھلی ہوئی آئسکریم تھی جو کھائی جائے نہ پی جائے۔

یوں تو ہم ہوتے، تم ہوتے کہ میر ہوتے،

سب ہی چائے کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہیں، لیکن سچ پوچھئے تو چائے پینے والے بھی سماج کے مختلف طبقوں میں بٹے ہوتے ہیں۔ اور ان میں سخت لسانی، اور طبقاتی تعصب بھی ہوتا ہے۔ اسی لئے فائیو اسٹار ہوٹل اور سڑک کے کنارے ٹھیلے پر بکنے والی چائے کی پیالی کی قیمت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ حالانکہ اسکے تیار کرنے کا نسخہ ایک ہی ہے۔ لیکن ہر جگہ کی چائے کا ایک مزاج ہے۔ ایک خصوصیت ہوتی ہے۔ مجال ہے کہ ایک خاص برانڈ کی چائے پینے والے کسی دوسری برانڈ کی چائے کو منہ لگائیں۔ یہاں چائے کی یہ خصوصیت بیوی سے ملتی جلتی ہے کہ باہر لاکھ مہ پاروں سے دل بہلائیے مگر پناہ بیوی میں ملتی ہے۔ اسی لئے ایک مخصوص ہوٹل میں چائے پینے والے کبھی دوسرے ہوٹل کا رُخ نہیں کرتے۔ اس کے باوجود کچھ لوگوں کو اپنی پسندیدہ چائے دوسروں کو پلانے سے دلی مسرت ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک بار ہمارے ایک میزبان نے بڑے خلوص کے ساتھ اپنی بیوی سے کہا۔

"بنّی ذرا بالو کو اپنے ہاتھ کی بنی ہوئی بارہ مسالے والی چٹ پٹی چائے تو پلاؤ آج۔" بارہ مسالے والی چٹ پٹی چائے کو پینے کے لئے آپکو دو سخت مقامات سے گزرنا پڑتا ہے۔ پہلے اس چائے کی پیالی کو ختم کرنا اور پھر چہرے پر خوشگوار تاثرات کو قائم رکھنا اسی طرح ہم نے اکثر اپنے مخلص میزبانوں کے ہاں کھوئے، بادام والی مقوی چائے، برف والی کولڈ چائے، لیمو والی کھٹی چائے۔ گرم مسالوں والی خوشبودار چائے۔ اور نمک والی نمکین چائے پی ہے۔ بلکہ ایک کفایت شعار خاتون کے ہاں تو ہم نے انڈوں والی چائے بھی پی ہے۔ سنا ہے وہ خاتون جس پانی میں انڈے ابالتی ہیں، اسی میں چائے کی پتی ڈال کر ایک نئے ذائقے کی چائے سے مہمانوں کی تواضع کرتی ہیں۔ اس طرح چائے بنانے کے مختلف طریقے مختلف گھرانوں کی مخصوص تہذیبی روایتوں میں شامل ہیں۔

یوں تو چائے تیار کرنے کے بے شمار طریقے ہیں۔ کچھ خواتین اتنے اہتمام کے ساتھ چائے تیار کرتی ہیں کہ چائے پینے والا مخدوم کا یہ مصرعہ گنگنانے لگتا ہے۔

آ بھی جا کہ ترے قدموں پہ مری جان نکلے

ایک اور خاتون چائے بھی اسی ترکیب سے بناتی ہیں، جس ترکیب سے ہنڈیا پکانا انکی دادی نے انہیں سکھا دیا ہے۔ یعنی چائے، پانی، دودھ اور شکر ملا کر چولہے پر چڑھا دو اب جو چیز دیگچی میں پک رہی ہے وہ چائے ہوگی۔ اس دیگچی میں پہلے پکائے ہوئے سالن کا ایک لطیف امتزاج بھی چائے میں شامل ہو جاتا ہے جو صرف صاحبِ ذوق حضرات ہی محسوس کر سکتے ہیں۔ اور جھٹ بتا سکتے ہیں کہ چائے بنانے سے قبل اس دیگچی میں کونسا سالن پکایا گیا تھا۔

جو لوگ چائے کے عادی ہوتے ہیں وہ ہر غم اور خوشی کے موقعہ پہ چائے میں پناہ ڈھونڈ لیتے ہیں۔ چائے پینے والا چائے کے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتا۔

بعض لوگ جب صاف صاف کرنسی نوٹوں کے ذکر
. شرمائیں تو بات کو چائے کی پیالی میں گھول دیتے
. اسی طرح آڑے وقت میں چائے کی بدولت بڑے
بے مسئلے حل کئے گئے ہیں۔ جہاں لاکھوں خوشامدیں کام
ئیں وہاں چائے کی ایک پیالی اپنا جادو جگا سکتی ہے۔
چائے پینے کے بہت سے مدارج ہیں اور اس کے
اب بھی ہیں۔ مثلاً ایک کلرک اپنے "باس" کو چائے
ے تو یہ مصلحت اندیشی چائے ہے۔
ایک شاعر نقاد کو چائے پلائے تو یہ خوشامدانہ
چائے ہے۔
ایک "باس" اپنے اسٹاف کو چائے پر بُلائے تو
بدبختانہ چائے ہے۔
ایک لڑکا کسی لڑکی کو چائے کی دعوت دے تو
رومانی چائے ہے۔
ایک غرض مند کسی چپراسی کو چائے پلائے تو یہ
. راندیشی چائے ہے۔
اسی لئے ہمارا آپکو مخلصانہ مشورہ ہے کہ چائے
دعوت قبول کرنے سے پہلے رسم دنیا، موقعہ
. دستور پر غور کر لیجئے۔ ■

ادارہ کے اُردو امتحانات

اُردو فاضل، اُردو عالم (مسلمہ عثمانیہ یونیورسٹی) کے
علاوہ اُردو دانی اور اُردو زباندانی کے امتحانات اس بار
کٹوبر ۱۹۸۳ء میں حیدرآباد اور آندھرا پردیش، کرناٹک،
بار اشٹرا اور شمالی ہند کے مختلف مرکزوں پر منعقد ہو
رہے ہیں۔
نئے اور قدیم مراکز کے اصحاب فوری مراسلت کریں۔
صاب اور کتب کے لئے لکھیں۔
ڈاکٹر مغنی تبسم۔ معتمد اعزازی شعبہ امتحانات
"ایوان اُردو" پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد – ۴

... اسلحہ ... سے آگے

دیکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح اسی نسخے میں "کٹار" بھی دکھلائی
گئی ہے۔
سترھویں صدی عیسوی کے ایک مخطوطے "خمسہ نظامی"
میں ہم تلواروں کے بعض بہترین نمونے دیکھتے ہیں۔ یہ تلواریں
بالکل سیدھی ہیں اور نوک کی طرف خمدار۔ دستے دائرہ
نما ہیں۔ انہیں تلواروں سے شاید آگے چل کر مرہٹوں نے
کرایچ تلوار، بمقام وجیانگرم اٹھارویں صدی عیسوی
میں ایجاد کی۔ ڈھالیں گول ہیں۔ نیزوں کے تیغے پتوں
جیسے ہیں۔ جو لکڑی کے ایک لمبے ڈنڈے پر بٹھائے گئے ہیں۔
اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی کے قلمی تصاویر
میں تلواریں ایسی ہیں جن سے فوراً پتہ چل جاتا ہے کہ
ان پر مغلوں اور راجپوتوں کا اثر ہے۔ دستے صلیب
نما ہیں۔ کبھی کبھی تیغوں پر "پشتے" بھی دکھائی دیتے ہیں۔
کرایچ تلوار عام طور پر داہنے ہاتھ میں پکڑی جاتی تھی۔
جبکہ دیگر تلوار اور خنجر وغیرہ کمربند سے لٹکائے
جاتے تھے۔ آخری زمانے کی دکھنی تصاویر میں ذوالفقار
تلوار بھی اکثر نظر آتی ہے۔ یہ تلوار زیادہ تر مذہبی
تقریبات میں استعمال ہوتی تھی، خصوصاً ماہِ محرم میں

زندگی .... صفحہ ۱۹۰ سے آگے۔

فضاؤں میں ایک کیف سا سمو دوں ـــ ایک ایسی جنت بن
جائے جہاں صرف خوشیاں ہوں۔ قہقہے ہی قہقہے ہوں۔
لیکن پھر دوسرے ہی لمحے میں اُداسیوں کا کفن اوڑھے
اپنی کنج تنہائی میں سسکتی رہتی ہوں ـــ کیوں یہ غم و خوشی
کی بدلتی گھڑیاں ہماری زندگی کو اس قدر متأثر کرتی ہیں؟
کیوں ہنستے ہنستے آنسو ہمارے دامن [illegible] تے ہیں ـــ؟
بچپن میں یہ شعر پڑھا تھا ـــ

غنچہ تری زندگی پہ دل ہلتا ہے ـــ بس ایک تبسم کے لئے کھلتا ہے
غنچے نے کہا کہ اس چمن میں بابا! ـــ یہ ایک تبسم بھی کسے ملتا ہے
کیا ہماری زندگی بھی غنچہ کا ایک تبسم ہے ـــ!! ●●

سیدہ طیبہ بیگم

زندگی غنچے کا تبسم ہے

یوں ہی بیٹھے بیٹھے جی چاہتا ہے کہ کھلکھلا کر ہنسوں ہنسوں اور دوسروں کو ہنساتی رہوں ۔ خواہ دل کتنا ہی روتا رہے، مسوستا رہے، تڑپتا رہے ۔ بگلے کی طرح ایک پیر پر ناچوں ۔ موسیقی کی لے بڑھتی جائے اور میرے قدم اس لے کے ساتھ تیز سے تیز تر ہوتے جائیں ۔ دنیا میرے اطراف گھومتی رہے ۔ اور میں دنیا پر ہنستی جاؤں ۔ لوگ مجھے پاگل سمجھیں اور میں پاگل بن کر دل کی ساری حسرتیں پوری کرلوں ۔ وہ وہ کہہ دوں جو کوئی ہوش والا نہیں کہہ سکتا ۔ اچھے بھلوں کو پاگل بنا دوں اور پاگلوں کو ہوش و خرد کے جلوے دکھا دوں ۔ کوئی سمجھے یا نہ سمجھے بس کہتی جاؤں بکواس کئے جاؤں اور پھر یہ اُمید کرکے کہ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی، اپنا سوانگ بدل لوں ۔ سنجیدگی کا چولہ پہن لوں اور اپنے پاگل پن کا خود مذاق اُڑاؤں ۔ میری آنکھوں کے کونے بھیگتے ہیں تو بھیگا کریں ۔ دل چیختا ہے چیخا کرے ۔ ان آنسوؤں میں رکھا ہی کیا ہے ۔ ان چیخوں کی قیمت ہی کیا ہے ؟

مگر یہ ہنسنا کیسا ، یہ رونا کیسا ؟ کیوں نہیں آدمی صرف ہنستا ہی رہتا ہے ۔ ہنستے ہنستے ہی کیوں نہیں آنکھیں موند لیتا ؟ زندگی میں کون سی ایسی گھڑیاں آتی ہیں جو اس کی حس یاس کو اسقدر بھڑکا دیتی ہیں کہ اسکے تال پر دھڑکنے والا دل اپنا رونا رگ شروع کر دیتا ہے ۔ میں بھی بار بار جھوم جھوم کر ہنسی اور ہنس ہنس کر رو دی مگر یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ کس بات پر ہنسی آئی اور کس بات نے رُلا دیا ۔ میری حساس طبیعت گھنٹوں بلکہ دنوں کسی بات پر بوجھل رہی ۔ دکھ کا یہ ساگر خوشی کی ہر لہر کو ٹھکراتا گیا ۔ محسوس ہوا کہ دُکھ میں بھی ایک خاص قسم کی لذت ہوتی ہے ۔ جیسے اس دکھ کو کھینچ کر نکال دیا جائے تو دل میں کوئی اور چیز باقی نہیں رہ جاتی ـــــ ایک دُکھ کے ساتھ دوسرا ایسے سمٹ آتا ہے جیسے ایک دوسرے کا سلسلہ ہے اور پھر اس کی وضاحت بھی تو نہیں کی جا سکتی کہ کس موقع پر کس بات نے دل کو دکھ اور کس بات کے یاد آتے ہی حالیہ دُکھ پھیل کر ایک بڑا سا حلقہ بن گیا ۔ ایک گرداب کی شکل اختیار کر گیا ۔ جس میں میں چکراتی رہی اور اندر ہی اندر دھنستی گئی ـــــ کالے سیاہ دھبے میرے اطراف بڑھتے گئے اور میں ان میں سماتی گئی ـــــ اور جو اُبھرنے کی کوشش کی تو کوئی روشنی نظر نہ آئی ۔ روشنی کی کرن نہ ملی جسے پکڑ کر آسمان کے کنگوروں تک پہنچ سکو

ہر طرف ایک مایوسی، ایک وحشت، ایک دُھندلکا۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا!! کبھی خوشیوں کی لہریں جھوم کر دکھ کے ساگر کو بھر گئیں۔ بات بات پر شگوفے چھوٹنے لگے۔ ہونٹوں کے کنارے دل نشین زاویوں میں بدل گئے۔ آنکھوں میں تراوٹ آ گئی ماہتاب کی کرنیں پھوٹ پڑیں ـــ پھول مہکا تو ہونٹوں پر گیت بکھر گئے ـــ کبھی بارش کے قطرے میری آنکھوں سے جھڑی برسانے لگے ـــ کبھی سیاہ بادل زلفوں کی گھنیری چھاؤں کی یاد دلا گئے۔ کبھی مسکراتا شرماتا چاند اور لچکتی بل کھاتی شاخ کسی حسینہ کے رُخِ انور اور نازک بدن کا تصور آنکھوں میں بسا گئی۔ اور پھر جی چاہا کہ کوئی مجھے بھی چاند سے تشبیہ دے اور میرے زلفوں کی چھاؤں میں ستائے اور میں رو پڑوں۔ حالانکہ مجھے ہنسنا چاہیئے۔ مگر میں رو پڑوں گی۔ کیونکہ اس کے پیچھے یہ احساس مجھے بے چین کر دے گا کہ میں نے چاہا تھا کہ کوئی مجھے اس والہانہ انداز سے آنکھوں میں بٹھا لے کہ میں اپنے وجود کو بھول جاؤں ـــ سارے دکھ درد ہوا کے دوش پر اُڑ جائیں۔ میں سُبک ہو جاؤں اور میری زندگی کے گل بوٹے روپہلی کرنوں میں بکھر جائیں اور میں اپسرا بن کر اِن کرنوں پر ناچتی پھروں۔! تھرکتی چلوں مگر ایسا نہ ہو سکا۔ میرا حساس دل تڑپتا رہا اور میں اسکی ایک ایک ٹیس پر مچلتی گئی۔ اور میری آنکھوں سے آنسو بہتے گئے۔ میرے رخساروں پر سے ڈھلک کر وہ میرے سُرخ ڈوپٹے میں جذب ہو گئے اور میرا یہ سُرخ گھونگھٹ میری مانگ میں بھر سیندور بکھیر کر میرے کانوں میں چُپکے سے کہہ گیا۔

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے ایک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

مگر میں نہیں چاہتی کہ میرا سُرخ ڈوپٹہ پرچم بن کر لہرائے۔ میں تو اسے خوشیوں کی نشانی سمجھتی تھی ـــ صبح کا طلوع ہوتا سورج سمجھتی تھی اور اسکے نور سے اپنی زندگی کا ذرّہ ذرّہ چمکانا چاہتی تھی۔ پھر یہ فضاؤں میں کیوں لہرائے! مگر یہ خونِ تمنا بن گیا ـــ اور میں خاموشی سے تمناؤں کا خون ہوتا دیکھتی رہی اور میری شریانوں میں، میری رگوں میں بہتا گرم گرم خون سرد ہوتا گیا ـــ سارے جذبات سے عاری ہوتا گیا۔ میں تھرتھراتی، کانپتی رہی ـــ کوئی مجھ میں حِدّت نہ پیدا کر سکا ـــ میری آرزوئیں چلّاتی گئیں اور میں ایک تصویرِ یاس بنی اپنی قسمت کی کھونٹی پر لٹکتی رہی ـــ کسی کے ہاتھوں نے اسے سنوارا نہیں، اور نہ میری قسمت ہی سنور سکی۔ اور میرا رواں رواں پکار اُٹھا ـــ

مقدّر میں لکھا ہے آنسو بہانا
مگر مُسکرانے کو جی چاہتا ہے

کہاں تک کوئی روئے اور روتے روتے چہرے بھی مسخ ہو جاتے ہیں۔ پھر تقدیر کی لکیریں کیسے بن سکینگی؟ کسی نے کہا تھا ـــ "روٹھ جاتا کہ دنیا تمہارے ساتھ ہنس سکے۔ روؤ تو تنہائی میں اکیلے روؤ، غم کا کوئی ساتھی نہیں۔ ہنسنے والوں کا دنیا ساتھ دیتی ہے مگر میری ہتھیلی کی لکیریں بھی تو میرے مقدّر کی طرح ٹیڑھی میڑھی اور گرہ گیں ہیں۔ اتنی ساری لکیریں ہیں مگر ان میں سے کوئی لکیر بھی قسمت کو چمکانے والی نہیں۔ یہ ہاتھ میرا مقدّر ہے۔ میں نے کئی بار ان ٹیڑھی لکیروں کو پڑھنا چاہا ـــ ان سے ایک خوبصورت کہانی بنانی چاہی جس میں دلکش و دلنواز لبوں کی مسکراہٹیں ہوں، اٹھکیلیاں کرتے پھول ہوں، سبزہ زار ہوں جہاں زمرّد کے گلوبند بڑھ کر میری گردن تک آ پہنچیں اور میری سجاوٹ بن جائیں ـــ میری آنکھوں کے سپنے سچّے نکلیں ـــ شامِ اودھ اور صبحِ بنارس کا وصال ہو جائے۔ اور شبِ ہجراں غمِ فردا بن جائے۔ میرے ہونٹ مسکراتے رہیں ـــ کلیوں کے تبسم کی طرح! بات بات میں گل افشانی کروں۔

(باقی صفحہ ۱۷ پر دیکھیے)

شہریار

اہلِ جہاں مقبول ہے تم میں مجھ جیسا دیوانہ کیوں
تم سب کی سفّاک زباں پہ ہے میرا افسانہ کیوں

میرے چپ ہونے سے پہلے بھی کتنا سنّاٹا ہے
بستی والو! ملزم مجھ کو پھر تم نے گردانا کیوں

ظالم، کالی، لمبی راتو! تم ہی کچھ انصاف کرو
دشمن خوابوں کے بدلے اک میں ہی دوں جرمانہ کیوں

میں بھی اس کو بھول چکا ہوں وہ بھی مجھ کو بھول گیا
اے یادو! اب تم نے لگا رکھا ہے آنا جانا کیوں

کب سماں دیکھیں گے ہم زخموں کے بھر جانے کا
نام لیتا ہی نہیں وقت گزر جانے کا

جانے وہ کون ہے جو دامنِ دل کھینچتا ہے
جب کبھی ہم نے ارادہ کیا مر جانے کا

لاتا ہم تک بھی کوئی نیند سے بوجھل راتیں
آتا ہم کو بھی مزہ خواب میں ڈر جانے کا

دستبردار ابھی تیری طلب سے ہو جائیں
کوئی رستہ بھی تو ہو لوٹ کے گھر جانے کا

سوچتے ہی رہے پوچھیں گے تری آنکھوں سے
کس سے سیکھا ہے ہنر دل میں اتر جانے کا

محمد قمرالدین

○

آج تک یاد ہے جو کچھ وہ بھلا کر دیکھوں
زندگی کو نیا انداز، دکھا کر دیکھوں

ہے جدا بات، سفر ختم بھی ہوگا کہ نہیں
ہاں مگر پہلا قدم خود بھی اٹھا کر دیکھوں

کیسے لگتے ہیں شب و روز یہی، میرے بغیر
کاش یہ فرق بھی، میں خود کو مٹا کر دیکھوں

یہی اک عذر نہ ہو شب کے ٹھہرنے کے لئے
کیوں نہ کچھ دیر، چراغ اپنا بجھا کر دیکھوں

درد و غم جن میں ہوئے جمع وہ اشعار اپنے
میر کے نام سے یاروں کو سنا کر دیکھوں

نظیر علی عدیل

○

شہرۂ آفاق مصر کا رستہ
ہے اک اندھے کنویں سے وابستہ

دل کے آگے نہیں کوئی رستہ
جیسے کوئی گلی ہو سربستہ

منزلِ عشق کیسے طے ہو گی
ہر قدم پہ ہے اک نیا رستہ

جن کو لایا بچا کے مقتل سے
ہیں مرے قتل پہ کمربستہ

کیسے نیند آئے سونے والوں کو
ہو اگر چھت مکان کی خستہ

ہم عدم تا عدم چلے تھے عدیل
واپسی میں بدل گیا رستہ

ڈاکٹر محمد علی اثر

حسن شوقی کی ایک غیر مطبوعہ غزل

شیخ حسن شوقی، دبستانِ دکن کا ایک بلند پایہ شاعر گزرا ہے۔ اس کا تعلق، نظام شاہی (۱۴۹۰ء۔۱۶۳۳ء) قطب شاہی (۱۵۱۲ء۔۱۶۸۷ء) اور عادل شاہی (۱۴۸۹ء۔۱۶۸۶ء) تینوں سلطنتوں سے رہا ہے۔ لیکن اس کی زندگی کا بیشتر حصہ بیجاپور میں بسر ہوا۔ ابنِ نشاطی، نصرتی، ہاشمی اور ولی اورنگ آبادی جیسے عظیم المرتبت شاعروں نے حسن شوقی کے کمالِ فن کا اعتراف کیا ہے۔ ؎

حسن شوقی اگر ہوتے تو الحال — ہزاراں بھیجتے رحمت مجھ اپر ال (ابنِ نشاطی)

ہوا ہے غلغلہ ہاشم ترے اشعار کا چوندھر — عجب نین گر سنے شوقی حسن سا کر دکھن نکلے (ہاشمی)

دس پانچ بیت اس دھات کے کئے ہیں تو شوقی کیا ہوا — معلوم ہوتا شعر اگر کہتے تو اس بستار کا (نصرتی)

حسن شوقی کی اب تک دو مثنویاں "فتح نامہ نظام شاہ"، "میزبانی نامہ"، تیس غزلیں اور ایک نظم کا پتہ چلتا ہے جنھیں ڈاکٹر جمیل جالبی نے مرتب کرکے دیوانِ حسن شوقی کے نام سے ۱۹۷۱ء میں انجمن ترقی اردو کراچی سے شائع کیا ہے موجودہ مواد کی روشنی میں حسن شوقی ایک بے مثال مثنوی نگار اور باکمال غزل گو کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ جہاں تک غزل گوئی کا تعلق ہے، وہ دبستانِ دکن کے صفِ اول کے متغزلین میں شمار کیا جائے گا۔ سادگی، سلاست اور واقعیت حسن شوقی کے کلام کے نمایاں اوصاف ہیں۔

راقم الحروف کو کتب خانہ سالار جنگ کے ایک مخطوطے (بیاضِ مراثی ۲۴) میں شوقی کی ایک غزل دستیاب ہوئی ہے جسے تدوینِ متن کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ غزل "دیوانِ حسن شوقی" میں شامل نہیں ہے۔ اس کو ملا کر شوقی کی جملہ غزلوں کی تعداد اکتیس (۳۱) ہو جاتی ہے۔ ؎

جا کہہ سلام شہ پور، میرا ثواب ہوئے گا[1] ⁘ ارداش[2] میں لکھیا ہوں اس کا جواب ہوئے گا

توں طور نکو لمانے شہ تجھ غصہ نہوسے[3] ⁘ میں خوش خبر لکھیا ہوں مقصد شتاب ہوئے گا

اس تن کی توں بھٹی کر آتش فراق لادے[4] ⁘ سب عشق ہے معطر اس کا شراب[5] ہوئے گا

سب رگ[6] رگوں میں پر تل بھیگل میں گلاب بوئے ⁘ عارف اول تے توں تھا رگ رگ رباب ہوئے گا

سرمت اول توں تھا اور کوں پلا ہور توں پی ⁘ شہباز کے کرم سوں تجھ فتح باب ہوئے گا

اس من کوں توں ذبح کر بریاں[7] نقس کوں ہونا ⁘ جیو کا نمک لگا دے سب تن کباب ہوئے گا

اسلام جیوں شرع سوں شوقی ہوا ہے شکر ⁘ دفتر تو لکھ رکھیا ہوں بعد از حساب ہوئے گا

---

[1] ہوئے گا (بہ اعتبار وزن) [2] عرض داشت [3] نہیں ہو سکتے [4] لگا دے [5] بد دعا کے درخت [6] خوشبو [7] جلتا ہوا

ڈاکٹر موہن لعل نگم

اسلحہ

دشمن کے حملے کا خوف اور اپنی دفاع کا جذبہ' ہماری نظر میں ایسے اسباب ہیں جنہوں نے اسلحہ سازی اور دیگر سامانِ حرب کی تیاری کی طرف انسان کو راغب کیا۔ سب سے قدیم ترین ہتھیار پتھر سے بنائے گئے' پھر رفتہ رفتہ لوہے سے ہتھیار بنائے جانے لگے۔ ان کے بعد دُور پھینکے جانے والے ہتھیار مثلاً تیر کمان وغیرہ ایجاد کئے گئے۔ ہندوستان کی قدیم سنسکرت کی کتابوں میں کئی ہتھیاروں کا ذکر ملتا ہے۔ جس سے اس زمانہ کی اسلحہ سازی سے متعلق مواد کا کھوج لگایا جا سکتا ہے۔ ہم فی الحال دھاتوں سے بنائے گئے دکھنی اسلحہ کا ذکر کریں گے۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ حیدرآباد ہی کے دو میوزیم یعنی سالار جنگ میوزیم اور آندھرا پردیش اسٹیٹ میوزیم میں اسلحہ کا ایک قابلِ قدر ذخیرہ موجود ہے۔

جہاں تک دکن کا تعلق ہے' اس کے مختلف مقامات پر اسلحہ بنائے جاتے تھے۔ جیسے وجیانگر' سرینگا پٹن' جگدیو پور' حیدرآباد اور ورنگل وغیرہ۔ مسلمانوں کے دور میں ایران اور یورپ سے تلواروں کے تیغے درآمد کئے جاتے تھے اور یہاں ان کے دستے' مٹھ اور میانیں ہندوستانی طریقے سے تیار کروا کے مکمل تلواریں بنائی جاتی تھیں۔ اس کام میں ہندوستانی کاریگر بڑے ماہر ہوتے تھے۔ دکن میں ان کے علاوہ ہر قسم کے ہتھیار حتیٰ کہ بندوقیں بھی تیار کی جاتی تھیں۔ زمانۂ وسطیٰ کی یہ بات بڑی دلچسپ ہے کہ اس زمانے کے ہتھیار محض نمائشی تھے۔ بعض محض سیر و شکار کیلئے تھے تو بعض صرف مذہبی یا درباری تقاریب میں استعمال کی جاتی تھیں۔ مثلاً سروہی تلوار صرف جانوروں کے ذبح کرنے کیلئے مختص تھی۔ اسی طرح خنجر "دو مُنہ" صرف شکار میں استعمال ہوتا تھا۔ تلوار "ذوالفقار" محض مذہبی تقریبات اور جلوسوں میں نکالی جاتی تھی۔ کئی تلواریں اور خنجر مع اپنے خوبصورت دستوں کے صرف تحفتاً دیئے جاتے تھے۔ تیغوں کی جلا' صفائی اور چمک' ان میں تہہ در تہہ طلائی کام' کوفتہ گری اور قیمتی و نیم قیمتی پتھروں کا ان پر جڑاؤ' ہتھیاروں کی سجاوٹ کے مختلف ذریعے تھے۔ جن کے لئے ہندوستانی کاریگر مشہور تھے کئی تلواریں ایسی بھی ہیں جن پر کارخانے اور تلوار ساز کا نام بھی کندہ ہے۔ کہیں کہیں تاریخ تیاری بھی دی گئی ہے۔

تاریخی اعتبار سے دکن کی قدیم ترین دھاتی تلوار' رائچور کے تعلقہ کلور کی ہے جو اسی دھات سے بنی ہوئی ہے۔ یہ بڑی سیدھی سادھی تلواریں ہیں جن کا تیغہ اور دستہ ایک ہی ٹکڑے سے ڈھالا گیا ہے۔ یہ لمبی اور دو دھاری ہیں انہیں دوسری صدی قبل مسیح یا اس سے پہلے بنایا گیا ہے

اسی طرح لوہے کا استعمال شاید دکن میں پہلی صدی قبل مسیح سے ہو رہا ہو، چنانچہ اس زمانے کی کئی تلواریں، خنجر چھریاں، نیزے۔ اور کلہاڑیاں ہمیں کئی مقامات کی کھدوائی میں دستیاب ہوئی ہیں۔ زیادہ تر دکن کے برہما گری، ماسکی، پوچیم پاڈ، ناگر جونا کنڈہ، یلیشورم اور بڈا بانکور وغیرہ اس سلسلے کے خاص مقامات ہیں۔ اب آہستہ آہستہ مِس کا استعمال کم ہونے لگا ہے۔ پوچم پاڈ سے دستیاب جنگی کلہاڑی سے پتہ چلتا ہے کہ دکن کے لوہے کے دور میں دھات سازی نے کافی ترقی کر لی تھی۔

اسلحہ کے متعلق معلومات کا ایک اور طریقہ یہ ہے کہ ہم قدیم دور یعنی دوسری صدی قبل مسیح تا چھٹی صدی عیسوی کے پتھروں کے مجسموں کا تفصیلی جائزہ لے کر ہتھیاروں کا پتہ چلائیں۔ امراوتی کے مجسمے جو دوسری صدی قبل مسیح تا دوسری صدی عیسوی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمیں اسلحہ مختلف نمونے دکھلاتے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بھی مختلف قسم کی تلواریں، ڈھالیں خنجر، کلہاڑیاں اور تیر و کمان وغیرہ رائج تھے۔ تیغ آجکل کے کھانڈا تلواروں سے ملتے جلتے تھے۔ دستے یا تو گول ہوتے تھے یا پھر مربع شکل کے، مگر ڈھالیں گول نہیں ہوتی تھیں۔ ناگر جوناکنڈہ کے اسلحہ بھی انہی جیسے ہیں۔ اسی زمانے میں ایک اور ہتھیار ہوتا تھا جسے "میس" (MACE) کہتے ہیں۔ پالوا دور کے مجسموں میں ہمیں دو نئی قسم کی تلواریں ملتی ہیں، جن میں ایک مشہور کھانڈا تلوار ہے۔ مجسموں کی ان تلواروں سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ دکنی دستے سب سے علٰحدہ ہوتے تھے۔

ساتویں صدی عیسوی تا چودھویں صدی عیسوی مغربی ہندوستان میں کھانڈا تلوار بڑی مقبول رہی، تیغے سیدھے مگر پتوں کی شکل کے ہوتے تھے۔ دکن کے مشرق میں ایک نئی تلوار تیار کی گئی جس کو "کورا" کہتے ہیں ا[س] کا تیغہ چوڑا مگر اگلے حصے میں خمدار ہوتا تھا۔ گورکھے [اس] کو زیادہ استعمال کرتے تھے اور یہ شاید آٹھویں صدی کی ایجاد ہے۔ چالوکیہ دور میں ترشول بھی ایک مقبول ہتھیار تھا۔ اسی طرح کاکتیہ دور کے مجسمے بھی نشاندہی کرتے ہیں کہ تیر، کمان، تلوار، خنجر، نیزے، ترشول اور کلہاڑیاں عام تھیں۔ تلواریں لمبی اور دو دھاری ہوتی تھیں۔ کہیں کہیں چھوٹی خمدار تلواریں بھی دکھائی دیتی ہیں دستے خالص دکنی ہیں۔ خنجروں کے تیغے، دستوں کی طرح موٹے ہوتے تھے۔ ڈھالیں بڑی اور مستطیل ہوتی تھیں جن کے پچھلے حصہ میں دائرے ہوتے تھے۔ مغربی دکن کے ہریاسلہ دور کی تلواریں چار قسم کی تھیں، اول کھانڈا جن کے تیغے چپٹے ہوتے تھے اور دستے خالصتاً ہندوستانی ہوتے تھے۔ دوم سیدھی تلواریں جو دو دھاری ہوا کرتی تھیں۔ سوم ایسی تلواریں جن کے اگلے حصے خمدار ہوتے تھے، اور چہارم ایسی تلواریں جن کے تیغے دوہرے خمدار ہوتے تھے۔ دستوں کیلئے بہترین مثال نا[ر]سمندر[م] کی تلواریں ہیں۔

چودھویں تا سترھویں صدی عیسوی دور کو ہم وجیانگر کے نام سے بھی یاد کر سکتے ہیں، ایسا لگتا ہے کہ اس دور میں تلواروں کی تیاری کیلئے کافی فنی مہارت اور لیاقت کو بروئے کار لایا گیا۔ اس دور کے مجسموں میں جو تلواریں دکھائی گئی ہیں، وہ پہلے دور کے مقابلے میں زیادہ بہتر اور خوبصورت ہیں۔ نت نئی شکلیں اور کئی نئی قسم کی تلواریں ہمیں ان میں مل جاتی ہیں، ان میں دو قابل ذکر ہیں۔ ایک تو وہ تلوار جو دو دھاری، نوکیلی اور مچھلی کے دُم کی شکل کی ہے، اور دوسری وہ تلوار جس کا تیغہ پہلے حصے میں سیدھا ہے، مگر آگے چل کر خمدار ہو گیا ہے۔ اللہ مچھلی

دم کی طرح لوک پر ضم ہو لیا ہے۔ دستوں کی ساخت بھی بدل گئی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ پہلے سے زیادہ مضبوط و بہتر ہیں مرہٹوں نے آگے چل کر جو دستے اپنائے انکی ایجاد وجیا نگر دور میں ہو چکی تھی۔ دوسرا اہم اضافہ یہ کیا گیا کہ تیغوں کے دونوں طرف مضبوطی کیلئے پشتے دیئے جانے لگے۔ بعض دستے ایسے بھی ہیں جو دونوں ہاتھوں سے پکڑے جا سکتے ہیں اسی دور کے مصور مخطوطے "راماین" میں بھی مذکورہ بالا تلواریں ملتی ہیں۔

سولھویں صدی عیسوی میں سلطنتِ وجیا نگر کو زوال ہوا، اور مسلمانوں اور مرہٹوں نے سارے دکن کو فتح کر لیا۔ بالآخر مغلوں نے انہیں شکست دے کر اپنی حکمرانی قائم کر لی۔ اور مختلف صوبہ داروں کو دکن پر مامور کیا۔ انہی میں سے ایک گورنر نظام الملک آصفجاہ نے ۱۷۲۴ء میں اپنی آزادی کا اعلان کر کے آصف جاہی حکومت کی دکن میں بنیاد رکھی۔ پہلے ان کا دارالسلطنت اورنگ آباد تھا، جو بعد میں حیدرآباد منتقل کیا گیا۔ اسی طرح میسور اور ٹراونکور بھی آزاد حکومتیں قرار دی جا سکتی ہیں۔ اسی درمیان یوروپی طاقتیں مثلاً ڈچ، پرتگالی، فرانسیسی اور برطانوی قومیں تاجروں کے روپ میں ہندوستان آئیں، اور آہستہ آہستہ انہوں نے یہاں کی سیاست میں بھی دخل دینا شروع کیا۔ راجگانِ میسور کے ملازم حیدرعلی نے اپنے راجہ کو تخت سے ہٹا کر خود کو میسور کا ایک آزاد بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ حیدرعلی نے اپنی افواج کیلئے جدید اسلحہ مہیا کئے جو اس نے ڈچ لوگوں سے حاصل کر کے انگریزوں کے خلاف استعمال کئے۔ لیکن موت سے کچھ دن قبل ۱۷۸۲ء میں اسے شکست ہوئی۔ اس کے مرنے اور جانشین۔ ٹیپو سلطان نے ایران، افغانستان اور فرانس سے راست تعلقات پیدا کئے؟ جدید اسلحہ خریدے اور فرانسیسی ماہرینِ جنگ کی خدمات حاصل کیں مگر بالآخر اسے بھی شکست اٹھانی پڑی۔ اور اس طرح دکن پر انگریزوں کا مکمل تسلط ہو گیا۔ ٹیپو سلطان کے ہتھیار، بہترین اور قیمتی تھے۔ بعض تو طلائی کام اور ہیرے جواہرات سے مزین تھے۔

ان سب چیزوں سے پتہ چلتا ہے کہ جہاں تک اسلحہ، اسلحہ سازی اور فنونِ جنگ کا تعلق ہے دکن کبھی کسی سے پیچھے نہیں رہا، پہلے ان کا مغلوں سے رابطہ پھر یوروپی اقوام سے تعلق وغیرہ نے دکنی اسلحہ سازی پر قابلِ ذکر اثر ڈالا، جس کے نتیجہ میں فوجی انداز بھی کافی تبدیل ہوئے۔ ایران اور یورپ سے قابلِ لحاظ اسلحہ کا ذخیرہ درآمد کیا گیا۔ تلواروں اور خنجروں کے تیغے اکثر باہر سے درآمد کر کے ہندوستانی دستوں میں بٹھائے جاتے تھے۔ مرہٹوں کے چھوڑے ہوئے ہتھیار بتلاتے ہیں کہ لمبے اور لچکدار تیغے جرمنی، اٹلی اور اسپین سے منگوائے ہیں۔ مقبول عام پٹوں کے تیغے عام طور پر یورپ سے منگوا کر ہندوستانی دستوں میں بٹھلائے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ غیر ہندوستانیوں کی فوج میں بھرتی سے بھی کئی جگہ کے اسلحہ ہندوستان میں داخل ہوئے۔ اسی طرح حیدرآبادی فوج بھی عربوں، پٹھانوں، حبشیوں، یورپ والوں، سکھوں اور راجپوتوں وغیرہ پر مشتمل تھی۔

حیدرآباد کے تعلق سے ایک بہت ہی دلچسپ بات معاصر تواریخ میں یہ ملتی ہے کہ یہاں ہر کئی ملک و قوم کے لوگ رہتے تھے۔ انیسویں صدی عیسوی میں حیدرآباد کی سڑکوں پر عرب، سدی، روہیلے، پٹھان، افغان، راجپوت، ایرانی، بخاروی، چرکسی اور ترک اپنے اپنے قومی لباس

اور ہتھیار کے ساتھ گھومتے ملتے تھے۔ اب بھی دکن میں اور خصوصاً حیدرآباد میں ہتھیاروں کا ایک اچھا خاصہ ذخیرہ محفوظ ہے۔

دکنی اسلحہ میں زمانے کے ساتھ ساتھ تغیّر بھی آیا، تاکہ کارکردگی بہتر ہو، تلواروں خنجروں کی شکل و صورت یقیناً باہر کے ہتھیاروں سے متاثر ہے۔ مثال کے طور پر آپ موجودہ تلوار کو لیجئے۔ اگر پچھلے مجسموں اور قلمی مصوّری کے نمونوں سے مقابلۃً اسے دیکھا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ موجودہ تلوار اواخر سولھویں صدی عیسوی سے دکن میں رائج ہوئی، اور یہ نتیجہ ہے ایرانی اثر کا، کوئی بھی ہندوستانی تلوار اس سے قبل پیچھے کی طرف خم نہیں کھاتی تھی۔ اسی طرح دیگر تلواریں اور خنجر جیسے ذوالفقار، سیلابہ، قمہ اور جنبیہ وغیرہ۔ عرب اور ایران کی ایجادات مسلمانوں کے ذریعہ دکن میں رائج ہوئے۔ ٹیپو سلطان کو تو ایرانی تلواروں سے گویا عشق تھا۔

یہی حال بارود والے اسلحہ کا ہے۔ یہ بھی زیادہ سے زیادہ تعداد میں یورپ سے برآمد کئے گئے ہیں۔ ہندوستان کی کئی خودمختار ریاستوں نے بندوق اور پستول سازی کے اپنے کارخانے کھول رکھے تھے۔ میاچ لاک اور فلنیٹ لاک بندوقیں قدیم ترین ہیں۔ توپ "ملک میدان" وسط سولھویں صدی عیسوی میں بمقام احمدنگر ڈھالی گئی اور اس کا استاد تھا حسینی خاں رومی۔ مغلوں میں بابر کے زمانے ہی سے توپوں کا استعمال جاری تھا۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں تو ہندوستان کے کئی شہروں میں اسلحہ سازی کے کارخانے کھل گئے، جہاں اور سامان کے علاوہ بندوقیں اور توپیں بھی تیار کی جاتی تھیں۔ خود حیدرآباد شہر کے کارخانے "مدرسۂ صناعی" میں بندوق "میکٹ"، تیار کی جاتی تھی۔ و نیرتی، گردال اور برمل وغیرہ میں میاچ لاک وغیرہ تیار ہوتے تھے۔

دکنی قلمی تصاویر سے بھی ہم اسلحہ اور اسکی تاریخ پر روشنی ڈال سکتے ہیں۔ ان سے ہم یہ بھی معلوم کرسکتے ہیں کہ ہندوستانی ہتھیار کب سے چلے آرہے ہیں، اور ان کے مقابلے میں ایرانی اور یوروپی ہتھیار کیا تھے؟ مگر افسوس کہ ہمیں مختصر قلمی مصوّری کے نمونے سولھویں صدی عیسوی سے پہلے نہیں ملتے۔ سب قدیم مختصر مصوّری کے نمونے ہمیں احمدنگر کے مخطوطے حسین شاہی میں ملتے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ کٹار اس زمانے کا مقبول ترین ہتھیار تھا۔ سالار جنگ میوزیم کے مخطوطے سے، جو اواخر سولھویں صدی عیسوی کا قرار دیا جا سکتا ہے، نیز معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی تلواروں اور خنجروں پر ایرانی اثرات زیادہ ہیں۔ دستے عام طور پر پستول جیسے ہیں، تیغے سیدھے ہوتے ہیں، اور کبھی کبھی نوک کی طرف خمدار بھی۔ تلواروں کی میانیں بھی بڑی خوبصورت بنائی جاتی تھیں جن پر مخمل ہوتا تھا۔ خنجر چھوٹے ہوتے تھے اور ان کے دستے دائرے دار ہوتے تھے۔ ایک قلمی تصویر میں جنبیہ بھی دکھایا گیا ہے۔ امریکہ کے ایک میوزیم میں ابراہیم عادل شاہ ثانی شاہ بیجاپور کی ایک مختصر قلمی تصویر ہے اس میں تلوار دھوپ بتلائی گئی ہے۔ یہ اوائل سترھویں صدی عیسوی کی قلمی تصویر ہے۔ "پٹے" کے لئے جو تیغ ملتے ہیں وہ بھی غیر ہندوستانی ہیں۔ زیادہ تر غیر ہندوستانی تیغے یورپ سے برآمد کئے جاتے تھے۔ اس لئے ایسی تلواروں کا نام "فرنگی" پڑ گیا۔ ایسی فرنگی تلوار کی نقاشی ہمیں بیجاپور اسکول کے طرز مصوّری میں مل جاتی ہے۔ ان میں ڈھالوں کے نمونے بھی دیکھے جا سکتے ہیں جو کافی بڑی ہوتی تھیں۔ راگمالا کے ایک مخطوطے میں، جو وجیانگر سے منسوب ہے، ہم ایرانی تلوار کی قلمی تصویر

(باقی ص ۱۷۱ پر دیکھئے)

سلطانہ شرف الدین احمد

دو سائے

شادی کی یہ تیسری محفل تھی مگر وہ اسی طرح سیاہ جالی کی ساڑی میں ملبوس تھی جس پر کامدانی کی بوقلموں سلکیاں کڑھی ہوئی تھیں۔ بلاوز بھی اسی رنگ کا تھا۔ لیکن اونچا، گلا چرا اور بے آستین۔ جیسے وہ کسی بکنی کا اوپری حصہ ہو۔ سلمیٰ جس میز پر بیٹھی کنکن کافی کے گھونٹ لطف و خوشی سے اتار رہی تھی، وہیں چند ایسی مہمان خواتین موجود تھیں جو اس محفل میں ضرورت سے زیادہ تعلیم یافتہ تھیں ان میں سے کئی اونچے عہدوں پر فائز تھیں۔ یہ مردوں اور عورتوں کی ملی جلی محفل تھی۔ مگر عورتوں نے اپنے گروہ الگ بنا رکھے تھے۔ دلچسپ باتوں کا سلسلہ جاری تھا اپنی جگہ سے اٹھنے پر کوئی بھی مائل نہیں تھا۔ مسز دلدار ایک جوتھائی گورا بدن چھلکاتی کچھ لہراتی بل کھاتی وہاں اچانک وارد ہوگئیں۔ سلمیٰ بس ٹھنڈی ہوگئی۔ آنکھیں بھی نہ چرائی جاسکتی تھیں۔ اتنی بڑی محفل میں جہاں زیادہ تر شائستہ عورتیں اور مہذب مرد موجود ہوں وہاں کوئی کولہوں کو خم دیتا، گہرا میک اپ چڑھائے اس چھلکاتا آجائے تو مرد تو مرد عورتیں بھی جھینپ جاتی ہیں۔ مسز دلدار نے بے اختیار سلمیٰ کے شانوں پر ہاتھ رکھ دیا اور انتہائی بے تکلفی سے گفتگو شروع کردی نہ جانے کتنی ہی سامنے والی اور کتنی اجنبی آنکھوں نے انھیں دیکھا۔ ایسی بے تحاشہ نمائشی عورت کی دوستی پر اس محفل میں تو شاید ہی کوئی ناز کرنے والا ہو۔ یہاں کی سوسائٹی اتنی ترقی یافتہ کہاں جو نیم برہنہ عورتوں کو سراہے۔ سلمیٰ نے بیسیوں سانسوں کو منظم کرکے بات کی اور وہ بھی اکھڑی اکھڑی، جس میں طویل گفتگو کے لئے بہت کم گنجائش نکلی تھی۔ وہ دیر بعد وہاں سے ٹلیں۔ سلمیٰ کی جان میں جان آئی سانس کھلی اور نارمل رفتار سے جاری ہوگئی۔

سارے دیش میں غریبی ہٹاؤ کے نعرے چل پڑے تھے مگر غریبی پھیلتی ہی جارہی تھی۔ اس کفایت اور مہنگائی کے دور میں ایسی محفلیں کمیاب ہوتی جارہی تھیں کوئی پانچ سو مردوں اور عورتوں کی دعوت تھی۔ ہندو مسلم اور عیسائی مہمانوں کے علاوہ چند تیس اونچے اونچے گورے چٹے سردار جی بھی دکھائی دے رہے تھے مگر ان کی بیویاں اس چمک دمک کی محفل میں نہ جانے کہاں گم ہوگئی تھیں۔

بے حد لمبا چوڑا ہال رنگ برنگی برقی جگنوؤں اور
تیز روشنی کی لکیروں سے جگمگا رہا تھا آراستہ تھا۔
ان گنت پنکھے ایک جیسی رفتار سے چل رہے تھے جانی
پہچانی شکلوں کی کمی نہ تھی۔ یہاں وہ غیر ملکی لڑکیاں بھی
موجود تھیں جو آج کافی سلیقہ سے کپڑے پہن کر آئی
تھیں۔ دو سال پہلے جب یہ آسٹریا سے آئی تھیں اونچے
اونچے فراک پہنا کرتیں یا پیٹ کھلے عجیب تراش کے بلوزوں
کے ساتھ پتلونیں چڑھائے رکھتیں۔ کلب کے گرم مزاج ہندستانی
نوجوان اور فیشن پرست ذرا ذرا سے چھوکروں نے مرکز
نظر بنا بنا کر انھیں تین چوتھائی ننگا رہنے پر مائل کر دیا تھا
ان میں جو سب سے بڑی تھی وہ بیتری کرم تھی اور دو ٹکڑوں والے تیراکی
کے لباس میں لفیسہ کے بے ساختہ قہقہے، شریر چمکتی آنکھوں
کی تویر نے کئی مختصر سے قہقہے فضاؤں میں بکھیر دیئے۔
مرنالینی بری طرح ہنس رہی تھی جیسے کوئی مضحکہ خیز ڈرامہ ہو رہا
ہو، میرے انتہائی شریف اور اسمارٹ سے مسٹر دلدار
بدن کی ہلکی ہلکی جنبشوں کے ساتھ ہنس ہنس کر بات کر رہی تھیں
وہ کافی حیران اور بوکھلائے نظر آ رہے تھے۔

وہ ایک دلکش صبح تھی۔ بے حد دلکش شاید یہ مئی سی
پہاڑی وادی ہی اسے جنم دے سکتی تھی، محل نما مکانوں کے وسیع
افسانوی دریچوں کے آگے ایسے کئی منظر رک رک گزرتے مگر آج
ان کے مکین بھی محو خرام تھے۔ سلمیٰ کو ایسی صبحوں سے
پیار تھا کیونکہ یہیں اس کی خیالی فردوس نے اصلیت کا
روپ لیا تھا۔ اس کی ازدواجی زندگی نے پہلی بار آنکھ کھولی
تو ایسی ہی ایک خوبصورت صبح نے اس کا خیر مقدم کیا تھا۔ وہ
اس وادی کے لئے نو وارد تھی اور نو واردوں کے لئے اس
میں دلفریبی ہی دلفریبی تھی۔

آفتاب شاید کہیں دور نمودار ہو چکا تھا۔ اجالے میں
ٹھنڈک اور شادابی گھلی ہوئی تھی وادی کی گہرائی جاگتے اور
لہلہاتے کھیتوں سے آباد تھی۔ اونچی اونچی سرمئی اور
بھوری پہاڑیوں سے گھرا ہوا بھرپور چشمہ، عجیب عجیب
وضع کے مکانات، کہیں کہیں جھانکتے ہوئے چٹانوں کے سر
آج کہیں زیادہ نظر نواز دکھائی دے رہے تھے۔ شبنمی ہوا
کی سبک لہریں رہ رہ کر ٹھنڈک کا احساس جگا رہی تھیں۔
سپاٹ سی چٹان پر سفید ساری میں لپٹی، سکڑی، سکڑائی،
سر جھکائے مسز دلدار بیٹھی نظر آ رہی تھیں نہ جانے وہ کیا دیکھ
رہی تھیں، شاید کسی عجیب سی چیز پر ان کی نظریں جمی ہوئی
تھیں۔ آنچل ڈھلکنے کے لئے منتظر تھا۔ زلفیں بے ترتیب تھیں۔
سلمیٰ کی آمد نے انھیں چونکا دیا۔ ناک گلابی تھی تر و
تازہ چہرے پر افسردگی کے سائے رینگتے دکھائی دے رہے
تھے۔ بیٹے سوچے ہوئے تھے۔ سلمیٰ نے اپنی مداخلت کو
بے جا سمجھا۔ لیکن مسز دلدار کے چہرے پر خیر مقدمی آثار
نظر آئے۔ وہ ٹھٹھکی، رکی اور وہیں بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد باتوں
کے مختلف موضوع ریڈیائی نشریات کی طرح جاری ہو گئے۔
یہ ان کا ہمیشہ کا سا انداز تھا سلمیٰ کے بیاہ کو صرف ۶ ماہ
ہوئے تھے۔ مگر دلدار چھ سال کی ازدواجی زندگی کا تجربہ
رکھتی تھیں۔ اس مختصر سی مدت میں وہ تین موٹے موٹے
انتہائی تندرست لڑکوں کی ماں بن چکی تھیں۔ ایک اور آمد
تھی سلمیٰ نے سوچا شاید وہ بچے پیدا کرتے کرتے تھک چکی
ہے۔ خوبصورت جوان بیوی ہو تو زیادہ بچے ہو ہی جاتے
ہیں۔ دلدار صاحب بھی حسین و جمیل مرد تھے۔ شاعر مزاج
آرٹسٹ اور ساتھ ہی بڑے عہدہ دار، ناچ گانے سے
زیادہ انھیں کلب کی زندگی سے پیار تھا۔ وادی احمر
میں پیارا سا گھر، حسین شوہر، خوبصورت صحت مند بچے
اور کیا چاہیئے تھا۔ مسز دلدار کی عورت کچھ اور بھی چاہتی
ہے۔ مسز دلدار امنگیں بھری جوانی اور دلفریب
حسن کی مالک تھیں۔ اس لئے انھیں اور بہت کچھ چاہیے

رف انو کھے ڈیزائن کا گھر دیدہ زیب شوہر اولاد
علاوہ انہیں روحانی قسم کی محبت غیر منقسم توجہ اور ..
رفتگی چاہیئے تھی جو بہت ہی کم عرصہ کے لئے ملی اور
ر کسی اور سمت مڑ گئی۔

دلدار صاحب نے کلب کی شامیں پھر سے آباد
نی شروع کر دیں۔ کارڈز کا عشق جنون میں بدلتا گیا
ی صاحب سے مسز دلدار کے گھر اور دل کی ویرانی
ھتی گئی۔ وہ اکثر سوچتی بے درد زمانے نے اس کی
بصورتی اور جوانی کی بہت کم قیمت ادا کی ہے یہ سندری
ول موتی کی تقدیر اسے نہ چاہیئے تھی کہ تہہ آب سرد
ر بے مہر گہرائیوں میں بس جائے۔

خوب سج سج کر نکلتی۔ نئے انداز کے زیور اور
ڑے پہنتی، پلکوں کی قطاروں کے ساتھ سنہلی سائے
تانی۔ ہونٹوں کی تراش گہری سرخی سے رنگتی مگر کون
ا وہاں جو مرکز توجہ بناتا۔ حسن کو نمائش کی آرزو میں
ڑ پاتیں، مگر وہ بجھتے احساس کے ساتھ حسرتوں کی کہر میں
دب جاتی۔

صبح و شام اسی انداز سے بیت رہے تھے۔ مسز
لدار، تقدیر کی کوتاہیوں پر قانع نہ رہ سکتی تھی وہ ان
کمیوں کو بری طرح محسوس کرتیں۔ اور غمگین ہو جاتیں ان
کی زندگی میں کوئی اور شوق بھی نہ رہا تھا۔ باغبانی نہ خانہ داری
لکھنا نہ پڑھنا۔ جذبات کی لگائی آگ سے شعلے نکلنے لگے۔
دلدار صاحب نے اپنی بھولی بھالی کم عمر خوبصورت بیوی
کے لئے دوست، دفتر، کلب کے سب ہی رشتے ختم کر
دیئے تھے۔ بیوی کے آگے، پیچھے پھرا کرتے سجا سجا کر
دیکھتے، ہاتھوں سے سنوارتے اور خوش خوش ہو کر اسی
طرح دیکھتے جیسے اطالوی سنگتراش اپنی کسی تخلیق سے
محظوظ ہو رہا ہو۔

مگر اُجالوں کے ساتھ اندھیرے اور عمل کے ساتھ
ردِّ عمل بھی لگے رہتے ہیں — دلدار صاحب کی پرانی اور
پچھلی زندگی ایک دم پلٹ آئی۔ لاڈلی بیوی کے ساتھ وہی
دوست، احباب، کلب اور کارڈز۔ گھر، بیوی، بچے۔
نہ جانے کن منزلوں تک پہونچا دیئے تھے کہ ان کی یاد
بھی نہ آتی۔ لاڈلی بیوی کے ساتھ یہ بے رخی، دیوانی چاہت
کے بعد ایسی دکھائی، اپنوں سے زیادہ غیروں نے ہمدردیاں
جتائیں کیونکہ اس میں خود غرضوں کا کیا خرچ ہوتا ہے ایسی
زبانی ہمدردیوں سے بھی مسز دلدار کو تسلی ملنے لگی۔ بیچاری
کا غم گداز ہو جاتا۔ بلوریں آنکھیں آنسوؤں سے کچھ اور چمک
اٹھتیں ——— نظر فریب جوان عورت سب ہی
مردوں کو موہ لیتی ہے۔ دلدار صاحب کے دوست کب چوکنے
والے تھے وہ تو ایسے زرّیں موقعوں کے دل و جان سے،
منتظر تھے۔ وہ اب بھی ان کی موجودگی سے زیادہ عدم موجودگی
میں آنے لگے۔ کوئی نہ کوئی حیلہ بہانہ انہیں وہاں پہونچانے لگا۔
اٹھوارے کی ملاقاتیں روزانہ میں بدل گئیں۔ پرستاروں
کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ شوہر سے کہیں زیادہ توجہ
ملنے لگی۔
مسز دلدار کی مرادیں بر آنے لگیں۔ یہ بیچارے اپنی بیوی کو
کے وجود کو فراموش کئے۔ دوسرے کی بیوی پر مرنے
لگے۔ جان چھڑکنے لگے۔ یہاں تک کے بعض سچی محبت اور
سچے عشق کا بھی دم بھرا کرتے۔
مسز دلدار کی جنت تعمیر ہو چکی تھی۔ ایسی جنت جس میں
وہ کسی حور سے بھی کم نہ تھی یہاں صرف پیار کی صندلی چاندنی
بکھرتی رہتی۔ ایک ایک ادا پر کئی کئی مر مٹنے کو تیار تھے۔
چوری چھپے الفت اور رازداری کے پینگ بڑھنے لگے۔
فون کی ان گنت گھنٹیاں بجتی رہتیں۔ بیگم دلدار نہ جانے
کن کن سے عاشقی کی زبان میں کیا کیا وعدے کیا کرتیں۔

گفتگو کا سلسلہ اتنا طویل ہوتا کہ شوہر کے اہم فون بھی محلے والے وصول کرتے اور اپنے ذکر سے پیغام بھجواتے وہ تو غرق ہوئی جا رہی تھیں۔ الفت کے نشیلے بھنور میں، زندگی میں ایسی حدیں بھی آ چکی تھیں کہ گھر کی ضرورتیں، بچوں کی نگہداشت اور شوہر کے نام و آبرو کی بھی انہیں پرواہ نہ رہی تھی۔ وارفتہ انسانوں کے قیمتی تحفے، سنہری زریں جڑی ہوئی بڑی بڑی پینٹنگس، دبیز مخملی قالین، فرنیچر، انگوٹھیاں بے مثال گلاب کے گلے اور نہ جانے کیا کیا تحفوں میں ملنے لگا۔ دلدار صاحب کی محبت پر اعتماد تھا۔ جیسے عام، شوہروں کو سدا اپنی بیویوں پر ہوا کرتا ہے یا خاص۔۔ بیویوں کا اپنے عام شوہروں کی بظاہر وفاداریوں پر مگر اب انہیں چڑ سی ہو گئی تھی۔ کہ عید برأت اور سالگرہ سے بھی بے نیاز رہنے لگے۔ نئی ساڑی تو بڑی چیز ہے۔ بلاوز کا ٹکڑا بھی تحفہ میں دینا بھول چکے تھے۔ گھر چلانے کے لئے ادنی، یونی تنخواہ پکڑا دیتے اور بس۔ حالانکہ منہگائی کو کوئی کریڈٹ چین نہ تھا۔ دلدار صاحب کا دفتر تو کلب ہی سے وابستہ رہ گیا تھا

جب رات گہری خاموشی میں سو جاتی پہاڑی کیڑے تڑپ تڑپ کے بے تکی سیٹیاں بجاتے اور بچھڑے پرندوں کی پکار فضاؤں میں پھیل جاتی تو ایسے وقت ان کے گھر سے لڑائی جھگڑے اور تو تو، میں میں کی آوازیں بلند ہو کر ہو کر وادی میں ڈوب جاتیں ایسے زبانی حادثوں سے درمیانی فاصلے کم ہوتے چلے گئے۔ وادی احمر کی ٹھنڈی بل کھاتی راہوں پر تیز تیز چلتے، چیختے، اور بھاگتے ہوئے وہ سائے اکثر دکھائی پڑتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے ہیڈلی چیز کے پراسرار ناولوں کے کردار اصلی روپ دھار چکے تھے۔

اس دلکش وادی کے مکین بھی جان گئے۔ عورتوں مردوں سے نہ جانے بات کہاں کہاں پھیل گئی۔۔ محفلوں۔ دعوتوں اور فیشن کی دلدادہ خواتین کے حلقوں میں بھی مسز دلدار کا وجود کھٹکنے لگا۔ صرف مروت کے مارے ہی انہیں بلا وا بھیجتے ورنہ، تغافل برتا جاتا۔ وہ دعوت کے باوجود ناخواندہ مہمان بھی جانے لگیں۔ خدا جانے وہ اب کہاں رہتی تھیں اور کس طرح گذر بسر کرتیں۔

ان کی زندگی کی گاڑی چوراستہ پر رک چکی تھی۔ اس کا ایکسل ٹوٹ گیا تھا وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہ کھسک سکتی تھی۔ وادی احمر کی سرد راہوں سے چیختے، چلاتے اور بھاگتے ہوئے وہ سائے آج بھی میری یادوں کے افق پر نقش ہیں۔

●● ———————

(انشائیہ صفحہ ۔۔ سے آگے)

اس کی زبان و بیان دونوں شاعرانہ ہوں کیونکہ انشائیہ کو ہر طور ادب لطیف ہونا چاہیئے۔ یہاں ادب لطیف سے مراد وہی طرز انشاء ہے جو وسعت علم، احساس شعریت اور حکیمانہ نزاکت خیال سے پیدا ہوتی ہے۔ لیکن اس میں زندگی اور زندہ دلی کا ہونا بھی لازمی اور ناگزیر ہے۔ اسی وجہ سے طنز و مزاح نگار اس صنف سے خوب فائدہ اٹھاتے ہیں۔ لیکن انشائیہ نگار اس سے جتنا بڑا ہوگا اسی قدر وہ انشائیہ کی ساری خصوصیات کا احاطہ کرے گا کیونکہ وسعت علم جب شگفتگی، شادابی اور زندہ دلی سے مرکب ہوتا ہے تو حکیمانہ نزاکت خیال کے دروازے خود بخود کھلنے لگتے ہیں اور احساس شعریت بھی جاگ اٹھتا ہے۔ ان سب کا امتزاج انشائیہ نگاری کی مثالی منزل ہے جس تک بڑی کوشش و کاوش کے بعد ہی پہونچنا ممکن ہے۔

محمد حفیظ الکبیر قریشی

شمالی امریکہ میں پہلی اُردو کانفرنس

غالب نے ایک جگہ لکھا ہے ؎

اثرِ آبلہ سے جادۂ صحرائے جنوں
صورتِ رشتۂ گوہر ہے چراغاں مجھ سے

خیال آفرینی اُردو بولنے والوں کو وراثت میں ملی ہے۔ جہاں ایک دو اہلِ ذوق مل بیٹھے، کوئی نہ کوئی ایسی صورت ضرور پیدا کر لیتے ہیں جس کی کوکھ سے شعر و ادب کی کونپلیں پھوٹنے لگتی ہیں۔ ویسے ادب و شعر کا شوق جب کسی کے ہاں رچ بس جائے تو وہ عادتِ ثانیہ بن جاتا ہے۔ اُردو شاعری کے رسیا مصافِ زندگی کی آزمائش کتنی ہی کڑی کیوں نہ ہو، تھوڑی فراغت پاتے ہی رزم گاہِ حیات کو محفلِ شعر گوئی میں تبدیل کر لیتے ہیں۔ اُردو زبان کا نشہ ہی کچھ ایسا ہے۔ اس لئے بھی کہ اُردو محض زبان ہی نہیں، ایک تہذیب بھی ہے اور معاشرتی قدر بھی جس سے اس کے افراد ایک ذہنی اور جذباتی وابستگی رکھتے ہیں۔ اور اس میں سرشار نظر آتے ہیں۔ ایسی مثال دوسری زبانوں کے بولنے والوں میں کم ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ اس وقت اُردو کے سلسلے میں جو جوش و خروش شمالی امریکہ میں نظر آتا ہے، اسے ایک نیک فال سمجھنا چاہیئے۔ ہمیں اس کا یقین ہے کہ اس کے بطن سے کار آمد نتائج ظاہر ہوں گے۔ مستقبل کے متعلق کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔ لیکن اس وقت حالات جو صورت اختیار کر رہے ہیں، اس کے پیشِ نظر ایسا لگتا ہے کہ شمالی امریکہ میں شاید یہ پودا جڑ پکڑ لے۔ یہاں ٹورانٹو میں ......

"انجمنِ اُردو" کا قیام کوئی چار سال پہلے عمل میں آیا ہے۔ اس قلیل عرصے میں اس کے کارکنوں نے ان تھک محنت اور حوصلے سے کام لے کر اُردو زبان کی آبیاری اور اس کی ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ اس کا سب سے پہلا فائدہ تو یہ ہوا کہ شمالی امریکہ میں ادبی ذوق و شوق کی لہر سی دوڑ گئی ہے۔

چراغ سے چراغ تو جلتا ہی ہے، یہاں پورے برِاعظم میں اُردو زبان کی ترقی و ترویج کا تقریباً ہر شہر میں کچھ نہ کچھ کام ہونے لگا ہے۔ اس سال انجمن نے اُردو کا جو چار روزہ جشن منایا ہے وہ ایک تاریخی مثال قائم کر گیا ہے۔ اس کانفرنس میں اس کے بعد ہونے والے مشاعرے اور مذاکرے میں بڑی کام کی باتیں ہوئی ہیں۔

سردار جعفری، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے ترقی پسند ادب اور جدید ادب پر بڑے معرکۃ الآرا مضامین پڑھے، جنھیں انجمن جلد ہی شائع کرنے والی ہے۔ اُردو غزل کا مسئلہ کافی الجھنوں کا شکار ہے اس پر جمیل الدین عالی نے بڑا سیر حاصل تبصرہ لکھا۔ مشاعروں کے آغاز اور ان کے چلن اور ان کی روایات پر منیب الرحمٰن نے تفصیلی مقالہ

میں کثرتِ ظہور سے نادیدنی ہوں جوشؔ
میں شدتِ وجود سے ناآفریدہ ہوں

سردار نے یہ بھی کہا کہ جوشؔ کی شاعری پر ہمارا کلاسیکی دور ختم ہو جاتا ہے۔ اور انہیں کی شاعری سے نیا دور بھی شروع ہوتا ہے۔

اس جلسہ میں احمد فراز بھی شریک تھے۔ ان کی رائے میں جوشؔ اس عظمت کے مستحق نہیں ہیں جس کا اعتراف اس جلسہ میں ہو رہا تھا۔ سامعین میں افتخار عارف بھی موجود تھے۔ جنہوں نے راقم الحروف سے ایک ہی جلسے میں جوشؔ کی عظمت کا اعتراف بھی کیا اور اس کے منکر بھی ہوئے۔ سامعین سے جو گفتگو ہوئی اس سے یہی تاثر ملا کہ جوشؔ اُردو زبان کے ایک بڑے کامیاب شاعر تھے۔ یہ دلچسپ محفل بڑی دیر تک چلتی رہی اور سامعین بھی باوجود پچھلے تین چار دنوں کی تھکان کے بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔

اس سال انجمن کے صدر بیدار بخت اور سکریٹری کرنل انور احمد، وائس پریذیڈنٹ کرشن ہاکسر تھے اور خزانچی طاہرہ چوہدری تھیں۔ ان کے یہاں سے چلے جانے کے بعد یہ ذمہ داری ہارون صدیقی کے سر آپڑی۔ کانفرنس کے روح رواں اور تنظیمی امور کے انچارج ڈاکٹر جمال نقوی رہے۔ ان حضرات کے علاوہ کانفرنس اور مشاعرے کی ترتیب و تہذیب میں جن لوگوں نے دامے درمے قدمے حصہ لیا اس کی فہرست طویل ہے لیکن ڈاکٹر جمال نقوی کی اعانت میں جو لوگ پیش پیش رہے ان میں صابرہ، زبیدہ، صبا اکرم، رشیدہ مرزا، ڈاکٹر عباس، سلام صاحب، جنید، اقبال خان اور رینا کی کوششوں کو کسی طرح نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ پوری کی پوری انجمن تن من دھن سے جٹی رہی۔ بیدار بخت، کرشن ہاکسر، ہارون صدیقی نے ڈنر دیئے۔ ان کے علاوہ پاکیزہ ماہنامہ کے اڈیٹر ترجیع الامنصور اور ان کی بیگم شہناز نے ایک شاندار ڈنر دیا۔ جس میں فیض احمد فیض، فراز، عالی، سردار، اور افتخار عارف تھے۔ پاکستان کی نامور شخصیت حکیم محمد سعید صاحب نے بھی شرکت فرمائی۔ اس ڈنر میں انجمن کی کارگزاریوں پر روشنی ڈالی گئی اور پاکستان کے ارباب حل و عقد سے درخواست کی گئی کہ وہ اُردو زبان کی ترویج و اشاعت میں انجمن کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ جمیل الدین عالی اور حکیم سعید صاحب نے اس سلسلہ میں اعانت کا وعدہ فرمایا۔ حکیم صاحب نے دوسرے دن کانفرنس میں بھی شرکت کی اور کانفرنس کے حسنِ انتظام اور سلیقہ کی تعریف کی اور زبان کے سلسلے میں یہ جوش اور ولولہ دیکھ کر سب ہی مہمان خوش ہوئے اور متاثر بھی۔ فضا میں ایک جشن کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ ہر طرف شعر و نغمہ کی یورش تھی۔ علم و ادب کے رسیا چاروں طرف سے کشاں کشاں چلے آ رہے تھے۔ مہمان شعراء، ادبا اور اہلِ ذوق حضرات کی یکجائی اور ہم آہنگی سے ٹورانٹو، عرفیؔ کے اس شعر کی تصویر بن گیا تھا۔

دوش در صومعہ آمد صنماں بادہ فروش
جام مے در بکف و زنار حمائل بردوش

اور اپنی یہ حالت تھی کہ ؎

میں صنم گوئی و مرملاں ہمہ در پا یا ہائے
من قدح نوش و مغاں نغمہ زن نوشا نوش

اُردو زبان و ادب کا یہ چار روزہ جشن اس اعتبار سے بھی مفید ثابت ہوا کہ شمالی امریکہ میں جن جن یونیورسٹیوں میں اُردو کی تعلیم یا اس کے تہذیبی موضوعات پر درس و تدریس کا انتظام ہے ان کے لئے یہ کانفرنس مہمیز کا کام کر گئی۔ خود ٹورانٹو یونیورسٹی کے ساؤتھ ایشین پروگرام نے اس زبان میں تعلیم دینے کے مسئلے پر سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا ہے۔ پروفیسر عزیز احمد مرحوم لکچر سیریز کے تحت انہوں نے پروفیسر بروس لارنس کو ڈیوک یونیورسٹی سے مدعو کیا۔ موصوف ہندوستان پاکستان کے علمی حلقوں میں تصوف پر اپنے عالمانہ تدقیق کی وجہ سے معروف ہیں۔ پروفیسر ملٹن اسرائیل کی ایک دعوت میں ان کے

بھی ملاقات ہوئی۔ مشائخ چشتیہ و فردوسیہ پیران کی کتاب نہایت دلچسپ ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ مغرب میں اسلامیات سے جو دلچسپی لی جاتی رہی ہے پہلے وہ عیسائی تعصب کی زبردست شکار تھی۔ اس کے بعد سیاسی عصبیت میں بدل گئی۔ لیکن اب ایسے آثار نظر آتے ہیں جیسے ایک خوشگوار موڑ آگیا ہے اور نقطۂ نظر بدل رہا ہے۔

اس کانفرنس اور مشاعرے میں شرکت کے لئے جن مہمان شعراء اور ادباء کو مدعو کیا گیا تھا۔ وہ ہماری زبان اور ادب کے بڑے نام ہیں۔ فیض، فراز، عالی، ادا، سردار جعفری، گوپی چند نارنگ، منیب الرحمٰن عصر حاضر کے نمائندہ لوگ ہیں۔ مشاعرے میں احمد فراز نے لوگوں کو بہت متاثر کیا۔ فراز کی شاعری میں موجودہ سیاسی صورت حال کی وجہ سے عجیب تیکھا طنز آگیا ہے۔ شاعری بنیادی طور سے جذبۂ اظہار کا ایک اسلوب ہوتی ہے۔ لیکن اگر اس میں احساس اور فکر بھی متوازن انداز میں شامل ہو جائے تو یہ دو آتشہ ہو جاتی ہے۔ ہماری جدید شاعری میں یہ انداز پیدا ہو رہا ہے۔ افتخار عارف نئی نسل کا شاعر ہے اور عصر حاضر کے مسائل کو شاعرانہ پیرائے میں پیش کرتا ہے۔ جمیل الدین عالی تو دوہوں کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ لیکن ان کی غزل میں تحت السطور جذبہ اور فکر کی آمیزش بڑے خوبصورت رنگ میں سموئی ہوئی ملتی ہے۔ ان کی دوسری خوبی یہ ہے کہ انہوں نے قومی اور ملی ترانے بھی لکھے ہیں اور قبولیت عامہ کا تاج ان کے سر پر رکھا گیا ہے۔ وہ عوام کے دلوں میں شاعر پاکستان کی حیثیت سے تخت نشین ہو گئے ہیں۔ ادا جعفری کے ہاں نسائی رنگ ہے محبت اور زندگی اور زندگی کے بدلتے ہوئے بڑے خوبصورت مرقعے ملتے ہیں۔ بعض نظموں میں شاعرہ کی نزاکت احساس بڑی منفرد ہے۔ سردار جعفری نے اکثر اور جوش کے آہنگ کی یاد تازہ کرتے ہیں۔

ان کی شاعری میں فکری انداز نمایاں ہے۔ سردار تقریر و تحریر دونوں دونوں ہی میں سرداری کرتے ہیں۔ اور نظم و نثر پر زبردست قدرت رکھتے ہیں۔

فیض سے متعلق اب مزید اور کیا لکھا جا سکتا ہے کہ عوام کے دلوں میں وہ اپنے وقت کے سب سے بڑے شاعر کی حیثیت سے براجمان ہو چکے ہیں۔ ان سے چھوٹی عمر کے لوگ انہیں پیر مغاں سمجھتے اور کہتے بھی ہیں۔ اب کی مرتبہ وہ یہاں آئے تو افتخار عارف کی زبانی ان کے متعلق ایک نیا خطاب سن کر خوشی ہوئی کہ نئی نسل کے شاعر انہیں محبت سے "بڑے میاں" کہنے لگے ہیں۔ مشاعرے میں بیروت کی خوں ریزی پر بڑی دلدوز نظمیں پڑھیں۔ کچھ پرانی نظمیں سنائیں۔ اس دفعہ وہ ٹورنٹو آئے تو بہت خوش گئے۔ کانفرنس سے بہت مطمئن اور بہت خوش تھے۔

شمالی امریکہ میں کئی اچھے شاعر آگئے ہیں۔ ان میں منیب الرحمٰن، حسین امام، نیر جہاں، مامون ایمن، مظفر شکوہ، حمیرہ رحمان، افتخار نسیم، حسن فاروقی، نزہت صدیقی، عرفانہ عزیز، طلعت اشارت، شاہین اور عبدالقوی ضیاء نے ہمارے مشاعرے میں شرکت کی۔

انجمن عنقریب کانفرنس اور مشاعرے کی تفصیلی روداد شائع کرنے والی ہے۔ شمالی امریکہ میں جو ادب لکھا جا رہا ہے اور جس نہج کی شاعری ہو رہی ہے اس پر بھی کام ہو رہا ہے۔ ◉

مغنی تبسم

غوث محمد کی زیبا نویسی

جناب غوث محمد کے مرقعات کی ۷، مئی ۱۹۸۳ء کو اُردو گھر میں ادارۂ ادبیات اور ادبی ٹرسٹ کی طرف سے ایک نمائش خوشنویسی کا اہتمام کیا گیا تھا اس موقع پر جاری کردہ فولڈر سے مندرجہ ذیل اقتباس شائع کیا جا رہا ہے۔ —— (ادارہ)

خطاطی مصوری کی طرح ایک فنِ لطیف ہے۔ حروف یوں تو آواز کے تحریری نشان ہوتے ہیں۔ اور وہ زبان کے ترسیلی مقصد کو پورا کرتے ہیں۔ لیکن مسلمانوں نے اسے ترسیل و ابلاغ تک محدود رکھنے کے بجائے ایک فنِ لطیف بنا دیا۔ اسلام میں شبیہ نگاری پر امتناع کی وجہ سے مصوری کے فن سے دلچسپی رکھنے والوں نے خطاطی کی شکل میں اپنے فنکارانہ اظہار کی تسکین کا سامان پیدا کر لیا۔ آغاز میں عربی زبان کے لئے جو خطِ کوفی استعمال کیا جاتا تھا اس میں کوئی حسن اور دلکشی نہیں تھی۔ آگے چل کر خطاطوں نے اس خط کو تزئینی انداز بخشا اور پھر نئے نئے خط ایجاد کئے جیسے نسخ، رقاع، ثلث، تعلیق محقق، ریحان، نستعلیق وغیرہ۔ ان کے علاوہ ان کے خالص تزئینی روپ خطِ طغرہ، خطِ گلزار، خطِ غبار، خطِ ماہی وغیرہ وجود میں آئے۔ عرصۂ دراز سے اس فن میں جمود طاری ہو گیا تھا۔ حالیہ برسوں میں ہندوستان اور پاکستان کے چند ممتاز خوش نویسوں اور مصوروں نے خطاطی کے تزئینی اسالیب کا احیاء کر کے ان میں نئی نئی اختراعات کی ہیں۔ ان میں ایک قابلِ ذکر نام صادقین کا ہے۔ جو بنیادی طور پر ایک مصور ہیں۔ اور انہوں نے خطاطی کو ایک میڈیم کے طور پر برتا ہے۔ اُردو گھر کے افتتاح کے موقع پر صادقین کے آرٹ کی نمائش کی گئی تھی۔ اُردو گھر کے اسٹیج کا سرنامہ صادقین کے موئے قلم کا شاہکار ہے۔ ادبی ٹرسٹ کے اٹھارویں سالانہ مشاعرے کے موقع پر اب اُردو گھر میں جناب غوث محمد کے آرٹ کی نمائش منعقد کی گئی ہے۔ جن کا شمار دورِ حاضر میں برصغیر کے ممتاز خوش نویسوں میں ہوتا ہے۔

جناب غوث محمد ۱۹۳۷ء میں سابق ریاستِ حیدرآباد کے ضلع عثمان آباد میں پیدا ہوئے۔ خوش نویسی کا ذوق انہیں ورثے میں ملا ہے۔ ان کے والد جناب خیر اللہ خان صاحب خطاطی کے فن میں مہارت رکھتے تھے۔ غوث محمد صاحب نے اس فن کے رموز و نکات اپنے والد سے سیکھے۔ ۱۹۵۲ء سے وہ کتابت کے پیشے سے وابستہ ہوئے۔ اور حیدرآباد سے شائع ہونے والے متعدد روزناموں، ہفتہ وار رسالوں اور ماہناموں میں کام کرتے رہے۔ ساتھ ہی ساتھ مختلف ادیبوں اور مصنفین کی کتابیں بھی لکھتے رہے۔ کچھ عرصہ محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ آندھرا پردیش سے وابستہ رہے بعد ازاں ادارۂ ادبیاتِ اردو میں قائم کردہ ترقی اردو بورڈ کے مرکزِ خوش نویسی میں ان کی خدمات حاصل کی گئیں۔ جہاں وہ سات برس تک بحیثیت استاد کارگزار رہے اور بے شمار طلبہ و طالبات کو اس فن کی تربیت دی۔

۱۹۶۵ء سے غوث محمد صاحب نے کتابت کے ساتھ ساتھ زیبا نویسی (خوش نویسی) کی طرف توجہ کی اور مسلمہ اور مروجہ خطوط کی تحریر کے نئے تزئینی طرز کے اختراع کئے۔ غوث صاحب کو نسخ، نستعلیق، ثلث اور تعلیق پر خاص مہارت حاصل ہے۔ انہوں نے ان خطوط کے بصری تاثر کو ملحوظ رکھتے ہوئے متناسب رنگوں کے امتزاج سے آیاتِ قرآنی، اشعار و اقوال کے بیش

اُردو نامہ

وقار خلیل

اُردو کی علمی، ادبی، تہذیبی خبریں

یکم مئی: مشہور شاعر جناب خیرات ندیم کے دائیں پیر کے نصف حصّہ کو گزشتہ دنوں آپریشن کے ذریعہ قطع کیا گیا تھا ان دنوں وہ اپنے گھر پر زیرِ علاج ہیں۔ ریاستی اُردو رائٹرس اور جرنلسٹ ویلفیر فنڈ کی طرف سے طبّی اعانت کے طور پر ایک ہزار روپے کا چیک مسٹر سرینواس لاہوٹی رکن ریاستی اُردو اکیڈیمی نے حوالے کیا۔

● جناب صلاح الدین اویسی یم. ایل. اے۔ و صدر کل ہند مجلس اتحاد المسلمین نے "دار السلام" میں اُردو کے مسئلہ پر اُردو اداروں اور تنظیموں کے سربراہوں سے تبادلۂ خیال کیا اور بتایا کہ ریاستی طور پر اُردو کا مسئلہ پیچیدہ صورت اختیار کر گیا ہے۔ ڈاکٹر ایس. اے. منّان (انجمن) مولانا حبیب عمر حسینی؟ جناب وقار الدین (رہنمائے دکن) جناب محمود انصاری (منصف) جناب حیدر ریاستو (اُردو اکیڈیمی) اور مجلس کے منتخبہ اسمبلی اراکین مسرز امان اللہ خان، باقر آغا اور افضل شریف نے شرکت کی۔ اور حکومت سے اُردو کے مسائل کے فوری حل کا مطالبہ کیا۔ اور ریاستی سرکاری زبان کمیشن میں اُردو نمائندہ کی شمولیت پر زور دیا۔

۲ ر مئی۔ جناب رتن راج سکسینہ صدر انجمن ترقی اُردو شہر حیدرآباد کی صدارت میں بمقام اُردو گھر انجمن کا سالانہ جلسہ منعقد ہوا، ریاست اور شہر میں اُردو کے تعلیمی مسائل کا اراکین نے جائزہ لیا اور حکومت کو ایک میمورنڈم دینا طے کیا۔ سالانہ انتخابات میں جناب سکسینہ کو دوبارہ صدر منتخب کیا گیا۔ مسرس سلام شاہدی، سری نواس ریڈی اور منظر حسین نائب صدور، غلام صادق الدین معتمد اور راحمد باشی شریک معتمد چنے گئے۔

● بزم جوہر کا ماہانہ مشاعرہ جناب نظیر علی عدیل کی صدارت میں ہوا۔ دہلی کے شاعر رادھا کرشن سہگل اور مسٹر راج سکسینہ مہمانانِ خصوصی تھے۔ ڈاکٹر راہی کو ان کے مجموعۂ کلام "دستک" پر اُردو اکیڈیمی کا ادبی انعام ملنے پر خیر مقدم کیا گیا۔ باقر منظور، کرید حقی، یوسف نظر، راجہ لال راجہ، فاروق شکیل، حبیب محوی، سہگل، عدیل اور راہی نے کلام سنایا۔

۳ ر مئی۔ انجمن جاں نثارانِ امام مظلوم کے زیرِ اہتمام چوتھے کل ہند مقاصدہ میں مہدی نظمی دہلی، رضوان الہ آبادی، باقر امانت خانی، راز عابدی، تقی عسکری، علی مقصود، ظہیر جعفری، قاسم شبیر، بہمن علی گوہر، رضا آفندی، اور کئی شعراء نے حصّہ لیا۔

● ادبی کتابوں کے ناشر مسرز حسامی بک ڈپو (مچھلی کمان، حیدرآباد-۲) نے مجروح سلطانپوری کے مجموعۂ کلام "غزل" کا خوبصورت جدید ایڈیشن اور مشہور فکاہی ادیب جناب مجتبیٰ حسین کے سفر نامۂ جاپان پر مبنی کتاب "چلو جاپان چلو" شائع کی۔

۵ ر مئی؛ عثمانیہ یونیورسٹی کی طرف سے محترمہ لئیق صلاح کو ان کے مقالہ "عہدِ ارسطو جاہ کی ادبی خدمات" پر پی. ایچ. ڈی. کی ڈگری کا مستحق قرار دیا گیا۔ ڈاکٹر لئیق نے ڈاکٹر سیدہ جعفر کی نگرانی میں یہ مقالہ تیار کیا۔

اس سے قبل موصوفہ کا مقالہ برائے ایم۔ اے "شمس الدین فیض، حیات اور کارنامے" چھپ کر ادبی حلقوں میں مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ چند ماہ قبل طنز و مزاح پر مشتمل کتاب "شگفتی سنانی" بھی منظر عام پر آچکی ہے۔ ڈاکٹر لئیق صلاح ان دنوں گلبرگہ یونیورسٹی کرناٹک میں لکچرار کے فرائض انجام دے رہی ہیں۔ "سب رس" اور ادارہ ادبیات اردو سے آپکا دیرینہ علمی ربط رہا ہے۔ ہم موصوفہ کو دلی مبارکباد دیتے ہوئے آرزومند ہیں کہ ادب اور تنقید سے اُن کا انہماک افزوں ہوگا۔

۶/ مئی: پروفیسر محمد اکبرالدین صدیقی نے خرابیٔ صحت کی بنا پر شعبۂ امتحانات ادارۂ ادبیات اردو کی معتمدی سے استعفیٰ دے دیا اور ڈاکٹر مغنی تبسم اور جناب محمد منظور احمد معتمد و شریک معتمد نامزد کئے گئے۔ پروفیسر صدیقی نے عرصہ تک اپنی علمی و تعلیمی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ادارہ کے اردو امتحانات کے باقاعدہ انعقاد اور ترقی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ جس کا اردو کے تعلیمی اور ادبی حلقوں میں اعتراف کیا جا رہا ہے۔

۷/ مئی: مرکزی وزیر قانون جناب پی۔ شیوشنکر نے ادبی ٹرسٹ اور روزنامہ "سیاست" کے زیر اہتمام اردو گھر میں منعقدہ غوث محمد صاحب کے فن خوشنویسی و خطاطی کی نمائش کا افتتاح کیا۔ اور ادارۂ سیاست کی طرف سے غوث محمد کو ۲ ہزار روپے نذر کئے اور اپنی طرف سے ۵۰۰ روپے کا عطیہ پیش کیا۔ جناب سید مکتر شاہ صدر ریاستی مجلس قانون ساز نے اس خوشگوار تقریب کی صدارت کی۔ جناب حسن الدین احمد ڈائرکٹر اردو اکیڈیمی نے جناب غوث محمد کے فن پر مقالہ پڑھا۔ جناب زاہد علی خان جوائنٹ ایڈیٹر "سیاست" نے مہمانوں کی شکرگزاری کی اور مسٹر یم۔ بللیا نے خیرمقدم کیا۔ یہ نمائش فن خطاطی سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے تین روز تک مرکز توجہ رہی۔

● ادبی ٹرسٹ کا ۱۸ واں ہند پاک منعقدہ مشاعرہ جناب پی۔ شیوشنکر کی صدارت میں ہوا۔ مرکزی وزیر داخلہ مسٹر پی۔ سی۔ سیٹھی نے افتتاحی کلمات کہے۔ اس مشاعرہ سے ۸۸ ہزار روپے کی آمدنی ہوئی، جسے اعلان کے مطابق ادارۂ ادبیات اردو کے ٹرسٹ کے لئے دیئے جانے کا اعلان کیا گیا۔ "سب رس" ماہ مئی ۸۳ء میں مشاعرہ کی رپورٹ شائع کر دی گئی تھی۔

۹/ مئی: انجمن عوامی مصنفین اور ارباب قلم کی طرف سے نامور شاعر اور سیاسی رہنما مخدوم محی الدین کے ۷۵ ویں یوم ولادت کے موقع پر ادبی و شعری محفل آراستہ ہوئی۔ جناب سید ہاشم علی اختر وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی، جناب نریندر لوتھر اور جناب اختر حسن پر مشتمل مجلس صدارت کے علاوہ پروفیسر معین احسن جذبی، مسٹر احسن علی مرزا، مسٹر کے۔ یلی۔ مہندرا، (یم۔ ایل۔ سی) مسٹر ایم۔ بی۔ طہ خان اور جناب کے۔ بی۔ لال نے خطاب کیا۔ نصرت محی الدین فرزند مخدوم نے نظم سنائی۔ جناب شاذ تمکنت کی صدارت میں مہمان شعراء جناب شان الحق حقی اور جذبی کے علاوہ راشد آذر، بانو طاہر سعیدہ، وقار خلیل، مضطر مجاز، رؤف خیر، رضا وصفی، حامد مجاز اور برق موسوی نے مخدوم کو نذرانۂ سخن پیش کیا۔ جناب قادر جاوید نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔

۱۴/ مئی: محفل خواتین کا ادبی و شعری اجلاس محترمہ سلطانہ شرف الدین احمد کی صدارت میں منعقد ہوا۔ شفیقہ قادری اور صدر جلسہ نے علی الترتیب نظامس اردو ٹرسٹ کی ادبی خدمات اور پاکستانی شاعرہ پروین شاکر کی نظموں پر مضامین سنائے۔ حفیظ النساء حزیں نے کہانی پڑھی۔ عظمت عبدالقیوم، مظفر النساء ناز اور حزیں نے کلام سنایا۔ وزیر النساء کارگزار معتمد نے کاروائی چلائی۔

● ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں جدید لہجے کے باشعور نئے شاعر جناب رضا وصفی کے ساتھ ایک خوشگوار شام کا انعقاد عمل میں آیا۔ پروفیسر سید سراج الدین نے صدارت کی۔

جناب اختر حسن مددگار معتمد ریاستی اُردو اکیڈمی، جناب مظفر مجاز اور جناب ابو الفہیم وحید علی خاں نے وجد کی شاعری پر مضامین سنائے۔ رضا وصفی نے اپنا کلام سُنا کر داد پائی۔ کینیڈا میں مقیم حیدرآبادی شاعر اور سائنس داں پروفیسر نور احمد شیخ نے بھی اس محفل میں شرکت کی۔ ڈاکٹر یوسف کمال نے نظامت کی اور شکریہ ادا کیا۔

۱۵ رمئی: حیدرآباد لٹریری فورم کی جانب سے جواں فکر شاعر جناب مظہر مہدی کے مجموعہ کلام "لا انتہا" کی رسم اجرا محترمہ خدیجہ عالم خوندمیری کے ہاتھوں انجام پائی۔ پروفیسر عالم خوندمیری، ڈاکٹر مغنی تبسم، بشارت علی بشارت، حسن فرخ اور صدر جلسہ جناب علی ظہیر نے مظہر کی شعری ذہانت پر اظہار خیال کیا۔ محفلِ شعر میں مہمان شاعر نور احمد شیخ کے علاوہ مغنی تبسم، تاج مہجور، رضا وصفی، مظفر مجاز، غیاث متین، رؤف خیر، مسعود عابد، طالب خوندمیری، علی الدین نوید، اور مظہر نے کلام سنایا۔ حسن فرخ نے شکریہ ادا کیا۔

۱۶ رمئی: دکن کے باکمال اور نامور سخنور حضرت سکندر علی وجد کا ۷۰ سال کی عمر میں بعارضۂ قلب اورنگ آباد میں انتقال ہوا۔ وجد کا شمار جامعہ عثمانیہ کے سپوتوں اور حیدرآباد کے مایۂ ناز شعراء میں ہوتا ہے۔ جناب حامد علی عباسی صدر ادارۂ ادبیات اُردو، ڈاکٹر سید عبدالمنان صدر ریاستی انجمن ترقی اُردو، حافظ ابو یوسف صدر ریاستی اُردو اکیڈمی نے تعزیتی بیانات میں حضرت وجد کو زبردست خراجِ عقیدت ادا کیا ہے۔ اور ان کی وفات کو اُردو شاعری کا نقصان بتایا ہے۔

۱۷ رمئی: اُردو دوست اور "سب رس" کے قدیم خریدار جناب عبید اللہ شریف رشتۂ لائبریری عثمانیہ یونیورسٹی نے ادارۂ ادبیات اُردو کے لئے ٹرسٹ کے قیام میں اعانت کی خاطر ۱۰۱ روپے کا عطیہ جناب عابد علی خاں بانی ادبی ٹرسٹ کے حوالے کیا۔

۲۱ رمئی: نفاست اُردو ٹرسٹ لائبریری کے اسٹیڈی سرکل حلقۂ ارباب ذوق کا ماہانہ اجلاس ڈاکٹر مغنی تبسم ریڈر شعبہ اُردو عثمانیہ یونیورسٹی کی صدارت میں ہوا۔ جناب مظفر مجاز نے جواں فکر اور ذہین شاعر رؤف خیر کے شعری مجموعہ "ایلاف" پر ادبی تبصرہ سنایا۔ محفلِ شعر میں غیاث متین، رؤف خیر، رضا وصفی، طالب خوندمیری، مصلح الدین سعدی، علی الدین نوید، مظہر مہدی، ڈاکٹر راہی، روشن خیال اور ستارہ صدیقی نے کلام سنایا۔ ابتداً حضرت سکندر علی وجد کی وفات پر جناب محمد منظور احمد معتمد حلقۂ فکر و نظر نے قرارداد تعزیت پیش کی۔ اور وجد کی شخصیت اور فن پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے خراجِ عقیدت ادا کیا۔

● ڈیموکریٹک یوتھ فورم کے زیرِ اہتمام جہیز کے خلاف ایک موضوعاتی مشاعرہ جناب امیر احمد خسرو کی صدارت میں منعقد کیا گیا۔ کنول پرشاد کنول، علی احمد جلیلی، رحمٰن جامی، صلاح الدین نیر، صادق نقوی، رئیس اختر، منیف الحسن خیال، منیر الزماں منیر اور عزیز النساء صبا نے نظمیں سُنا کر داد پائی۔ اسمٰعیل القادری کنوینر نے شکریہ ادا کیا۔

۲۲ رمئی: جناب پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی معتمد شعبۂ کتب خانہ ادارہ ادبیاتِ اُردو نے ادارہ کے مالیہ کے استحکام کو محسوس کرتے ہوئے ادبی ٹرسٹ کی طرف سے ٹرسٹ کے قیام کی اپیل پر از راہِ معارف نوازی ایک ہزار روپے کا عطیہ مرحمت کیا۔

● عثمانیہ یونیورسٹی میں روٹیشن سسٹم کے تحت ممتاز ادیبہ ڈاکٹر زینت ساجدہ صدر شعبۂ اُردو کے عہدہ پر فائز ہوئیں۔ موصوفہ نے ڈاکٹر غلام عمر خاں سے شعبۂ عہدہ کا جائزہ حاصل کر لیا۔ علمی و ادبی حلقوں میں ڈاکٹر ساجدہ کے صدر شعبۂ اردو ہونے پر خوشگوار ردِ عمل کیا جا رہا ہے۔

ماہنامہ "پونم" کے اعلان کے مطابق عنقریب اس کا خصوصی شمارہ "زینت ساجدہ نمبر" منظرِ عام پر آنے والا ہے۔

۲۳ رمئی: گولڈن جوبلی تقاریب
ادارۂ ادبیاتِ اُردو کے سلسلے میں ڈاکٹر زور کی ۵ کتابوں کے نئے جوبلی ایڈیشن شائع ہوئے جن میں دکنی ادب کی تاریخ، داستانِ ادب حیدرآباد، تاریخِ ادب اُردو، سیرِ گولکنڈہ اور تذکرۂ مخطوطات جلد دوم شامل ہے۔ ان کتابوں کی اشاعت کے لئے نظامس اُردو ٹرسٹ نے مالی اعانت منظور کی تھی اور یہ کتابیں پروفیسر محمد اکبرالدین صدیقی کی نگرانی میں طبع ہوئیں۔ مرکزی وزارتِ تعلیم کی اعانت سے تذکرۂ مخطوطات ادارہ جلد ششم مرتبہ محمد اکبرالدین صدیقی صاحب و ڈاکٹر محمد علی اثر کی اشاعت بھی اس دوران عمل میں آئی۔ اُردو امتحانات کے نصاب میں شامل دو کتابیں مولانا ابوالکلام آزاد و قارِ خلیل اور شوکتِ نظم مرتبہ سیدہ مہدی جعفری کے نئے ایڈیشن بھی ادارۂ ادبیاتِ اُردو نے شائع کئے ہیں۔

● اسمار اُردو ماڈل اسکول واقع قلعہ گولکنڈہ کا جلسۂ سالانہ و تقسیمِ انعامات کا انعقاد بصدارت جناب منوہر راج سکسینہ عمل میں آیا۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر ریڈر شعبۂ اُردو عثمانیہ یونیورسٹی کے علاوہ منظور ظفر اور میر اعظم علی نے اس مثالی درسگاہ کے طریقۂ تعلیم کی ستائش کی۔ جناب غلام صادق الدین بانیٔ اسکول نے رپورٹ سنائی۔ محترمہ فوزیہ بیگم نے خیرمقدم کیا اور محترمہ طاہرہ بیگم انچارج نے شکریہ ادا کیا۔

۲۴ رمئی: ادبستانِ دکن کا ادبی اجلاس اُردو گھر میں بصدارت ڈاکٹر راج بہادر گوڑ منعقد ہوا۔ ڈاکٹر مجید بیدار نے سراج اورنگ آبادی پر مقالہ، جناب محمد منظور احمد نے امجد حیدرآبادی پر مضمون اور جناب احسن علی مرزا نے سکندر علی وجد کے فن اور شخصیت پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ شعری نشست جناب علی احمد جلیلی کی صدارت میں آراستہ ہوئی۔ شمس الدین تاباں، وقار صدیقی، روحی قادری، مضطر مجاز، محمد منظور احمد، ڈاکٹر یوسف کمال، ڈاکٹر راہی، جیلانی بیگ صادق، خلیل عمرانی، رؤف رحیم، داؤد نصیب، اسمٰعیل ظریف، اختر واجدی، نذیر نیر، حفیظ ساکت اور دلاور علی خان نے کلام سنایا۔ یحییٰ جمیل نے شکریہ ادا کیا۔

۲۹ رمئی: اُردو مجلس کا ماہانہ ادبی اجلاس ڈاکٹر زینت ساجدہ صدر شعبۂ اُردو عثمانیہ یونیورسٹی کی صدارت میں بمقام اُردو ہال منعقد ہوا۔ جناب طیب انصاری پرنسپل گورنمنٹ کالج گلبرگہ نے "اُردو تہذیب کا نمائندہ شاعر وجد" کے زیرِ عنوان مضمون سنایا۔ ابتداً جناب صلاح الدین نیر معتمد اُردو مجلس نے حضرت وحید کی وفات پر قرار دادِ تعزیت پیش کی۔ محفلِ شعر میں شمس الدین تاباں، ضیا النساء حتینی، رؤف رحیم، منیرالزماں منیر اور صلاح الدین نیر نے کلام سنایا۔ انجمن ترقی اُردو اور اُردو مجلس کی طرف سے ڈاکٹر زینت ساجدہ کو شعبۂ اُردو کی صدارت پر متمکن ہونے کی مسرت میں مبارکباد پیش کی گئی۔ ●

بقیہ ص ۳۷ سے آگے......

مرقعے تیار کئے ہیں۔ اپنے مرقعوں کے پس [illegible] میں کبھی گہری یک رنگ سطح سے کام لیتے ہیں کبھی "ابری" کے نقوش پر حروف و کلمات کی اس طرح تزئین کرتے ہیں کہ متن کی [illegible] اور معنویت ابھر آتی ہے۔ صادقین کی [illegible] دار اور قوس نما تحریر کے برخلاف غوث محمد صاحب کے حروف بالعموم [illegible] اور مستطیل نما ہوتے ہیں۔ غوث صاحب نے تزئینی خطوط مثلاً معکوس، غبار اور [illegible] میں بھی اختراعات کی ہیں۔ غوث محمد [illegible] کی زیبانویسی (خطاطی) کی منفرد خوبی [illegible] تنوع ہے۔ ان کا ہر مرقع جداگانہ [illegible] رکھتا ہے۔ اصول و قواعد کے مطابق [illegible] مشق و مہارت کے ذریعہ ممکن ہے لیکن وصف کو شانِ خط کہا جاتا ہے وہ ایک قدرت ہوتی ہے۔ غوث محمد صاحب کے

Regd. No. HD 134

The "SABRAS" Urdu Monthly

Organ of Idara-e-Adabiyat-e-Urdu, Aiwan-e-Urdu, Hyderabad 500 004 A. P.

National Fine Printing Press, Charkaman, Hyd

سن اجراء: ۱۹۳۸ء فون نمبر ۳۸۴۶۹

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

ماہنامہ

حیدرآباد

مدیر اعزازی مغنی تبسم

معاون مدیر وقار خلیل

جلد (۳۴) جولائی سنہ ۱۹۸۳ء شمارہ (۷)

قیمت فی پرچہ ۲ روپے ۲۵ پیسے

ادارۂ ادبیات اردو، پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد ۴

زر سالانہ بیرونی ملکوں میں

۲۵ روپے ہوائی ڈاک سے بحری ڈاک سے

کتب خانوں سے مشرق وسطی ۱۰ ڈالر ۴ ڈالر

۳۰ روپے امریکہ ۱۲ ڈالر ۶ ڈالر

بذریعہ رجسٹری ۴۵ روپے

پاکستان، برما، سیلون ۸ ڈالر ۳ ڈالر

انگلستان ۷ پونڈ ۳ پونڈ

ترتیب

سید علی اکبر ایڈیٹر، پبلشر، پرنٹر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چار کمان میں چھپوا کر حیدرآباد ۵۰۰۰۰۴ سے شائع کیا

اپنی بات

بزرگ دانشور اور ماہر تعلیم پروفیسر سید علی اکبر صاحب کا ادارۂ ادبیاتِ اُردو سے دیرینہ تعلق رہا ہے۔ آپ کی رہبری اور مشوروں کا فیضان ہے کہ ادارہ کے اُردو امتحانات جو کبھی ریاستِ حیدرآباد کے اضلاع تک محدود تھے اب شمال اور جنوب تک پھیل گئے ہیں۔ بحیثیت صدر ادارہ، پروفیسر سید علی اکبر صاحب نے ڈاکٹر زورؔ کے بعد ادارہ کے امیج کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ ادارہ کے سابق معتمدِ اعزازی جناب سید ہاشم علی اختر (آئی اے ایس) حال وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی اور دیگر رفقائے ادارہ کے تعاون سے ۱۹۸۲ء میں ادارہ کی مہتم بالشان گولڈن جوبلی تقاریب کا اہتمام کیا۔

گزشتہ دنوں صاحبِ موصوف نے اپنی پیرانہ سالی کے پیشِ نظر ادارہ کی صدارت سے سبکدوشی اختیار کی اور مجلسِ انتظامی ادارہ نے جناب حامد علی عباسی سابق معتمد فینانس حکومتِ حیدرآباد کو نیا صدر منتخب کیا اور کرسیٔ صدارت سے مجلسِ انتظامی نے پروفیسر سید علی اکبر کی گرانقدر خدمات کو ایک قرارداد تہنیت کے ذریعہ خراجِ تحسین ادا کیا۔ مجلسِ انتظامی نے طئے کیا ہے کہ پروفیسر سید علی اکبر صاحب کی خدمات کے اعتراف میں ادارہ کی طرف سے ایک نمائندہ جلسۂ تہنیت منعقد کیا جائے اور انکی جناب میں "مومنٹو" نذر کیا جائے۔ جناب رمن راج سکسینہ جنھیں مجلس انتظامی ادارہ نے نیا معتمد عمومی منتخب کیا ہے، اس جلسۂ تہنیت کا کنوینر مقرر کیا ہے۔ جناب سید ہاشم علی اختر سابق معتمدِ ادارہ کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے انہیں نائب صدر ادارہ کے عہدہ کا پیشکش کیا گیا، جسے موصوف نے قبول کرکے اپنی روایتی ادارہ شناسی اور ادب دوستی کا ثبوت دیا ہے۔ ادارہ کی مجلسِ نظماء نے ڈاکٹر مغنی تبسم کو شریک معتمد ادارہ اور ادارہ کے شعبۂ امتحانات کا معتمدِ اعزازی منتخب کیا۔ ادارہ کے شعبۂ امتحانات کو فعال اور کارکرد بنانے میں دکنیات کے محقق اور بزرگ ادیب جناب محمد اکبرالدین صدیقی نے سابق میں بے لوث خدمات انجام دی ہیں۔ ڈاکٹر تبسم سے اُردو دنیا اور تعلیمی اُفق خوش آئند توقعات رکھتا ہے، یقین ہے وہ اپنے تجربہ کی روشنی میں ادارہ کے اُردو امتحانات کو ہر لحاظ سے باضابطہ بنائیں گے۔

ادارہ کے امتحانات اُردو فاضل اور اُردو عالم کو بہت پہلے عثمانیہ یونیورسٹی نے تسلیم کرلیا ہے، ان کے ساتھ ساتھ ابتدائی امتحانات اُردو دانی اور زبان دانی بھی ہیں۔ اب یہ امتحانات ۸ تا ۱۱ اکتوبر ۱۹۸۳ء کو آندھرا پردیش، کرناٹک اور مہاراشٹرا نیز دہلی کے مرکزوں پر منعقد ہوں گے۔

مجلسِ مشاورت "سب رس" نے پروفیسر سید علی اکبر کی تدریسی، علمی اور قومی خدمات پر خصوصی شمارہ شائع کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔ اُردو دوستوں کے اشتراک سے ہم اس مشن میں انشاء اللہ کامیاب رہیں گے۔ ●●

وقار خلیل

وحید اختر

غزل کی مضبوط آواز

(خطرہ گزر سے نمو کی آگ تک)

سیاسی انقلاب کے ساتھ حیدرآباد کی تہذیبی بساط بھی الٹ گئی۔ ایک جیتی جاگتی تہذیب کی برہمی محض معاشی سماجی رشتوں کی چند تبدیلیوں ہی سے عبارت نہیں ہوتی، لاکھوں، کروڑوں افراد کی ظاہری اور داخلی زندگیوں میں بھی انقلاب لاتی ہے۔ ریاست حیدرآباد کا آزاد جمہوری ہندستان میں انضمام، سیاسی لحاظ سے لاکھ خوش آئند اور ناگزیر سہی، صدیوں کے خون سے سینچے ہوئے معاشرے اور اس کی اقدار اور اس سے وابستہ زندگی کے لیے پیغام اختتام بھی تھا۔ نئے نظام کے خواب دیکھنے والے جد و جہد کی گرما گرمی اپنے ماضی سے گہری وابستگی کو بھولے رہتے ہیں، لیکن جب وہ خواب حقیقت میں ڈھل جاتے ہیں تو ماضی کی جڑیں جو ہماری رگ رگ میں دور تک پیوست ہوتی ہیں اپنے اکھڑنے اور ٹوٹنے کے عمل میں روح و دل کو لہولہان کر دیتی ہیں۔ شاعر اور ادیب تہذیب سے زیادہ مضبوطی کے ساتھ جڑے ہوتے ہیں، اسی لیے تبدیلی و انقلاب کی یہ کشاکش ان کے اندر شدید تر ہوتی ہے۔ کوئی تہذیب اپنی ہی زمین پر اپنی بقا کے لیے بدلے ہوئے حالات میں نئی صورت نکال سکتی ہے یہ کوشش نشاۃ ثانیہ کا ایک اظہار بن جاتی ہے۔

حیدرآباد کی زبان و تہذیب نے نشاۃ ثانیہ کی یہ راہ خود اپنی ہی زمین پر نکالی اس زندہ اور توانا، شائستہ اور پرتکلف وسیع النظر اور روادار، رندمشرب اور صلح کل تہذیب نے جیسے فشار قبر کے دوران ایک نئی کروٹ لی۔ اور اس فشار کے عمل سے اردو کے نئے ادیبوں، شاعروں، دانشوروں اور محققوں کی ایک نئی فصل ابھری۔ ۵۰ء سے ۶۰ء تک کے دس سال حیدرآباد کی ادبی زندگی میں بڑی ہمہمی، تخلیقی جوش، نئی آوازوں کی پرورش اور نئے شعلوں کی تربیت کے سال تھے وہ بساط تہذیب جسے انقلاب زمانہ الٹنے پر مصر تھا، اپنی زندگی پر نئے سرے سے اصرار کر رہی ہو ہزیمت خوردہ ذہنوں فریب خوردہ خوابوں اور سراب گرفتہ ذہنوں کے سنسان بے آب و گیاہ جنگل میں جہاں ایک طرف ایام رفتہ کا ماتم ہو رہا تھا، وہاں تخلیقی آوازیں اسی زبان و تہذیب کی حیات تازہ کا جشن منانے کا اہتمام کر رہی تھیں۔ یہ شکست کا عجیب ردعمل تھا۔ اسی نے بکھرتے ہوئے شیرازے کو از سر نو بہم کیا۔ وہ آئینہ خانہ، جو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پرانے مانوس چہرے سے بچھڑ کر تاریک و ویران ہو جائے گا۔ اسے نئے چہروں کی آب و تاب نے پہلے سے کچھ زیادہ ہی روشن و آباد کر دیا۔ ماضی سے جدید کا سفر سیاسی انقلاب سے سخت تر اور زیادہ بے رحم نکلا۔ نئی آوازوں تک یہ پہنچ کر ہوا اسے معاشرے میں ایسے

بکھرے کہ اطراف و اکنافِ ہند ہی میں دور دور اُڑتے نہیں پھرے، سرحد کی دوسری طرف بھی پہنچے اور سات سمندر پار بھی ——
لیکن یہ جہاں گئے اپنی زمین کی قوتِ نمو، اپنی تہذیب و زبان کا جوشِ تخلیق ساتھ لے گئے —— ان آوازوں نے اپنے شہر
کی تہذیب کے آئینہ خانے کو اتنا منور کر دیا تھا کہ پھر آئینہ خانہ بجھ نہ سکا۔ گم گشتہ چہروں کی جگہ نئے نئے چہرے اور دور افتادہ
آوازوں کی جگہ قریب کی آوازیں ان کی جگہ لیتی جا رہی ہیں۔

ان ہی آوازوں میں جنھوں نے حیدرآباد کی تہذیب کے نشاۃ ثانیہ کا چراغ ہوائے انقلاب کی تیزی و تندی میں
روشن رکھا تھا ایک نمایاں اور تازہ کار آواز اکبر کی تھی۔ غزل بجائے خود ایک مکمل تہذیب ہے اکبر کی اپنی تہذیب سے
گہری وابستگی غزل کی تہذیب گر، تہذیب نواز قوت بن کر اسی دور میں ابھری —— ترقی پسندی غزل گریزی کے بعد اپنے رویّے
پر نظرِ ثانی کر کے اب پھر غزل کی طرف رجوع کر رہی تھی۔ فیض کی دستِ صبا اور پھر زنداں نامے کی غزلیں گلشن کی طرز
غنائی ٹھہر رہی تھیں۔ ترقی پسند غزل کا اپنا منفرد لہجہ، مخصوص لفظیات اور نئے تلازمے و استعارات سے تشکیل پا چکا تھا
اس دور کے تمام نو واردانِ بساطِ شعر و ادب کی طرح اکبر بھی ترقی پسندی ہی کی راہ سے اس میدان میں داخل ہوئے
ابتدا سے ان کے یہاں وہ پختگی اور رچاؤ تھا جو برسوں کی ریاضت کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ اس کا سبب شاید یہ ہو کہ
انھوں نے ایسے گھرانے میں ادبی ہوش سنبھالا جس میں ادب رچا بسا تھا۔ کئی سال بعد ۱۹۷۱ء میں ان کے پہلے مجموعۂ
کلام "خطِ رہگزر" پر لکھتے ہوئے سجاد ظہیر نے سادگی و سلاست اور حلاوت کے ساتھ ان کی غزل میں اس روحِ عصر کا
احساس ہوا جو "روحانی" "ذہنی اور نفسیاتی کیفیات کا عکس ہے، جو انسان کے انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی زندگی کو زیادہ
معنی خیز، زیادہ باخبر اور لطیف تر اور روشن تر بنانے کی کد و کاوش کے دوران پیدا ہوتی ہے۔"

خطِ رہگزر کی ابتدائی ۳۲ غزلیں ان کے قیامِ حیدرآباد کی یادگار ہیں جن میں سے بیشتر ترقی پسندی کے مروّجہ لہجہ
کی نمائندگی کرتی ہیں۔ اُس وقت حیدرآباد میں شاہد صدیقی ایک کہنہ مشق، خوشگوار اور مقبول شاعر تھے جن کی زندگی محدود
اور استعارات مخصوص تھے۔ اکبر کی اس دور کی کئی غزلوں میں شاہد کی آواز کی بازگشت ملتی ہے جسے شاہد کی آواز
کے آشنا صاف پہچان سکتے ہیں۔ بتلائیے یہ اشعار ؎

حادثاتِ پیہم کی زد میں رہ کے بھی دل نے — تیرے خواب دیکھے ہیں تیرے گیت گائے ہیں
آندھیوں نے قسمت کی اک دیا بجھایا جب — حوصلوں نے انساں کے سو دیئے جلائے ہیں
جنھیں تھا انتظارِ موسمِ گل — انھیں ہاتھوں میں پیمانہ نہیں ہے

اکبر کی اس دور کی غزلوں میں ترقی پسندی کا چہرہ صاف جھلک رہا ہے —— یہی نہیں انگلستان جانے کے بعد بھی
[illegible] تک بھی ان کا غالب لہجہ رہا۔ وہ خود اعتراف کرتے ہیں:۔

"تغزل اور رومانیت کے ابتدائی دور کے بعد جب میری شاعری احساس و شعور کی منزل تک پہنچی تو اس وقت کی
ادبی تحریکوں کے اثر قبول کیے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ ادب میں اشتراکی رجحانات کا زور تھا۔ اشتراکی اور

مارکسی نظریات محض سیاسی نہیں ان میں زندگی کا ایک وسیع نظریہ موجود ہے اور سینکڑوں اقدار ایسی ہیں جنھیں ذہن فلسفے کے طور پر قبول کرلیتا ہے۔"

لیکن وہ یہ بھی مانتے اور جانتے تھے کہ اس یقین و ایمان کی منزل پر بھی داخلی کرب، احساس شکست اور اندوہ و غم کی پرچھائیاں ان کے ساتھ لگی تھیں۔ وہ تغزل اور رومانیت جسے وہ بزعم خود پیچھے چھوڑ آئے تھے کہیں کہیں اب بھی چمک اٹھتی تھی سے

کچھ خبر تو ہے کہ ہر تمنا — کروٹ سی بدل کے سو گئی ہے
غم دوراں حقیقت ہے تو اکبر — غم جاناں بھی افسانہ نہیں ہے

انتظار شب وعدہ یہ بھی موقوف نہیں — یہ قیامت تو دل زار پہ اکثر گذری
ہائے وہ صبر شکن آخری فرقت کی گھڑی — جو کبھی وصل کی ساعت سے بھی دشوار گذری

اسی کے ساتھ ان کے یہاں تغزل کا وہ شوخ رنگ بھی اس دور میں ملتا ہے جو حسرت کی عاشقانہ شاعری اور مخدوم کی رومانی نظم کی یاد دلاتا ہے۔

اکبر اس کے بعد بھی برسوں روایت کے پیچ در پیچ نہ خانوں کی بھول بھلیاں میں احساس جلاوطنی اور ہم عصر عہد کی سفاک حقیقتوں کے شعور کی شمع لیے دور تک سرگرداں نظر آتے ہیں —— ان کی جستجو کا شعلہ بہت زیادہ اونچا نہ سہی روشن و سرگرم سفر ضرور نظر آتا ہے۔ اس دھیمے پن کے لیے شاعر کا عذر قابل لحاظ ہے سے

ہے دور جہد کہاں فرصت سخن اکبر — روانی طبع میں مشق سخن سے آتی ہے

ترک وطن سے قبل کا کچھ عرصہ اور اس کے بعد کے کئی برس ان کے اشعار میں الفاظ کے پیچھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اندرونی کشمکش اور کسی بڑے روحانی یا رومانی حادثے پر غالب آنے کی کوشش میں گزر گئے۔ وہ شعر کو شاید اس سخن ناگفتنی کا پردہ بنانے سے بھی گریزاں رہے ہیں —— اس حادثے کا سراغ ان شعروں میں ملتا ہے سے

کیا کہیں زیست ترے ہجر میں کیوں کر گزری — مستقل ایک قیامت تھی جو دل پر گزری
گزر چکا ہوں زندگی میں اس کڑے مقام سے — جہاں تمہاری یاد بھی ہم سفر نہ ہو سکی
فصل دیوانگی بیتی تو وہ رشتے ٹوٹے — تھی کبھی دست و گریباں میں شناسائی سی

ہجرتیں ہمارے عہد کا مقدر رہیں۔ بیسویں صدی کے دوسرے نصف نے ہجرتوں کے اتنے قافلے دیکھے ہیں کہ شاید چشم فلک نے پوری انسانی تاریخ میں بیک وقت اتنے جلاوطنوں کو شمار نہ کیا ہوگا۔ ہجرتوں کا یہ لامتناہی سلسلہ کسی نئے عقیدے کی اشاعت کا ایقان خیز سفر نہیں۔ بے یقینی، تذبذب، خوف اور اندیشوں کی بے سروسامان دشت پیمائی ہے دشت کی جگہ انسانوں کے گنجان جنگلوں نے لے لی ہے۔ جہاں ہجوم میں سب ایک دوسرے سے ناآشنا ہیں۔ حاشیائی ثقافتوں کے گلستان ہجرتوں کے اس بے کراں صحرا میں جگہ جگہ ابھر آئے ہیں۔ مجھے کو یہ بھی سمجھا سکتا ہے کہ ہمارے دیس کی معیشت کے جبر کے ہاتھوں جلاوطن ہونے والوں کے توسط سے دور دیسوں میں بھی ہماری ثقافت اپنی جڑیں پھیلا رہی ہے ۔ لیکن

اجنبی زمینوں میں جڑ پکڑنے کی یہ کوشش کتنی جاں گداز اور صبر آزما ہے اس کا اندازہ انہی کو ہو سکتا ہے جو غیر ملک غیر تہذیب، غیر زباں کے دشمن ماحول میں اپنی ثقافتی شناخت قائم رکھنے پر مصر ہیں۔

کسی اجنبی تہذیب و معاشرہ میں خود کو سمونے کے لیے عمریں نہیں نسلیں درکار ہوتی ہیں۔ اکبر نے اس سعی لاحاصل کی جگہ اپنی تہذیبی شناخت کو بیگانہ ماحول میں برقرار رکھنے کی کوشش کا انتخاب کیا۔ اس عمل میں ترقی پسندی اور مارکسزم کے تصورات نے کچھ دور تک ان کا ساتھ ضرور دیا۔ خطرہ گزر کی غزلوں اور نظموں میں انسان کی وحدت اور اس کی سعیِ فلک گیر کی فتح مندیوں پر ایمان مستحکم نظر آتا ہے ـــــ لیکن شاید یہ تصورات سہارا بنتے ہوئے بھی کافی ثابت نہ ہوئے۔ انھیں تلاشِ ذات کے معصومانہ تجربے سے بھی روح کی گہرائی میں گزرنا پڑا ـــــ تلاشِ ذات آج ادبی تنقید اور شعری محاورہ کی جنس با افتادہ اور نئی مہمی اصطلاح بن گئی ہے ـــــ اکبر جو ہندو پاکستان کے ادبی ماحول اس کی بحثوں اور اصطلاحوں سے بہت دور اور بڑی حد تک بے خبر بھی رہے، فیشن زدگی کی رو میں ذات یا عرفانِ ذات کا ورد نہیں کرتے۔ ان کے یہاں یہ الفاظ تو ان کے اپنے گہرے اور سچے روحانی تجربے سے عبارت ہیں شعر میں معتبر اور نامعتبر کی کوئی کسوٹی بجز ذوقِ سلیم کوئی اور نہیں ـ اسی کسوٹی پر کسا جائے بشرطیکہ یہ ذوق شوقِ تنقید بعد سے عطا بھی ہوا ہو تو اکبر کے تجربے کی سچائی اور معتبری کا احساس ہونا لازمی ہے ؎

انتظار اپنے لیے تھا، انتشار اپنے لیے　　پاس کا صحرا، سمندر پاس کا ہم بھی رہے
جسم کے ظلمت کدے میں صورتِ قندیلِ ذات　　سینکڑوں پردوں میں رہ کر برملا ہم بھی رہے

پیچ نہ ہوا راستا خم سا کبھی ایسا　　گنجان نہ تھا دشتِ تمنا کبھی ایسا
خوف آتا ہے ہر حادثہ مانوس سے ہم کو　　کس شہر پہ تھا سایہ صحرا کبھی ایسا
بجلی کوئی اعصاب سے ہوتی ہوئی گزری　　چمکا نہ تھا آزار کا شعلہ کبھی ایسا

وابستہ یوں تو ہم سے زمان و مکاں رہے　　سب کچھ ہمارے ساتھ رہا ہم کہاں رہے
ہستی کو ہم نے ڈھونڈ نکالا تو گرنہ جسم　　اک جنسِ نارسا کی طرح رائگاں رہے

ہے کدھر میری زمیں کس سمت میرا آسماں　　کیسے ہالے ہیں مجھے ہر سمت سے گھیرے ہوئے

تھا تصور اس کو فقط اسی ہی گہرائی کا　　وہ سمندر کہ سمجھتا رہا پایاب مجھے

میں بھٹکتا ہی رہا نیند کے صحراؤں میں　　رات لے جس سمت نہ لوٹائے مرے خواب مجھے

نکہت و رنگ کے مانند سمن زاروں میں　　ہم بھی موجود کوئی ڈھونڈنے والا نہ ملا

میں ناگہاں کے طلسمات کا سمندر ہوں　　ہے موج موج مری حادثات کے مانند
یہ آج اس پہ عجب فرصتوں کا سحر ملا　　وہ کھلتا جاتا ہے اسرارِ ذات کے مانند

برچھیاں غم کی لیے قاتل ہوا ہے اور ہم　　ہر طرف اک منظرِ دشتِ فنا ہے اور ہم

ہے اور یہی ان کی انفرادیت ہے — فطرت سے قربت ہی نہیں بلکہ یک جان ہونے کا یہ احساس ان کے اشعار میں بہت نمایاں ہے جسے ہم نئی حسیت کا متصوفانہ تجربہ بھی کہہ سکتے ہیں ؎

اس کاروبارِ جان و جسد پر نگاہ رکھ　　ہیں کیسی کیسی نعمتیں آب و ہوا میں دیکھ
سُن تو خرامِ وقت میں ہیں کیسی آہٹیں　　کیا رنگ پر فشاں ہیں غبارِ ہوا میں دیکھ

میں ڈوبتا رہا نسیان کے سمندر میں　　مری تلاش میں صحرائے صبح و شام رہا
وہ بے کنار سمندر رہا ہم کنار مگر　　میں ایسا دشتِ طلب تھا کہ تشنہ کام رہا

ریگ زاروں کے دلوں کی دھڑکنیں　　سن رہے ہیں نغمۂ دریا میں ہم

اسی مٹی سے تو ابھرے ہیں خد و خال اپنے　　معنی و حرف کا رشتہ ہے جہاں سے اپنا
نفس کو شلِ نفس ہم نے سبک جانا تھا　　دب گیا جسم اسی بارِ گراں سے اپنا

اور اس سے یہ والہانہ عارفانہ نغمہ پیدا ہوتا ہے ؎

زندانِ صبح و شام میں تو بھی ہے میں بھی ہوں　　اک گردشِ مدام میں تو بھی ہے میں بھی ہوں
بے فرش و بام سلسلۂ کائنات کے　　اس بے ستوں نظام میں تو بھی ہے میں بھی ہوں
بے سال و سن زمانوں میں پھیلے ہوئے ہیں ہم　　بے رنگ و نسل نام میں تو بھی ہے میں بھی ہوں
اس دائمی حصار سے راہ مفر کہاں　　ذرّوں کے اژدہام میں تو بھی ہے میں بھی ہوں
تیرے، مرے بکھرنے سے ہے سارا انتشار　　ترتیب و اہتمام میں تو بھی ہے میں بھی ہوں
میرا زیاں بھی تیرے زیاں سے ہے منسلک　　خوابوں کے انہدام میں تو بھی ہے میں بھی ہوں

یہ نئی حسیت کی آفاقیت ہے جو اُن سے کہلوا رہی ہے ؎

نہ صداؤں کا ہے وطن کوئی، نہ ہواؤں کا ہے کوئی صتن

ہمیں ہر روش ہمیں ہر جہت، نہ جنوب ہم نہ شمال ہم
یہ ہوا، یہ آگ، یہ آب و گِل ہیں علامتیں ہی علامتیں
کہ تسلسلِ شب و روز میں فقط ایک حرفِ سوال ہم

اکبر کے یہاں اس حسیت نے فنا کے احساس کو منفی، شکست خوردہ تجربہ بننے نہیں دیا۔ محدودیت کا احساس ان کے یہاں لامحدود و بے زماں سے رشتہ استوار کرنے کی ملکہ بن گیا ہے۔ جدید حسیت کا منفی پہلو تو ہماری شاعری میں عام ہے، لیکن اس کا یہ اثباتی رُخ جتنا اکبر کے یہاں نمایاں ہے، نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے — اکبر کے فنی ریاض، تہذیبِ غزل سے ان کی وابستگی، زبان کے معاملے میں ان کی احتیاط اور لفظوں کی تخلیقی مزاج شناسی نے اس حسیت سے مل کر غزل کے اس مضبوط لہجے کو جنم دیا ہے جو نمو کی آگ کا شناس نامہ ہے ؎

وہ موج کدھر کدھر آج بہالے گئی ہم کو ۔ تنکا ہی سمجھ کر جو اٹھا لے گئی ہم کو
یوں ہی نہ گئے اپنی تباہی کی طرف ہم ۔ اک کشمکش بیم و رجا لے گئی ہم کو
تھی بے حسیٔ خلق کہ خود اپنی انا تھی ۔ جو شہرتِ آساں سے بچا لے گئی ہم کو
محفل ہی کا کیا ذکر کہ مقتل کی طرف بھی ۔ وابستگیٔ رنگ حنا لے گئی ہم کو

غزل کی یہ مضبوط آواز جو اب تک خود کو "شہرتِ آساں" سے بچائے رہی' اس لحاظ سے اور قابلِ داد ہے کہ اس کا چراغ سات سمندر پار ۲۵ برس سے روشن ہے ۔۔۔ اکبر نے حیدرآباد کی تہذیب سے جو نور کسب کیا تھا' اسے اپنے وجود کی آگ سے انھوں نے بڑے فن سے تابندہ تر کر دیا ہے۔ "نمو کی آگ" غزلوں کے ساتھ اُن کی نظموں میں بھی روشن ہے ۔۔۔ غزل اور نظم کے شاعر کی تقسیم و تخصیص میرے نزدیک مصنوعی ہے۔ لیکن پھر بھی یہ ماننا پڑے گا کہ کچھ شاعر اپنے منفرد اظہار کے لیے کسی ایک صنف کو غیر شعوری طور پر مختص کر لیتے ہیں ۔۔۔ اختصاص کا یہ عمل اکبر کے یہاں بھی ملتا ہے ۔۔۔

اکبر ہجرتوں کے اس دور میں ہم کو وہ روشنی دینے آئے ہیں جسے وہ ہماری ہی تہذیب سے لے گئے تھے، یہ بڑی بات ہے کہ وہ ہجرت کے باوجود منقسم نہیں ہوئے، اور اسی تہذیب کو اپنا وجود بنائے رہے۔ نمو کی آگ ان کے وجود کا تخلیقی اظہار ہے اور مشرق و مغرب کی وجودی وحدت و ہم آہنگی کا ایک دل آویز تجربہ۔

اکبر نے قدیم و جدید، ترقی پسند و غیر ترقی پسند کے ذہنی تحفظات سے بے نیاز رہ کر اپنے انفرادی تجربے اور حسیت کو حسن آفاقیت سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے وہ انھیں "شہرتِ آساں" کی بجائے دیرپا توجہ کی مستحق بناتی ہے۔ جدید غزل میں اتنی مضبوط آوازیں جن میں کلاسیکی رچاؤ بھی ہو اپنے انفرادی تجربے کے بھرپور اعتماد اظہار پر قدرت بھی ہو کم ہیں ۔۔۔

واپسی کا بقایا ص ۲۹ سے آگے

بھلا دیا ہے ۔۔۔ بچپن جو زندگی کا خوبصورت ترین دور ہوتا ہے ۔۔۔ ہماری معصومیت ہم سے جدا ہو کر چپکے چپکے روتی ہے اور ہم اپنے "تجربہ کار" ہونے پر فخر کرتے ہیں ۔۔۔

حسن خوبصورتی سے ایک انوکھے تجربہ کو، ایک نادر لمحے کو گرفت میں لا کر پیش کیا گیا وہ ناشر کی عظمت کی دلیل ہے یوں کہانی بذاتِ خود ایک حسین شعر بن جاتی ہے ۔۔۔ اور ہماری بصیرت میں حیرت انگیز اضافہ کرتی ہے جو بڑے فن کی معراج ہے۔

شاذ تمکنت

دو غزلیں

کب رُت پھرے، کب گل کھلیں ہم کو پتہ کچھ بھی نہیں
یہ شہر کیسا شہر ہے، آب و ہوا کچھ بھی نہیں

اپنا وجود اپنا عدم اک بندِ مُٹھی کا بھرم
مانا کہ ہے کچھ بھی نہیں، سچ ہے کہ تنہا کچھ بھی نہیں

ہر لذتِ دنیا کو چکھ ہر سانس کو گن گن کے رکھ
سب جیتے جی کے ٹھاٹ ہیں بعدِ فنا کچھ بھی نہیں

جب دل شگفتہ ہو میاں پھر لطفِ بزمِ کہکشاں
بوندیں پڑیں تو کیا ہوا، کالی گھٹا کچھ بھی نہیں

تو کیا بھلادیں سب مزے، ملنے لطفِ رُت جگے
وعدے جو ایماں بن گئے آخر یہ کیا کچھ بھی نہیں

کل چاند اُترا مرے گھر، آزردہ رُو با چشمِ تر
میں نے کہا کیا بات ہے اس نے کہا کچھ بھی نہیں

جب حسن خود ہو منتظر اے شاذ کیوں تاخیر پھر
ناخن ہے پیچ و خم کشا، بندِ قبا کچھ بھی نہیں

○

آنکھ ساقی کی بھر آئے دلِ ساغر بیٹھے
جب مرے بعد کوئی تیرے برابر بیٹھے

تہ نشینی نہ گُہر چینی جنوں مانگے ہے
سوچتے رہ گئے ساحل پہ شناور بیٹھے

ایستادہ تھے جہاں صاحبِ دستار و کلاہ
تھے اسی بزم میں ہم جیسے گداگر بیٹھے

ہم نے مر مر کے یہ اندازِ سخن پایا ہے
تم کو تو حسن ملا ہے مری جاں گھر بیٹھے

سنگ کو سنگ نہ کہہ نجد کو صحرا نہ سمجھ
شاذ کا ٹھیک نہیں جانے یہ کیا کر بیٹھے

○

مسز ی نیوا س لاھوٹی

پروفیسر ہارون خان شروانی

موت ابن آدم کی میراث ہے۔ جو پیدا ہوا ہے اسے ایک نہ ایک دن مرنا ضرور ہے لیکن جب کسی عالم یا مورخ کی موت واقع ہوتی ہے تو دل بے چین ہو جاتا ہے۔ اور یہی حال میرا بھی ہوا، جب میں نے ۱۶ ر ستمبر ۱۹۸۰ء کے اخبارات میں پروفیسر ہارون خان شیروانی کی موت کی خبر پڑھی۔

تاریخ یاد نہیں ہے لیکن ۱۹۴۷ء کی بات ہے۔ قاضی عبدالغفار نے پروفیسر مجیب کے اعزاز میں ایک استقبالیہ ترتیب دیا تھا اس میں پہلی بار مجھے پروفیسر ہارون خان شروانی سے ملنے کا موقع ملا۔ اس وقت تک وہ بہ حیثیت مورخ اور سیاست کے استاد کے بڑا نام کما چکے تھے اور پڑھے لکھے طبقے میں ان کی بڑی ساکھ تھی بعد میں مجھے پتہ چلا کہ یہ وہی ہارون خان شروانی ہیں جو انگلستان میں پنڈت نہرو کے ساتھ تعلیم پانے کے علاوہ بیرسٹری کا امتحان بھی ایک ساتھ کامیاب کیا تھا۔ البتہ یہ آکسفورڈ کے طالب علم تھے اور پنڈت نہرو کیمبرج کے۔ پنڈت نہرو کے حیدرآباد میں اور ایک ساتھی بھی تھے جو ہیرو کے پبلک اسکول کے علاوہ کیمبرج اور قانون کی تعلیم بھی ان کے ساتھ حاصل کی تھی۔ ان کا نام محمد قادر اشرف تھا جو عالم جوانی ہی میں انتقال کر گئے تھے۔

شروانی صاحب نے کبھی اس بات کا چرچا نہیں کیا کہ وہ انگلستان میں قیام کے دوران میں جواہر لال نہرو کے ہمعصر رہے ہیں۔ مجھے اس بات کا پتہ تو اس وقت چلا جب کہ پنڈت نہرو ۱۹۵۶ء میں اردو ہال کا افتتاح کرنے تشریف لائے تھے اور پروفیسر شروانی جلسہ گاہ کی اگلی صف میں بیٹھے ہوئے تھے جب پنڈت نہرو ڈائس پر پہنچے اور انہوں نے ہارون خان صاحب کو دیکھا تو وہ فوراً ڈائس سے اتر آئے اور ہاتھ ملاتے ہوئے بہ ہی نرم لہجے میں انگریزی میں کہا HOW ARE YOU HAROON

تب مجھے پتہ چلا کہ پنڈت نہرو کا اور ان کا برسوں انگلستان میں ساتھ رہا ہے۔ چنانچہ پنڈت موتی لال نہرو پر ایک مضمون لکھتے ہوئے ہارون خان صاحب نے تحریر کیا ہے کہ ۱۹۱۹ء میں وہ ایک مقدمہ کی اپیل دائر کرنے کے لئے الٰہ آباد ہائی کورٹ گئے تھے تو وہاں اچانک پنڈت نہرو سے ان کی ملاقات ہوگئی تو انہوں نے دریافت کیا کہ تم یہاں کیسے؟ تو شروانی صاحب نے فرمایا کہ میں ایک مقدمہ میں اپیل دائر کرنے آیا ہوں۔ اس پر جواہر لال نہرو نے جو اس وقت اپنے والد کے ساتھ پراکٹس کرتے تھے کہا کہ اپیل تو داخل ہوتی رہے گی تم میرے ساتھ گھر چلو، کھانا بھی وہیں کھاؤ اور میرے والد سے بھی ملو۔ شروانی صاحب کے اس مضمون میں اس وقت کے سیاسی حالات کی بڑی اچھی عکاسی کی گئی ہے۔ اس وقت ہارون خان صاحب یو۔پی۔ صوبائی خلافت کمیٹی کے معتمد اور علی گڑھ ضلع کانگریس کمیٹی کے سکریٹری کی حیثیت سے کارگزار تھے۔

اس واقعہ کے چند ماہ بعد ہی ہارون خان صاحب باضابطہ

سے وابستہ ہو گئے اور غالباً پہلے سال کے اُستادوں میں اس وقت تک صرف وہی بقیدِ حیات تھے اس لئے ان کی موت سے جامعہ کی تاریخ کا یہ باب بھی ختم ہو گیا اور اب صرف اس کی یاد باقی رہے گی۔

جب میں ہندی پرچار سبھا اور اس کے بعد انجمن ترقی اُردو میں کام کرنے لگا تو مجھے ہارون خان صاحب کو بہت ہی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ انجمن میں جب میں نے ۱۹۵۸ء میں کام کرنا شروع کیا اس وقت شروانی صاحب انجمن کے نائب صدر تھے اور برسوں اس عہدے پر فائز رہے۔ اور ان ہی کے مسلسل اصرار پر انہیں اس عہدے سے سبکدوش کیا گیا۔ جب انجمن کے صدر اور ماہر آثارِ قدیمہ ڈاکٹر غلام یزدانی کا انتقال ہوا تو ان کی یاد کو باقی رکھنے کے لئے "یادگار جلد" شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اور اس کے لئے جو کمیٹی تشکیل دی گئی اس کے معتمد ہارون خان صاحب ہی بنائے گئے۔ میں بھی اس کمیٹی کا ایک رکن تھا۔ اور مجھے ان کے طریقۂ کار کا مشاہدہ کرنے کا موقع ملا کہ وہ کس طرح لوگوں سے کام لیتے ہیں اور کس طرح سے اپنا مفوضہ کام انجام دیتے ہیں۔ دو سال کی مقررّہ مدت میں ہارون خان صاحب کی سعی سے یہ ضخیم یادگار جلد طبع ہو کر منظرِ عام پر آئی تو ہر ایک کی زبان پر کلمۂ تحسین تھا۔ یہ ان کے علمی کام کرنے کی ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ مرحوم نے سلاطین بہمنی اور قرونِ وسطیٰ کی دکنی تاریخ پر جو بے مثال کام کیا ہے اسے زمانہ بھلانا چاہے بھی تو نہیں بھلا سکے گا۔ ان کی ایک عادت تھی کہ وہ کوئی کام اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بڑا ہچکچاتے تھے اور جب وہ کام ان کے سپرد کر دیا جاتا تو وہ اسے اس خوبی سے انجام دیتے کہ یہ بات آج کی نسل کے لئے ایک نمونہ اور قابلِ تقلید مثال ہے۔

بحیثیت رکنِ قانون ساز کونسل انہوں نے کونسل میں اُردو کے مسائل پر جس بے باکی کے ساتھ حکومت کو متوجہ کیا کرتے تھے اس کی کوئی اور مثال آج کے دور میں مشکل ہی سے ملے گی۔ جب بھی وہ کسی مسئلے کو اپنے ہاتھ میں لیتے تو اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچائے بغیر ان کو چین نصیب نہیں ہوتا تھا۔ بسا اوقات تو وہ مواد اکٹھا کرنے کے لئے اپنی چھڑی ہاتھ میں لئے ہر اُردو والے کے ہاں آ جاتے اور جس مواد کی انہیں ضرورت ہوتی اسے وہ اسی وقت حاصل کر کے جاتے تھے۔ اگر انہیں مواد کے حاصل کرنے میں ناکامی ہوتی تو وہ کوئی اور بات کئے بغیر ہی اُردو والے کے ہاں سے روانہ ہو جاتے تھے۔

تاریخ اور سیاست کے وہ کیسے اُستاد تھے اس بات کی گواہی تو ان کا کوئی شاگرد ہی دے سکے گا۔ لیکن "سیاسیات کے اُصول" یا تاریخی موضوعات پر ان کی تحریر کردہ تصانیف کا جن لوگوں کو پڑھنے کا موقع ملا ہے وہ ضرور اس بات کے قائل ہوئے ہیں کہ ان کی ہر تحریر پڑھنے والے کی تشفی کا باعث بنی ہے۔

اچھا ادیب یا اچھا مورخ آدمی اسی وقت بن سکتا ہے جب کہ وہ اچھا انسان بھی ہو اور یہ بات بجا طور پر کہی جا سکتی ہے کہ ہارون خان صاحب ایک سچے انسان اور ایک سچے مسلمان تھے۔ وہ اس بات کے قائل نہیں تھے کہ دل میں تو ایک بات پوشیدہ ہے مگر زبان پر وہ دوسری بات لائیں۔ اس لئے بسا اوقات بڑی اُلجھنیں بھی پیدا ہو جاتی تھیں اور وہ مجلس سے اُٹھ کر چلے جایا کرتے تھے لیکن وہ گھر جا کر یہ محسوس کرتے کہ ان سے زیادتی ہوئی ہے تو وہ فوراً ہی اپنی تحریر کے ذریعہ اپنی کوتاہی کا اعتراف کر لیا کرتے تھے۔ یہی ان کے اندر چھپے ہوئے انسان کی نشانی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں اور بھی کمزوریاں رہی ہوں لیکن ان کی یہ کمزوریاں ایک اچھے شعر کی کمزوریاں تھیں جس سے شعر کے لطف و بے ساختگی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اس لئے ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ خال خال ہی ایسے انسان، ایسے استاد، ایسے مورخ پیدا ہوتے ہیں جنہیں ہارون خان شروانی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ ●●

میمونہ وحید

پطرس کی تحریف نگاری

طنز و مزاح پیدا کرنے کے بے شمار طریقے استعمال کیے جاتے ہیں۔ انہی طریقوں میں سے ایک اہم طریقہ پیروڈی یا تحریف کی شکل میں ملتا ہے۔ یہ صنف بھی مغربی ادب سے اُردو میں آئی۔ جس طرح سے مغربی ادب کی کئی اصناف یونانی اور لاطینی الفاظ سے بنی ہیں۔ اسی طرح سے انگریزی کا یہ لفظ "پیروڈی" بھی یونانی لفظ "پیروڈیا" سے لیا گیا ہے۔ اصل میں پیروڈی کا مفہوم ہی کسی بات کا جواب دینا ہے۔ ڈاکٹر اعجاز حسین نے لکھا ہے کہ پیروڈی کا مفہوم یونانی زبان میں جوابی نغمہ ہے۔ پیروڈی ایک بہت ہی قدیم صنف ادب ہے۔ ارسطو نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر اعجاز حسین لکھتے ہیں "ارسطو نے بتایا ہے کہ یہ صنف پانچویں صدی قبل مسیح میں وجود میں آئی۔ اس کا خیال ہے کہ ہیگومن نے پہلے پہل GIGANTO MACHIA دیوتاؤں کی جنگ لکھ کر پیروڈی کی داغ بیل ڈالی۔ لیکن بعض ادبی مورخین کا خیال ہے کہ اس سے بھی پہلے ہیوناکس نے ہومر کی ایک نظم کی پیروڈی کی ہے۔" [1]

اُردو میں پیروڈی یا تحریف نگاری کے ابتدائی نقوش مختلف اصنافِ سخن میں ملتے ہیں۔ قدیم اردو شاعری میں بھی اس کے کچھ نقوش سودا، انشا اور مصحفی کے ہاں مل جاتے ہیں۔ بعد کے دور میں اودھ پنچ میں بھی تحریف نگاری کے مختلف نمونے ملتے ہیں۔ جیسے سجاد حسین، پنڈت تربھون ناتھ ہجر، اکبر الہ آبادی وغیرہ کے یہاں اس کے بعض نمونے مل جاتے ہیں۔ لیکن پیروڈی کو شعوری طور پر استعمال، بیسویں صدی ہی میں کیا گیا۔ خاص طور پر اردو نثر میں پیروڈی کا استعمال سب سے پہلے پطرس ہی کے پاس ملتا ہے۔

پیروڈی وہ صنف ادب ہے جس میں کسی مشہور و معروف تحریر کی نقل اس طرح سے کی جاتی ہے کہ مزاحیہ پہلو ابھرتا ہے۔ پیروڈی کا مقصد جہاں مزاح پیدا کرنا ہوتا ہے وہیں خوش گوار انداز میں طنز کرنا بھی ہوتا ہے تاکہ اس مشہور و معروف تحریر کی پرستش کم ہو جائے اور زیادہ توازن کے ساتھ اس ادبی تخلیق کی تنقید ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ نیو آکسفورڈ ڈکشنری میں لکھا گیا ہے، "پیروڈی کو مصنف کی کسی خاص تخلیق تک محدود ہونا چاہیئے۔ اس طرح کہ اس سے اصل کی مزاحیہ انداز میں تنقید ہو۔"

پطرس نے گو زیادہ پیروڈیاں نہیں لکھی ہیں۔ لیکن ان کی پیروڈیاں "مضامین پطرس" میں ملتی ہیں۔ "ایک اردو کی آخری کتاب" دوسری "لاہور کا جغرافیہ" اپنی تحریفات سے اردو نثر میں پیروڈی یا تحریف نگاری کا آغاز ہوتا ہے۔ ان کی پیروڈی کو بجا طور پر اُردو ادب کی پہلی پیروڈی قرار دیا گیا ہے۔ تمکین کاظمی بھی پطرس کو اردو کا پہلا پیروڈی نگار ثابت کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں: "اُردو کی آخری کتاب" یہ پیروڈی ہے اور اُردو زبان کی سب سے پہلی پیروڈی ہے۔ آپ فرمائیں گے پہلی کس طرح

---

[1] "ادبی رجحانات" از ڈاکٹر اعجاز حسین ص ۳۶

ہوئی۔ پطرس سے پہلے بھی لوگوں نے پیروڈی لکھی ہے! سواس کے متعلق میرا یہ جواب ہے کہ پیروڈی کو پیروڈی سمجھ کر اور پیروڈی کے طور پر سے پہلے پطرس نے لکھا۔"[۱]

اسی طرح ڈاکٹر شریف احمد نے بھی پطرس کی پیروڈی کو اردو نثر کی سب سے پہلی اور کامیاب کوشش قرار دیتے ہوئے لکھا "اردو نثر میں کامیاب پیروڈی پطرس کی اولیات میں سے ہے۔ ان سے پہلے صرف اردو نظموں اور شعروں وغیرہ ہی کی پیروڈی کی جا رہی تھی۔"[۲]

ڈاکٹر وزیر آغا پطرس بخاری کی تحریف نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں "جدید اردو نثر میں اس کی بہترین مثال پطرس کی پیروڈی "اردو کی آخری کتاب" ہے"[۳]

پیروڈی کیا ہوتی ہے۔ اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے وزیر آغا لکھتے ہیں، "پیروڈی یا تحریف کسی تصنیف یا کلام کی ایک ایسی لفظی نقالی کا نام ہے جس سے تصنیف یا کلام کی تضحیک ہو سکے۔ تحریف کا بنیادی اور امتیازی عنصر نقل ہے۔ ......
تحریف کا بنیادی وصف یہ ہے کہ تحریف اعمال اشیا، یا تخلیقات کی "عظمت" کو زندگی کے غیر اہم مظاہر سے مربوط کر کے عظمت کے سحر کا پردہ چاک کرتی اور ناظر کو کھلکھلا کے ہنسنے پر آمادہ کرتی ہے۔"

پطرس نے محمد حسین آزاد کی مشہور کتاب "اردو کی پہلی کتاب" کی تحریف کی ہے۔ یہ کتاب نصابی کتابوں میں بے حد مقبول تھی اور سالہا سال تک یہ کتاب اسکولوں میں بچوں کو پڑھائی جاتی رہی ہے۔ یہ کتاب اس کثرت اور اتنے متواتر انداز سے نصاب میں شامل رہی ہے کہ اس کی وجہ سے ایک بیزارگی سی اس کے تعلق سے پیدا ہوئی تھی۔ یہ کتاب اسی زمانے میں اپنی کثرت استعمال کی وجہ سے مختلف ناموں سے پکارے جانے لگی تھی۔ تمکین کاظمی اس تعلق سے لکھتے ہیں: "پیروڈی کو سب سے پہلے پطرس نے اپنایا اور اردو میں پہلی کوشش پیروڈی کی جو کی وہ "اردو کی آخری کتاب" ہے۔ پنجاب کے محکمہ تعلیم نے مولانا محمد حسین آزاد سے ایک سلسلہ اردو نصاب کا مرتب کرا دیا تھا جو سارے ہندوستان میں لاگو کر دیا گیا۔ اس کی پہلی کتاب ہی میں "ماں بچے کو گود میں لیے بیٹھی ہے" تھا اس لیے بچے سے ماں بچوں کی کتاب" کہتے تھے اور یہ نام ایسا پڑ گیا تھا کہ اس سلسلہ ہی کو "ماں بچوں" کے نام سے مشہور کر دیا گیا اور ماں بچوں کی پہلی، ماں بچوں کی دوسری، ماں بچوں کی تیسری کتاب کہلانے لگی۔ ہمارے بچپن میں یہ سلسلہ شریک نصاب تھا۔ اور پطرس نے بھی ابتدا اسی کو پڑھا ہے معلوم نہیں وہ کب سے اس کے متعلق سوچ رہے تھے۔ آخر رہ نہ سکے اور انھوں نے یہ پیروڈی لکھ دی۔"[۴]

تحریف نگاری کا بنیادی مقصد کیا ہوتا ہے۔ اس میں اختلاف ملتا ہے۔ بعضوں کے نزدیک تحریف صرف تفریح پیدا کرنے کے لیے کی جاتی ہے۔ لیکن بعض اسے سنجیدہ مقصد کا حامل قرار دیتے ہیں۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ تحریف کے ذریعے بڑے بڑے ادیبوں کی بے اعتدالیوں کو روکنا اور اس کی اصلاح کرنا ممکن ہے اور یہی اس کا بنیادی مقصد ہے۔ اصل میں اچھی تحریف میں یہ دونوں ہی باتیں پنہاں رہتی ہیں۔ تحریف نگار اس طرح ایک تو کسی بھی کلام یا کلام کے تعلق سے کتاب کے مسلسل استعمال

---

۱ رسالہ "نقوش" پطرس نمبر "مضامین پطرس کا مطالعہ" از تمکین کاظمی ص ۱۴۲

۲ "مشاہدے" ڈاکٹر شریف احمد "پطرس بخاری" ص ۱۹۰ ۳ "اردو ادب میں طنز و مزاح" از ڈاکٹر وزیر آغا ص ۲۴۷

۳ رسالہ "نقوش" پطرس نمبر "پطرس کی تحریف نگاری" از وزیر آغا ص ۱۵۷

۴ "نقوش" پطرس نمبر "مضامین پطرس کا مطالعہ" از تمکین کاظمی ص ۱۴۳)

جو بیزار کن فضا پیدا ہوتی ہے اس کو ختم کر کے تفریح کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ دوسری طرف وہ اس طلسم کو بھی توڑتا ہے جو کسی کتاب یا کلام کے تعلق سے پیدا ہو جاتی ہے اور یوں جدت اور تازگی کی طرف لوگوں کو متوجہ کرتا ہے۔ پطرس کی "اردو کی آخری کتاب" میں یہ دونوں ہی مقاصد پنہاں نظر آتے ہیں۔ پطرس نے محمد حسین آزاد کی "اردو کی پہلی کتاب" کی تحریف کر کے اس طرح سے دونوں ہی مقاصد حاصل کر لیے ہیں۔ ان کا مضمون "اردو کی آخری کتاب" اس طرح سے شروع ہوتا ہے:

"ماں بچے کو گود میں لیے بیٹھی ہے۔ باپ انگوٹھا چوس رہا ہے اور دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا ہے، بچہ حسب معمول آنکھیں کھولے پڑا ہے۔ ماں محبت بھری نگاہ سے اس کو تک رہی ہے اور پیار سے حسب ذیل باتیں پوچھتی ہے۔

(۱) وہ دن کب آئے گا جب تو میٹھی میٹھی باتیں کرے گا۔ (۲) بڑا ہو کر کیا بنے گا؟ مفصل لکھو۔

(۳) دولہا کب بنے گا، اور دولھن کب بیاہ کر لائے گا؟ اس میں شرمانے کی ضرورت نہیں۔

(۴) ہم بڈھے کب ہوں گے؟ (۵) تو کب کمائے گا۔ (۶) آپ کب کھائے گا، اور ہمیں کب کھلائے گا، باقاعدہ ٹائم ٹیبل بنا کر واضح کرو۔ بچہ مسکراتا ہے، اور کیلنڈر کی مختلف تاریخوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ تو ماں کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔"[1]

اسی طرح سے ان کی پوری پیروڈی مولانا محمد حسین آزاد کی کتاب "اردو کی پہلی کتاب" کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے اور انھوں نے بعض الفاظ کی تبدیلی سے بڑے دلچسپ اور مزاحیہ پہلو پیدا کیے ہیں۔ پیروڈی عام طور پر تین طرح کی ہوتی ہے۔ ایک تو لفظی "جس میں ایک لفظ کے بدل دینے سے اصل تحریر مضحک ہو جاتی ہے۔ عام طور پر یہ مشہور شاعروں کے کلام میں کی جاتی ہے اور ان کے بعض بہترین اشعار کو صرف دو ایک الفاظ کی تبدیلی سے مضحکہ خیز بنا دیا جاتا ہے۔ پیروڈی کی دوسری قسم طرز ہوتی ہے جس میں کسی مصنف کے طرز تحریر کی نقل کی جاتی ہے۔ اس طرح نقل کی جاتی ہے کہ وہ مزاحیہ بن جائے۔ پیروڈی کی تیسری قسم "موضوعاتی" ہے۔ جس میں مصنف کی تحریر اور اس کے الفاظ ہی کو نہیں بلکہ اس کے انداز فکر کو بھی بدل کر کچھ کا کچھ بنا دیا جاتا ہے اور خود جس موضوع پر مصنف نے لکھا تھا۔ اسی کو مضحکہ خیز بنا دیا جاتا ہے۔

پطرس کی پیروڈی میں یہ تینوں باتیں ملتی ہیں۔ وہ الفاظ میں بھی تحریف کرتے ہیں۔ مصنف کی طرز کو بھی اپنا کر اسے مضحکہ بنا دیتے ہیں۔ اور اس کے موضوع کو بھی مضحکہ خیز بنا دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پطرس کی پیروڈی کو مختلف نقادوں نے اردو کی بہترین پیروڈی قرار دیا ہے۔

پطرس کی دوسری پیروڈی ان کا مضمون "لاہور کا جغرافیہ" ہے۔ یہ پیروڈی بھی پطرس نے اسی وجہ سے لکھی ہے کہ جغرافیہ کی کتابیں مدتوں سے ایک انداز اور ایک ہی طرز پر لکھی جاتی ہیں۔ صرف مقام اور چیزوں کے نام کی تبدیلی ہو جاتی ہے باقی پورا انداز تمام جغرافیہ کی کتابوں میں ایک ہی سا ہوتا ہے۔ تمکین کاظمی پطرس کی دوسری تحریف کے تعلق سے لکھتے ہیں: "دوسری کوشش بھی پطرس ہی نے "لاہور کا جغرافیہ" کے عنوان سے کی ہے۔ جو مضامین پطرس کا آخری مضمون ہے "اردو کی آخری کتاب" سے زیادہ لمبی اور بڑی ہی نفیس ہے۔ پہلے آپ لاہور کا کوئی ایسا جغرافیہ لیجیے جو آج سے بیس سال پہلے وسطانی جماعتوں کے لیے لکھا گیا ہو پھر اس کو سامنے رکھ کر پطرس کی پیروڈی کا مطالعہ کیجیے۔"[2]

---

[1] "مضامین پطرس" از پطرس بخاری "اردو کی آخری کتاب" ص ۳۳ [2] "نقوش" پطرس نمبر "مضامین پطرس کا مطالعہ" از تمکین کاظمی ص ۱۴۹

اس طرح سے پطرس نے اس زمانے کی جغرافیائی کتابوں کا مضحکہ بڑی خوبی سے اڑایا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے خود لاہور کے حالات پر بھی بڑے ہی مزاحیہ انداز میں تبصرہ کیا ہے۔ ان کی تحریف یوں شروع ہوتی ہے: "تمہید: تمہید کے طور پر صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ لاہور کو دریافت ہوئے اب بہت عرصہ گزر چکا ہے، اس لیے دلائل و براہین سے اس کے وجود کو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں۔ محل وقوع: لاہور پنجاب میں واقع ہے لیکن اب پنج آب نہیں رہا۔ اس پانچ دریاؤں کی زمین میں اب صرف ساڑھے چار دریا بہتے ہیں اور جو نصف دریا ہے وہ اب بہنے کے قابل نہیں رہا۔ اسی کو اصطلاح میں "راوی ضعیف" کہتے ہیں۔ ملنے کا پتہ یہ ہے کہ شہر کے قریب دو پل بنے ہوئے ہیں۔ ان کے نیچے ریت میں یہ دریا رہتا ہے۔ بہنے کا شغل عرصہ سے بند ہے۔"

لاہور تک پہونچنے کے لیے کئی رستے ہیں۔ وسطی ایشیا کے حملہ آور پشاور کے رستے اور یو۔پی کے حملہ آور دہلی کے رستے وارد ہوتے ہیں۔ اول الذکر اہل سیف کہلاتے ہیں۔ اور غزنوی یا غوری تخلص کرتے ہیں۔ موخر الذکر اہل زبان کہلاتے ہیں۔ یہ بھی تخلص کرتے ہیں اور اس میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔

آب وہوا: لاہور کی آب وہوا کے متعلق طرح طرح کی روایات مشہور ہیں جو تقریباً غلط ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ لاہور کے باشندوں نے حال ہی میں یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ اور شہروں کی طرح ہمیں بھی آب وہوا دی جائے۔ لیکن بدقسمتی سے کمیٹی کے پاس ہوا کی قلت تھی۔ اس لیے لوگوں کو ہدایت کی گئی کہ مفاد عامہ کے پیش نظر اہل شہر ہوا کا بے جا استعمال نہ کریں بلکہ جہاں تک ہوسکے کفایت شعاری سے کام لیں۔ چنانچہ لاہور میں عام ضروریات کے لیے ہوا کی بجائے گرد اور خاص خاص حالات میں دھواں استعمال کیا جاتا ہے۔ کمیٹی نے جابجا دھوئیں اور گرد کے مہیا کرنے کے لیے لاکھوں مرکز کھول دیئے ہیں۔

صنعت وحرفت: اشتہاروں کے علاوہ لاہور کی سب سے بڑی صنعت رسالہ سازی اور سب سے بڑی انجمن سازی ہے۔

پیداوار: لاہور کی سب سے مشہور پیداوار یہاں کے طلبا ہیں جو بہت کثرت سے پائے جاتے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں دساور کو بھیجے جاتے ہیں۔ فصل شروع سرما میں بوئی جاتی ہے اور عموماً اوائل بہار میں پک کر تیار ہوتی ہے۔

طبعی حالات: لاہور کے لوگ بڑے خوش طبع ہیں:[1]

پطرس نے اپنی اس پیروڈی میں مختلف عنوانات کے تحت لاہور کے جغرافیائی حالات کو مزاحیہ انداز میں پیش کیا ہے اور خود اہل لاہور کو بھی اپنے مزاح کا ہدف بنایا ہے۔ کہیں کہیں ان کے پاس اس مضمون میں طنزیہ انداز بھی ابھر آیا ہے۔ لیکن مجموعی اعتبار سے مزاح کی فضا پورے مضمون پر حاوی ہے۔ بہرحال پطرس کی یہ دونوں تحریفیں اردو نثر کی تحریف نگاری کے بہترین نمونے ہیں۔ اس تعلق سے ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا ہے: "اردو نثر میں تحریف نگاری کے سلسلے میں پطرس کو ایک مقام امتیاز حاصل ہے۔ یہ اس لیے کہ پطرس نے غالباً سب سے پہلے نثر میں پیروڈی کے اعلیٰ نمونے پیش کیے۔ پطرس سے قبل اردو شاعری میں پیروڈی کے نمونے تو ملتے ہیں اور اس ضمن میں رتن ناتھ سرشار اکبر الٰہ آبادی اور اودھ پنچ کے بہت سے معاونین کے نام پیش کیے جاسکتے ہیں۔ لیکن نثر میں پطرس سے قبل اول تو پیروڈی کا نمونہ بمشکل سے ملتا ہے اور کہیں ایک آدھ چیز نظر بھی آئی ہے تو اس کی ادبی حیثیت کچھ زیادہ بلند نہیں۔ چنانچہ بعض دوسرے اوصاف کے علاوہ پطرس کی تحریف نگاری کو تاریخی اعتبار سے بھی اہمیت حاصل ہے اور طنز وظرافت کے طالب علم کے لیے اس بات کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔" ۵۵

---

[1] "مضامین پطرس" از پطرس بخاری "لاہور کا جغرافیہ" صہ ۹۶ تا ۱۰۳

یوسف اعظمی

تین غزلیں

تو آدمی کو حسن، یقیں، اعتبار دے
رشتوں کا جھوٹ موٹ لبادہ اتار دے

آنکھوں میں جم رہے ہیں مہ و سال مثلِ گرد
رفتار ہو صبا کی وہ لیل و نہار دے

برگد کی چھاؤں میں ترا وقفہ حسین ہے
وقفوں کا سلسلہ نہ مگر بار بار دے

کچھ لوگ مانگتے ہیں تری زیست کا حساب
تو ان کو چاکِ پیرہن تار تار دے

آنکھوں کی شوخیوں میں نئی گفتگو تلاش
شاداب آئینوں کو صدا بار بار دے

اے اعظمی یہ بے سواد دنیا سے کچھ نہ مانگ
دستِ طلب کو رحمتِ پروردگار دے

کنواری خموشی کو لفظوں نے لوٹا
کھلے لب تمہارے کہ سناٹا ٹوٹا

خیالات جیسے کہ اُڑتا پرندہ
ابھی ساتھ تھا اور ابھی ساتھ چھوٹا

بچھا کا ہوا فرش پر چاندنی کا
کہ آواز کا نرم آئینہ ٹوٹا

پھٹا پیرہن بے بسی کا مقدّر
ترے عہد میں ہے نیا سچ بھی جھوٹا

ہوئے موت سائے کی تعبیر تھے تم
جسموں کی سیاحت میں کیوں ساتھ چھوٹا

نقشِ پا اب بھی محوِ نظر ہے
ہواؤں کی دیوار سے میں نہ ٹوٹا

ہم سفر ساتھ صبا کے ہے مرا گھر دیکھو
مری آواز کا بہتا ہوا منظر دیکھو

روٹھ کر جائے ہے اس شوخ کا بچپن کیسے
سوندھی مٹی سے بنا دھوپ کا ساغر دیکھو

ڈھونڈتے کیوں ہو مشینوں میں تمدن کا شباب
چیخ صدیوں کی مرے جسم کے اندر دیکھو

جس کی بنیاد لہو پر ہے وہ ٹکڑوں میں
تم مری روح کے اندر کا حبس گھر دیکھو

وہ صبا جسم تکلم ہے، ترنم، کیا ہے!
اس کی سرگوشیاں لہجے میں ڈبو کر دیکھو

چیزے، ہستم

الفت کے راز و سرِ خفی کا فسانہ ہوں
اس کو چھپائے رکھنے کا حیلہ بہانہ ہوں
اپنی خودی پہ خوش ہوں جنوں کا دیوانہ ہوں
وارفتگی ہوش ہوں یکتا یگانہ ہوں
میخانۂ مغاں کی میں پی پی کے ارغواں
مستی کناں ہوں تقویٰ سے یکسر بیگانہ ہوں
خاکی ہوں گرچہ سوزِ دروں ہے مری سرشت
تنکوں سے بجلیوں کی بنا، آشیانہ ہوں
نیرنگیاں ہوں قدرت پروردگار کی
مجھ کو بُرا بھلا نہ کہو، میں زمانہ ہوں
اچھا ہوں یا بُرا ہوں میں جو کچھ بھی ہوں مگر
اُمیدوارِ رحمت و لطف شہانہ ہوں
آدم کا نام دیتے ہیں کرّوبیاں مجھے
یزداتِ بے مثال کا تصویر خانہ ہوں
میری کمندِ ذوق میں یزداں بھی ہے اسیر
سرِّ الست و رازِ بلیٰ کا خزانہ ہوں
مجھ سے ملائکہ کو ازل سے ہے اختلاف
وجہِ خلافت و سببِ شاخسانہ ہوں
شاعر ہوں میں شعور ہے میرا جنوں نواز
سوئی ہوئی خرد کے لیے تازیانہ ہوں

نظرِ سحر اثر

احمد حسین خاں

؛ کھل سکا تری نیچی نگاہوں کا جوہر
ہزار سحر کیے اور پڑھے کئی منـ
اٹھی تو پار گئی سات آسمانوں کے
جھکی تو دھنس گئی پاتال کے بہت
نظر حیات فزا اور نظر ممات اثر
چھپے ہیں اس میں کئی موت و زیست کے د
نظر میں شعلہ تو گریہ میں آب و تاب لیے
کرشمہ سازیٔ برقِ تپاں ہے تیر
نظر ملے جو کسی سے تو پھر وہ اٹھ نہ سکے
یہ ایستادہ کرے اس کو جو گرا ہو بـ
نظر میں شورِ قیامت نظر سکون نواز
ہر اک بات ہے اس کی تضاد کا مظہ
وہ چشم نیم خمار و بہ نیم ہوش اگر
غلط ہی مجھ پہ جو پڑ جائے تو رہوں مغط
جیوں تو جی نہ سکوں اور مروں تو مر نہ سکوں
نفس کے تار میں گوندھوں میں شک کے گوہ
نظر لگے نہ تجھے اے نظر نواز مرے
تری نظر ہے مرے جبر و قدر کا مظ
چھپا لے آنکھ میں اپنی اگر، زہے قسمت
بنوں مجاِ چشم فراز ونگوں میں کمل بنہ
تو راز سارے زماں و مکاں کے کھل جائیں
نیاز و ناز نہ ہو اور نہ ہو آقل اکـ
یہ فرق ما و شما کا ہمیشہ مٹ جائے
مری خودی یہ بتا دے کہ چیز کیا ہے لـ

صغریٰ عالم

درد وغم، رنج والم اور دعا ساتھ رہے
من نا ظلم میں رہوں اور خدا ساتھ رہے

مری محفل میں اکیلے نہ کبھی آؤ تم ـ!
نکہتِ گل بھی ہو رفتارِ صبا ساتھ رہے

بکرِ فکر کو عریاں نہ کرا اے بزم ادب!
رہن لفظ کا معنی کی ردا ساتھ رہے

دا اٹھا شاخِ تمنا کو ذرا اور بلند
ں رہوں اور مرا دستِ رسا ساتھ رہے

ہ گساروں میں وہ آداب کہاں ہیں صغریٰ
ورتِ درد ترا عہد وفا ساتھ رہے

علی ظہیر

ابوذر غفاریؓ

وہ کبوتر
جو اُڑتے تھے
تاج و تخت و کاخ و پرچم سے بلند
وہ ابھی لوٹے نہیں ہیں

وہ اکیلا
آسماں اور ریت کے ٹیلوں کے بیچ
اپنے دفنانے کسی کا منتظر

اذان

سروں میں گنبدوں کی گونج بھر کر
سنہری مچھلیوں کے حوض پر
اتریں گے جب
اڑتے کبوتر
موذن
آفتابِ عصر کی جانب
صداؤں کے علم اونچے کرے گا

زاہدہ حنا

بود و نبود کا آشوب

اندھیرا پڑ رہا تھا۔ دو شنبہ کی رات کی رانی میں اتر گیا تھا، پھیل کر ہوا میں گھل گیا تھا۔

میں دھوپ سے بھرے ہوئے ڈرائنگ روم میں بیٹھے بیٹھے تھک گئی تھی تھکن میری ہڈیوں اور تلووں میں رچ گئی تھی۔ اسی لیے میں اپنے شوہر اور اس کے دوستوں سے معذرت کر کے باہر نکلی تھی اور برآمدے کے ٹھنڈے فرش پر ننگے پاؤں ٹہلنے لگی تھی۔

ڈرائنگ روم کی ساری کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں اور روشنی کے قتلے برآمدے کے فرش پر بچھے ہوئے تھے۔ انہیں دیکھ کر مجھے بچپن کا ایک کھیل یاد آیا۔ جب ہم اپنے گھر کے آنگن میں ایسے ہی بڑے اور چھوٹے قتلوں کو پھلانگتے جاتے اور جب کسی کا پیر غلطی سے روشنی کے کسی قتلے پر پڑ جاتا تو سزا کے طور پر اسے چور بنا دیا جاتا۔ پھر ہم سب کچھ بھول کر بھاگا کرتے اور چور بننے والا لنگڑی ٹانگ سے ہمارے پیچھے لپکتا۔ اس وقت روشنی کے سارے قتلے ہمارے پیروں تلے روندے جانے اور رات ہمارے گونجتے نام گوشے ہماری چیخوں سے بھر جاتے۔

اس رات جب میں برآمدے کے ٹھنڈے فرش پر ننگے پاؤں ٹہل رہی تھی تو یوں ہوا کہ ڈرائنگ روم کی کھلی کھڑکیوں نے سب کچھ اگل دیا، سب کچھ نگل لیا۔

میں اپنی جگہ ٹھٹھک کر رہ گئی میری نظر اپنے شوہر پر پڑی، وہ ہاتھ بڑھا کر اسٹیریو کا سوئچ آن کر رہا تھا BONEYM کی چیختی ہوئی آواز اٹھی۔

PARA - RASPUTEEN میں نے دہشت زدہ ہو کر ان سب کو دیکھا، اندر چار دوست تھے شراب کے نشے میں ڈوبے ہوئے، قہقہے لگاتے ہوئے۔ اور سامنے کتابوں کی الماری پر ایک تصویر تھی تصویر میں سفید پتھروں والی ایک چٹیل پہاڑی تھی۔ اس پہاڑی کے ایک مختصر حصے کو تراش کر ہموار دیوار کی شکل دے دی گئی تھی، اور دیوار پر ایک سلاخ دار دروازہ لگا تھا جس میں آہنی قفل تھا اس دروازے سے پرے ایک غار تھا اور محراب تھی، محراب سے پرے بھی ایک تنگ و تاریک غار تھا، اور اس غار سے پرے ازل تھا، ابد تھا اور لانہایت خندق تھی جو زندوں اور مُردوں کے درمیان عدل کرتی ہے۔

میں بھی اس تصویر میں تھی، دروازے کی ایک سلاخ کو تھامے ہوئے اور غار کے اندر جھانکتی ہوئی چہرہ غار

کی سمت اور پشت کیمرے کا سامنا کرتی ہوئی اور اسی تصویر کے برابر کانسی کا ایک مجسمہ تھا۔ غار کے قیدی کا یہ مجسمہ میں نے اسی کے شہر سے خریدا تھا۔

جب میں نے یہ تصویر کھنچوائی تھی اور جس لمحے میں میں نے یہ مجسمہ خریدا تھا، اس لمحے میں نہیں جانتی تھی کہ ایک رات ایسی بھی آئے گی جب میرے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا ایک شخص اس تصویر اور مجسمہ کو دیکھ کر ایک جملہ کہے گا اور پھر اندھیرا روشنی کے تمام خلیوں کو نگل لے گا۔

میری نگاہیں جھکیں اور کتابوں کی الماری کے مقابل رنگین ٹیلی ویژن پر جم گئیں۔ ٹیلی ویژن کینٹ پر سادہ فریم میں جڑا ہوا ایک فوجی اعزاز سجا تھا چند مہینوں پہلے یہ اعزاز میرے شوہر کو اعلیٰ بیش بہا خدمات کے صلے میں عطا ہوا تھا۔

کچھ دیر پہلے کا وہ لمحہ میرے اندر ازل کی طرح منجمد تھا جب ڈرائنگ روم کی کھلی ہوئی کھڑکیوں سے میرے شوہر کے عزیز ترین دوست کی آواز آئی تھی اور اس آواز نے پوچھا تھا "یار، یہ سلاخ دار دروازے کی تصویر کیسی ہے؟"

تب میرے شوہر نے بتایا کہ یہ اس بوڑھے فلسفی کا قید خانہ ہے جس نے زہر کے پیالے کے انتظار میں بہت سے دن اور بہت سی راتیں گزاری تھیں۔

یہ سن کر میرے شوہر کے اسی عزیز ترین دوست نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تھا: "بھابھی نے اس کمرے میں خوب تضاد اکٹھا کیا ہے، ایک طرف صدیوں پہلے زہر پینے والے بوڑھے کے قید خانے کی تصویر اور اس کا مجسمہ ہے اور دوسری طرف تمھیں ملنے والا اعزاز سجا ہے۔"

"ذرا آہستہ بولو۔ تمھاری بھابھی نے سن لیا تو قیامت آجائے گی۔" میرے شوہر کی صدا تنبیہ مرتبہ سے آرہی تھی۔

"تم تو مجھے یوں خاموش کر رہے ہو جیسے بھابھی کو تمھاری ڈیوٹی کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔" ہنسی سے کھلی ہوئی آواز نے کہا۔

"اُسے واقعی کچھ نہیں معلوم۔"

"لیکن وہ تو اس تقریب میں شریک تھیں جس میں تمھیں یہ اعزاز ملا تھا۔"

"ہاں وہ شریک تو تھی لیکن اُسے نہ اس اعزاز کا پس منظر معلوم ہے اور نہ میری سرکاری مصروفیات کے بارے میں کچھ علم ہے۔" یہ اس شخص کی آواز تھی جو مجھے جان سے عزیز تھا۔

وہ باتیں کر رہے تھے۔ میرے شوہر کو داد دے رہے تھے، وہ تنظیم جسے میں بہت عزیز رکھتی تھی اس کے کچل دیئے جانے کا سہرا میرے شوہر کے سر باندھ رہے تھے۔ سادہ فریم میں جڑا ہوا اعزاز میری نگاہوں کے سامنے تھا اور اس شخص کا چہرہ بھی جسے یہ اعزاز عطا ہوا تھا۔ کیا یہ وہی شخص تھا جس سے میں نے گھنٹوں ادب اور تاریخ کے معاملات پر

باتیں کیں جو فنون کا دلدادہ تھا، کتابوں کا شیدائی تھا اور فلسفۂ تاریخ جس کا محبوب موضوع تھا۔

کیا یہ واقعی اُسی شخص کی آواز تھی؟

میری ٹانگوں میں دم نہیں رہا تھا، میں وہیں بیٹھ گئی۔ آوازیں مجھ تک آتی رہیں۔ یہ انسانوں کی آوازیں تھیں یا بھیڑیوں کی غراہٹیں؟ وہ ان لوگوں کے نام لے رہے تھے، ان کی باتیں کر رہے تھے جن میں سے کئی کو میں نام بہ نام جانتی تھی۔ ان سے میں نے ادبی نشستوں اور نجی محفلوں میں گھنٹوں باتیں کی تھیں۔ ان کے ساتھ میں نے کئی پسماندہ بستیوں کا سفر کیا تھا۔ [illegible] علاقے اور ان میں بسنے والے محروم ترین انسان جن کی زندگی کی بستیوں کا شہر میں رہنے والے تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہ لوگ پسماندہ بستیوں میں رہنے والوں کے ساتھ اُن ہی کی طرح رہتے تھے۔

پھر اُنہی دنوں میں اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر چلی گئی۔ دوسرا تعلیمی سفر ختم ہو رہا تھا تو میری ملاقات اُس شخص سے ہوئی۔ جو اب میرا شوہر ہے اور ان دنوں کسی ٹریننگ کے سلسلے میں باہر گیا ہوا تھا۔ بھیّا کو جب معلوم ہوا کہ میں اس سے شادی کی خواہشمند ہوں تو انھوں نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا میں ایک فوجی کے ساتھ زندگی گزارنے کی استطاعت بھی رکھتی ہوں؟ وہ میری افتادِ طبع سے بخوبی واقف تھے۔ میرے سیاسی نظریات سے آگہی رکھتے تھے اور اندیشہ ہائے دور و دراز میں مبتلا ہو گئے تھے۔

مجھے اُن پر ہنسی آئی تھی۔ آخر سقراط نے بھی تو یونان کی ریاست کے کسی عام سپاہی کی طرح حلف اٹھایا تھا اور عہد کیا تھا کہ "میں اپنے ہتھیاروں کی بے حرمتی نہیں کروں گا اور میدانِ جنگ میں اپنے قریب کھڑے ہوئے آدمی کو چھوڑ کر نہیں بھاگوں گا اور دیوتاؤں اور انسانوں کی چیزوں کے لیے جنگ کروں گا۔"

میں نے کتابوں سے سیکھا تھا کہ پیشے انسانوں کی افتادِ طبع نہیں بدل سکتے۔ یہ تمام باتیں میں نے بھیّا سے کہی تھیں اور وہ چپ ہو گئے تھے۔ لیکن عشق کے سامنے دلیلیں ہار جاتی ہیں سو وہ بھی ہار گئے۔

شادی کے کچھ دنوں بعد ہم دونوں وطن واپس آ گئے۔ میں پانچ برس ملک سے باہر رہی تھی اور جب واپس آئی تو خواہش کے باوجود پرانے دوستوں سے رشتہ استوار نہ ہو سکا۔ جبر کی فضا میں اضافہ ہوا تھا، لوگ بکھر سے گئے تھے اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ کچھ لوگوں نے مجھ پر اعتبار کرنا چھوڑ دیا تھا۔ میں ان کے خیال میں TROJAN HORSE تھی، وہ مجھے قلبِ لشکر میں کس طرح لے کر جاتے۔

یہ اسی فراغت کی اذیت تھی کہ جس کا اظہار بھی میرے لیے ممکن نہ تھا۔ میں اپنے اندر سمٹ کر ٹھٹھر کر رہ گئی۔ وہ بھی دو کنارے تھے اور سنا ہے میں بھی درست تھی کہ کشش کی بیمار تھی۔

اس وقت یہ لوگ جن کے نام لے رہے تھے ان کی گرفتاری کی خبر ہماری واپسی کے چند ہفتوں بعد ہی چھپی تھی۔ پھر خبر آئی کہ ان کا معاملہ ایک فوجی ٹریبونل کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ میں نے اپنے شوہر سے اس معاملے پر بات کرنی چاہی لیکن وہ ٹال گیا۔ وہ جانتا تھا کہ ان میں سے کئی میرے ذاتی دوست ہیں۔ وہ تفصیلات بتا کر مجھے اذیت نہیں دینا چاہتا تھا۔

اس کے بعد معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک شخص تشدد کی تاب نہ لا کر ختم ہو گیا۔ اور اس کی لاش لاوارثوں کی طرح ایک چھوٹے سے شہر کے قبرستان میں دفن کر دی گئی۔ اس کی قبر پر کوئی کتبہ نہ تھا، وہ گمنام سپاہی کی قبر تھی۔ اس کی بیوہ اور اس کے ضعیف ماں باپ کی آہ و زاری کی ایک کالمی خبریں آئیں اور پھر سب کچھ یوں بھلا دیا گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اس کی موت کی خبر نے مجھے کئی روز تک رُلایا تھا۔ مجھے یقین ہی نہیں آتا تھا کہ وہ روشن دماغ اور روشن ضمیر انسان مر بھی سکتا ہے، وہ زبان جو دانائی کے موتی رولتے نہ تھکتی تھی وہ گویائی سے محروم بھی ہو سکتی ہے۔ وہ ہاتھ جنھوں نے ہمیشہ سچ لکھا تھا وہ پیوند زمین بھی ہو سکتے ہیں۔

میں نے بے یقینی کی ریتیلی دیوار کی کگر کو تھام کر یقین کی پتھریلی زمین تک پہنچنا چاہا لیکن ریتیلی دیوار کا قامت کم ہو رہا تھا، میری انگلیوں کے درمیان سے ریت پھسل رہی تھی، گر رہی تھی۔

آوازوں کا پگھلتا ہوا، دہکتا ہوا سیسہ، بہتا ہوا میری سماعت تک آ رہا تھا۔ یہ لوگ بار بار اس شخص کا نام لے رہے تھے جو موجود انسانوں میں میرے لیے بہت محترم تھا۔

وہ ہنس رہے تھے، وہ ایک دوسرے کو بتا رہے تھے کہ انھوں نے اسے کس کس طرح کی اذیتیں دیں۔ اس کی انگلیوں سے ناخن کس طرح کھینچے گئے، اسے کتنے گھنٹے برف کی سل پر لٹایا گیا اور کتنی مرتبہ بجلی کے جھٹکے دیے گئے۔

تب میں نے جانا کہ وہ ہلاک ہونے سے مہینوں پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ اسے چوپایوں کی طرح چلنے پر مجبور کیا گیا اُسے برہنہ کر کے غلاظت کے تالاب میں غوطے دیے گئے، پیروں میں رسی باندھ کر اور کلائیوں کو آہنی حلقوں میں جکڑ کر چھت سے لٹکایا گیا۔

اذیت، ہر وہ اذیت جو صرف ایک انسانی ذہن ہی سوچ سکتا ہے اُسے اور اُس کے ساتھیوں کو دی گئی صرف اس لیے کہ وہ ان حکمرانوں سے اختلاف رکھتے تھے جنھوں نے انسانوں پر جینا حرام کر رکھا تھا۔ یہ حکمران جن کا خیال تھا کہ وہ زمین پر خدا کے نائب ہیں اور خدا کے نائبین سے زیادہ بھلا اور کون عدل کر سکتا ہے، سو انھوں نے بھی عدل کیا

سزاؤں کا نگرانِ اعلیٰ اندر بیٹھا تھا اور ہنس رہا تھا، جس کی نگرانی میں ان سب لوگوں کو سزائیں دی جا رہی تھیں جن پر دنیا کی ہر راحت حرام تھی اور جب ان پر عقوبت کا ہر در کھلا تھا، انہی دنوں میں نے اس عقوبت کے نگراں کا ہر شام بے تابی سے انتظار کیا تھا اور ہر شب، شب بسری کی تھی۔

کتنے ہی کتابچے، رپورٹیں میری نگاہوں میں تھے INTERNATIONAL PROTECTION OF HUMANRIGHTS ایمنسٹی کی رپورٹ آن ٹارچر۔ اقوام متحدہ کا UNIVERSAL DECLARATION OF HUMANRIGHTS جس پر بیشتر شہر کے سابق و موجودہ حکمرانوں کے دستخط تھے جس کی پہلی شق یہ تھی کہ تمام انسان آزاد پیدا ہوتے ہیں اور وہ یکساں حقوق اور مساوی رتبے کے حقدار ہیں جس کی نویں شق یہ تھی کہ . . . لیکن صرف پہلی اور نویں شق کا ہی ذکر کیوں؟ اس دستاویز کی تیس شقیں تھیں اور نہ جانے

کتنی دبلی شفقیں۔ تو کیا اس دستاویز پر دستخط کرنے والوں کے اندر کبھی کسی سوال نے سر نہیں اٹھایا تھا۔
ایسے سوال اور ان کے جواب ضمیر کی کھیتی میں اکھوے کی طرح پھوٹتے ہیں اور ضمیر کی کھیتی سفید محل میں رہنے والے لال دیوتاؤں کے ہاتھ گروی رکھ دی گئی تھی جن کی آنکھیں نیلی تھیں اور جن کے بدن تانبے کے رنگ کے تھے۔

میرے چاروں طرف آوازیں تھیں، آگ تھی اور دھواں تھا۔ خون کی اور سڑتے ہوئے گوشت کی بساند تھی۔ مجھے ابکائی آئی اور جو کچھ بھی میرے اندر سڑا ہوا تھا باہر آ گیا۔ سڑا ہوا ذہن اس اذیت ذہنی کے عوض ملنے والے روپوں سے خریدا گیا۔ میں اس سڑتے ہوئے رزق کے پاس بیٹھی رہی۔

میں جانے کتنی دیر تک بیٹھی رہی پھر ہمت کر کے اٹھی اور اپنی خواب گاہ میں چلی گئی۔ میں نے پانی سے اس سڑتے ہوئے رزق کو دھو دیا لیکن ابھی تو بہت کچھ میرے اندر تھا۔ ابھی تو میرے اندر ایک عزیز از جان رشتے کی مسخ لاش تھی۔

میں نے اپنے ہونٹوں پر سے لپ اسٹک صاف کی اور آئینے میں مجھ کو اپنا ہاتھ نظر آیا۔ یہ ہاتھ جو مر جانے والے، موجود اور پیدا ہونے والے، دنیا کے تمام انسانوں کے ہاتھوں کی طرح کھال، چربی دار خلیوں، نسوں، پٹھوں، خلیوں، ہڈیوں اور جوڑوں سے بنا تھا۔ یہ ہاتھ جس کا اختتام تمام دنیا کے انسانی ہاتھوں کی طرح انگلیوں پر ہوا تھا۔
میں نے آئینے میں اپنی انگلیوں کو دیکھا۔ سبک اور سڈول انگلیاں، مخروطی ناخن اور ان پر دمکتی ہوئی ہلکی گلابی نیل پالش، سورج کی انگلی پر سفید اوپل تھا اور اس کی دودھیا سفیدی میں قوس و قزح میں سات رنگ جھلکتے تھے۔

پھر وہ انگلیاں میری نگاہوں میں گھوم گئیں جنھیں میں نے کئی برس پہلے دیکھا تھا۔ توانا اور مردانہ انگلیاں۔ صاف اور ترشے ہوئے ناخنوں کے نیچے سے خون کی سرخی جھلکتی ہوتی۔ مشتری اور زحل کی انگلیوں کی پہلی پوروں کے کنارے سگریٹ کے دھوئیں سے زرد۔ وہ انگلیاں کتابوں کے صفحے الٹ رہی تھیں اور وہ ہونٹ ان صفحات پر لکھے ہوئے الفاظ کی ادائیگی میں مصروف تھے۔

وہ آخری موقع تھا جب میں نے ان انگلیوں کو متحرک دیکھا اور ان ہونٹوں کو بولتے ہوئے سنا۔ مجھے آج معلوم ہوا تھا کہ سیاہ بالوں سے ڈھکے ہوئے وہ توانا ہاتھ جب رخصت ہوئے تو محض کھپچیاں رہ گئے تھے، ان ستموں اور حساس انگلیوں اور صحت مند گلابی ناخنوں کی جگہ ٹھٹھری ہوئی کچلی ہوئی بے ناخن انگلیاں تھیں۔
وہ انگلیاں جو شعر لکھتی تھیں جنھوں نے تاریخ کی جدلیاتی تعبیر پر کتاب لکھی تھی، اپنے عہد کی صدی کے خد و خال اجاگر کیے تھے، وہ انگلیاں خاک کا رزق ہوئیں۔

ڈرائنگ روم سے ایک بار پھر BONEHM کی آواز آئی HE WAS STEPP'SWOLF میں کسی معمول کی طرح اٹھ کھڑی ہوئی۔ میری نگاہوں میں اس سترے کا توانا بدن کھنچ گیا جسے میں نے لذتوں کا راتب کھلایا تھا۔
اب میں ڈرائنگ روم کی محراب کے نیچے سایہ سی کھڑی ہوئی ہوں۔ ان لوگوں نے میری موجودگی کو محسوس

بقیہ ص ۳۵

غزلیں

تاج دار عادل

ہر ایک چہرے پہ دل کو گماں اس کا تھا
بسا نہ کوئی یہ خالی مکان اس کا تھا

میں بے جہت ہی رہا اور بے مقام سا وہ
ستارہ میرا سمندر نشان اس کا تھا

میں اس طلسم سے باہر کہاں تلک جاتا
فضا کھلی تھی مگر آسمان اس کا تھا

سلیقہ عشق میں جاں اپنی پیش کرنے کا
جنھیں بھی آیا تھا ان کو ہی دھیان اس کا تھا

پھر اس کے بعد کوئی بات بھی ضروری نہ تھی
مرے خلاف سبھی وہ بیان اس کا تھا

ہوا نے اب کے جلائے چراغ رستے میں
کہ میری راہ میں عادل مکان اس کا تھا

زخم لکھوں کہ ماجرا لکھوں
یاد آیا ہے وہ تو کیا لکھوں

حوصلہ زندگی کا کیا لکھوں
بھول جانے کا مرحلہ لکھوں

شدتِ عشق کا تقاضا ہے
قربتوں کو بھی فاصلہ لکھوں

اس کی ہمراہی کو بیاں کر دوں
یا کسی خاک سے ہوا لکھوں

دل کی خواہش ہے اس کے چہرے پر
اپنی تنہائی کی دعا لکھوں

اک دیے کی مزاحمت دیکھوں
یا ہواؤں کا فیصلہ لکھوں

خواہشوں کے ہجوم کو عادل
اس کے رستے کا قافلہ لکھوں

نجمہ شہریار

واپسی — ایک مطالعہ

(نوٹ۔ اصل کہانی سب رس کے شمارہ نومبر ۱۹۸۲ء میں شائع ہو چکی ہے ذیل میں اس کہانی کا تجزیہ پیش ہے)

کہانی کی وہ تعریف کہ "یہ کسی ایک خاص لمحہ کو گرفت میں لانے کا نام ہے — وہ تیزی سے بہتے ہوئے لمحے جو عموماً گرفت میں مشکل سے آتے ہیں ان کو لازوال بنانا، ان کو بیان کرنا کہانی کا اصل مقصد ہے" بہت قابل قبول ہے کیونکہ کہانی بذات خود شعر بن جاتی ہے اور اس طرح تبصرے یا تجزیے درجے کی صنف سخن" کے الزام سے خود کو بچا لے جاتی ہے۔ ای۔ ایم۔ فارسٹر کی یہ کہانی ایک ایسی ہی کہانی ہے۔ یہ دو مختلف سطحوں پر پڑھی جا سکتی ہے وہ سطحیں جو کسی بھی عظیم فن پارے کی بہترین کسوٹی ہیں کہ — اس سے بچے یا عام قاری بھی محظوظ ہو سکتے ہیں ساتھ ہی مشکل پسند یا پیچیدہ ذہن رکھنے والے بھی اس میں جہان معنی پیدا کر سکتے ہیں — یہی فن کی معراج ہے۔ شاید شیکسپیئر اور اس کے بعد کولرج اور ورڈزورتھ اسی لیے دنیا کے عظیم فنکاروں میں سے ہیں!

اس علامتی کہانی میں دور جدید کے انتشار اور مادیت، روحانی قدروں اور انسانی رشتوں کو پیش کیا گیا ہے ساتھ ہی وجدان اور عقل کے مابین جو کشمکش ہے اس کی طرف بھی اشارے کیے گئے ہیں۔ یہ کہ موت انسان کو تباہ کر دیتی ہے لیکن اس کا تصور اس کو زندگی بخشتا ہے اور یہ بھی کہ زندگی ایک مسلسل بہتا ہوا چشمہ ہے جو اپنی راہیں تو بدل سکتا ہے پر رکتا نہیں!

اس کہانی میں مرکزی کردار اور اس کے ساتھیوں کے مابین ایک تضاد ملتا ہے۔ مسٹر لوکس جو ایک سیدھے اور سادہ لوح انسان معلوم ہوتے ہیں ان میں سمندروں کی گہرائی ہے ان میں وہ معصومیت ہے جس کو کہ ورڈزورتھ اور بلیک دونوں نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا تھا۔ مسٹر لوکس کے دل میں فطرت کی سچی محبت سمائی ہوئی تھی۔ وہ ایک عارفانہ تجربے کے ذریعے قدیم یونان کی روحانیت کو پا لیتے ہیں۔ پس اگر ان میں کمی تھی تو یہ کہ وہ اپنے ساتھیوں کی طرح اتھلے پانیوں میں تیرنے سے قاصر تھے۔ وہ ساتھی جو سطحی بھی تھے، پر تصنع ریاکار اور دنیا دار بھی جو کہ لوکس کے قدرتی حسن کے بارے میں چرب زبانی سے بات تو کر لیتے ہیں۔ اس جگہ کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے تو ملا سکتے ہیں لیکن جن میں احساس کی شدت اور معصومیت کا فقدان ہے وہ ساتھی مسٹر لوکس کے گہرے احساسات کو سمجھنے سے قاصر تھے اور اسی لیے لوکس عدم گویائی کا شکار ہوئے یوں وہ آج کے جدید انسان کی بہترین نمائندگی کرتے ہیں جو احساس تنہائی کا شکا

ہے۔ عام ذہن یا COMMN SENSE کے لیے جو زندگی ہے وہ مسٹر لوکس کے لیے موت کے مترادف ہے۔ حالانکہ وہ زندہ رہتے ہیں لیکن روحانی موت مر چکے ہیں۔

مسٹر لوکس کو سمجھنا ان کے کھوکھلے اور سطحی ساتھیوں کے بس کی بات نہ تھی۔ ان کو خوب الّو بنایا گیا۔ وہ سب کچھ سمجھتے رہے پر انجان بنے رہے اور یوں بظاہر بیوقوف بن کر بیوقوف بناتے رہے، وہ عدم گویائی کا شکار ہوئے جو کہ تمام انسانی رشتوں کے ٹوٹنے کی علامت ہے لوکس یہ سمجھ کر ان کے محسوسات کو کوئی سمجھ نہیں رہا ہے خاموشی کو ترجیح دیتے ہیں اور جو کچھ بولتے ہیں وہ بھی زبردستی جب کر وہ جذبات کی غیر معمولی شدت، معصومیت سادگی اور خلوص کی وجہ سے اپنے تمام مادیت پرست ساتھیوں سے برتر ہیں جس کو دیکھ اور سمجھ کر ورڈزورتھ کا ایک سانیٹ THE WORLD IS TOO MUCH WITH US یاد آتا ہے۔

ورڈزورتھ اور بلیک دونوں کی شاعری میں معصومیت اور تجربے کے درمیان ایک تضاد اور کشمکش کا احساس ہوتا ہے۔ کہانی کا موضوع معصومیت اور تجربے کی باہمی کشمکش ہے مسٹر لوکس معصومیت اور ان کے ساتھی تجربے یا EXPERIENCE کے علمبردار ہیں یہاں لفظ "تجربہ" دنیاداری کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

اوڈی پس OEDI PUS کی روایت LEGEND کا اس کہانی سے براہ راست تعلق ہے۔ اوڈی پس لوکس سے مماثلت ہے اور انٹی گنی کو اسیحل سے۔ اوڈی پس کی پوری زندگی ایک علامت ہے روح کی آلودگی اور بعد تپاسیہ کے ذریعہ اس روح کی نجات یا DELIVERANCE کا مسٹر لوکس ایک سیاح کی حیثیت سے یونان آئے تھے۔ انھیں ہمیشہ یہ محسوس ہوتا رہا تھا کہ انگلستان کی مادی زندگی نے ان کی شخصیت کو پارہ پارہ کیا ہے، ان کی روح میں زہر گھول دیا ہے۔ لوکونس میں آکر اس کو محسوس ہوتا ہے جیسے ان کی خوابیدہ روح جاگ گئی ہو، بیدار ہو گئی ہو . . . . . ایک عالم حیرت میں وہ ادھر ادھر گھومتے ہیں۔ اس خشک جگہ پر بہتا ہوا پانی زندگی کی زرخیزی کی علامت بن جاتا ہے۔ بہتے ہوئے پانی کا ترنم اور موسیقی اپنے اندر گہرے معانی رکھتی ہے۔ یہ ہم اس لمحے کی یاد دلاتا ہے جب کہ اوڈی پس نے اچانک اپنے گناہ کبیرہ کو یاد کیا تھا۔ اب اس جگہ پر وہ ایک بکسر ملامت انسان ہے۔ وہ سینہ کوبی کرتا ہے کہ شاید اس کا ماسف تھیبس کے باسیوں کو سکون بخش دے۔

مسٹر لوکس پیڑ کے تنے کے اندر TRANCE کی اس کیفیت میں اسی روحانی ارتقا کو پہنچتے ہیں۔ کون جانے ان کا فرار کوکونس میں تن سکے گا نہیں ــــ لیکن ان کے نصیب میں تو انگلستان واپس جا کر اس اچھوتے تجربے کو یکسر بھول جانا تھا ــ کہ یہی ان کا المیہ تھا۔ اس کہانی کا تعلق پوسی ڈان (POSEIDON) سے بھی ہے جو کہ یونانی اساطیر کے مطابق زلزلوں کا دیوتا ہے۔ وہ زمین کو ہلانے والا ہے اور اسے زرخیز بناتا ہے۔ کہانی پڑھتے وقت ہم شقائق النعمان اور سوسن کے پھولوں کی مہک سونگھتے ہیں اور بہتے پانی کی موسیقی سنتے ہیں بنجر زمین۔ اوڈی پس اور ساتھ ہی مسٹر لوکس کی روح کے بنجر پن کی علامت ہے۔ اور یہ چشمہ آتا ہے جو کہ زندگی کی علامت بن جاتا ہے۔ــ نرمی سے بہتا پانی اپنی راہیں بدلتا چشمۂ زندگی۔ مسٹر لوکس صرف اپنے گرد و پیش کے حسن سے باخبر تھے۔ ان لمحات میں جب کہ وہ درخت کے کھوکھلے تنے کے اندر بے حس و حرکت کھڑے تھے۔ ان کو محسوس ہو رہا تھا جیسے ان کی روح اس ہستی میں تحلیل ہو رہی ہو

جو ساری کائنات میں جاری و ساری ہے اور وہ اس لازوال حقیقت کا ادراک کر رہے ہوں جو عقل انسانی کی حدود سے پرے ہے۔ وہ حقیقی صداقت کے متلاشی تھے اور اس کے لیے انھوں نے جو راستہ اختیار کیا تھا وہ دھیان یا مراقبے کا راستہ تھا۔ وہ لمحہ جب کہ وہ ایک جذب کی کیفیت سے سرشار تھے۔ ان پر حیرت و تحیّر کے . . . . جذبات طاری تھے۔ کہانی کا وہ حصہ پڑھ کر ہم کو ورڈز ورتھ کی عظیم نظم TINTERN ABBEY کی یاد آتی ہے جس میں ایک جگہ شاعر کہتا ہے :-

میں فطرت کا نہ دل سے ممنون ہوں
جو مختلف پیرائے میں میری مدد کرتی ہے
اور مجھے ان لمحات سے دوچار کرتی ہے
جب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے
ایک انجانی ان دیکھی دنیا کا راز
مجھ پر منکشف ہو رہا ہو۔
اور مجھے لگتا ہے
جیسے فطرت کے حسن میں
میرا جسم تحلیل ہو رہا ہو
جیسے میرے خون کی گردش رک گئی ہو
ایسے لمحات میں ہم جسمانی طور سے سو جاتے ہیں
اور ایک زندہ مجسم روح میں تبدیل ہو جاتے ہیں"

مسٹر لوکس کو بھی ان لمحات میں (جب کہ وہ درخت کے تنے میں بے حس و حرکت کھڑے تھے جیسے انھیں سکتہ ہو گیا ہو) محسوس ہو رہا تھا جیسے ان کی روح مجسم ہو گئی ہو، جیسے ہر شے کے معنی بدل گئے ہوں اور ان میں چیزوں کے آر پار دیکھنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہو جسے کہ TRANSCENDENCE کہتے ہیں۔ ان لمحات میں انھوں نے ساری دنیا اور زندگی کی اصل روح کو پہچان لیا تھا ۔۔۔!

مسٹر لوکس کی یہ خواہش کہ وہ اس فردہ گاہ میں ایک مکمل انسان کی شبیہہ آویزاں کریں اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ ان کے اندر اپنی ذات کی تکمیل کی شدید خواہش اور آرزو ہے۔ نہ جانے کتنے عرصہ کے بعد ان کو یہ محسوس ہوا تھا کہ وہ ایک مکمل انسان ہیں جیسے ہر چیز ان کے لیے بامعنی ہو گئی ہو سرائے کے وہ غریب باسی ان کو بہت دلکش اور محبوب معلوم ہو رہے تھے اور ایسا اس لیے ہوا کہ وہ اب پرسکون تھے۔

موت انسان کو تباہ کرتی ہے لیکن اس کا تصور اس کو زندگی بخشتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ مسٹر لوکس کو یہ سبھی

اڈیپس لےجایا جاتا دراصل ان کو اس نجات یا SALVATION سے محروم کرنا تھا جو وہ حاصل کرنے جا رہے تھے ہم مسٹر لوکس کی ہار پر کف افسوس ملتے رہ جاتے ہیں جیسا کہ کہانی کے اصل عنوان ROAD FROM COLONUS کے ادا اس لفظ "FROM" سے ظاہر ہوتا ہے۔ اگر وہ رک گئے ہوتے تو موت کی آغوش میں پہنچ کر ابدی سکون حاصل کر لیتے۔

موت کا تصور ان کے لاشعور میں تھا۔ اس جگہ پران کو محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ایک تیراک ہوں جو طوفانی سمندروں سے جنگ کر رہے ہوں اور پُر امید ہوں کہ بالآخر ان کو سمندر کی لہریں کنارے کی طرف لے جائیں گی۔ اُسی سکون کے لمحے میں وہ مرجانا چاہتے تھے تاکہ وہ لمحہ لافانی بن جائے۔ اوڈی پس بھی اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں اسی جگہ پر آیا تھا (جب کہ وہ اندھا ہو چکا تھا) تاکہ وہ اپنے اس گناہ کی تلافی کر سکے جو لاعلمی میں اس سے سرزد ہوا تھا۔ اس کا سارا غصہ، غرور، تمکنت اس جگہ آکر ختم ہو گیا تھا اسے احساس تھا کہ اس کی موت کا لمحہ قریب آپہنچا ہے اور یہ کہ وہ اس مقدس کنج میں موت سے ہمکنار ہونے آیا ہے اسی احساس اور اس تلافی کے ذریعہ ہی وہ اپنے کھوئے ہوئے وقار کو حاصل کر رہا ہے۔ مسٹر لوکس میں اوڈی پس کا وہ المیاتی دبدبہ تو نہیں اور نہ ہی ان کی موت اس جگہ پر کوئی اہم واقعہ ہوتی۔ تاہم وہ عارفانہ لمحہ جس سے وہ گزرے جب کہ ان کو موت کے تجربے کا احساس ہوا، اور جسے انھوں نے قبول کیا ان کو بہت بلند کر دیتا ہے۔

انگلستان پہنچ کر مسٹر لوکس پھر وہی پہلے جیسے غصہ ور اور چڑ چڑے بوڑھے کی صورت اختیار کر لیتے ہیں جسے پھول سے نفرت ہے، جسے گیت گاتا ہوا نوجوان زہر لگتا ہے جسے بہتے ہوئے پانی سے بیزاری ہوتی ہے۔ وہ اپنے اس پُر اسرار عارفانہ تجربے کو بالکل فراموش کر چکے ہیں۔ اس تجربے کا فراموش ہوجانا ایک زبردست المیہ ہے۔ اس پورے ماحول میں جس میں کہ وہ جسمانی طور پر زندہ ہیں جن جن چیزوں نے یونان میں اپنے معانی بدل دیئے تھے اب وہی چیزیں یہاں انگلستان میں ان کے لیے بے معنی اور فضول ہیں مسٹر لوکس گو کہ جسمانی طور سے زندہ ہیں لیکن روحانی موت مر چکے ہیں اور ان کی بیٹی اس روحانی موت سے مسرور ہے۔ دراصل ہم سب کا المیہ یہ ہے کہ ہم معصومیت سے عاری ہیں اور نالاں بھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور یہ کہ ہم کو اپنا بچپن یاد نہیں رہتا۔

کہانی کی ایک اہم خوبی اس کی تہ داری اور پیچیدگی ہے جتنی بار پڑھو ایک جہان معنی ملتا ہے نئے نئے اسرار منکشف ہوتے ہیں۔ یہ عارفانہ تجربہ فارسٹر کا دراصل اپنا ذاتی تجربہ تھا جو کہ ایک بار یونان میں ان کو ہوا تھا۔ تجربہ چونکہ ذاتی تھا اس میں خلوص سچائی اور گہرا تاثر نمایاں ہے۔

فطرت کے مختلف مناظر، بہتا ہوا پانی، پھول ہمارے سامنے مختلف تعاویر پیش کرتے ہیں اور فارسٹر ہمارے سامنے ایک عارف کی صورت میں آتے ہیں۔ ورڈز ورتھ اور بلیک کے ساتھیوں کو ملوس لیے۔

یہ کہانی ہمارے دور کا المیہ ہے، یہ دور جو اجنبیت اور تنہائی کا دور ہے کہ ہم نے اپنے بچپن کو

(بقیہ صفحہ پر دیکھئے)

نظام الدین نظامؔ

آخری دوست آخری شکار

دو پہاڑوں کے ٹکرانے کا منظر عجیب ہے
دریا چھلک پڑے
آبشار منتشر ہو چکا ——— اور
ہوائیں چنگھاڑنے لگی ہیں
کون جانتا ہے کہ خدا برہم کیوں ہے ؟
اپنے جسم کے تاریک ——— غار میں،
ہم سب قید ہیں
ہماری روحیں دیواروں سے سر ٹکراتی پھرتی ہیں
دریا ——— آبشار ——— ہوائیں،
خدا کے عذاب کی زد میں ہیں
اور
جسم کے غار میں ایک آواز گونجتی ہے
"خذا من فضل ربی"
——— آواز روشنی ہے
روشنی رہنما ہے
ہم سب روشنی کے پیچھے چلنے والے سائے ہیں
——— اور سائے مر بھی سکتے ہیں۔
روشنی ہمیشہ رہے گی۔
ہمارے بعد بھی ——— ہم سے پہلے بھی تھی۔
دو پہاڑوں کے ٹکرانے کا حادثہ نیا نہیں ہے۔
آسماں گواہی دے گا،
زمین شاہد ہے۔
——— اور پھر یہ حادثہ،
آخری بھی نہیں۔
حادثہ کبھی آخری نہیں ہوتا
ہاں، شاید
یہ بنی نوع انسان کی آخری نسل ہے
ہمارے بعد کون آئے گا ؟
ہمارے بعد کون آسکتا ہے ؟
زمین کے آخری دوست،
آسمان کے آخری شکار،
ہمیں تو ہیں۔

ساجدہ عابد

دردِ پنہاں

آج فضا ابر آلود ہے اور کالے بادلوں کے جھنڈ نیلے آسمان پر آہستہ آہستہ بغیر کسی آہٹ کے جمع ہو رہے ہیں بالکل اُن آوارہ لڑکوں کی طرح جو اِدھر اُدھر شرارتیں کرتے اور دندناتے پھرتے ہیں۔ باوجود بارش ہونے کے بھی فضا گھٹی گھٹی سی لگ رہی ہے۔ ہوا کے تیز و تند جھونکے چل رہے ہیں جس کی وجہ سے فضا میں مٹی کے بگولوں سے ہر طرف غبار سا اٹھ رہا ہے اور ایسا ہی ایک غبار میرے ذہن پر چھایا ہوا ہے جو رہ رہ کر جھلکنے والی حسین یادوں کا ایک مدفن بن گیا ہے۔ یادوں کے اس مدفن میں روشنی کی ایک کرن نظر آجاتی ہے تو میں لرز اٹھتی ہوں، پریشان ہو جاتی ہوں زندگی کی طویل مسافت طے کرنے کے بعد بھی میرے ذہن میں دنیا کی چبھنے والی نگاہوں کا خوف ابھی باقی ہے جو باوجود کوشش کے بھی اب تک میرے دل سے دور نہیں ہو سکا ہے۔

میں اپنے کمرے پر نظر ڈالتی ہوں۔ ہر طرف دواؤں کی شیشیاں اور نسخوں کے پلندے پڑے ہیں جن کو دیکھ کر میرا دل ڈوبنے لگتا ہے اور دل چاہتا ہے کہ میرے دل کی ویران بستیوں میں ایک بار پھر سوئی ہوئی یادوں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگا دوں۔ میں اپنے پلنگ پر بیٹھی ہوئی آسمان کی طرف دیکھنے لگتی ہوں اور چاہتی ہوں کہ اپنے جلتے ہوئے دل کے الاؤ کے قریب بیٹھ کر اپنی تھکی ہوئی زندگی میں ایک بار پھر سے نئی جان ڈال دوں، مگر مضمحل اور تھکی ہوئی روح کی تھکان بھلا تنہائی کے اکتا دینے والے وقت سے بھی کہیں دور ہو سکتی ہے؟

اتنے میں مینا میرے پاس آتی ہے میرے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں دوا کی گولی تھماتے ہوئے کہتی ہے۔

"نانی اماں گولی کھا لیجئے۔ پانی کا گلاس یہاں رکھا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ چلی جاتی ہے۔ میں اسے پکارتی ہوں۔ "مینا میری بچی۔ آج مجھے کمزوری بہت ہے ذرا پانی پلا دینا۔"

اور وہ بڑی بیزارگی سے گلاس اٹھاتی اور پانی سے بھرتی ہے اور میرے منہ کے قریب لاتی ہے۔

"نانی اماں جلدی سے یہ گولی کھا لیجئے اور بس آرام سے لیٹ جائیے۔" آرام یہ لفظ میرے لیے کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ بیماری اور تنہائی میں آرام ایک زہریلے سانپ کی پھنکار لگتا ہے جو بار بار انسان کو ڈستا ہے بھلا ذہنی بیمار کے لیے پلنگ پر بنا کسی کام کے پڑا رہنا اور آرام لینا ایسا ہی ہے جیسے مشرق کو مغرب سے ملا دینا۔

اس نے مجھے پانی پلایا اور دندناتی ہوئی سیڑھیاں اترنے لگی۔ مینا میری نواسی جسے اس کی ماں کے مرنے کے بعد

میں نے ہی پالا پوسا اور بڑا کیا تھا جو آج میری تنہائی کی ساتھی ہے اور تیمار دار بھی ——

"منا میری بچی مجھے یوں اکیلا چھوڑ کر نہ جا" وہ بلکتی ہے اور میں بڑی بیزارگی سے بگڑے ہوئے لہجہ میں کہتی ہے۔ نانی اماں آپ خواہ مخواہ چیختی رہتی ہیں۔ آپ کو کچھ بھی تو نہیں ہے۔ ڈاکٹر نے صرف آرام لینے کے لیے کہا ہے۔" ہاں۔ میری بچی ڈاکٹر ہر مرض کا علاج کر سکتا ہے مگر بڑھاپے کا نہیں۔"

اور مجھے ایسا وہ پچھلا زمانہ یاد آجاتا ہے جب میری ماں کے گزر جانے کے بعد میری نانی اماں بھی اسی طرح دن رات بستر پر پڑی رہتی تھیں اور اپنے ہر کام کے لیے مجھے ہی بلایا کرتیں —— جس طرح میں مینو کو بلاتی ہوں۔ میری مینو بہت اچھی ہے پر میں الھڑ اور کھلنڈری تھی میں اپنا کافی وقت کھیل کود میں دیا کرتی اور جب کبھی نانی اماں بلاتیں تو میں بجائے ان کے بڑھاپے پر رحم کھانے کے انہیں اپنے لیے ایک بوجھ سمجھتی۔

واقعی جوانی اندھی ہوتی ہے اور اس اندھیرے میں حقیقت کہیں چھپ کر انسان کو دھوکہ دیتی اور بھٹکاتی ہے جوانی اندھے کی لاٹھی بن کر اسے راستہ نہیں دکھلا سکتی۔ انسان اسی لاٹھی کو پکڑے سچائی کو ٹٹولتا رہتا ہے اور سچائی کو پانا اس کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ ایک دن نانی اماں بیمار ہوگئیں اور مجھے پکارا۔

بیٹی پیاس لگی ہے پانی تو لانا۔ اور میں بڑی بے دلی سے انہیں پانی پلا آئی۔ نانی اماں اس دن کمزور لگ رہی تھیں —— پھر انہوں نے پکارا ——

"بیٹی مجھے دوا تو دینا ——"

میں نے بڑی بیزارگی سے کہا تھا" نانی اماں اپنے کام کے لیے کسی ملازم کو کیوں نہیں رکھ لیتیں"۔

"تیرے ہوتے ہوئے کسی کی کیا ضرورت ہے بیٹی"

اور میں نے کہا تھا" نہیں نانی اماں مجھ سے بوڑھوں کی خدمت نہیں کی جا سکتی۔ دیکھئے نا مجھے اپنی دوست کے ہاں دعوت میں جانا تھا آپ کی وجہ سے دیر ہوگئی۔"

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ یہ جواب سن کر ان کا چہرہ سوت گیا جیسے رسی کسی کنویں کے بیچ میں ہی اٹک کر رہ گئی ہو۔ انہوں نے سرد آہ بھری اور کہا تھا" کاش! آج تیری ماں زندہ ہوتی" اور آنسو ان کی پلکوں سے جھر جھر کر نیچے گرنے لگے —— ان کی آواز ان کے گلے میں رندھ گئی۔

خدا کسی کو بوڑھا نہ کرے —— میں نے خدا سے التجا کی —— دنیا جوانوں کے لیے ہے بوڑھوں کے لیے نہیں — دھرتی پر بڑھاپا ایک بوجھ کے سوا اور کچھ نہیں —— میں اپنے خیالات میں کھو سی جاتی ہوں۔ ایک آواز مجھے چونکا دیتی ہے۔

"آپ کیا سوچ رہی ہیں نانی اماں"

"کچھ نہیں بیٹی۔ انسان ہمیشہ مایوسی میں اپنے ماضی کی طرف دیکھتا ہے"

"چھوڑیئے بھی پچھلی باتوں کو۔ زندگی صرف حال کے لیے ہی ہے اور مستقبل نگاہوں سے پوشیدہ ہے"

"بڑی فلسفی بن گئی ہے میری بیٹی" اور وہ اچھل کر میرے قریب آجاتی ہے۔
"آپ جانتی ہیں آج مجھے کس کا انتظار ہے" ؟
"ریاض" میرے منہ سے نکلتا ہے — اور وہ شرما جاتی ہے۔ ریاض اس کے بچپن کا ساتھی جو بمبئی کی ایک فرم میں انجینئر ہے۔ ریاض جسے مینا نے بچپن سے چاہا اور ریاض نے اسے۔ کیا وہ واقعی آج آرہا ہے۔
ہاں نانی اماں۔ اور رینو کے گال حیا کی سرخی سے لال ہو گئے — سر کو ایک جھٹکا دے کر خوشی سے پھولی نہ سماتی ہوئی وہ بڑے بڑے ڈگ بھرتی سیڑھیوں سے نیچے چلی گئی — اسے ریاض کا انتظار ہے۔
کاش زندگی میں انتظار کی اتنی کٹھن گھڑیاں نہ آئی ہوتیں — لیکن نہیں شاید زندگی کا دوسرا نام انتظار ہے۔ دنیا میں انسان کو بہت سی باتوں کا انتظار رہتا ہے۔ محبوب کا انتظار۔ اس کو پانے کا انتظار۔ اس سے ملنے کا انتظار — آرام و سکون کا انتظار اور شاید موت کا بھی — اس موت کا مجھے بھی بے چینی سے انتظار ہے جو شاید مجھے دکھ دے دے کر آئے گی۔ میرا سکھ چین چھین کر آئے گی۔ اور تڑپا تڑپا کر آئے گی۔ مجھے اس گھڑی اور پل کا کتنا انتظار ہے جو مجھے زندگی کی پیہم ناکامیوں کے شدید احساس سے ہمیشہ کے لیے نجات دلا دے۔ اور مجھے پھر سہیل کی یاد آنے لگی۔ بھلانے کے باوجود میں اسے بھلا نہ سکی۔ اس کی تصویر آج بھی میری نگاہوں میں گھومتی پھری پیہم ناکامیوں کا مذاق اڑا رہی ہے۔ اتنے سال گزر جانے کے باوجود میرے ذہن پر اب بھی اس کا نام چھایا ہوا ہے۔
سہیل جس نے آسمانی شہزادے کی طرح میری زندگی میں قدم رکھا تھا جس نے مجھے سب کچھ دیا۔ محبت دی زندگی دی — اور زندگی کی ایک نشانی بھی دے دی رینو — میری اکلوتی بیٹی۔ اور آسمان کے اس شہزادے نے رینو کو دے کر مجھے ایک اور چیز بھی دی — دھوکہ — ناکامیوں کا — زندگی کا دھوکہ — وہ آسمانی شہزادہ کی طرح دندناتا ہوا آیا اور دندناتا ہوا آسمان کی بلندیوں میں کہیں کھو گیا اور مجھے زندگی کے دوراہے پر اکیلا چھوڑ کر چل دیا اپنی دوسری دنیا بسانے کے لیے — کہہ کر گیا کہ وہ کسی ٹریننگ کے لیے جا رہا ہے چند ماہ بعد آئے گا — لیکن وہ نہیں آیا۔ چند سال تک اس کے خطوط آتے رہے بعد میں وہ بھی بند ہو گئے — سنا کہ اس نے دوسری شادی کر لی۔ وہ کہاں ہے۔ کیسا ہے ؟ معلوم نہ ہو سکا۔ ادھر میں انتظار کی گھڑیاں کاٹتی رہی۔ زندگی کی طویل مسافت کیسے طے ہوتی یہ میں ہی جانتی ہوں۔ رینو بڑی ہوئی۔ بیاہ ہوا۔ اور رینو کو میرے سہارے چھوڑ کر وہ بھی اس دنیا سے چل بسی۔ ہمیشہ ہمیشہ کے [illegible]
اور انتظار کرنے کے لیے کہ کب میں اپنی رینو سے جا ملوں۔ لیکن رینو کے پاس ہی میں جا سکی [illegible]
[illegible] غم کے انتہا [illegible] ہو [illegible] چلی گئی، دل کی گہرائیوں میں [illegible] ایک آواز [illegible]
[illegible] اس کی وارث ہو تم اس وقت تک نہیں مروگی جب تک کہ اس کا ہاتھ کسی کے ہاتھ میں نہ دے دو"
میں کانپ اٹھی۔ میں جو سدا بیمار رہتی ہوں۔ پلنگ میری زندگی ہے۔ دوائیں میری غذا۔ میرا نحیف و نزار جسم

اور کمزور روح اس بوجھ کو کیسے اتار سکے گی۔

آوارہ بادل آسمان پر جھکے جھکے سرگوشیاں کر رہے ہیں۔ بادلوں میں چھپا ہوا سورج اب آہستہ آہستہ باہر نکلا دنیا کو دیکھ رہا ہے۔ میری یادوں کے تانے بانے بکھرتے جا رہے ہیں۔ آج کی فضا مجھے بھی بہت کچھ کہہ دینے پر مجبور کر رہی ہے

کمرے میں سلو جا رہی ہے۔ مینا جاگ چکی ہے۔ اسے ریاض کا انتظار ہے وہ آج گھر کے کونے کونے سے گرد صاف کر رہی ہے تاکہ خاک اور گرد کا کہیں نشان باقی نہ رہ جائے۔ باغ کے گملوں سے پھول توڑ توڑ کر گلدان میں سجا رہی ہے، پلنگ پر نئے دھلے ہوئے بیڈ شیٹ بچھا رہی ہے۔ باورچی خانہ سے پلاؤ کی خوشبو کی مہک آرہی ہے۔ ریاض آرہا ہے۔ اور بس ریاض کا اسے انتظار ہے وہ بنگلے میں اپنی ماں کے سونے کا ہار پہنے ادھر سے ادھر تتلی کی طرح اڑ رہی ہے۔ بالوں میں گلاب کا پھول لگائے کتنی دلفریب لگ رہی ہے وہ میری بیٹی۔ ہو بہو میری طرح۔ میری بیٹی۔ ہو آج زندہ رہتی تو اپنی بیٹا جیسی منو کو دیکھ کر کتنی خوش ہوتی۔ اور بیچ لوری بھولی بھالی سے قریب آتی ہے۔ اس کا چہرہ مستقبل کی بھیانک حقیقتوں سے بے خبر حال کی رنگینیوں میں مست ہے۔ وہ آج بھی بچی ہے۔ اسے خبر نہیں کہ کٹھن راہیں اس کا انتظار کر رہی ہیں۔ انسان نہیں جان سکتا کہ اس کی منزل کہاں ہوگی۔ کتنے انجانے راستوں سے گزرتے ہوئے اندھیروں میں اسے بھٹکنا ہوگا

وہ خوش ہے اس کا پھول سا چہرہ آج خوشی سے تمتما رہا ہے۔ سرخ گلاب کی طرح۔ اس کی نظر گھڑی پر لگی ہوئی ہے

"نانی اماں" - وہ خوشی سے اچھل پڑی۔

اب ریاض کا (PLANE) پہنچ رہا ہوگا۔ میں ایرپورٹ چلی جاتی مگر آپ اکیلی ہیں نا - آپ کو تنہا چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔

ہو نہیں جانتی انسان تنہا رہنا چاہے تو بھی تنہا رہنے پر کتنا مجبور ہے۔

اتنے میں کال بل (CALF BELE) بجتی ہے۔ وہ چھلانگ لگا کر نیچے جاتی ہے یہ سمجھ کر کہ شاید ریاض آگیا ہوگا

مگر تھوڑی دیر بعد وہ مغموم و افسردہ ہاتھ میں ایک خط لیے آتی ہے۔

"کس کا خط ہے بیٹی؟"

اور وہ خاموشی سے خط میرے ہاتھ میں تھما دیتی ہے۔ یہ خط ریاض کا ہے۔ ریاض اچانک امریکہ چلا گیا۔ لکھ کر گیا ہے اسے امیگریشن (EMIGRATION) مل گیا جس کا اسے سالوں سے انتظار تھا اور وہ آج کی تاریخ اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور ہے۔ وہ آئندہ سال آئے گا ضرور آئے گا۔ منو سے ملے گا اور ضرور ملے گا۔

اور منو بے بس اور مجبور پھڑپھڑاتے پرندہ کی طرح پلنگ پر گر جاتی ہے۔ اس آنکھوں سے مسلسل آنسوؤں کی برسات ہو رہی ہے۔ باہر کی کہر آلود فضا کی طرح اس کا دل بھی مکدر ہو گیا ہے۔

"منو میری بچی نہ رو۔ زندگی کو سمجھنے کی کوشش کر۔ اس کی تلخ حقیقتوں پر غور کر۔ اس کی رنگینیوں پر نہ جا۔ زندگی کا عکس انسان کی جوانی کی طرح ہے اور اس کی تلخی اس کا بڑھاپا۔ تیرے یہ مسلسل بہتے ہوئے آنسو زندگی کے بھٹکے ہوئے

کو کبھی راستہ نہ دکھلا سکیں گے۔ یہ تیری جوانی اور اس کی لہلہاتی کھیتی زندگی کے تندو تیز طوفانوں کو آگے بڑھنے سے روک سکیں گے۔ تجھے کبھی زندگی نہ بخش سکیں گے۔ تجھ میں نئی روح نہ پھونک سکیں گے۔ یہ آنسو بہتے ہی رہیں گے اور تیری ناکامی کا مذاق اڑاتے رہیں گے۔ یہ تیرے حامشِ گالوں سے بہہ بہہ کر تیرے دامن میں جذب ہوتے رہیں گے، تو اپنی قیمتی زندگی کی کٹھن راہوں پران ننھے پودوں کی طرح بن جا جسے طوفان اور آندھی کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے ورنہ تیرے لڑکھڑاتے قدم زندگی بھر کے انجانے راستوں اور انجانی راہوں پر اندھیرے میں یوں ہی بھٹکتے رہیں گے۔

مگر نہیں ملنو تو ابھی بچی ہے۔ وہ اس فلسفہ کو بھلا کیا جانے۔ میں نے اس کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھا اور اپنی بڑی بڑی شیشوں والی کھڑکی میں سے دیکھا کہ گھنٹوں بارش کی مسلسل برستی ہوئی بوندیں حل ترنگ کے ساتھ آئینہ پر سے پھسل پھسل کر ملنو کے آنسوؤں کی طرح نیچے گر رہی ہیں۔ آسماں پر بادل بھٹکے ہارے مسافر کی طرح ادھر سے اُدھر گھوم رہے ہیں اور دور بہت دور ایک درخت پر تھکا ہارا پرندہ اپنے ساتھیوں سے بچھڑ کر یتیم کی طرح اداس بیٹھا ہے۔

"بود نبود کا آشوب" صفحہ ۲۴ سے آگے

بس کیا ہے لیکن جب یہ میری موجودگی محسوس کرلیں گے تو یہ جھوٹ کرایۂ بھیڑ یا چہرہ بکریوں کے ماسک چڑھا لیں گے ان کی غراہٹیں گھٹی گھٹی جمیائی آوازوں سے بدل جائیں گی

کہا جاتا ہے کہ نہ جاننا سب سے بڑی نعمت ہے کچھ نہ جاننے کی کبھی ان بے کچھ اس طرز سے کاٹی ہے کہ آج میرے دونوں ہاتھ خالی ہیں

انھوں نے میرے قدموں کی چاپ سن لی ہے اور وہ جلد ہی جلد ہی بکریوں کے ماسک پہن رہے ہیں۔ میں اپنے شوہر کے چہرے کو دیکھتی ہوں اس شخص کو پرانا ماسک کہاں ہے؟ کیا یہ اسے کبھی رکھ کر بھول گیا ہے؟ وہ جنگی شخص ہے من مرزا زماں؟ آواز تکرار کرتی ہے۔ HE WAS STEPPE 'S WOLF میں اندھیرے کے وسط میں کھڑی ہوں تمام رستباں مجبور نگر ہیں اور میرے تمام لرزہ ناک دانت منہ پھاڑ رہے میری طرف بڑھ رہے ہیں

بقیہ اردو نامہ صفحہ ۴ سے آگے

انعقاد عمل میں لایا جائے اور ان کی مدمت میں "میمو" نذر کیا جائے نیز سب رس کا خصوصی شمارہ بھی شائع کیا جائے ● ۲۶ جولائی۔ ادارہ فکر جدید و مغربی ادبی بچاناکے زیر اہتمام تلگو شاعر سری سری کی یاد میں ایک جلسہ جناب اختر حسن کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اردو ہندی تلگو اور مراٹھی کے ممتاز اہل قلم اصحاب نے شرکت کی ● ۲۹ جولائی مسٹر پی مہندر ناتھ ریاستی وزیر مال نے صحافت کو بتایا کہ اردو کے تعلق سے کانگریسی حکومت کا رویہ نفی اور زبانی ہمدردی کی حد تک تھا۔ اس کے برخلاف تلگو دیشم پارٹی کی برسر اقتدار حکومت اس امر کی خواہاں ہے کہ وہ اردو والوں سے ان کا حل تلاش کرنے کی خاطر بات چیت کرنا چاہتی ہے کیونکہ ہماری حکومت اردو زبان کی ترویج و ترقی کے سلسلہ میں کھلا ذہن رکھتی ہے موصوف نے بتایا کہ وہ اردو کے مسائل کو کابینہ میں پیش کرنے آمادہ ہیں۔

قدیر امتیاز

نقد و نظر

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہے۔ ادارہ کا مبصر کی رائے سے اتفاق ضروری نہیں)

نام کتاب:۔ "بہت دیر کر دی" ناول، علیم مسرور

پچھلی ربع صدی میں ادبی اور معیاری ناولوں کی رفتار تیز نہیں رہی ہے۔ اس کے باوجود چند ایک ناول ایسے شائع ہوئے ہیں جن کے بغیر اُردو ناول کی تاریخ ادھوری سمجھی جائے گی۔ ان انگلیوں پر گنے جانے والے ناولوں میں، میں علیم مسرور کے ناول "بہت دیر کر دی" کا شمار کرتا ہوں۔ گو کہ یہ علیم مسرور کا پہلا ناول ہے لیکن یہ ناول اپنے فنی رچاؤ، موضوع اور مواد، فکر و شعور کے اعتبار سے قابلِ مطالعہ ہے۔ یہ ناول کردار نگاری، واقعہ نگاری، مکالمہ نگاری اور فضا و آفرینی کے سبب دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ ناول میں اتنا بہاؤ ہے کہ قاری کو اپنے ساتھ بہا لے جاتا ہے۔ یہ ناول جہاں عصمت فروشی کے اسباب و علل پر روشنی ڈالتا ہے۔ وہیں طوائف کی نفسیاتی کمزوری کو بھی سامنے لاتا ہے۔ اور وہ کمزوری ہے گھر بسانے کی۔ سلطانہ کہنے کو طوائف ہوتی ہے اور یہ عصمت فروشی اس کو ماں سے ورثہ میں ملی ہے۔ وہ آنکھ ہی طوائفوں کے ماحول میں کھولتی ہے۔ اسی ماحول کی پروردہ ہوتی ہے لیکن چند دن کے لئے اس کو عارضی طور پہ داؤد کی نقلی بیوی بننا پڑتا ہے تاکہ داؤد کو جیل میں رہنے کا ٹھکانہ مل سکے۔ داؤد کے ساتھ ساتھ رہتے ہوئے وہ جسمانی طور پر اس سے دور رہتی ہے اس کے دل میں خواہش ہوتی ہے کہ وہ داؤد کے گھر کو سنوارے اور خود کو گھریلو بیوی ثابت کرے اور اس مقصد میں وہ کامیاب ہو جاتی ہے۔ داؤد کی بے ترتیب زندگی میں سلیقہ آجاتا ہے۔ وہ اس کے کھانے پینے، آرام و آسائش کا ایک حقیقی بیوی سے زیادہ خیال رکھتی ہے۔ کسی کی بیوی بننے کی یہ دبی ہوئی خواہش جو ہر طوائف میں ہوتی ہے داؤد کے گھر میں عارضی طور پہ پوری ہوتی ہے۔ وہ اپنے پڑوسنوں سے خوشگوار تعلق رکھتی ہے۔ اس کی سلیقہ شعاری کے باعث سارے چال میں بہار آجاتی ہے۔ وہ دو دن کے لئے اپنی ماں کے پاس جاتی ہے تو اس کی جدائی داؤد اور پڑوسنیں برداشت نہیں کر پاتی ہیں۔ سلطانہ کی شکل میں علیم مسرور نے بڑا جاندار کردار اُردو کو دیا ہے۔ سلطانہ کے اتنے ٹوٹ کر چاہنے کے باوجود داؤد اس کو حقیقی بیوی نہیں بنا پاتا اس لئے کہ وہ طوائف ہوتی ہے۔ آخر معاہدہ کے مطابق سلطانہ کے لوٹ جانے کا وقت آتا ہے۔ داؤد دل پر جبر کر کے اس کو شہر کے بدنام غنڈے کریم کے پاس چھوڑ آتا ہے جس نے داؤد کی مشکل دور کرنے کے لئے سلطانہ کو اس کے حوالہ کیا تھا۔ سلطانہ کو داؤد چھوڑ تو آتا ہے لیکن اس کا من کسی چیز میں نہیں لگتا۔ اس کے اندر کا مرد جاگ اٹھتا ہے۔ وہ سلطانہ جو اس کی عزت و آبرو تھی یوں اس کی آبرو ریزی کرے، وہ تلملا اٹھتا ہے۔ وہ کریم کے یہاں سے سلطانہ کو ہمیشہ کے لئے لے جاتا ہے۔ وہ اس کو اپنانے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ آخر کریم سے لڑ کر سلطانہ کو لے آتا ہے اور اس کو اپنی محبوبہ کائنات کے یہ کہہ کر بتلاتا ہے کہ یہ میری بیوی ہے جو مجھ سے لڑ کر

علیم مسرور نے کرداروں کی نفسیاتی الجھنوں اور مسائل کو بڑی خوبصورتی اور دلچسپی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مکالمے فطری اور برجستہ ہیں۔ سمندر پار کی چال کا نقشہ اور اسکی نقالد جینا بکدھ پواور اور جینا پبلکیشن کا ماحول اور کریم کے ٹھکانے کی تصویر کشی بڑی خوبی سے کی گئی ہے۔ ساری فضا و نظروں کے آگے رچی آتی ہے۔ بمبئی کی زندگی کی خوبصورت عکاسی کی گئی ہے اس ناول کا شمار بمبئی کے ماحول پر لکھے گئے چند ایک اچھے ناولوں میں ہوتا ہے۔ کہانی کا تجسس آخر تک برقرار رہتا ہے۔ کہیں ناول غیر دلچسپ نہیں لگتا۔ علیم مسرور ہر مقام سے فنکارانہ طور پر گزرے ہیں۔

افسوس کہ اتنا پیارا ناول لکھنے والا ناول نگار اب ہم میں نہیں رہا۔ پہلے ناول پر اس کو نظر لگ گئی ــ علیم مسرور مرحوم کے اس ناول کو دوبارہ اہتمام سے شائع کر کے اُردو اکیڈیمی اُتر پردیش نے ایک مستحسن اقدام کیا ہے. جو لائق ستائش ہے۔ یہ ناول ہر اس قاری کے لئے دلچسپ ہوگا جس کو اچھے ناولوں کی تلاش رہتی ہے۔ نو روپے کے عوض یہ ناول اُتر پردیش اُردو اکیڈیمی لکھنؤ سے خریدا جا سکتا ہے۔

(قدیر امتیاز)

نام کتاب :۔ "آگ، الاؤ، صحرا" مصنف: قمر احسن

قمر احسن کے اس افسانوی مجموعہ میں افسانوں کے علاوہ ایک ناولٹ بھی شامل کیا گیا ہے۔ افسانوں کو انہوں نے تین عنوانوں کے تحت تقسیم کیا ہے۔ پہلا عنوان "آگ" ہے جس کے تحت تعاقب، صدیاں، دھورے اور دھوزہ ۔ میم۔ فہ ہیں۔ دوسرا عنوان "الاؤ" ہے جس کے تحت بریدہ جسموں کو جیکانے والا بوڑھا، پہلا چہرہ + چوتھا چہرہ = دوسرا چہرہ، سانپ، رَومیہ ہے، رَمش عمر اور قولنج شامل ہیں۔ تیسرا عنوان "صحرا" ہے۔ اس کے تحت آخری تنہا درخت، نیا منظر نامہ، سلیمان سَر بہ زانو اور سبا ویراں، "تطہیر اور ہما"، یا مصطفیٰ، ابابیل اور طلسمات شامل ہیں۔ اس کے بعد ایک ناولٹ "آگ اور صحرا" ہے۔

قمر احسن کے یہ افسانے اساطیری داستان اور تہذیبی پس منظر لئے ہوئے ہیں۔ تہذیبی بازیافت، شخصی تشخص اور ذہنی تناؤ کی ایک رَو ان کے اکثر افسانوں میں ملتی ہے۔ انہوں نے جہاں افسانوی اظہار کے لئے علامتوں کو اختیار کیا ہے وہیں استعاراتی اور تمثیلی اسلوب کو بھی برقرار رکھا ہے۔ ان کے یہاں عقائد، اوہام اور اسرار کچھ اس طرح جگہ پا گئے ہیں کہ بقول شمس الرحمٰن فاروقی ان کی ذاتی تہذیبی شخصیت انہیں اوہام و عقائد و اسرار میں دلیل صبح روشن دیکھنے پر مجبور کرتی ہے۔ کچھ یہی کیفیت "آگ اور صحرا" میں ملتی ہے۔

قمر احسن نئے ذہن کے افسانہ نگار ہیں۔ انہیں چند دہائیوں میں افسانوی اظہار میں جو تجربے ہوئے ہیں اس کی نمائندگی ان کے افسانے کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں کڑیاں ٹوٹی ہوئی اور بکھری بکھری ملتی ہیں۔ انتظار حسین کی طرح ان کے افسانے مربوط نہیں ہیں۔ ان کے پسند آنے والے افسانوں میں 'سانپ'، 'ابابیل'، 'سلیمان سَر بہ زانو' اور 'سبا ویران' کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

کتابت اور طباعت خاصی اچھی ہے۔ قیمت پچیس (۲۵) روپے ہے جو مناسب ہے۔ ڈیمائی سائز کے ۲۵۶ صفحات پر مشتمل یہ کتاب جو خوبصورت گیٹ اَپ سے مزیّن ہے "شب خون" کتاب گھر الہ آباد سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ (قدیر امتیاز)

نام کتاب :۔ "ایلاف" شاعر: رؤف خیر
کراؤن سائز، مجلد صفحات (۱۲۶) قیمت: ۱۰ روپے، ناشر: محل نو پبلی کیشنز، چھتہ بازار، حیدرآباد ــ ۲۔

اُردو ادب میں ترائیلے کی صنف کو جن شعراء نے باقاعدہ برتا اور اختیار کیا ہے ان میں رؤف خیر بھی ہیں۔ آٹھ

معروضے کہ ترائیلے میں دنیا کے حقائق اور اس کے موضوعات کو سمیٹنا کچھ دشوار طلب کام ہے۔ اختصار اور جامعیت کا امتزاج جس طرح رباعی اور قطعہ کے لئے ضروری ہے یہی ترائیلے کے لئے بھی لازمی ہے۔ رؤف خیر نے ایک ذہین شاعر کی طرح حقائق و تجربات کا جائزہ لیا ہے۔ ان کے ترائیلوں میں بانکپن ہی نہیں ندرتِ فکر بھی ہے۔ کہیں کہیں وہ اپنے پڑھنے والوں کو دعوتِ فکر دیتے ہیں۔ 'اعراف'، 'کارِ جہاں دراز ہے'، 'بازی گر'، 'گھر'، 'کوہِ ندا'، 'بیلف'، 'بائی جاک'، 'سفید ہاتھی' اور 'رانگ کورٹ' ان کے کامیاب ترائیلے ہیں۔ ان ترائیلوں میں زندگی کے تعلق سے شاعر کا اپنا نقطۂ نظر سامنے آتا ہے۔

"ایلاف" کا بیشتر حصہ ترائیلوں پر محیط ہے اس کے بعد کچھ مختصر سی نظمیں بھی ہیں۔ جن میں 'چہ نسبت خاک را بہ عالمِ پاک'، 'تم کہاں کھو گئے'، 'وہم تو مائل بہ کرم'، 'خود بینی' اور 'واقعۂ سمت' ان کی کامیاب نظمیں ہیں۔ ترائیلوں کی طرح نظموں میں بھی مذہبی روایات، تلمیحات اور مذہبی اساطیر کو کام میں لایا گیا ہے۔ تہذیبی بازیافت اور مذہبی قصص سے رؤف خیر کی دلچسپی نظری ہے جس سے ان کے مزاج کی بھی تشکیل ہوئی ہے۔

ان کی غزلیں غزل کے نئے مزاج کو سامنے رکھ کر کہی گئی ہیں۔ ان میں روایتی مضامین کم اور نہ ہونے کے برابر ہیں۔ نئی غزل کا لب و لہجہ جو جاں نثار اختر اور ان کے بعد کے شعراء کے یہاں ملتا ہے وہی انداز رؤف خیر کے یہاں آیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

کیا بھرے اشجار آخر ہاتھ خالی ہو گئے
کب ہوا گزری تھی یونہی ڈالی ڈالی کھیلتے

تو نے خود اپنے سایوں سے خوش ہم سے خفا
اندھیر کس قدر ہے یہ سورج کے شہر میں

اب رتجگے ہیں جیسے لہو میں رچے ہوئے
کیا رات تھی کہ ایک کہانی میں کٹ گئی

دنیا نہیں بدلی زمانے ہی تو بدلے
ہم خانہ خرابوں کے ٹھکانے ہی تو بدلے

مختصر یہ کہ رؤف خیر نئے ذہن اور خوشگوار فکر کے شاعر ہیں۔ توقع ہے کہ فن اور فکر کا یہ امتزاج انہیں شاعری کے میدان میں آگے لے جائے گا، اور ان کی شاعری کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔ (قدیر امتیاز)

اردو نامہ

وقار خلیل

اردو کی علمی، ادبی، تہذیبی خبریں

۳ جون: نیرنگِ ادب کا ماہانہ ادبی اجلاس و مشاعرہ جناب ماہر حیدرآبادی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ معراج صوفی، شاغل ادیب اور یوسف ترکی نے ادبی موضوعات پر تخلیقات پیش کیں۔ محفلِ شعر میں ماہر، عظیم حیدرآبادی، بے حس الہ آبادی، اکبر یوسفی، اقبال ہاشمی، شاغل ادیب، سمیع اللہ شفق اور شکیل مظہری نے کلام سنایا۔

۴ جون: اردو اسوسی ایشن ساؤتھ سنٹرل ریلوے کا سالانہ ادبی اجلاس و مشاعرہ ریل نیلائم میں آراستہ ہوا۔ مسٹر جے سی سریواستوا نے صدارت کی۔ ادبی اجلاس میں ڈاکٹر حبیب ضیاء اور مسیح انجم نے فکاہی مضامین سنائے اور داد پائی۔ محفلِ شعر میں غیاث متین، ڈاکٹر یوسف کمال، مضطر مجاز، رؤف خیر، محسن جلگانوی، قتیل شیدائی، طالب خوندمیری، مصطفیٰ علی بیگ، علی الدین نوید، فکری بدایونی، اشرف خوندمیری، سرپٹ حیدرآبادی اور بے دھڑک مدراسی نے کلام سنایا۔

۵ جون: ساؤتھ انڈیا اردو اکیڈیمی سٹی یونٹ کی طرف سے اردو کے موقف اور مسائل پر ایک سیمینار بشیر سراج الدین کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مسز عابدہ صدیقی، اکرام جاوید اور ایم اے آر بیگ نے مخاطب کیا۔ جناب خواجہ ناصر الدین نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔

● ایوانِ ادب کا مشاعرہ جناب بشیر وارثی کی صدارت میں آراستہ کیا گیا۔ بنگلور کے جناب حلیم بسمل مہمانِ خصوصی تھے۔ صدر اور مہمان کے علاوہ صابر کوسگوی، اسد انصاری، عابدہ ناز، عبدالرحیم شفق، پرسو رام پرشاد اور دیگر شعراء نے کلام سنایا۔

● بزمِ عرفانِ ادب کا مشاعرہ ڈاکٹر اکبر یوسفی کی صدارت میں ہوا۔ مہمان شاعر سمیع اللہ شفق (بہار) کے علاوہ یوسف نظر، بے حس الہ آبادی، محسن نظامی اور کئی شاعروں نے کلام سنایا۔

۶ جون: جناب میر اعظم علی مالک نیشنل پریس و بکڈپو کا بعارضہ قلب انتقال ہوا۔ مرحوم سب رس اور ادارۂ ادبیات اردو کی مطبوعات کے ڈسٹری بیوٹر اور اردو دوست فرد تھے۔ خدا مغفرت فرمائے۔

۹ جون: اجلاس اردو ٹرسٹ لائبریری کے اسٹڈی سرکل حلقۂ فکر و نظر کا ماہانہ اجلاس جناب احمد حسن مددگار معتمد اردو اکیڈیمی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر جعفر صادق نے طنز و مزاح کی چار کتابوں (ہنسی ہنسائی از لبنیٰ صلاح، خواہ مخواہ از رشید الدین، چند کلیاں نشاط کی از ریحان حسن اور شوخ تتے از راشد علی خان) پر ادبی تبصرہ سنایا۔ جناب محمد منظور احمد سکریٹری نے شکریہ ادا کیا۔

● اردو اسوسی ایشن محکمۂ ڈاک و تار کی طرف سے منعقدہ ادبی اجلاس میں مسٹر نرسیندر لوتھر، اکرام جاوید، مسیح انجم نے مضامین سنائے۔ مسٹر راجندر پرشاد ڈائرکٹر ریاستی پوسٹل سروسس نے صدارت کی اور غنی حسین کے اسلامی معمون "امریز" کا انگریزی ترجمہ سنا کر داد پائی۔

۱۰ جون: ابوالکلام آزاد اورینٹل انسٹی ٹیوٹ کے جلسہ [illegible] ابن سعد نبی ترجمہ

کی شعری خدمات کو خراجِ عقیدت ادا کیا گیا، جناب نواب میر اکبر علی خاں سابق گورنر یوپی نے صدارت کی۔ جناب اصغر اشرف اور جناب خواجہ محمد احمد ڈائرکٹر اسٹیٹ بیورو نے بھی مخاطب کیا۔

● سنٹرل یونیورسٹی حیدرآباد نے مس واجدہ فرزانہ کو اردو میں ان کے مقالہ "نصیر الدین ہاشمی حیات اور ادبی کارنامے" پر ایم فل کی ڈگری کا مستحق قرار دیا۔ یہ مقالہ ڈاکٹر سیدہ جعفر کی نگرانی میں تیار ہوا۔

۱۱ر جولائی۔ ادارۂ جدید فکر و عصری رجحانات کی طرف سے محترمہ صفیہ اریب کی مرتبہ کتاب "بازاریب" کی رسمِ اجراء جناب اختر حسن کے ہاتھوں انجام پائی۔ پدم شری عالم خوندمیری نے صدارت کی۔ پروفیسر سراج الدین، ڈاکٹر مغنی تبسم، ڈاکٹر انور معظم، جناب عوض سعید اور حسن فرخ نے اریب، صبا اور حیدرآباد کے ادبی ماحول پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ عزیز آرٹسٹ کے پورٹریٹ کی نقاب کشائی کی۔ جناب قدیر زماں نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔

● جوبلی ہال میں [illegible] فخرالدین علی احمد قومی استحکام کمیٹی کی طرف سے [illegible] مسٹر ٹی انجیا سابق چیف منسٹر کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر ڈی چندر شیکھر ریڈی ایڈیٹر دکن کرانیکل کو ان کی یکجہتی سے عبارت خدمات پر [illegible] ایوارڈ نذر کیا گیا۔ جناب کنول پرشاد کنول اور بانو طاہرہ سعید کو ان کی شعری خدمات کے اعتراف میں ایوارڈ دیئے گئے۔ جناب آصف پاشاہ صدر ریاستی اقلیتی کمیشن نے مخاطب کیا۔ محفل شعر میں کنول، بانو سعید شہیدی، علی احمد جلیلی، وفا خلیل، خواجہ شوق، صلاح الدین نیر، صادق نقوی، غلام جیلانی صادق، آغا سروش، رؤف رحیم، شجاع فاروقی اور انور ہاشمی نے کلام سنایا۔ فکر حیدرآبادی اور علی احمد [illegible] نے خیر مقدم اور شکریہ ادا کیا۔

● محفل خواتین کا ادبی و شعری اجلاس محترمہ بشیر قربان علی (آل انڈیا ریڈیو) کی صدارت میں ہوا۔ ڈاکٹر ناصرہ بیگم اور محترمہ شاکرہ بیگم نے نثری تخلیقات اور خواتین شعراء نے کلام سنایا۔

۱۵ر جولائی۔ اورینٹل اردو کالج کے اساتذہ و طلبا کی طرف سے ڈاکٹر زینت ساجدہ کے صدر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی مقرر کیے جانے کی مسرت میں [illegible] پروفیسر [illegible] الرحمٰن کی صدارت میں منعقد ہوا۔ [illegible] کی شخصیت پر اساتذہ اور صدر جلسہ نے اپنے [illegible] کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر حبیب ضیاء نے نظامت کی۔

۱۷ر جولائی۔ تلگو کے جدید اور انقلابی شاعر سری سری (۱۹۱۰ء – ۱۵ر جون ۱۹۸۳ء) کی وفات پر ڈاکٹر [illegible] شاہد جنرل سکریٹری ریاستی انجمن ترقی اردو نے تعزیتی بیان میں کہا ہے کہ "سری سری خود آفرین شاعر تھے۔ جمہوریت اور سوشلزم کے لیے ان کی خدمات ہمیشہ رہیں گی، انسانیت کی سربلندی ان کے فکر و فن کا زینہ رہا ہے۔ آنجہانی تلگو ترقی پسند تحریک کے بانی رہنماؤں میں

۱۹ر جولائی۔ ادارۂ ادبیات اردو کی مجلس انتظامی کا اجلاس "ایوانِ اردو" میں منعقد ہوا۔ جناب حامد علی عباسی (آئی اے ایس) ریٹائرڈ کو ادارہ کا صدر منتخب کیا گیا۔ سابق صدر ادارہ پروفیسر سید علی اکبر صاحب نے ناسازیٔ مزاج کے باعث نئے صدر کے انتخاب کا مشورہ دیا تھا۔ اس کے علاوہ ادارہ کے معتمد عمومی جناب سید ہاشم علی اختر وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی کو ادارہ کا نائب صدر اور جناب رمن راج سکسینہ [illegible] کو ادارہ کا معتمد [illegible] معتمد چنا گیا۔ اس موقع پر طے پایا کہ پروفیسر علی اکبر صاحب کی دیرینہ ادارہ سے وابستگی [illegible] اعتراف [illegible]
(۳۵ [illegible])

R. N. 10922/57
Regd. H/HD. 134

The "SABRAS" Urdu Monthly

..gan of "Idara-e-...at-e-Urdu"s Aiwan-e-Urdu, Hyderabad-500 004. (A. P)

بالِ جبریل

National Fine Printing Press, Charkaman, Hyd.

سب رس

ن اجراء: ۱۹۳۸ء　　　　فون نمبر ۴۸۳۶۹

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد

مدیر اعزازی　مغنی تبسم

معاون مدیر　وقار خلیل

لد (۴۳) اگست سنہ ۱۹۸۳ء شمارہ (۸)

قیمت فی پرچہ ۲ روپے ۲۵ پیسے

دارۂ ادبیاتِ اردو، پنجہ گٹہ، حیدرآباد ۴

رسالانہ　　بیرونی ملکوں میں

۲۵ روپے　ہوائی ڈاک سے　بحری ڈاک سے

تب خانوں سے　مشرق وسطی ۱۰ ڈالر　۴ ڈالر

۳۰ روپے　امریکہ ۱۶ ڈالر　۶ ڈالر

ذریعہ رجسٹری، ۴۵ روپے

ستان، برما، سیلون　۸ ڈالر　۲½ ڈالر

نگلستان　۷ پونڈ　۳ پونڈ

ترتیب

سید علی اکبر ایڈیٹر پبلشر پرنٹر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان میں چھپوا کر حیدرآباد ۴ ... ۵ سے شائع کیا۔

سید سبط حسن

پیمانِ وفا کی تجدید

سفرِ حیدرآباد (۱۹ اکتوبر تا ۲۶ اکتوبر ۱۹۸۰ء کے تاثرات)

وقت کسی سے نفرت کرتا ہے نہ محبت،
وہ کسی سے رعایت بھی نہیں کرتا۔
وہ پیدا بھی کرتا ہے اور مارتا بھی ہے۔
اور جب ساری دنیا سوتی ہے وہ تب بھی جاگتا رہتا ہے
وقت باقی ہے بقیہ ہر شے فانی ہے،
جوانی، حسن، زندگی، تندرستی،
دولت، دوستی کسی کو ثبات نہیں

(مہابھارت)

رپ وان ونکل کا قصہ آپ نے سنا ہوگا۔ موصوف کو کام کاج سے بالکل دل چسپی نہ تھی۔ بس سارا وقت بیٹھے بچوں کو جن پریوں کی کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ گھر والے اُس کے نکھٹو پن سے عاجز تھے۔ ایک بیوی سے کسی بات پر جھگڑا ہوا تو رپ وان ونکل نے خفا ہو کر جنگل کی راہ لی۔ وہاں اس کو بونے ملے جو بیٹھے دارو پی رہے تھے۔ انھوں نے رپ وان ونکل کی خوب خاطر تواضع کی اور جب رپ وان ونکل مدہوش ہو کر سو گیا تو بونے غائب ہو گئے۔ رپ وان ونکل سوتا رہا، سوتا رہا یہاں تک کہ بیس سال گذر گئے۔ آنکھ کھلی تو سر کے بال شانوں تک بڑھ آئے تھے۔ ڈاڑھی نے سینے پر سایہ کر لیا تھا اور مونچھیں کے برابر ہو گئے تھے۔ رپ وان ونکل بہت حیران ہوا۔ گاؤں واپس آیا تو کتے اس جنگلی آدمی کو دیکھ کر بھونکنے لگے بچوں نے تالیاں بجانا شروع کر دیں۔ اور عورتیں گھروں سے نکل آئیں مگر کسی نے رپ وان ونکل کو نہ پہچانا۔ بیٹی بھی نہیں کہ اب بڑی ہو کر کئی بچوں کی ماں بن چکی تھی —

رپ وان ونکل بیس برس کے بعد گھر لوٹا تھا اور میں ۳۵ برس کے بعد اپنے منہ بولے وطن حیدرآباد جا رہا تھا۔ رپ وان ونکل نے بیس سال سو کر گزارے تھے۔ مگر میں نے ۳۵ سال پورے ہوش و حواس دیس پردیس میں بسر کیے تھے۔ میری ذہنی کیفیت کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو طویل مفارقت کے بعد اپنے کسی محبوب سے ملے ہوں۔

دہلی سے حیدرآباد تک کا مختصر سفر نہ پوچھیے کس اضطراب میں گذرا۔ ہوائی جہاز میرے جذبات سے بے نیاز ہوا کا سینہ چاک کرتا اور فراٹے بھرتا شہر نگاراں کی جانب بڑھتا جا رہا تھا اور میرے دل میں طوفان برپا تھا یادوں کے شب چراغ کبھی جلتے کبھی مدھم ہو جاتے —— یہ اخبار پیام کا دفتر ہے۔ یہ قاضی عبدالغفار ہیں۔ یہ میرا پیارا دوست مخدوم ہے —— دل فگاروں اور دل نوازوں کا جھمگٹا، نازنینوں اور نازبرداروں کا منظورِ نظر اور دکن کی بے چین روح کی شاعرانہ علامت —— یہ بلبلِ ہند کا "آستانۂ زریں" ہے جہاں انجمن ترقی پسند مصنفین کی داغ بیل پڑی تھی۔ دل کہتا کہ حیدرآباد مانا کہ اب ان ہستیوں سے خالی ہے۔ مگر وہ جو حیات ہیں کیا ۳۵ سال کی طویل مدت میں ان کے مزاج اور طور طریقوں میں کوئی تبدیلی نہ آئی ہوگی۔ کیا وہ مجھ کو پہچان لیں گے۔ ملاقات کا جو اشتیاق مجھ کو کشاں کشاں لیے جا رہا ہے کیا وہ اس کی شدت کو محسوس کر سکیں گے۔

کیا زمانہ میری خاطر پیچھے کی طرف مڑے گا ۔ کیا دلوں کی قربت فاصلے کی طنابوں کو توڑ سکے گی؟ اور اگر ایسا نہ ہوا تو؟ اگر اس دیارِ حسن نے جہاں میں نے "محبت کے سبق کی ابتداء کی تھی" مجھ کو بیگانہ سمجھا تو؟ میں اسی اُدھیڑ بن میں تھا کہ جہاز کے عملے کی طرف سے پیٹی باندھنے اور کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھنے کا اعلان ہو گیا ۔ میں کھڑکی کے شیشے کے باہر جھانکنے لگا۔ شوقِ دید درختوں، پہاڑوں اور تالابوں سے اپنے شکوک آمیز سوالوں کا جواب طلب کر رہا تھا ۔ لیکن ہر لمحہ بدلتے منظر کے یہ خاموش تماشائی مجھ کو کچھ نہ بتا سکے ۔

میں جانتا تھا کہ ہوائی اڈے پر دوستوں میں سے کوئی نہ ملے گا کیونکہ میں معینہ تاریخ سے ایک دن بعد پہونچ رہا تھا پھر بھی مشتاق نظریں اجنبیوں کے ہجوم میں یاروں آشناؤں کو تلاش کر رہی تھیں ۔ جی چاہتا تھا کہ کاش کوئی جان پہچان ہی کا مل جائے تو دل کی دھڑکن کچھ کم ہو لیکن مایوسی ہوئی ۔ سامان لے کر باہر نکلا تو ادھیڑ عمر کا ایک ٹیکسی والا میری طرف بڑھا ۔ اس کے چہرے بشرے سے پتہ چل رہا تھا کہ خالص حیدرآبادی ہے ۔ مجھ کو نہ جانے کیا سوجھی کہ بے اختیار اس سے بغل گیر ہو گیا ۔ وہ پہلے حیران ہوا پھر مسکرانے لگا ۔ میں نے نادم ہو کر معافی مانگی تو وہ خالص دکنی لہجے میں بولا ۔ کوئی بات نہیں جناب ۔ آپ گلے ملے ہیں گالی تو نہیں دی ہے ۔ "کہاں جائیےگا"۔ میں نے کہا حمایت نگر میں ایک جگہ مخدوم بھون ہے ۔ کیا آپ جانتے ہیں؟ ۔ ہنس کر بولا ۔ کیوں نہیں جناب ۔" مقدوم بھون" تو ہمارا اپنا ہے ۔ اس کو نہ جانیں گے ۔

صبح کا وقت تھا ۔ اور دہلی کی شدید گرمی کے بعد دکن کا خوش گوار موسم بہت ہی اچھا لگ رہا تھا ۔ موٹر پوری رفتار سے فاصلہ طے کر رہی تھی اور میں سڑکوں کو پہچاننے کی کوشش میں مصروف تھا ۔ اتنے میں جیسے ساگر دکھائی دیا ۔ یادوں کی شہنائیاں بجنے لگیں ۔ "پیار کی چاندنی، مہکتے ہی کی خوشبو، ساڑھی کے پلوؤں کا ہوا میں رقص، دھیمی دکنی کے گیت، احاطۂ خیالی فانوسوں کی روشنی سے جگمگانے لگا ۔ ٹینک بنڈ کی سڑک اب پہلے سے زیادہ کشادہ ہو گئی تھی ۔ ٹینک بنڈ کے نشیب میں باغیچے اور بچوں کے جھولے بھی نئی چیزیں تھیں ۔ البتہ سڑک کی بائیں جانب جگہ جگہ اشتہاروں کے بھونڈے سائین بورڈ دیکھ کر بڑی کوفت ہوئی ۔ نہ جانے بازاری ذہنیت کو حسن سے اتنا بیر کیوں ہے ۔ غالب نے غالباً اسی بازاری ذہنیت کا ماتم کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ؎

غارت گر ناموس نہ ہو گر ہوسِ زر
کیوں شاہدِ گل باغ سے بازار میں آوے

مگر سرمایہ داری نظام میں شاہدِ گل ہی پر کیا منحصر ہے انسانیت اخلاق، مروت، محبت دوستی، ادب سب بازاری مال بن گئے ہیں ۔ پھر بھی بھوکا اگر چاند سورج کو دیکھ کر کہے کہ ؎ "بابا مجھے تو سب نظر آتی ہیں روٹیاں" تو بات سمجھ میں آتی ہے لیکن مال داروں کی بدمذاقی کا کیا جواز ہے؟

(۲)

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ سے دہلی میں ملاقات ہو چکی تھی ۔ یہ حضرت کسی زمانے میں دبلے پتلے نوجوان طالب علم ہوتے تھے اور اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے روحِ رواں تھے ۔ اب دیکھا دُہرا جسم، بال کھچڑی، کسی کے دادا، کسی کے نانا مگر تیزی طراری اور پھرتی میں کوئی فرق نہ آیا تھا ۔ پہلے یار دوستوں کے محبوب تھے اب ان کا شمار ملک کی ممتاز شخصیتوں میں ہوتا ہے ۔ سیاسی لیڈر بھی ہیں اور اردو کے معروف ترقی پسند ادیب بھی ۔ ملتے ہی ڈانٹنے لگے کہ کل تمہارے عاشقوں کی فوج لے کر ایرپورٹ گیا تھا اور گالیاں دیتا واپس آیا ۔ اچھا ان سے ملو یہ پروفیسر نرسنگھ راؤ ہیں ۔ تمہارے پرانے دوست نرسنگ راؤ ایڈیٹر ہفت روزہ رعیت کے بھتیجے اور شہاب الدین کے یار ۔ تمہارے ٹھہرنے کا انتظام کلب میں کیا تھا ۔ سردار جعفری اور کیفی وہیں ٹھہرتے ہیں مگر نرسنگھ کی حیدرآبادی ناک بہت لمبی ہے ۔ کہتے ہیں کہ تیس چالیس لاکھ کے شہر میں کیا ایک گھر بھی نہیں جس میں پاکستانی مہمان کے لیے ایک چارپائی بچھ جائے ۔ تو آج سے وہ تمہارے میزبان اور تم ان کے مہمان ۔ میں چلا

آٹھ دس آدمیوں کو پولیس نے بلا وجہ پکڑ لیا ہے۔ ان کو ضمانت پر رہا کروانا ہے۔۔ اور وہ مجھ کو نرسنگ راؤ کے حوالے کرکے یہ جا وہ جا۔

نرسنگ راؤ طالب علمی کے زمانے میں آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جنرل سکریٹری رہ چکے تھے۔ تلنگانہ تحریک کے زمانے میں گرفتار ہوئے مگر اب انوار العلوم کالج میں سیاسیات کے پروفیسر ہیں۔ کہنے لگے گھر چلتے ہیں لیکن ذرا شہاب کو لے لیں۔ سامان گاڑی میں رکھا گیا اور موٹر حمایت نگر سے مغل پورہ کی سمت روانہ ہو گئی۔ راستے میں عابد روڈ سے گزرے، میں نے پہچان لیا یہ دیانی ہوٹل ہے جس میں میں نے کچھ دن قیام کیا تھا۔ یہ معظم جاہی مارکٹ ہے۔ میں نے پہچان لیا پھر موسٰی ندی کا پل آیا اور اس کے کنارے واقع آصفی دور کی عالی شان عمارتیں نظر آنے لگیں۔ عثمانیہ ہسپتال، کتب خانہ آصفیہ، ہائی کورٹ۔ پتھرگٹی، چار کمان، سکہ اور چار مینار سب جانے پہچانے لگے

شہاب الدین حیدرآباد میں میرا سب سے عزیز دوست ہے۔ اس سے آخری ملاقات ۳۵ برس گزرے بمبئی میں ہوئی تھی۔ جب میں امریکہ جا رہا تھا اور شہاب ریلوے اسٹیشن پر مجھ کو رخصت کرنے آیا تھا۔ خط و کتابت کا وہ چنداں قائل نہیں البتہ مرزا ظفر الحسن جب حیدرآباد سے کراچی واپس آتے تو ان سے شہاب کی خیریت معلوم ہو جاتی تھی۔ شہاب سے مل کر جو خوشی ہوئی سو ہوئی لیکن یہ دیکھ کر بہت غصہ آیا کہ اتنا عرصہ گزر جانے کے باوصف موصوف میں بظاہر کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ نہ تن و توش میں نہ عادات و اطوار میں وہی بوٹا سا قد، بے فربہی، قد وہی سر کے سیاہ بال اور چہرے پر وہی رنگت اور شادابی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے۔ کاروبار زندگی سے ان کو کبھی دل چسپی نہ تھی۔ دولت و ثروت کو انہوں نے کبھی خاطر میں نہ لایا۔ بال بچوں کا جھمیلا اس نے کبھی نہیں پالا کہ اس سے آزادی پر قفل پڑنے کا خطرہ تھا۔ کتابیں جمع کرنا، کتابیں پڑھنا اور آرام کرنا شہاب کے من بھاتے مشاغل ہیں اور وہ اس دیرینہ روایت کو بڑی وضعداری سے نباہ رہا ہے۔ مخدوم کہا کرتا تھا کہ شہاب کی سب کتابیں حشر کے دن پھڑ پھڑا پھڑ پھڑا کر اپنے مالکوں کی گود میں گریں گی۔ مگر اس کاہل اور گوشہ نشین انسان میں نہ جانے کیا کشش ہے کہ ہر شخص اس کو پیار کرتا ہے۔ شاید اس کا خلوص اور بے غرض ملنا جلنا ہی لوگوں کو اس کی طرف کھینچ لیتا ہے۔

ہندوستان پاکستان دونوں ملکوں میں ایک نہایت بیہودہ بلکہ توہین آمیز دستور پولس میں اندراج کا ہے۔ یہ برتاؤ فقط ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کے لیے مخصوص ہے (کسی اور ملک کے باشندے کو ہندوستان یا پاکستان میں یہ ذلت برداشت نہیں کرنی پڑتی) لہٰذا پیشہ ور گنڈوں، بدمعاشوں کی طرح اپنے آنے جانے کی رپورٹ پولس کے دفتر میں لکھوانی پڑتی ہے اور وہ بھی ۲۴ گھنٹے کے اندر ورنہ خود اندر۔ پولیس کمشنر کا دفتر شہاب کے گھر کے پاس تھا لہٰذا میں نے کہا کہ اس کار خیر سے بھی کیوں نہ لگے ہاتھوں سبک دوش ہو لیا جائے۔ نرسنگ نے کہا یار چھوڑو بھی۔۔ یہ حیدرآباد ہے دہلی نہیں۔۔ یہاں کس کی مجال ہے جو تم سے باز پرس کرے مگر میں نہ مانا۔ خیر صاحب، پولس کمشنر کے دفتر میں حاضری رہی۔ ساڑھے دس بج چکے تھے لیکن دفتر میں سناٹا تھا۔ اسسٹنٹ پولیس کمشنر تو موجود تھے البتہ عملہ غائب تھا۔ اُن سے رجوع کیا۔ بڑے اخلاق سے اٹھ کر ملے۔ حاضری کی غرض بیان کی۔ معذرت کرتے ہوئے بولے، آج دسہرہ ہے اور کل بقر عید۔ پرسوں آجائیے۔ میں نے کہا مگر جناب حکم تو یہ ہے کہ ۲۴ گھنٹے کے اندر حاضری لکھواؤ۔ ہنس کر کہنے لگے بس آپ کے درشن ہو گئے یہی رپورٹ ہے۔ اب جس دن جی چاہے آجائے گا۔۔ باہر نکلے تو نرسنگ نے بڑے فاخرانہ انداز میں کہا "ہم نہ کہتے تھے کہ یہ حیدرآباد ہے، دہلی نہیں ہے"۔ شہاب نے لقمہ دیا "کام آرام سے کرنا چاہیے۔ جلد بازی سے صحت خراب ہو جاتی ہے"۔

ہاں لکھنا تو بھول ہی گیا کہ شہاب اندر سے تیار ہو کر نکلا تو اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔ لفافہ اس نے میری طرف بڑھا دیا۔ اس میں چھ سات چھوٹے چھوٹے فوٹو تھے جو ۱۹۴۲ء میں اس وقت کھینچے تھے جب شہاب لکھنؤ آیا تھا۔ ان تصویروں میں شہاب ہے، مجاز ہے اور میں ہوں۔

۔ مجاز بڑے بانکپن سے شال اوڑھے اور کلاہ کج کیے بیٹھا ہے مجاز کی اتنی پیاری تصویر میں نے کہیں نہیں دیکھی اور اور اس کے ساتھ بھی میری کوئی اور تصویر نہیں ہے اور نہ شہاب کے ساتھ۔ جوانی کی ان تصویروں کو دیکھ کر میرے منہ سے بے ساختہ نکلا کہ یار جوانی میں ہم لوگ کتنے خوب صورت تھے' آپ اپنے کو بھی خوب صورتوں میں شامل کرتے! یہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ شہاب کتنا خوب صورت تھا۔

یہ تصویریں ہم نے راجہ بہادر کے فوٹو گرافر کو دیں کہ ان کی کاپیاں نکال دو تاکہ میں ساتھ لے جاؤں مگر وہ غائب ہو گئے ا،ر تصویریں مجھ کو نہ مل سکیں۔ خدا کرے افضل نے گم نہ کر دی ہوں۔

نرسنگھ راؤ کا بنگلہ بنجارہ ہل پر ایک پُر فضا پہاڑ کے دامن میں واقع ہے۔ البتہ بنگلے کے سامنے اور مازو میں دو عجیب سے قبرستان جن میں رنگ، برنگی پختہ قبریں بنی ہیں۔ میں نے نرسنگھ سے پوچھا کہ یہ قبریں کس کی ہیں۔ بولے ہمارا دیس پرانی قوموں کا گہوارہ ہے یہ قومیں تمہارے موہن جو دڑو اور ہڑپہ کے رشتہ دار ہیں اور یہ قبرستان ایسی ہی کسی قوم کے ہیں۔ جس زمانے میں یہ جگہ سنسان ویران ہوتی تھی اور بنجارے یہاں آکر ڈیرے ڈالتے تھے تو وہ اپنے مُردوں کو یہیں دفن کرتے تھے۔ اب یہ علاقہ بیچوں بیچ شہر میں آگیا لیکن قبروں کو کون ہٹائے۔ زندوں کی جھونپڑیاں ہوتیں تو فوراً بلا تکلف اٹھوا دی جاتیں لیکن مردوں کو کس دل سے چھیڑا جا سکتا ہے۔ ہم کو زندوں کے آرام آسائش کی پروا نہیں ہوتی۔ لیکن مردوں کا احترام ہماری تہذیب میں داخل ہے۔ میں نے کہا تم اپنا لیکچر بند کرو اور مجھ کو اس قوم کے بارے میں بتاؤ۔ نرسنگھ نے کہا کہ یہ پیگن (PAGAN) لوگ ہیں نہ ہندو نہ مسلمان۔ وہ سال میں دو بار جمعرات کے دن یہاں آتے ہیں۔ قبروں کی صفائی کرتے ہیں۔ ان کو رنگتے ہیں، کڑھائیاں چڑھاتے ہیں، گاتے بجاتے ہیں۔ شام کے وقت قبروں پر دیئے جلاتے ہیں اور پھر کھا پی کر چلے جاتے ہیں۔ نرسنگھ نے کہا کہ قبرستان کی وجہ سے اس مکان میں نہ مالک مکان خود رہتے تھے اور نہ کوئی اس کو خریدتا تھا۔ بلکہ مشہور ہو گیا تھا کہ اس میں بھوت ہیں۔ گاہک آتے، دیکھتے اور واپس چلے جاتے تھے۔ میں نے یہ مکان خریدا تو مالک مکان نے میرا بہت شکریہ ادا کیا کہ جان چھوٹی۔ اب میں روز بھوتوں کا منتظر رہتا ہوں مگر ہم خود اتنے بڑے بھوت ہیں کہ چھوٹے موٹے بھوت ادھر کا رخ نہیں کر سکتے۔

حیدرآباد میں میرا قیام ایک ہفتے رہا لیکن یہ خوش گوار شب و روز پل جھپکتے گذر گئے۔ دوستوں اور کرم فرماؤں کے نرغے میں ایسا پتہ ہی نہ چلا کہ شام کب آئی اور صبح کب ہوئی۔ اس دوران میں نرسنگھ شاید ہی ایک دو روز کالج گئے ہوں۔ بس سارے وقت موٹر لیے مجھ کو سیر کرواتے رہتے تھے۔ سیر کیا لوگوں سے ملواتے رہتے تھے۔ پھر بھی افسوس ہے کہ کئی گھروں پر سلام کے لیے نہ جا سکا۔ میری وجہ سے ڈاکٹر مسز منگوتا نرسنگ راؤ کو کبھی پارٹیکس پر آنا جانا پڑا۔ وہ صبح کے وقت سرکاری زنانہ ہسپتال میں مریضوں کو دیکھتی ہیں اور شام کے وقت اپنا ذاتی مطب کرتی ہیں۔ ایک رات ہم لوگ عالم سرور میں بیٹھے دکنی ضیافت کے مزے لوٹ رہے تھے کہ نرسنگ کو اچانک بیوی یاد آگئی۔ بولے یار غضب ہو گیا۔ میں نے منگوتا سے وعدہ کیا تھا کہ واپسی میں تم کو لیتے چلیں گے۔ مگر اب تو بہت دیر ہو گئی۔ میں نے کہا فوراً اٹھ چلو۔ شاید انتظار کر رہی ہوں۔ چنانچہ بھاگم بھاگ پہونچے تو دیکھا کہ مطب کھلا ہے اور ایک موٹر بھی باہر کھڑی ہے۔ نرسنگ بلانے گئے تو منگوتا بہن باہر آئیں اور مسکرا کر بولیں مجھ کو معلوم تھا کہ حسیناؤں کی محفل میں تم لوگ مجھ کو بھول جاؤ گے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ میں ایک بچے کو دیکھ رہی ہوں۔ اس کے والدین مجھ کو گھر پہونچا دیں گے۔ تم لوگ جاؤ"

ڈاکٹر منگوتا بچوں کی بے حد مقبول ڈاکٹر ہیں۔ ہر روز نہیں دیکھتیں حتیٰ کہ اپنے نام کی تختی بھی نہیں لگوائی ہے۔ پھر بھی

عورتیں چالیس چالیس میل سے بچوں کو لے کر وقت بے وقت گھر پر آجاتی ہیں۔ اور ڈاکٹر منگو منا انکار نہیں کر پاتیں۔ کہتی ہیں کہ بیمار بچوں کو دیکھ کر میرا دل تڑپ اٹھتا ہے۔ مجھ کو اپنے بچوں کا بچپن یاد آنے لگتا ہے۔

(۳)

مجھ کو اردو اکیڈیمی نے پریم چند سیمینار میں شرکت کیلئے مدعو کیا تھا۔ یہ بہت فعال سرکاری ادارہ ہے جس کا مقصد اردو زبان و ادب کی اشاعت اور اردو ارباب قلم کی حوصلہ افزائی کرنا ہے۔ اس قسم کی اردو اکیڈیمیاں یوپی، بہار، بنگال، مہاراشٹر بلکہ قریب قریب ہر ہندوستانی ریاست میں قائم ہیں۔ اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش کا دفتر ایک دو منزلہ عمارت میں ہے اس کے ڈائرکٹر مسٹر سری واستو جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل نوجوان دانش ور ہیں۔ وہ بڑے اخلاق سے ملے اکیڈیمی کی سرگرمیوں کے بارے میں دیر تک گفتگو کرتے رہے اور اردو اکیڈیمی کی مطبوعات بھی عنایت کیں۔ وہیں جناب اختر حسن سے بھی ملاقات ہوئی جو مسٹر سری واستو کے رفیق کار ہیں۔ اختر حسن سے میری پرانی یاد اللہ ہے۔ وہ میرے بعد اخبار پیام سے وابستہ ہوئے تھے۔ اور قاضی عبدالغفار مرحوم نے علی گڑھ جاتے وقت پیام انہیں کے سپرد کیا تھا۔ اختر حسن اردو کے معروف ادیب ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف۔ حال ہی میں انھوں نے غالب کی مشہور مثنوی "ابر گہربار" کا منظوم اردو ترجمہ شائع کیا ہے۔ ایک نسخہ مجھ کو بھی دیا لیکن ابھی تک اس کو پڑھنے کی نوبت نہیں آئی ہے۔

اردو اکیڈیمی کے دفتر سے اٹھ کر سیاست کے دفتر عابد علی خاں سے ملنے گیا کہ ۱۹۴۵ء جب میں آخری بار حیدرآباد آیا تھا تو یہی صاحب جو اُس وقت صاحبزادے تھے انجمن ترقی پسند مصنفین کے معتمد تھے اور انجمن کی اس تاریخی کانفرنس کو کامیاب بنانے میں پیش پیش تھے جس کو کرشن چندر نے "پودے میں" اور سجاد ظہیر نے "روشنائی" میں لکھ کر زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔ عابد علی خاں تو نہ ملے البتہ جگر، احسن علی مرزا اور دوسرے کئی دوستوں سے ملاقات ہو گئی۔ عابد علی خاں نے اپنی اس عدم موجودگی کی تلافی بعد میں ایک پُرتکلف دعوت سے کر دی۔ کام و دہن کی لذت تو وقتی ہوتی ہے لیکن ان کے لطف و عنایات کا نشہ ہنوز باقی ہے۔ وہیں عزیزم زاہد علی خاں نے سیاست کی مطبوعات بھی عطا کیں۔ ان کتابوں میں مخدوم کے نثری مضامین کا ایک مختصر سا مجموعہ "بھی کے پیچھے لڑکا" بھی تھا۔ جس سے میں بالکل بے خبر تھا۔ دہلی اور حیدرآباد میں اردو کی نئی نئی مطبوعات کی فراوانی دیکھ کر اپنی ناواقفیت کا احساس بڑی شدت سے ہوا۔ امریکہ یا انگلستان میں کوئی کتاب شائع ہو تو ساری دنیا کے انگریزی دانوں کو خبر ہو جاتی ہے، لیکن اردو بے چاری اس سعادت سے محروم ہے۔ اس لیے کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان قریبی ہمسایہ ہونے کے باوجود کتابوں اور رسالوں کی لین دین بند ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان کی بیشتر اردو مطبوعات سے پاکستان کے لوگ اور پاکستانی مطبوعات سے اہل ہند بے خبر رہتے ہیں — کاش کوئی سورما اس دیوار چین کو توڑ سکتا — کیونکہ ان رکاوٹوں سے سراسر زیاں اردو زبان و ادب کا ہے —

پہلی تقریب جس میں حیدرآباد کے ادیبوں سے ملاقات کا موقع ملا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی جانب سے اردو ہال میں منعقد ہوئی تھی۔ اردو اکیڈیمی کی مانند اردو ہال بھی نئے دور کا ادارہ ہے۔ اس کے بانی ایک مخیّر بزرگ حبیب الرحمٰن صاحب ہیں۔ وہ ریٹائرڈ سول سرونٹ ہیں انھوں نے شہر کے وسط میں اپنی کئی ایکڑ زمین اردو کے لیے وقف کر دی ہے اور نام و نمود سے بے پروا بڑی خاموشی سے اردو کی خدمت کرتے رہتے ہیں۔ اردو ہال کی عالی شان عمارت کا افتتاح پنڈت جواہر لال نہرو نے کیا تھا۔ اردو کالج بھی اسی احاطے میں ہے۔ ترقی پسند مصنفین کے جلسے میں پہلی ملاقات جناب حبیب الرحمٰن سے ہوئی۔ وہ منتظمین کے ہمراہ باہر ہی کھڑے تھے حیدرآباد کا روایتی لباس یعنی ترکی ٹوپی اور بند گلے کی شیروانی اور تنگ مہری کا پاجامہ زیب تن تھا۔ نہایت دبلے پتلے مگر بڑی بڑی روشن آنکھیں۔ اور چہرے پر کہن سالی کے کوئی آثار نہ تھے

آندھرا پردیش کی انجمن ترقی پسند مصنفین کے معتمد عمومی ڈاکٹر حسینی شاہد ہیں۔ وہ اردو کالج کے پرنسپل ہونے کے

علاوہ پرانی دکنی اردو کے ممتاز محقق اور ادیب بھی ہیں۔ اس تقریب کے مہتمم بھی وہی تھے۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ پرانی نسل کے جانے پہچانے ادیبوں اور دانشوروں کے علاوہ نئی نسل کے ادیب بھی بڑی تعداد میں موجود تھے۔ ہر شخص جاننا چاہتا تھا کہ پاکستان میں ترقی پسند ادب کی تحریک کس حال میں ہے۔ میں نے پاکستان کے ابتدائی دور کا ذکر کرتے۔ عرض کیا کہ ۱۹۴۷ء و ۱۹۵۴ء تک ہماری انجمن پاکستان کی سب سے سرگرم ادبی تنظیم تھی۔ ملک کے اکثر و بیشتر ادیب انجمن سے وابستہ تھے اور مولوی عبدالحق، مولانا چراغ حسن حسرت ایڈیٹر امروز، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، مولانا صلاح الدین ایڈیٹر ادبی دنیا اور مولانا غلام رسول مہر ایڈیٹر انقلاب جیسے بزرگ بھی تحریک کی حمایت کرتے تھے بلکہ ۱۹۵۳ء میں انجمن کی جو کانفرنس کراچی میں ہوئی تھی اس کی صدارت مولوی عبدالحق مرحوم نے کی تھی۔ البتہ ۱۹۵۴ء میں جب امریکہ کا عمل دخل بڑھ گیا تو انجمن ترقی پسند مصنفین کو خلاف قانون جماعت قرار دیا گیا اور لاہور، کراچی، ملتان، حیدرآباد اور پشاور میں انجمن کی جو ہفتہ وار بیٹھکیں ہوتی تھیں وہ بند ہو گئیں۔ اس طرح تنظیم باقی نہ رہی لیکن ادب میں ترقی پسند رجحانات انجمن سے پہلے بھی موجود تھے۔ اور آج بھی ادیبوں میں غالب رجحان یہی ہے۔ بیشتر ادیب گرد و پیش کی زندگی کی تنقید کی جانب مائل ہیں اور معاشرے سے وابستگی کا دم بھرتے ہیں۔ ترقی پسند ادب کی ہمہ گیری کا اعتراف اس کے مخالفوں کو بھی ہے۔ چنانچہ سرکار پرست نقاد جناب سلیم احمد نے حال ہی میں جماعت اسلامی کے اخبار جسارت میں اپنے ہم خیال ادیبوں کو بہت آڑے ہاتھوں لیا ہے کہ ان کی ادبی تخلیقات حسن قبول سے محروم ہیں۔ وہ نہ فنی محاسن کے اعتبار سے ترقی پسند ادیبوں کی ہمسری کر سکتیں اور نہ ان میں وہ حقیقت شناسی، حسیت اور خلوص کی حرارت پائی جاتی ہے جس کے باعث ترقی پسند ادیبوں کی تحریریں آج بھی زیادہ پسند کی جاتی ہیں۔

ہیئت کے نئے تجربوں کا ذکر کرتے ہوئے میں نے کہا تھا کہ ہیئت کے تجربے ہر دور میں ہوئے ہیں۔ نئی نئی علامتوں، تشبیہوں اور استعاروں کا استعمال، نئے حسی تجربوں کے لیے نئی لفظیات اور اظہار بیان کا نیا انداز اس بات کا ثبوت ہے کہ زبان زندہ ہے اور رواں دواں زندگی کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش کر رہی ہے۔ البتہ ہیئت کے تجربوں کی آڑ لے کر قاری کو چونکانے یا مرعوب کرنے کی خاطر بے مقصد اور بے معنی مہمل ادب تخلیق کرنا ادب کی خدمت نہیں ہے۔ یہ کوئی اتفاقی بات نہیں ہے کہ جدیدیت کے نام پر اس قسم کے تجربے وہی ادیب کر رہے ہیں جن کا کوئی واضح نصب العین نہیں ہے یا جو یاسیت، شکست خوردگی، تنہائی اور بے چارگی کا شکار ہیں۔ ان ادیبوں کا انسان اور انسانیت پر سے اعتبار اٹھ گیا ہے۔ وہ اپنی ذات ہی کو انجمن سمجھ بیٹھے ہیں اور اپنے ذاتی آلام و مصائب کا رشتہ غم زمانہ سے نہیں جوڑ پاتے۔ یہی آلام و مصائب ترقی پسند ادیبوں کا مقدر بھی ہیں مگر فیض، حبیب جالب اور احمد فراز وغیرہ کے کلام پر دم مردم بیزاری کے آثار ملتے ہیں نہ بے بسی، ہزیمت اور اکیلے پن کا احساس ہوتا ہے۔

انجمن ترقی اُردو کی تقریب میں موضوع گفتگو پاکستان میں اردو کی ترویج و ترقی تھا۔ حیدرآباد کے لوگ اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ آئینی طور پر پاکستان کی سرکاری اور قومی زبان اُردو ہے۔ لیکن وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ہندوستان کی طرح پاکستان میں بھی اقتدار کی زبان ہنوز انگریزی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ اس رکاوٹ کے باوجود نہ صرف اُردو بلکہ علاقائی زبانیں اور ان کا ادب روز افزوں ترقی کر رہا ہے۔ افسروں کی بارگاہ میں تو ابھی تک انگریزی اخباروں اور رسالوں ہی کو باریابی کا شرف حاصل ہے لیکن اردو اخباروں کی اشاعت انگریزی اخباروں سے کہیں زیادہ ہے۔ اور طباعت و کتابت کے اعتبار سے بھی ان کا معیار بہت بلند ہے۔ میں نے مجلس ترقی ادب لاہور، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، ترقی اردو بورڈ اور اس نوع کے دوسرے اداروں کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے سید امتیاز علی تاج کی خدمات کو سراہا جو مجلس ترقی ادب کے پہلے ڈائرکٹر تھے۔ انھوں نے اردو کے کم و بیش سارے کلاسیکی ادب کو ٹائپ میں یکساں سائز پر شائع کیا تھا اور قیمت بھی بہت معقول تھی۔ مثلاً سرسید کی

تحریریں جو بالکل نایاب تھیں سترہ اٹھارہ جلدوں میں شائع ہوئی ہیں اور ان کی مجموعی قیمت فقط ساٹھ روپے ہے۔ اسی ادارے نے فورٹ ولیم کالج کی مطبوعات جس میں جان گلکرسٹ کی تصنیفات بھی شامل ہیں شائع کی ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی کے زیر اہتمام انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے اردو ترجمہ کی بھی سترہ اٹھارہ نہایت ضخیم جلدوں میں ٹائپ میں شائع ہوئی ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی ہی سے "تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند" کے نام سے ایک کتاب پندرہ جلدوں میں چھپی ہے۔ اس میں عربی، فارسی، اردو، بنگالی، سندھی، پنجابی، بلوچی اور پشتو کے علاوہ بلتی (بلتستان کی زبان) شنا (گلگت کی زبان) بروشسکی (ہنزہ کی زبان) کھووار (چترال کی زبان) کشمیری، ہندکو، سرائیکی (ملتانی) اور براہوئی (بلوچستان) زبان و ادب کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے اور ان قوموں کی تاریخ و تہذیب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ترقی اردو بورڈ کراچی تقریباً بیس برس سے اردو کا ایک نہایت جامع لغت مرتب کرنے میں مصروف ہے۔ مگر مجھ کو یہ ماننا پڑا کہ ہرچند کہ پاکستان میں علمی اور ادبی کتابیں کثرت سے شائع ہو رہی ہیں لیکن ابھی وہ حالات نہیں پیدا ہوئے ہیں کہ ادیب اور دانش ور فقط اپنی تصنیفات کے سہارے زندہ رہ سکیں اور فکر معاش سے آزاد ہوں۔ ان کو ٹی وی، ریڈیو، اخبار، سرکاری دفتر یا اس قسم کے دوسرے اداروں میں ملازمت کرنا پڑتی ہے۔

اُردو اور دوسری پاکستانی زبانوں کے باہمی تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے میں نے کہا تھا کہ اردو کا کوئی بھی خواہ سندھی، پنجابی، پشتو یا بلوچی کو دفن کر کے اپنی زبان کا سکہ نہیں چلانا چاہتا۔ کیونکہ اولاً یہ ممکن نہیں ہے۔ دوئم اردو ہمیشہ صلح و آشتی اور بھائی چارے کی زبان رہی ہے۔ آج اگر یہ زبان راس کماری سے درۂ خیبر تک کسی نہ کسی انداز میں بولی یا سمجھی جاتی ہے تو اس میں جبر اور دھونس کو دخل نہیں بلکہ اس وجہ سے کہ اردو میں رابطے کی زبان بننے کی قدرتی صلاحیت موجود ہے۔ میں نے کہا کہ اردو کا کسی زبان سے جھگڑا نہیں ہے اور نہ وہ کسی زبان کو اس کے جائز حقوق سے محروم کرنا چاہتی ہے۔ بلکہ ہمارا خیال ہے کہ پاکستان میں اگر علاقائی زبانوں کو فروغ ہوگا تو اس سے اردو کو بھی بہت فائدہ پہونچے گا۔ چنانچہ آج بھی جس طرح آپ کے دیس میں اُردو کا دامن تلوگو ادب کے نئے پرانے شاہکاروں کے ترجمے سے بھر رہا ہے اسی طرح پاکستان میں بھی علاقائی زبانوں کے ترجمے سے اُردو کے سرمایہ میں بیش قیمت اضافہ ہو رہا ہے علاقائی زبانوں کا قریب قریب سارا لوک اور کلاسیکی ادب اردو میں منتقل ہو چکا ہے۔ مثلاً شیخ ایاز نے جو سندھی کے سب سے بڑے شاعر ہیں اور اردو میں بھی فکر سخن کرتے ہیں سندھ کے ہر دل عزیز قومی شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی کے کلام کا منظوم اردو ترجمہ کیا ہے۔ علاقائی زبانوں کے میل جول سے بے شمار نئے الفاظ اور محاورے اردو میں رائج ہو رہے ہیں اور علاقائی زبانوں کے نئے ادیبوں کی تحریریں اُردو میں ترجمہ ہو کر شائع ہو رہی ہیں۔

حیدرآباد آصف جاہی دور میں اُردو زبان و ادب کا بہت بڑا مرکز تھا۔ ریاست کی سرکاری زبان اردو تھی عدالتوں کے فیصلے اور دفتری دستاویزات سب اردو میں لکھے جاتے تھے۔ ذریعہ تعلیم بھی ابتدائی جماعتوں سے اعلیٰ جماعتوں تک اردو ہی تھا۔ یہ صورت حال انضمام کے بعد وزیر اعلیٰ بی رام کشن راؤ (میرے میزبان نرسنگ راؤ کے والد) کے زمانے تک باقی رہی البتہ ۱۹۵۶ء میں جب ہندوستانی صوبوں کی لسانی بنیادوں پر از سر نو تشکیل ہوئی اور آندھرا پردیش وجود میں آیا تو اس نئی ریاست کی سرکاری زبان تلگو قرار پائی مگر آندھرا پردیش ہندوستان کی واحد ریاست ہے جہاں اُردو کو تلوگو کے پہلو بہ پہلو علاقائی سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہے اور اُردو زبان و ادب کی جو کوششیں ہر سطح پر یہاں ہو رہی ہیں وہ قابل تعریف بھی ہیں اور حوصلہ افزا بھی۔

سر تیج بہادر سپرو نے ایک بار کہا تھا کہ اردو زبان ہندو مسلمانوں کے اتحاد کی نشانی ہے (یہ فقرہ انجمن ترقی اُردو کے سرکاری ترجمان "ہماری زبان" کے سرورق پر برسوں لکھا رہا) سر تیج کے اس فقرے کی سچائی کا شاہد حیدرآباد ہے جہاں وہ غیر مسلم ادیب اور دانش ور بھی جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے۔

اردو کی ترویج و اشاعت میں پیش پیش ہیں ان میں سر فہرست
جناب یم باگا ریڈی صدر اردو اکیڈیمی اور وزیر پنچایت راج ہیں۔
وہ جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل ہیں اور انگریزی، اردو، ہندی
تلوگو، کنڑی اور مرہٹی کے علاوہ فارسی پر بھی پوری قدرت رکھتے
ہیں (وہ جامعہ نظامیہ کے منشی فاضل ہیں) جہاں تک اردو سے
محبت کا تعلق ہے مسٹر باگا ریڈی اردو اکیڈیمی کے ڈائرکٹر مسٹر
سری واستوا کے بقول "بلاشبہ اپنے قول و فعل میں فرزند اردو
ہیں۔ اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دلوانے میں مسٹر نیلم سنجیوا ریڈی
صدر جمہوریہ ہندوستان (جن کا تعلق آندھرا پردیش سے ہے)
کے علاوہ مسٹر باگا ریڈی کی انتھک کوششوں کو بڑا دخل ہے۔
وہ اردو میں کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ وہ اپنی کتاب "آندھرا
پردیش میں" جو "مادر جامعہ" کے نام معنون ہے اور اقبال کے
شعر سے

ہر لحظہ نیا طور، نئی برق تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

سے شروع ہوتی ہے۔ پھر لکھتے ہیں کہ "اس علاقے میں لسانی
عصبیت کا دور دور تک وجود نہیں ہے بلکہ تلوگو اور اردو ایک
دوسرے کو بڑھاوا دیتی ہیں اور ایک دوسرے کی اشاعت و
ترقی کی آرزو کرتی ہیں۔ زبانوں کے اس مخلصانہ آہنگ و امتزاج
نے یہاں کے پورے ماحول کو محبت، رفاقت اور علم و ادب
و فنون کا ایک دل کش گہوارہ بنا دیا ہے خصوصاً تلوگو اور اردو
اس ریاست میں شانہ بہ شانہ ترقی کی منزلیں طے کر رہی ہیں اگرچہ
اردو کا جنم شمالی ہند میں ہوا لیکن یہ افتخار آندھرا پردیش کو حاصل
ہے کہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ اسی
سرزمین کا شاعر اور فرماں روا تھا۔

حیدرآباد میں اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں
اردو کی تعلیم کا معقول انتظام ہے۔ میرے عزیز ڈاکٹر مجاور حسین
نے جو حیدرآباد یونیورسٹی میں اردو کے استاد ہیں مجھ کو بتایا کہ ہندوستان
کی ۲۶ یونیورسٹیوں میں اردو کی اعلیٰ تعلیم کا بندوبست ہے اور
اردو کے چھ سو اساتذہ یہ فرائض انجام دے رہے ہیں۔ حیدرآباد
میں اردو اکیڈیمی، انجمن ترقی اردو، ابوالکلام انسٹی ٹیوٹ، انجمن فروغ
اردو، "انجمن ترقی پسند مصنفین" اور ادارہ ادبیات اردو کے علاوہ
متعدد ادارے اردو زبان کی خدمت میں مصروف ہیں۔ ان اداروں
کو مالی امداد بھی ملتی ہے۔ ابوالکلام انسٹی ٹیوٹ کے ناظم میرے
کرم فرما جناب فضل الرحمٰن ہیں۔ ایک تقریب میں ملاقات
ہوئی۔ بڑی شفقت سے ملے۔ کہنے لگے میرے گھر ضرور آنا۔
یہ وہی مکان ہے جس میں قاضی عبدالغفار رہتے تھے۔ موصوف نے
اپنی ایک تازہ تصنیف بھی مجھے عنایت کی۔ میں شرمندہ ہوں کہ
وعدہ کرنے کے باوجود ان کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا البتہ
ان دنوں اردو کی جو انسائیکلوپیڈیا مرتب کر رہے ہیں اس کی
تفصیلات ان کے مددگار مسٹر کلیم اللہ سے معلوم ہوئیں۔
کلیم اللہ کسی زمانے میں ہمارے ہمسفر اور ہم صفیر تھے۔ اب
ابوالکلام انسٹی ٹیوٹ سے وابستہ ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ کل ہند
اردو بورڈ کی سالانہ گرانٹ ایک کروڑ روپیہ ہے۔ ترقی اردو بورڈ
کا بنیادی کام اردو نصاب کی کتابیں تیار کرنا اور مختلف علمی اور
تحقیقی منصوبوں کی مالی امداد کرنا ہے۔ ترقی اردو بورڈ نے انسائیکلو
پیڈیا مرتب کرنے کا کام ابوالکلام انسٹی ٹیوٹ کے سپرد کر دیا ہے
یہ انسائیکلوپیڈیا بارہ جلدوں میں ہوگی اور اب تک اس کی
چار جلدیں تیار ہو چکی ہیں۔ اردو کا ایک جامع لغت بھی زیر ترتیب ہے

حیدرآباد میں میری آنکھیں روزنامہ پیام، رہبر دکن،
صبح دکن، مشیر دکن، اور رعیت کو تلاش کرتی رہیں کہ عہد آصفیہ
کے ممتاز اخبار رہی تھے۔ لیکن ان میں اب کوئی بھی زندہ نہیں
اُن کی جگہ اب سیاست، رہنمائے دکن، اور منصف شائع
ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ انگریزی اور تلوگو کے اخبارات بھی ہیں
اردو اخباروں کی مجموعی اشاعت اگرچہ ایک لاکھ سے زیادہ
نہیں (جو تلوگو اخباروں سے بہت کم ہے) لیکن حیدرآباد کی
سیاسی و تہذیبی زندگی میں اردو اخباروں کو جو اہم مقام حاصل
ہے اس کا اندازہ ان کی تعداد و اشاعت سے نہیں لگانا چاہئے۔
—— اردو اخبارات پاکستانی اخبارات کی مانند آفسٹ پر
چھپتے ہیں لیکن ان کی کتابت اور طباعت کا معیار اطمینان بخش

نہیں ہے۔

منشی پریم چند کے صد سالہ یوم پیدائش کی تقریبات

ان دنوں ہندوستان کے گوشے گوشے میں منعقد ہو رہی ہیں۔ حیدرآباد کا پریم چند سمینار اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ یہ سمینار اردو اکیڈمی کی جانب سے اردو ہال میں بڑے اہتمام سے منایا گیا اور مجھ کو یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ حاضرین کی تعداد دہلی کے چار روزہ سمینار کے اجلاس سے زیادہ تھی۔ اس سمینار کا حاصل محترمہ ڈاکٹر زینت ساجدہ کی تقریر تھی۔ اس طوطی شیریں بیان کی خوش مذاقی اور شوخی گفتار کا تھوڑا سا تجربہ مجھ کو پہلے ہی دن دوپہر کے کھانے پر ہو گیا تھا۔ وہ میزبان تھیں لہذا ہر شخص موقع پا کر ان پر فقرے چست کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور وہ اکیلی تنہا لڑ رہی تھیں۔ ان کے ناوک نطق دلب سے کسی کو مفر نہ تھی اور میں انتظار میں تھا کہ دیکھیں یہ برق میری طرف کب رخ کرتی ہے۔ لیکن شاید مجھ کو مہمان سمجھ کر بخش دیا گیا۔

پریم چند سمینار میں زینت ساجدہ کی تقریر کا موضوع "منشی پریم چند کے نسوانی کردار" تھے۔ پریم چند کے ناولوں اور افسانوں میں عورت ماں، بیوی، بیٹی بھی ہے اور طوائف بھی۔ پرانی وضع کی گھر گرہستن بھی ہے اور نئی طرز کی سوسائٹی لیڈی بھی مگر زینت ساجدہ کے بقول عورت کی شخصیت کا احترام اور اس سے بے پناہ ہمدردی کا جو جذبہ پریم چند کی تحریروں میں ملتا ہے وہ شاید ہی کسی ادیب کو نصیب ہو ــــ بلکہ بیشتر ادیبوں کے افسانوں میں تو عورت فقط بستر کی زینت اور ہوس کی بے شرمیوں کا نشانہ بنی رہتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ:

"پریم چند کی کہانیوں اور ناولوں میں مرد کی لگام ہر جگہ
کسی نہ کسی عورت کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔"

اب راستہ صاف تھا اور زینت ساجدہ ادب کی لگام ہاتھ میں لیے بے تکان دوڑنے پر آمادہ مگر ڈاکٹر حسینی شاہد نے جو سمینار کمیٹی کے سکریٹری تھے اپنا حق شوہری استعمال کر کے اس چہکتے بلبل کا منہ بند کر دیا اور سمینار پر اوس پڑ گئی۔

بقرعید کی شام ہم نے پروفیسر انور معظم اور جیلانی بانو کے ساتھ گذاری۔ جیلانی بانو سے میں اس وقت سے واقف ہوں جب ان کی کہانیاں ہفت روزہ لیل و نہار لاہور میں چھپتی تھیں ان کے اور واجدہ تبسم کے افسانوں کے ذریعہ میں حیدرآباد کی نئی نسل کی ادبی سرگرمیوں سے تھوڑا بہت روشناس ہوا تھا۔ اسی دوران میں پتہ چلا کہ وہ علامہ حیرت بدایونی کی صاحب زادی ہیں۔ علامہ حیرت مرحوم پیام کے منیجر قاری عباس حسین کے دوست تھے اور میں کبھی کبھار قاری صاحب کے ہمراہ علامہ حیرت کے گھر جایا کرتا تھا۔ جیلانی بانو سے ملاقات اس وقت ہوئی جب کئی برس گذرے وہ "انور معظم صاحب کراچی آئے اور میرے مکان کے قریب ہی اپنے عزیزوں کے پاس ٹھہرے۔ وہ پچھلے سال بھی کراچی آئے تھے مگر فقط ایک بار ملنا ہوا تھا۔ انور معظم صاحب اسلامیات کے پروفیسر ہیں لہذا میں اُن سے دور حاضر کے اسلامی افکار و احوال پر گفتگو کرنا چاہتا تھا لیکن ہنس مکھ ہونے کے باوصف معظم صاحب بے حد کم سخن واقع ہوئے ہیں۔ اس لیے زیادہ وقت ادبی مسائل ہی پر گفتگو ہوتی رہی۔ چلتے وقت جیلانی بانو نے اپنے افسانوں کا نیا مجموعہ "پرایا گھر" عنایت کیا۔ ہماری خاتون افسانہ نگار نہ جانے اتنے حقیقتوں سے لبریز افسانے کیسے لکھ لیتی ہیں۔ پڑھو تو یوں لگتا ہے گویا ساری دنیا دیکھ چکی ہیں اور ہر قسم کے حسی تجربات سے آگاہ ہیں مگر انسانی رشتوں کے پیچ و خم اور غم ہستی کے اظہار کا ہنر ان کو کون سکھاتا ہے؟

ایک شام حیدرآباد کے نوجوان اور صاحب ذوق شاعر راشد آذر کے ساتھ گذری۔ وہ میرے جواں مرگ دوست مصطفٰی زیدی کے مداح نکلے۔ اپنے آخری مجموعے "کوہ ندا" کا مسودہ مصطفٰی زیدی نے خودکشی سے فقط تین دن پہلے مجھ کو اشاعت کے لیے دیا تھا اس کی ایک نظم کا ہدف فیض صاحب اور میں ہوں۔ راشد صاحب کے استفسار پر میں نے بتایا کہ جن دنوں ہم لوگ کراچی سے لیل و نہار شائع کرتے تھے تو مصطفٰی زیدی ایک نظم اشاعت کے لیے لائے جس کے آخری شعر میں صدر پاکستان کو ملک کا جیلر کہا گیا تھا۔ وہ زمانہ جنرل یحیٰی خاں صدر پاکستان کے مارشل لا کا تھا۔ ہم نے مصطفٰی زیدی سے کہا کہ یہ شعر نکال دو ورنہ پرچہ بند ہو جائے گا۔ تم ایسے کون سے قومی رہنما ہو جس کے

ایک شعر پر ہم اخبار کو قربان کر دیں (وہ جنرل یحییٰ خاں سے اس وجہ سے خفا تھے کہ سرکاری افسری سے ان کی برطرفی جنرل یحییٰ خاں کے حکم سے ہوئی تھی)۔ زیدی نہ مانے اور نظم واپس لے کر چلے گئے۔ مگر دوسرے ہی دن پھر آئے اور ہماری "جراءت کردار" کے خلاف ایک طویل طنزیہ نظم ہمارے سامنے رکھ دی اور کہنے لگے کہ ہمت ہو تو اس کو چھاپ دو۔ ہم نے چھاپ دی۔ "جیلر والی نظم اور طنزیہ نظم" دونوں کوہ ندا میں موجود ہیں۔

راشد میاں تجریدی شاعری کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے تین مجموعے مجھ کو دیئے اور میں نے ایک رات میں پڑھ لیے۔ ان پر جو جانکاہ سانحہ گزرا اس سے وہ ابھی تک سنبھل نہیں سکے۔ اس صدمے کا اثر ان کے کلام پر بہت گہرا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کی شاعری محبوب سے دائمی مفارقت کا نوحہ بن گئی ہے۔ ان کے جذبے کے خلوص اور احساسات کی سچائی سے کون انکار کر سکتا ہے لیکن پرانے زخموں کو خون دل پلا کر تازہ کرتے رہنا صحت مند ذہن کو زیب نہیں دیتا۔ غم ذات خواہ کتنا ہی پیارا ہو زندگی کا بدل نہیں ہو سکتا۔ غم ذات کو غم کائنات میں حل کر دینا آسان کام نہیں ورنہ ہر شخص کا مزاج اس کو قبول کرتا ہے۔ البتہ اس کوشش میں غم ذات کی شدت اگر کم ہو جائے تو بھی غنیمت ہے مگر راشد میاں کو مشورہ دینے والا میں کون۔ ان کو چارہ سازوں اور غمگساروں کی حاجت ہے۔ ناصحوں کی نہیں۔

ایک شام انوار العلوم کالج کے اساتذہ اور ریسرچ اسکالروں سے گفتگو کا موقع ملا۔ اجتماع چونکہ محققین کا تھا لہٰذا میں نے البیرونی کی کتاب الہند، ابن ندیم کی الفہرست اور شہرستانی کی الملل والنحل کا حوالہ دیتے ہوئے عرض کیا کہ ان بزرگوں کا تلاش حق کا جذبہ اور حصول علم کی خواہش ہمارے لیے آج بھی مشعل راہ کا کام دے سکتی ہے۔ ان کو کبھی یہ خیال نہیں آیا مختلف مذہبوں اور معاشروں کے مطالعے سے ان کا ایمان خطرے میں پڑ جائے گا۔ لیکن ہمارے دانشوروں نے مدت ہوئی یہ روایت ترک کر دی نتیجہ یہ ہے کہ آج اردو زبان میں کسی قدیم مذہب یا معاشرے

اگر کوئی اردو داں یہ جاننا چاہے کہ ہندو مذہب، ہندو فلسفہ یا بدھ مذہب یا یہودی مذہب یا عیسائیت کے بنیادی اصول کیا ہیں تو اس کو ناکامی ہوگی۔ میں نے مغربی محققین کی علمی کاوشوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر مانٹگومری واٹ Montgomery Watt اور پروفیسر حتی وغیرہ کی کتابیں اسلامیات کے نصاب میں داخل ہیں۔ لیکن کیا کسی مسلمان محقق کو گوتم بدھ حضرت موسیٰ یا حضرت عیسیٰ پر کوئی کتاب لکھنے کی توفیق ہوئی ہے۔ اس کوتاہی کے اسباب وعلل پر افسوس ہے کہ زیادہ بحث نہ ہو سکی کیونکہ کالج کی شام کی شفٹ کا وقت ہو گیا تھا۔ بہر حال میں کالج کے پرنسپل صاحب اور اساتذہ کا ممنون ہوں کہ انھوں نے میری گذارشات ہمدردی سے سنیں۔

ایک دن نرسنگ راؤ مجھ کو تلگو فلم "ما بھومی" (ہماری زمین) دکھانے کے لیے گئے۔ میں نے اب تک کوئی تلگو فلم نہیں دیکھی تھی۔ البتہ جاں نثار اختر مرحوم کے بیٹے جاوید نے کراچی میں بتایا تھا کہ تلگو میں فلمی صنعت نے بہت ترقی کی ہے اور ہندوستان میں بے شمار تلگو فلمیں بن رہی ہیں۔ ما بھومی حیدرآباد میں بنی ہے اور اتنی مقبول ہے کہ اس کے دو سو سے زیادہ شو ہو چکے ہیں لیکن ٹکٹ گھر کے سامنے شائقین کی قطار بدستور لگی رہتی ہے۔ بیرون ملک کے لیے مکالمے /رامنش نرسنگ راؤ نے لکھے ہیں۔

ما بھومی "یادش بخیر تلنگانہ کے بارے میں ہے۔ وہی تحریک جس کو مخدوم نے "مرا ثبات، مری کائنات، میری حیات" کہا تھا (اس فلم میں ٹریڈ یونین لیڈر کا کردار مخدوم ہی کا جزو ہے) فلم میں آصفی دور کے کسانوں پر مقامی زمین داروں کے مظالم سرکاری عملے اور زمین داروں کی ملی بھگت اور آخر کار اس جور وستم کے خلاف کسانوں کی مسلح جدوجہد کو بڑی دلیرانہ فنکاری کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ کسان زمین داروں کو مار بھگاتے ہیں اور زمیں آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔ اسی اثنا میں ہندوستانی فوج ریاست میں داخل ہوتی ہے۔ کسان خوش ہیں کہ اب ان کو زمین داروں کی لوٹ کھسوٹ سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا مل جائے گا
[illegible]

کی وفاداری کا دم بھرتے تھے کھدر کا کرتا اور گاندھی ٹوپی پہن کر دیش بھگتوں کا روپ دھار لیتے ہیں۔ سرکاری جیپوں میں بیٹھ کر اپنے علاقے کا رخ کرتے ہیں۔ اور پولیس اور فوج کی مدد سے کسانوں کو شکست دے کر زمینوں پر دوبارہ قابض ہو جاتے ہیں۔ اس فلم میں فنی خامیاں ضرور موجود ہیں لیکن طبقاتی جدوجہد کے سچے واقعات پر مبنی اتنی تیز و تند اور مفاہمتوں سے پاک فلم شاید ہندوستان میں بھی اب تک نہیں بنی ہے۔

ایک روز مخدوم کے بیوی بچوں سے ملنے گیا۔ میں نے ان کی بڑی بیٹی اسا لقی کو اس وقت دیکھا تھا جب وہ چھ سات سال کی تھی۔ بیگم مخدوم اور دوسرے بچوں سے ملاقات کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ وہ سب لوگ اب آرام سے ہیں۔ مخدوم کو تو دوسروں کی چارہ گری سے کبھی اتنی فرصت نہ ملی کہ اپنے جیب و گریباں کی فکر کرتا البتہ مخدوم کے شیدائیوں کی کوشش سے دو مکان مخدوم کی بیوی اور اسا دری کو الاٹ کر دیئے گئے ہیں۔ اور ان کے دونوں بیٹے نصرت اور ظفر ملازم ہیں۔ میرے پاس کہنے کے لیے الفاظ نہ تھے۔ سارا وقت مخدوم کی پوتیوں، نواسیوں کے ساتھ بیٹھا جشن مخدوم کی تصویروں کا البم دیکھتا رہا۔ وہاں سے اٹھ کر سیدھے درگاہ شاہ خاموش گیا جہاں راج بہادر گوڑ پھولوں کی چادریں لیے منتظر تھے۔ ایک چادر شاہد صدیقی کی قبر پر چڑھائی اور دوسری مخدوم کی قبر پر جو "سو گیا ساز پہ سر رکھ کے سحر سے پہلے"۔ عجیب اتفاق ہے کہ مخدوم سے میرا تعارف شاہد صدیقی ہی نے ایک مشاعرے میں کروایا تھا ــــ ہم لوگ چلنے لگے تو قبروں کے نگراں نے شکایت کی کہ مخدوم صاحب کی قبر کے گرد لوہے کی جو سلاخیں نصب ہیں بچے ان پر جھولا جھولتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ایک سلاخ ڈھیلی ہو گئی ہے۔ اس غریب کو کیا معلوم کہ مخدوم کو بچوں سے کتنا پیار تھا۔ اور بچوں کی ان شرارتوں کو اگر وہ دیکھ سکتا تو کتنا خوش ہوتا۔

ایک شام شری متی اندرانی دھن راج گیر اور ان کے شوہر نامدار شری ششندر رشرما کی صحبت میں گذری۔ اندرانی دیوی روپ سار، دکن کے ایک پرانے ادب نواز خاندان کی نور نظر ہیں۔ آبائی محل میں رہتی ہیں مگر جھونپڑیوں کا خواب دیکھتی ہیں انگریزی میں شعر کہتی ہیں۔ حالانکہ خود حافظ شیرازی کی مجسم غزل ہیں۔ ان کا غائبانہ تعارف تو مخدوم کے مجموعہ بساطِ رقص کے ذریعہ ہو چکا تھا جس میں اندراں دیوی کی دو نظموں کے ترجمے بھی شامل ہیں البتہ ملاقات اب کے پہلی بار ہوئی۔ اور جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا بلکہ کچھ زیادہ ہی۔ اندرانی دیوی محل کے جس گوشے میں رہتی ہیں وہ دکنی تہذیب کے امیرانہ لوازمات سے سجا ہوا ہے۔ آسمانی رنگ کی نیلی چھت جس پر ستاروں کی طرح جگمگاتے ہوئے طلائی نقش و نگار، بلوری جھاڑ فانوسوں میں برقی شمعیں روشن ایرانی قالین اور افرنگی صوفے لیکن پرانی وضع کے جو مشرقی مذاق کو گراں نہ گذریں۔ غرضیکہ بہشت کے اس گوشے میں ذوق نظر کی تسکین کا پورا سامان موجود تھا اور کام و دہن بھی لذت سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ لیکن وہاں بجلی کے پنکھے نہ تھے اور ہم گرمی میں پسینے سے تر ہو رہے تھے۔ ہمارا کوئی ارادہ جہنم میں جلنے کا نہیں ہے۔ لہٰذا دل ہی دل میں سوچتے رہے کہ اگر بہشت میں بھی ایسا ہی ماحول ملا اور بجلی کے پنکھے نہ ہوئے تو زندگی کیسے بسر ہوگی۔ اپنے اندیشے کا اظہار چپکے سے شہاب سے کیا تو وہ بولا "جنت میں تو ایر کنڈیشنر لگے ہوئے ہیں۔ ہم نے کہا پھر اندرا جی ایر کنڈیشنر کیوں نہیں لگواتیں"۔ اس نے جواب دیا "ان کو گرمی نہیں لگتی ــــ" اور واقعی میں نے دیکھا کہ اندرانی جی اور شری ششندر دونوں آرام سے بیٹھے تھے۔ ان کی پیشانیاں عرق آلود نہ تھیں۔

شری ششندر رشرما تلگو کے مشہور شاعر اور نقاد ہیں۔ اب تک ان کی ۴۴ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ وہ انگریزی میں بھی لکھتے ہیں۔ انھوں نے مجھ کو اپنی تین تصانیف عنایت کیں ایک مجموعہ تلگو نظموں کا جن کا ترجمہ خود انھوں نے انگریزی میں کیا ہے۔ دوسری انگریزی خطوط کا مجموعہ جس میں عوام اور ادب کے حوالے سے بحث کی گئی ہے اور تیسرے "میری دھرتی میرے لوگ" جمان کی جدید رزمیہ نظم ہے۔ اس کا ترجمہ جناب اختر حسن نے

اردو میں کیا ہے۔

اندرا ن دیوی زیادہ وقت اردو ہی میں گفتگو کرتی رہیں۔ وہ پریم چند سمینار میں شریک ہونا چاہتی تھیں لیکن تاریخ کے بارے میں دھوکا ہوا اس لیے نہ جا سکیں۔ جی چاہتا تھا کہ ان کی نظمیں اُن کی زبان سے سنوں مگر فرمائش کی جرأت نہ ہوئی۔ اردو کی شاعر ہوتیں تو ہم کو کہنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی، وہ خود سنا نے لگتیں اسلیے کہ اردو شاعر اپنا کلام دوسروں پر مسلط کرنے کو اپنا حق سمجھتا ہے۔ وہ شعر نہ سنائے تو شاید اس کا کھانا ہضم نہ ہو۔ اور ہم تو وہ سخت جان ہیں جس نے لکھنؤ میں ایک شاعر صاحب کے خیالِ ادارئیے نثر میں سنے اور اب تک زندہ ہیں۔ افسوس ہے کہ انگریزوں میں مشاعرے کا رواج نہیں ہے لہٰذا انگریزی کے شاعر محفلوں میں بھی اپنے شعر شاذ و نادر ہی سناتے ہیں ـــ اور ہم نہ سخن فہم، نہ سخن ور پھر اندرا ن دیوی ہم کو کیوں سناتیں۔ البتہ انھوں نے بھی اپنی دو تصانیف عنایت کیں۔

بعض اوقات جوالا مکھی پہاڑ کی چوٹی پر برف جم جاتی ہے اور سادہ لوح سمجھتے ہیں کہ پہاڑ کا دل بھی ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ ان کو کیا خبر کہ لاوا اندر ہی اندر پکتا رہتا ہے اور جب پھوٹتا ہے تو اس کی ہیبت ناک آتش فشانی سے موت بھی لرز اٹھتی ہے۔ اندرا ن دیوی کی رفتار و گفتار میں اتنا ٹھہراؤ تھا۔ ان کا چہرہ اتنا پر سکون تھا کہ مجھ کو ان کی روح کے ہیجان و اضطراب کا اندازہ نہ ہو سکا۔ اور نہ ان کے شاعر ذہن میں جذبات و احساسات کی جو آگ بھڑک رہی تھی اس کی تمازت محسوس ہوئی بلکہ بار بار یہی خیال آتا کہ یہ آسودہ حال خاتون لاکھ دل کش سہی مگر شعر کیا کہتی ہوں گی۔ دردمندی ان کی خو کیوں ہو اور زندگی کی المناکیوں سے ان کو کیا سروکار لیکن ان کی نظمیں پڑھیں تو اپنی بدظنی پر سخت ندامت ہوئی۔

ان کی نظم Partings in Mimosa علامتی ہونے کی وجہ سے مشکل سے گرفت میں آتی ہے۔ مموسا کو ہماری زبان میں چھوئی موئی کہتے ہیں۔ ہوتا ہے جیسی جس کی پتیاں عشق پیچاں کی طرح بہت باریک اور نازک ہوتی ہیں پتیوں کو چھوؤ تو وہ لجا کر اپنا بدن سکیڑ لیتی ہیں۔ کہتی ہیں ہم کو بس دور سے دیکھو چھوؤ گے تو ہم مرجھا جائیں گے۔ پھر تھوڑی دیر میں ہوا کا کوئی جھونکا آ ملتا ہے اور ان کی شرم کی چادر سرکا دیتا ہے۔ پتیوں کے لب دوبارہ کھل جاتے ہیں۔ اور پلکیں جھپکنے لگتی ہیں۔ مگر اندرا ن دیوی کی نظم میں ممو سا کوئی درخت ہے جس کے تلے دو دل ملتے اور جدا ہوتے ہیں۔ اس قسم کے ممو سا سے ہم واقف نہیں۔ ممکن ہے یورپ میں ہوتے ہوں۔

یہ نظم وقت کے محور پر گھومتی ہے۔ وقت جو ابدیت کے دوش پر سوار، مقام و منزل سے بے نیاز، گردش لیل و نہار کے منظر دکھاتا اور فنا و بقا کے اسرار بتاتا، ہستی کے سینے میں اترتا اور کائنات کی پہنائیوں میں حل ہوتا، تاریخ کے ورق الٹتا اور تہذیب کو چلاتا مارتا، انسانی شعور کو بیدار کرتا اور تحصیل ذات کے امکانات روشن کرتا گذر جاتا ہے۔ لہٰذا زندگی کے بدلتے ہوئے موسموں کی تگ و دو، حیات بشر کے سفر میں بہار و خزاں کی آویزشیں اور عرفان ذات کی جستجو سب وقت ہی سے وابستہ ہے۔

ان کے دوسرے مجموعے Poems of National Memory کی نظمیں اگرچہ بے حد جذباتی ہیں۔ لیکن عام فہم بھی ہیں اور بہ اعتبار معنی ممو سا والی نظم سے مختلف بھی۔ ممو سا والی نظم میں اندرا ن دیوی افسانہ آفاق کی بوقلمونیوں کے حوالے سے بیان کرتی ہیں۔ قومی یادوں انسانوں کا دکھ ہے" جن کی زندگی عبارت ہے آسمان کی کھلی چھت کے نیچے غربت اور بھوک سے۔ یہ نظمیں قومی یادیں ہیں "یادیں جو فقط میری نہیں ہیں اور نہ محض میرے اندر کے شاعر کی ہیں بلکہ قومی حافظہ جو تاریخ کے ہر لمحے کو یادوں کی زمین پر پڑنے والے ہر قدم کے نشان کو محفوظ کر لیتا ہے/ میرا اعظم اور اس کے باسی اجتماعی حافظے میں محو ہو کر ایک ہو جاتے ہیں

در ایک مشترکہ درد میں شریک ہو جاتے ہیں۔" اور شاعر جس کو
ہر تاریخی حقیقت کا شعور ہے اپنے کلام میں لوگوں کے اجتماعی
شعور کو اپنی علامت بنا لیتا ہے ہر ملک کا ادب اپنے زمانے کے
واقعات ہی قلمبند نہیں کرتا بلکہ انسانوں کی تقدیر اور ان کے
کردار کی از سرِ نو تشکیل بھی کرتا ہے۔"

اندرا دیوی کی یہ نظمیں دراصل فردِ جرم ہیں اس سماجی نظام
کے خلاف جو ہزاروں برس سے ہم پر حاوی ہے اور جس نے
انسان سے اس کی انسانیت، اس کی انفرادیت، اس کی خودی
سب چھین لی ہے ان کے نزدیک "یہ صدی اندھی صدی ہے،
بصیرت سے محروم جس میں بھوک اُگتی ہے۔ بھوک کے پھول کثرت
سے کھلتے ہیں، جنگل کی طرح گنجان، باغ کی طرح بھرپور۔" ان
کی آرزو ہے کہ "میرا قلم کسی بھوکے پیٹ کا خاکہ کھینچ سکے، ایک
بھوکی صدی کی سچی تصویر، میں برہنہ انسانیت کی تصویریں بناتی
رہتی ہوں یہاں تک کہ یہ صدی بول اٹھے اپنی ناانصافیوں
کے جواب میں۔"

ان کے ضمیر میں پوشیدہ بھوکا انسان کہتا ہے کہ "آسمان
بہاسانس لے رہا ہے جو امیر الکھرہے میں ایک پرشکستہ پرندہ ہوں جو
میں پر رینگتا ہے یہاں میری انتڑیوں میں بھوک ایک بدنما
جنس پھول کی مانند اندر ہی اندر اُگتی ہے بھوک جس کی کوئی شکل
نہیں کوئی جسم نہیں کوئی نام نہیں کیونکہ اس کو نام کبھی نہیں ملا
بھوک جس کی کوئی شکل نہیں کوئی جسم نہیں اس صدی کو نام
دے دیا ہے اس نے تو برا عظموں کو بھی نام دیا اور میں ایسے ہی ایک
عظیم کا باسی ہوں جہاں لاشیں کتب خانوں کے ارد گرد لوٹ آتی
جاتی ہیں اور حنوط شدہ انسانی چڑیا گھروں میں دفن ہوتے
ہیں بھوک ہمارے ضمیر کی بولتی دستاویز ہے ہمارے عہد کی
بھی آپ جیسی بالخصوص اس براعظم کی لیس ہم اپنے اصلی چہرے
سے سر سیوں چھپائیں ؟
مردود چہرے مجروح چہرے قابلِ نفرت چہرے زخموں
سے بھوہان اور زمانے کے ہاتھوں بدنام اور رسوا چہرے۔"

لیکن شاعر کا زخمی ضمیر کراہتا نہیں بلکہ للکارتا ہے۔ "ہم
ان غاروں میں کیوں رہیں۔" دکھ کے آنسو کب تک بہائیں گے اور
کب تک ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں گے۔ درد کے ان دنوں کو
احتجاج بن کر پھوٹنے سے کب تک روکتے رہیں گے، احتجاج کو کب تک
اپنا وجود نہ بنائیں گے ۔

"میرے لوگو!
ہماری جدوجہد زندگی کی خاطر ہونی چاہیے
انسانی وقار کی بحالی کی خاطر۔
تمہارے جلال کو مجروح ہستی کے پنجرے سے باہر آنا چاہیے ۔
اور کھلے آسمان میں
خواہشوں کے شہپار کی مانند پرواز کرنا چاہیے
وقت سے اس دعدوں کو جھپٹ کر چھیننے کی خاطر
اس کے چہرے کی جھوٹی نقاب کو ہمیشہ کے لیے نوچ پھینکنے کی خاطر۔

OO

بقیہ شیشوں کا مسیحا صفحہ ۲۰ سے آگے

کی ہیں اور سہیل نے اپنی منویر کی صلاحیتوں کو خوش
آمدید کہا ہے۔

تنویر نے درست ہی اعتراف کیا ہے کہ "میں نے
ان خوابوں کو ذہن کے کاسہ میں ٹھا ماسنر ذرخ
کیا جیسے شرابی شیشے سے آخری بوندوں کو سمیٹتا ہے اور پھر
اس عالم میں میں نے زندگی کی کچھ تلخ حقیقتوں کو گھول دیا اور
اور جب میں نے اس کاسہ پر نظر ڈالی تو یہ راز مجھ
پر عیاں ہو گیا کہ اس میں میرا اپنا ہی عکس نظر آ رہا
ہے۔

یہ ناولٹ نئی دنیا کے لوگوں اور بدلتے ہوئے ساظر میں
ہر آئینہ دہلا العادیا سعادت کی بھرپور رومانیت کا حامل
ہے جس کی اشاعت پر تنویر مبارکباد کے مستحق ہیں۔
(وقار خلیل)

فضا ابنِ فیضی

طرزِ احساس نیا، اور اچھوتا اسلوب
ہے جدا سب کے اسالیب سے اپنا اسلوب

کوئی اظہار یہاں مانعِ ترسیل نہیں
شرط یہ ہے، کہ نہ گنجلک ہو ہمارا اسلوب

سب کی آواز کی پہچان ہے اس بھیڑ میں گم
ڈھونڈتے پھرتے ہیں خود اپنا ہی چہرا اسلوب

دور تک تازگیِ فکر کی ملتی نہیں دھوپ
وہی یخ بستہ سے جذبے، وہی ٹھنڈا اسلوب

بات کہنے کا سلیقہ ہے بڑی چیز یہاں
کھُردرے سے یہ مسائل، یہ دھکتا اسلوب

ذہن گنجینۂ معنی ہے تو فکر اس کی کلید
کھولتے ہیں درِ گنجینۂ معنی اسلوب

مختلف ذہنی رویوں کی دھنک ہیں ہم تم
وہی اپنا بھی ہو کیوں، ہے جو تمہارا اسلوب

بات کیا ہے، کہ نہ بات اس کی دلوں میں اتری
طرزِ اظہار تھا پامال، نہ پھیکا اسلوب

آتشِ جاں نے، مری گود میں پالا اُس کو
جب بدن جل کے ہوا راکھ تو نکھرا اسلوب

نوکِ قلم سے کبھی ظالم کا سراپا لکھا
نوکِ تیشہ سے کبھی ہم نے سنوارا اسلوب

کچھ اسی سے ہے یہاں خوش ہنری کی پہچان
مرا اسلوب، کہ ہے بے ہنری کا اسلوب

ڈھنگ سیکھے کوئی اس شخص سے فن کاری کی
بات سادہ سے، مگر تازہ و رعنا اسلوب

بھیڑ سے نکلو فضا تم کو صدا خود دے گا
منفرد سا کوئی لہجہ، کوئی تازہ اسلوب

۵۵

بات رسیلی سب کی سب، لہجہ البیلا سب کا سب
ہم عصروں میں بانٹ چکا میں اپنا سونا سب کا سب

کس سے پوچھوں کیوں ہیں یہ ترسیل کے پیکر بے چہرہ
لفظ مکمل سب کے سب، ابلاغ ادھورا سب کا سب

لوگ پرانی قدروں کی تجدید سے خائف ہیں کتنا
ڈال دو میرے دامن میں یہ کھوٹا سکہ سب کا سب

توصیفی جملے بھی اُس کے ہیں طنزیہ تمثیلیں
پی جائیں گے پینے والے، میٹھا کڑوا سب کا سب

دن جب پھریں گے تو اک دن یہ راتیں کام آئیں گی
اچھا ہے جھولی میں بھر لو، کالا اجلا سب کا سب

تم بھی عصری آگاہی کا اک پیکر بن جاؤ گے
وقت چُرا لے جائے گا، جب آنکھیں چہرا سب کا سب

کس کی بلا تھی کس کے سر آئی، ڈھوتی ہے رسوائی رات
ڈوبتا سورج چھوڑ گیا تھا، اپنا اندھیرا سب کا سب

میں بھونرا تھا، ساری تہمت میرے سر کا بوجھ بنی
دھوپ ہوا نے چپکے چپکے شہد نچوڑا سب کا سب

معنی کے انجانے رشتے لفظوں کی الجھی ڈوریں
میرے ہی حصے میں آیا اُلٹا سیدھا سب کا سب

پہلے تپا لو خود کو شعورِ نقد و نظر کی بھٹی میں
یہ کیا بس کاغذ پہ اُگل دو، کچا پکا سب کا سب

پہلے بھی اپنی باتوں میں شیرینی کچھ کم تو نہ تھی
درد گھلا تو اور ہوا احساس رسیلا سب کا سب

۵۵

زبیدہ تحسین

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

جامعہ عثمانیہ کو اپنے جن فرزندوں پر فخر ہے
ان میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ کا نام نمایاں
مقام رکھتا ہے۔ آپ اچھے ادیب، نقاد، شاعر
یہاں تک کہ مؤرخ بھی تھے۔ آپ کے اجداد سلطان
محمد تغلق کے ساتھ دکن آئے تھے۔ آپ کے جدِ اعلیٰ
سید ابراہیمؒ جنھوں نے دکن میں قندھار شریف کو
اپنا وطن بنایا۔ علم کی خدمت، مسلمانوں اور ہندوؤں
کو روحانی بیداری کا سبق پڑھایا۔ حضرت سید نظام الدین
اولیاءؒ کی فیضِ صحبت سے استفادہ کیا۔ ان پر
حضرتؒ کی خاص عنایت و شفقت رہی۔ شیخ کا لقب
آپ ہی نے عنایت فرمایا۔ آپ کے بزرگوں میں سید شاہ
جلال الدین رفاعی و سید شاہ بدر الدین رفاعی
نے شہرت حاصل کی۔ ڈاکٹر صاحب کے والد بزرگوار
سید شاہ غلام محمد تھے جنھوں نے [illegible]
[illegible] آزمائی کی پھر سب چھوڑ کر مسلمانوں کی ترقی اور
مذہب کی اشاعت اور ترویج کے لیے اپنے آپ کو
وقف کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ان کے مزار پر ایک
خوبصورت مقبرہ اور درگاہ کے احاطہ میں خانقاہ تعمیر
کروائی۔ ان کا عرس ہر سال بڑے اہتمام سے منایا
جاتا ہے۔

ڈاکٹر زورؔ ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئے اور ابتدائی
تعلیم کی تکمیل مفید الانام ہائی اسکول سے کی پھر دارالعلوم
اور عثمانیہ یونیورسٹی سے امتیاز کے ساتھ کامیابی
حاصل کی اور ڈاکٹریٹ کے لیے ۱۹۲۷ء میں سرکاری
طور پر انگلینڈ بھیجے گئے۔ ۱۹۲۹ء میں پی ایچ ڈی کی
ڈگری لی اور پیرس ہوتے ہوئے حیدرآباد واپس
ہوئے۔ جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ اردو میں [illegible]
آپ کا تقرر عمل میں آیا۔ پروفیسر شعبۂ اردو اور صدر شعبہ
[illegible] جلیل القدر عہدہ پر فائز رہے۔ عثمانیہ
یونیورسٹی سے وظیفۂ حسن خدمت پر سبکدوش ہونے کے بعد
کشمیر یونیورسٹی بحیثیت صدر شعبۂ اردو [illegible]
گراں قدر خدمات [illegible]

[illegible] پر فائز [illegible]

ڈاکٹر زورؔ [illegible] اہم [illegible]

یادگار [illegible] جن میں چند ایک [illegible]
عہدِ عثمانی میں "اردو کی ترقی" [illegible]
اردو کے اسالیب بیان، تذکرۂ اردو مخطوطات
محمود غزنوی کی بزمِ ادب، روحِ تنقید، ہندوستانی لسانیات

راشد آذر

زخموں کی زباں

جو گھاؤ سینے پہ ہیں
مجھے ان کا دکھ نہیں ہے
کہ ان کی ایسی زبان نہیں ہے
جو تم کہو تم سمجھ نہ پائے
تم ان سے نظریں چراؤ لیکن
حقیقتوں کو نظر کا دھوکہ نہ کہہ سکو گے
تم اپنے خنجر چھپاؤ لیکن
لہو پکارے گا آستیں کا
کہ خوں زبانوں کی چھوٹی چھوٹی [illegible]
[illegible] کی چیخ بن گیا ہے
مگر میں ہر لمحہ یہ سوچتا ہوں
جو زخم دل میں چھپے ہوئے ہیں
میں اُن کا اظہار کس زباں میں کروں
کہ تم ان کو دیکھ پاؤ
مجھے خدا کے لیے بتاؤ
مجھے خدا کے لیے بتاؤ

سید علی ظہیر

ایک نظم

جبر اور ظلم کی دو دھاری تلوار
کوئی نئی چیز تو نہیں
لیکن جب بھی چمکتی ہے نئی لگتی ہے
اس کی زبان میں عجیب چمک ہوتی ہے
راتوں میں یہ زبان آسمان سے لٹکتی رہتی ہے
اور دن کے اُجالے میں دماغ میں چھپ جاتی ہے
اس کی نوک پر چپکے ہوئے ہزاروں ماؤں کے [illegible]
کسی پسیتے ہوئے لمحے [illegible]
لیکن پھسلتا ہوا کوئی لمحہ
ان کو نہیں بچا سکتا
صرف گرم گرم قطروں اور جلتا ہوا وقت [illegible]
انشاءاللہ انھیں بچائے گا۔

قندِ مکرر

محمد احمد سبزواری

سکندر علی وجد: چند یادیں

اورنگ آباد دکن برِصغیر کی تاریخ میں کافی اہم مقام رہا ہے۔ اورنگ آباد جس کا پرانا نام کھڑکی تھا، اکبر کے دور میں ایک حبشی سردار ملک عنبر کا مستقر رہا ہے جس نے اکبر اور جہانگیر کی فوجوں کو بڑا تنگ کیا۔ مرہٹوں کو نظام شاہی فوج میں بھرتی کرکے چھاپہ مار لڑائیوں کا طویل سلسلہ شروع کیا جو شاہ جہاں اور عالمگیر کے عہد تک جاری رہا اور دکنی مہمات کے ذیل میں اورنگ زیب کو مستقل دکن میں سکونت اختیار کرنا پڑی۔ اس کی ملکہ رابعہ دُرانی بیگم کا یہیں انتقال ہوا اور یہاں کا مقبرہ تاج محل آگرہ کے نمونے پر اورنگ آباد ہی میں واقع ہے۔ خود شہنشاہ کا انتقال احمد نگر میں ہوا مگر وصیت کے مطابق اُن کو اورنگ آباد کے قریب خلد آباد میں دفن کیا گیا۔

اردو کے ابتدائی شعرا میں سراج کی پیدائش یہیں کی ہے جن کی مثنوی "بوستانِ خیال" کو اردو مثنویات میں خاص مقام حاصل ہے۔ بیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں جب سکندر وہاں طالب علمی کی زندگی گزار رہے تھے اس وقت اورنگ آباد کی یہ حالت تھی

یہ ریاست کے چار صوبوں میں سے ایک کا صدر مقام تھا، ریاست کے جملہ محکموں کے دفاتر یہاں تھے۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد بلدۂ حیدرآباد اور تینوں صوبائی مستقروں پر انٹرمیڈیٹ کالج قائم ہو چکے تھے۔ مولوی عبدالحق اس کالج کے پرنسپل تھے، جس کے ساتھ ہائی اسکول کی جماعتیں بھی شامل تھیں، انجمن ترقی اردو کا دفتر اور پریس بھی یہیں تھا۔ مولوی صاحب نام کے پرنسپل تھے، نگران کو اورنگ آباد کا بے تاج بادشاہ سمجھنا چاہیے۔ مولوی صاحب کافی عرصے سے یہاں تھے، اس لیے سب سے واقفیت تھی، مولوی صاحب کی علمی شخصیت سے بھی لوگ کافی متاثر تھے۔ اپنے اثر سے مولوی صاحب بہت کام لیتے تھے اور ضرورت مندوں کے بے شمار کام کرا دیتے تھے اور ان میں طالب علم پیش پیش ہوتے تھے۔ ان کو محنتی طالب علموں سے بڑی محبت تھی۔ اورنگ آباد میں جن طالب علموں پر ان کی خاص نظرِ عنایت رہی ان میں شیخ چاند [illegible] تھے اور سکندر علی وجد خاص طور پر نمایاں رہے۔ وجد ضلع اورنگ آباد کے تعلقہ بیجاپور کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد [illegible] زمیندار تھے۔ وہاں سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اورنگ آباد آ گئے اور یہیں سے میٹرک اور انٹرمیڈیٹ [illegible] جامعہ عثمانیہ سے ڈگری حاصل کی۔

بھی صدیقی، عبدالخالق، میر محمد علی خاں میکش وغیرہ شامل تھے۔ باہر سے مخدوم محی الدین، مرزا ظفر الحسن، میر حسن اس میں شامل رہتے تھے بسکندر بھی اس کے ایک اہم رکن تھے کچھ سے تو اس لیے تعلق تھا کہ وہ ہم جماعت تھے اور کچھ سے اورنگ آباد کے ناتے تعلقات تھے۔ مگر یہ ہمیشہ لیے دیے رہتے تھے۔

اس زمانے میں ہمالیہ، ویکاجی اور نظامیہ (حیدرآباد کے دو مشہور ہوٹل) کی شاخیں کھل چکی تھیں جن میں چائے، سٹر، سینڈ وغیرہ مل جایا کرتی تھی، مگر بعد مغرب بند ہو جاتی تھیں جب کہ پڑھنا کو یا ہم پڑھا کو لڑکوں کو رس گیا۔۔۔ چائے کی تلاش ہوتی تھی تاکہ چائے کی ایک پیالی پی کر مزید پڑھائی کر سکیں۔ حالانکہ کالی چائے، کے بعد چائے پینے کے بعد زیادہ تر چائے نوش بستروں میں دب کر سنہرے سپنے دیکھا کرتے تھے۔ اس وقت اس ضرورت کی طلب ماسٹر کا ہوٹل فراہم کیا کرتا تھا جو ایک جھگی میں واقع تھا اور دن بھر جامعہ کے مزدوروں کی طلب پوری کیا کرتا تھا رات کو طلبہ کی ٹولی یہاں پہنچتی، ماسٹر کو جگایا جاتا، وہ گیس کی لالٹین اور چولہا جلاتا اور راستی رکی لذت کو دوبالا کرنے کے لیے گراموفون کے ریکارڈ بجاتا، اور بالآخر نہ کاموں کی ساعت بجھاتا۔ جب ماسٹر کی خوب روبیوی کو کوئی لے اڑا تو ماسٹر بھی ہوٹل بند کر کے اس کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا، اور اب اس کی جگہ ایک پوربیا نے لے لی اس کی ایک خصوصیت تو یہ تھی کہ یہ ادھار دینے میں بڑا فراخ دل تھا اور دوسرے گولڈ فلیک کو "گولڈ فلاس" کہتا تھا جس کی بنا پر اس ہوٹل کا نام ہی "گولڈ فلاس" پڑ گیا۔ سکندر وقتی طور پر ایسی ہوٹلوں کو دیکھ کر ان ہوٹلوں پر آجایا کرتے تھے۔ بالخصوص اس زمانے میں جب کہ وہ حیدرآباد سول سروس کے امتحانی مقابلے میں شرکت کی تیاری کر رہے تھے۔

اس ٹولی کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ گالی گلوچ کے ماہر تھے۔ ایک دوسرے کو ننگی گالیاں دے کر بے تکلفی جتاتے تھے۔ لطف کی بات یہ تھی کہ نہ صرف گالی کھانے والا برا نہ مانتا تھا بلکہ دوسروں کے ساتھ لطف لیتا، قہقہے لگاتا اور بدلے کی طرح نئی گالی دینے کی سوچتا تھا مگر سکندر کی گالیاں بھی مخصوص تھیں، وہ ان کو ایسی پونجی سمجھتا تھا جس کو ہر کہہ و مہ پر لٹانا نہیں چاہتا تھا۔

یہ لوگ ذہین تھے، ہنسوڑ تھے، فقرہ بازی میں استاد، ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے۔ سکندر کو گنگنانے کی عادت تھی۔ اشفاق نے اس کے کمرے کا نام رکھا "سماع خانہ"۔ محمد علی میکش کے کمرے کا نام تھا "میخانہ"۔ ایک کمرے میں دو بلند قامت بھائی رہتے تھے اس کا نام رکھا "شتر خانہ"۔ ایک روز اشفاق نام گنا رہا تھا کہ مخدوم نے پوچھا "اور خود تیرے کمرے کا نام کیا ہے؟" اشفاق نے کہا "چائے خانہ"۔ کسی نے کہا نہیں "یتیم خانہ"۔ سکندر تڑ سے بولا "بے خانہ"۔ اور قہقہوں کا سیلاب امڈ آیا۔

میری قدریں اس جماعت سے متضاد تھیں مگر پھر بھی معلوم نہیں کیوں یہ سب میرے چہیتے تھے اور میں نے بارہا ابتدا میں گالیاں کھائیں مگر جب جواب میں خاموشی رہی تو انھوں نے گالیوں کو ضائع ہونے سے

سکندر کا رنگ صاف اور شکل و صورت اچھی تھی، آواز سُریلی۔ گانے اور اداکاری کا بھی شوق تھا۔ کالج کے ماحول نے ان پر اور رنگ چڑھا دیا۔ سید وہاج الدین مبتلا (لکھنؤ کے رہنے والے) جو کالج میں معاشیات کے استاد تھے۔ مگر آپ ہر فن مولا تھے۔ شعر و ادب، تقریر، ترجمہ، ڈرامہ نگاری، اداکاری اور ٹینس سب سے دلچسپی تھی اور ہر صنف میں کافی ملکہ تھا۔ یہ کالج کے اقامت خانے کے وارڈن تھے اور سالانہ کالج کے دو ماہی رسالے "نورس" کے نگران مدیر۔ یوم کالج یہاں بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا جس میں دوڑوں اور کھیلوں کے مقابلے، تقریری مباحثے، مشاعرے اور ڈرامے ہوا کرتے تھے جس میں نہ صرف دیگر اضلاع بلکہ بلدہ سے چیدہ چیدہ حضرات بطور مہمان شرکت کیا کرتے تھے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی کا مشہور "مشاعرہ" "دلی کی آخری شمع" سب سے پہلے یہیں ۱۹۲۹ء میں اسٹیج پر پیش کیا گیا تھا۔

مبتلا صاحب کی سرپرستی نے سکندر کی شاعرانہ صلاحیتوں کو ابھارا اور یہ شعر کہنے لگے۔ اقامت خانے میں ہر بارہویں کو محفلیں ہوتی تھیں جن میں سارے طالب علم (جن کی تعداد ۲۴، ۲۵ ہوتی تھی) ایک طرف ہوتے تھے اور مبتلا صاحب دوسری طرف۔ مبتلا صاحب کو اگر کوئی شعر یاد نہ آتا تو فی البدیہہ شعر کہہ لیا کرتے تھے۔ سکندر بھی ان کی پیروی میں شعر موزوں کرنے لگے۔ جب یہ ایف اے کے سال دوم میں آئے تو "نورس" کے نائب مدیر بنا دیئے گئے جس کا اعزازیہ بھی سات روپیے ماہانہ ملا کرتا تھا۔ سکندر کے بعد راقم الحروف نے یہ خدمت دو سال انجام دی۔ اسی سال یہ اقامت خانے کے سینئر ہاؤس مانیٹر بنا دیئے گئے۔ کالج کا ہاسٹل قلعہ ارک میں ایک پرانی کوٹھی میں تھا اور جس کے حصہ میں مبتلا صاحب رہا کرتے تھے اور انھوں نے اپنے ساتھ والا ایک کمرہ سینئر ہاؤس مانیٹر اور سینئر فٹ بال مانیٹر کو دے رکھا تھا۔ اس طرح سکندر اوپری منزل میں رہتے تھے اور اپنے ساتھیوں پر رعب جھاڑا کرتے تھے۔

۱۹۳۳ء میں جب میں اورنگ آباد پہنچا اس وقت سکندر حیدرآباد جا چکے تھے مگر کالج، اقامت خانہ اور ادبی محفلوں میں ان کا نام گونجا کرتا تھا۔ اسی سال جب موسم سرما میں وہ کالج ڈے کے سلسلے میں اورنگ آباد آئے تو ان سے پہلی ملاقات ہوئی۔ یہ آج سے پورے نصف صدی کی بات ہے۔

دو سال بعد جب میں حیدرآباد پہنچا تو سکندر نے بی اے کر کے ایم اے میں داخلہ لے لیا تھا، اور اڈیکمیٹ کی ہی شاندار عمارت کے ہاسٹل "ڈی لے" کے ایک انفرادی کمرے میں مقیم تھے۔ ہوسٹل کی یہ عمارت اپنی نوعیت کی واحد عمارت تھی اور اس وقت تک برصغیر کی کسی جامعہ میں ہوسٹل کی اتنی شاندار عمارت موجود نہ تھی۔ کمروں میں سلو کے چکنے پتھروں کا فرش تھا۔ وارڈروب، میز، کرسی ہر طالب کی ہوا کرتی تھیں۔ غسل خانوں اور واش بیسنوں میں گرم اور ٹھنڈے پانی کا انتظام تھا۔ وسیع و عریض اور اعلیٰ قسم کے فرنیچر سے مزین کامن روم تھے۔ یہ ساری چیزیں طلبہ کے مزاج بگاڑ دیتی ہیں پھر سکندر جیسے شخص کو نیم چڑھا کریلا بنا دینے کے لیے کافی تھیں۔

اس زمانے میں اقامت خانے میں ایک جماعت تھی جس میں سید اشفاق حسین، شہاب الدین، جمیل احمد رفی

کے لیے گالی دینا چھوڑ دی اور اس طرح محبت و خلوص بڑھتا رہا۔ میں ان کی علمی و ادبی محفلوں میں [illegible]
ت کرنے لگا اور انتخابی اختلافات کے باوجود کبھی کوئی کشیدگی نہیں ہوئی اور جب [illegible] اور مرزا
حسن نشستگاہ حیدرآباد پر قابض ہوگئے تب تو یاران طریقت کے مزے ہوگئے اور تعزیتوں اور نظموں کا
سلسلہ چلنے لگا جس نے ہم جیسوں کے معیار زندگی کو بلند کرنے میں اہم کردار ادا کیا مگر سکندر نے اس چشمہ
سے کم ہی فیض حاصل کیا۔ وہ رہتا ٹھاٹ باٹ سے تھا۔ ایک زمانے میں وہ وکاجی ہی رہا جو حیدرآباد
کا گراں ہوٹل تھا۔ اس کا تعلق کھاتے پیتے گھرانے سے ضرور تھا مگر اس کے والد تو فیاضی کی بنا پر
تنگ دست ہی رہا کرتے تھے۔ مجھے پتہ نہیں کہ اس کے پاس اس اللّے تللّے کے لیے روپیہ
سے آتا تھا۔

سکندر آتش مزاج تھا اس میں انا بھی اور برتری کا احساس۔ اس کے مزاج کا اندازہ یوں ہو سکتا
ہے وہ مجھ سے دو سال سینئر تھا، پھر ہم دونوں اورنگ آباد کالج سے آئے تھے۔ ان معاملوں میں سینئر اور جونیئر
کا امتیاز ہوتا ہے۔ جونیئر کو ہر معاملہ میں اپنے سینئر کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ ابتدا میں [illegible] سلام میں
کیا کرتا تھا لیکن جب میں چوتھے سال میں آیا تو عارضی اقامت خانے کا [illegible] ہوگیا اور
طرح موسٹ سینئروں کے زمرے میں شامل ہوگیا۔ جب میں نے محسوس کیا [illegible] سلام کا منتظر ہے میں نے
اس کو سلام کرنا چھوڑ دیا۔ انھوں نے کبھی مجھے سلام نہیں کیا اور ہم دونوں [illegible] کے ایک دوسرے
سے کبھی کبھی تو وہ میرے کمرے پر آجاتے تھے اور بغیر سلام کے بات چیت شروع ہوجاتی تھی۔ [illegible]
اس کی آتش مزاجی دو آتشہ ہوگئی۔ بعد میں ان کو شاید اس کا خود بھی احساس ہوگیا تھا [illegible]
اسمبلی الکشن کے بعد ان کے بہت سے ساتھی پاکستان آگئے۔ کچھ [illegible] اصرار
شادی تو بیجاپور کے ایک خاندان میں ہوئی جو کچھ عرصہ پہلے ہی منتقل ہوکر آیا تھا اور جس کی
ہوگئی تھی مگر ان کے اولاد نہیں ہوئی اور ان اسباب نے ان کے مزاج کو بدل دیا ان کا ایک شعر

شعلہ مزاج وجد میں اب سرکشی کہاں
وہ خاک پائے اہل نظر بن کے رہ گیا

وجد کے زمانے میں جامعہ میں شعرا کی کوئی کمی نہیں تھی مشاعروں میں ایک وہ تھا تانی، مخدوم، وجد، صمد رضوی ساز
[illegible] مسکین، مسلم ضیائی، شعیب احمد حزیں، محی الدین قادری، ریاض الحسن ہاشمی، محمود حسین [illegible]
شریک ہوا کرتے تھے مگر ان میں مخدوم اور وجد دونوں ممتاز رہتے تھے۔ دونوں کی آواز اچھی اور
نرالا تھا مگر شخصی طور پر دونوں میں بڑا تفاوت تھا۔ وجد کا استری دار پاجامہ، سیاہ شیروانی، اکڑا اکڑا
وں میں کریم، ناک پر سنہرا چشمہ ہوا کرتا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ دارالامرا کی نمائندگی کر رہا ہے۔ مخدوم بے استری کا

میلا پاجامہ جس کا کبھی ایک پائنچہ نیچا اور دوسرا اونچا، پھٹے موزے، میلی سی شیروانی جس کا ایک آدھ بٹن غائب سر پر کشتی جس کے کناروں پر میل کی تہہ، رنگت آبنوسی، آنکھیں چمکدار اور روشن جن میں شرارت ناچتی ہوی، سچ مچ دالہا کا سا نندہ معلوم ہوتا تھا۔ اس ظاہری تضاد کے باوجود ابتداء میں دونوں کے خیالات میں بڑی ہم آہنگی تھی، رومانوی کیفیت اور واردات قلب نمایاں ہوا کرتی تھی۔ مخدوم کی ایک ابتدائی نظم یوں تھی:

یہیں لی تھی محبت نے سبق کی ابتداء میں نے یہیں کی جرأتِ اظہارِ حرفِ مدعا میں نے
یہیں دیکھے تھے عشوے ناز و انداز و حیا میں نے یہیں پہلے سنی تھی دل دھڑکنے کی صدا میں نے
یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

وجد نے کہا ہے

تری رعنائیوں میں اپنے شعروں کو بسایا ہے
تری تعریف کا نغمہ تجھے بے دل رلایا ہے

کچھ آگے بڑھتے ہیں تو مخدوم نے کہا:

شب کے جاگے ہوے تاروں کو بھی نیند آنے لگی آپ کے آنے کی امید تھی اب جانے لگی

وجد نے کہا:

سن کے مجرم کیوں ربائی کا پیام
دیر تک لپٹا رہا زنجیر سے

اگلے قدم میں شاعروں کو سماجی ناانصافیوں معاشی مشکلوں اہلِ ہنر کی ناقدریوں کا احساس ہوتا ہے۔ مخدوم سرمایہ داروں کی پرانی حویلی کا ذکر یوں کرتا ہے:

جن میں رہتے ہیں مہاجن جن میں بستے ہیں امیر جن میں کاشتی کے برہمن جن میں کعبے کے فقیر
رہزنوں کا قصرِ شوریٰ قاتلوں کی خواب گاہ کھکھلاتے ہیں جرائم، جگمگاتے ہیں گناہ

تو وجد نے ناقدریِ ہنر کا شکوہ یوں کیا:

ناقدریِ ہنر کی شکایت فضول ہے آئیں نیا نہیں یہ پرانا اصول ہے
اصلاحِ انتظام وطن تیری بھول ہے اِل ہر گدھے کی پیٹھ پہ اطلس کی جھول ہے

اس میں چند شعر اور اضافہ کر کے بہ نذرِ اشفاق کر دیے، دراصل یہ اس جاگیردارانہ ماحول پر بھرپور طنز تھا جس کا تابناک سورج اپنی پوری شدت سے دکن کی سرزمین پر چمک رہا تھا اور جس کی گرمی سے مقامی باشندے ہی زیادہ جھلس رہے تھے اور اسی کی لگائی ہوی آگ نے وہاں ملکی غیر ملکی کا سوال کھڑا کیا جس میں اکثر دونوں ہی طرف کے اہلِ ہنر پسے۔ مخدوم محی الدین، سید اشفاق حسین، محمد احمد سبزواری سب ان ہی تیروں کے زخم خوردہ ہیں لہ میں مخدوم کھلم کھلا باغی ہو گیا اور دیارِ ہند میں تلنگانہ کو آزادی و انقلاب کا رہبر بنا کر یوں کہنے لگا:

پڑی ہے فرقِ مبارک پہ ضربتِ کاری حضورِ آصفِ سابع پہ ہے غشی طاری

وجد بھی کچھ اسی قسم کی بات کرتا مگر اپنی ذاتی صلاحیت اور مولوی عبدالحق کی کوششوں کی بدولت وہ حیدرآباد سول سروس کے امتحانی مقابلے میں کامیاب ہوگیا۔ سول سروس اکیڈیمی میں ٹریننگ لے کر محکمہ عدالت میں سب جج مقرر کردیا گیا اور اب اگر وہ آصف سابع کی مدح سرائی نہ کرے تب تو کم از کم اس پر ذاتی حملوں سے گریزاں ہوگیا اور یوں مخدوم اور وجد دو ایسی الگ الگ راہوں پر چل کھڑے ہوئے جو ایک دوسرے کی مخالف سمتوں میں جاتی تھیں۔

وجد کی ایک خوبی یا خصوصیت یہ بھی رہی کہ اس کو شہرت اور تحسین ناشناسی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ ہر اس کی تعریف کے ڈونگرے سمیٹنا نہیں چاہتا تھا۔ اسی وجہ سے وہ طالب علمی ہی کے زمانے سے صرف جامعہ کے مشاعروں یا مخصوص بھی مشاعروں میں شرکت کیا کرتا تھا۔ عام مشاعروں میں شرکت کو قطعاً پسند نہیں کرتا تھا اور نہ ایسا کلام ہر رسالے یا اخبار کی زینت بنانا چاہتا تھا۔ سول سروس میں آنے کے بعد ان قیود کی پابندی اس پر سرکاری اور روایتی طور پر خود بخود لگ گئی اور وہ عوام سے بالکل کٹ گیا۔

عوام سے کٹ جانے کا مقصد یہ نہیں تھا کہ وہ عوام سے الگ ہوگیا یا عوام اس کو بھول گئے وہ عوام کا پسندیدہ شاعر رہا اور اس کے کلام میں عوام کے دلوں کی دھڑکنیں سنی جاسکتی ہیں۔ اس کی معرکتہ الآرا نظموں میں جہاں تخیل کی بلندی اور خیالات کا تنوع موجود ہے وہاں اس بات کا بھی برملا اظہار ہوتا ہے کہ وہ تاج محل، اجنتہ اور جامعہ عثمانیہ کے حسن و نازک گوشوں کی تعریف کرتے ہوئے اس حقیقت کو فراموش نہیں کرتا کہ ان کے صناعوں کا ریگروں، معماروں اور مزدوروں کے نام سے کوئی واقف نہیں مگر اپنے بنائے ہوئے نقوش کی وجہ سے وہ عرصہ دراز تک باقی رہیں گے آرٹس کالج جامعہ عثمانیہ کی نظم کا ایک مصرع ہے ؎

کام چھوڑا ہے کہیں نام نہیں چھوڑا •

یا اجنتہ کی مشہور نظم کا ایک شعر ہے :

زمانے کی جبیں پر عکس چھوڑے ہیں نگاہوں کے
رہیں گے نقش ان کے نام مٹ جائیں گے شاہوں کے

اور یہ حقیقت خود وجد پر بھی صادق آتی ہے کہ شاہوں کے نام مٹ رہے ہیں اور مٹتے جائیں گے مگر اس کے شعر زندہ رہیں گے۔　　(بشکریہ سب رس کراچی جولائی ۸۲ء)

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید

اعظم صاحب

(جناب میر اعظم علی مالک [illegible] نیشنل فائن پرنٹنگ پریس اور نیشنل بک ڈپو کا بعارضہ قلب ۶ جون ۱۹۸۳ء کو اچانک انتقال ہو گیا۔ موصوف نے اپنے طور پر اردو کی جو خدمات انجام دیں ان کا اعتراف ضروری ہے۔ ادارہ ادبیات اردو کی مطبوعات اور ماہنامہ سب رس کی اشاعت میں مرحوم نے اپنے والد کی روایتی اردو دوستی کو تادم زیست بحال رکھا۔ ڈاکٹر جاوید کا یہ خاکہ اردو والوں سے ان کی رفاقت کا آئینہ دار ہے (ادارہ)

میر اعظم علی نام اور خواجہ پاشا عرفیت [illegible]۔ اپنے گھر، نزدیک و دور کے رشتہ داروں، سسرالی عزیزوں، جناب [illegible] اور بک ڈپو کے ملازمین، ادیبوں، شاعروں اور کاروباری حلقوں میں جانے پہچانے اور پکارے جاتے۔ لیکن ان سے میرے مراسم تھے ہی جداگانہ۔ اپنی نوعیت کے۔ میں نے انھیں خواجہ پاشا، نہیں اعظم میاں کہا یا اعظم صاحب۔ اعظم صاحب شستہ و شائستہ، مرنجان مرنج، سنجیدہ، متین اور غیر معمولی رکھ رکھاؤ کی شخصیت کے مالک تھے۔ انھیں تو آج سے صدی پون صدی قبل حیدرآباد کے کسی جاگیردارانہ معاشرے کا فرد ہونا چاہیے تھا وہ اس معاشرے کے فرد نہ ہوئے ہوں لیکن جاگیردارانہ معاشرے کی بہت سی اچھی خصوصیات ان کی شخصیت میں رچ بس گئی تھیں اور واقعہ یہ ہے کہ جاگیردارانہ معاشرہ اپنی خامیوں کے باوجود کئی ایسے اوصاف کا حامل تھا۔ کاروباری ہوتے ہوئے بھی خیر کا [illegible] روایت [illegible] اور [illegible] ہوئی۔ [illegible] کھلا ہاتھ اور [illegible] لوگوں کو دیتے بھی ایسے کہ دوسرے ہاتھ کو خبر نہ ہوتی۔

آج اعظم صاحب کی خانوادہ روتی ہیں کہ ان کا [illegible] بیٹا چلا گیا۔ ان کی اہلیہ کے دل پر جو بھی گذری ہوگی اس کا [illegible] نہیں کر سکتا۔ ان کی لڑکیاں اپنے باپ کے غم میں سوگوار ہیں اور لڑکے مشتاق اور امتیاز ریاب کا ذکر اس حسرت سے کرتے اور [illegible] ہیں کہ فضا دردناک محسوس ہوتی ہے۔ لیکن یہی لوگ غم زدہ، ملول خاطر اور باچشم نم ہیں۔ آج تو اور کئی بھی نوحہ بہ لب ہیں کیا ان کا سہارا ٹوٹ گیا۔ ان کا سرپرست اٹھ گیا اور ان کا نگہبان اور رکھوالی کرنے والا نہیں رہا — اور ان کے انتقال کے بعد آج ان کے رشتہ داروں اور ملازمین سے جو واقعات سننے میں آتے ہیں تعجب ہوتا ہے کہ یہ وہی اعظم صاحب تھے جو ذیل ڈول کے اعتبار سے بظاہر آرام پسند اپنے آپ میں گم، چپ چاپ اور دوسروں سے بے پرواہ دکھائی دیتے تھے۔ نہ جانے انھوں نے کتنوں کی رشتے داریوں میں خود وہ پنے عزیزوں کی ہمت افزائی، غیروں کے دل کھول کر مدد کی، کتنوں کے انتقال پر ان کے تجہیز و تکفین کے سامان کیے۔ کتنے ہی طالب علموں کی فیس ادا کی اور کتنوں کے کیسے کیسے وقت کام آئے۔ اور یہ سب کچھ اس انداز سے کہ کوئی خواہش [illegible] جیسے یہ ان کے معمولات میں داخل تھا اور یہ سب نہ ہوتا تو وہ بھی نہ ہوتے سو وہ رہتے بھی تھے ایسے خاموش خاموش سے۔ ایسا

...یں کے سیٹیوں کی گھڑگھڑاہٹ میں ان کی آواز دب چکی تھی۔
...ہٹ کر بھی میں نے انہیں کبھی زور سے اور تیز گفتگو کرتے
...سنا۔ نہ وہ تیز چلتے نہ کھاتے اور نہ چائے ہو کہ پانی تیز پیتے
...ان کی ہر بات میں اعتدال، توازن اور میانہ روی پائی
...بھی۔ میانہ قد و قامت۔ چلتے بھی تو ایسے جیسے سوچ سوچ
...پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے ہوں۔ گفتگو محسوس ہوتا
...وقت کرتے جب سامنے والا بات کرتے کرتے تھک جائے یا
...سب فکر یں آؤ کوئی انہونی ہو جائے یا شاید کبھی مخاطب
...ہنسنا مقصود ہوتا۔ گفتگو کر لیتے۔ حتیٰ کہ پیسے لینے دینے
...وغیرہ کے لیے میز کا خانہ بھی کھولتے تو تکلف سے گویا
...ندے کا ڈھل رہا ہو۔ پریس میں میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ
...زور سے آواز دیتے ہوں۔ ملازم دور ہوتا تو اشارہ
...وہ قریب آتا تو جو بھی کہنا ہو کہتے۔ گھر میں بھی یہی حال
...سید کہیں کہ بے نہیں ہے، کس طرح رہتے... ادیبوں
...شاعروں سے بھی ان کے مراسم کچھ انفرادی نوعیت کے تھے۔

اعظم صاحب اپنے ڈھب کے مطالعے میں خاصا وقت
...تے گھر پر بھی اور خاص طور پر پریس میں اندر کے کمرے میں
...کے کھانے کے بعد وہ تھوڑا بہت وقت مطالعہ کے لیے
...دیتے۔ اعظم صاحب نہ ادیب تھے نہ شاعر، لیکن ان
...ادبی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ حیدرآباد
...کتنے ادیب اور شاعر ہیں جن کی تصانیف کو انھوں
...طباعت سے آراستہ کیا۔ حیدرآباد میں اردو کے موقف اور
...والوں کی تعداد کے تناسب سے بد قسمتی یہ ہے کہ یہاں
...نہ تو کوئی مناسب اشاعت گھر ہے اور نہ کتابوں
...ادارے خاص طور پر ادبی کتابوں کے لیے طویل
...ہے۔ ادیب اور شاعر اپنے طور پر کتاب شائع کر
...ہیں تو کس نیا مسئلہ!؟ میں یہ نہیں کہتا کہ نیشنل پریس اور
...ڈپو نے اس خلا کو پورا کر دیا تھا۔ البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ اس
خلا کو ممکنہ حد تک . . . .

...کم کرنے میں نیشنل بک ڈپو نے خاطر خواہ حصہ ادا کیا ہے۔ اعظم
صاحب اور ان کے والد مغفور جناب میر احمد علی صاحب نے
اردو کے کتنے ہی ادیبوں اور شاعروں کی حوصلہ افزائی کی۔ ان
کی کتابوں کو اپنے طور پر شائع کیا۔ جنہوں نے چاہا ان کو معاوضہ
بھی دیا بلکہ بعضوں نے تو کچھ زیادہ ہی حاصل کیا اور جن ادیبوں
اور شاعروں نے کتابیں اپنے طور پر شائع کیں ان کی کاغذ کی
فراہمی میں مدد کی اور طباعت وغیرہ کا معاوضہ جتنا بھی ادا کیا ہو
لے لیا۔ تقاضہ کیا ہو لیکن ایسا تقاضہ نہیں کہ شاعر یا ادیب کا
موقف مجروح ہو۔ اور وہ شرمندگی محسوس کرے یا اس کی کتاب
کی رسم اجراء یا نکاسی متاثر ہو۔ ادیب شاعر ایسے بھی ہے کہ
معاوضہ جلد ہی ادا کرنے کا وعدہ کر کے رسم اجراء کے لیے کتاب کی
چند جلدیں لے لیتے اور پھر مہینوں غائب اعظم میاں جنہوں نے
اپنا سرمایہ ان کتابوں پر لگایا ہوتا خاموش ہو جاتے۔ اگر کوئی توجہ
دلاتا تو یہ کہہ کر رہ جاتے کیا کریں اردو والوں کا حال ہی ایسا ہے۔
گویا سارے گلے تمام ہوئے۔ اس جواب میں ... ہیں انھوں
نے دیگر کتب خاص طور پر کلاسکس کی اشاعت میں نمایاں ...
ادا کیا "شاہنامہ اسلام" غالب، میر اور مومن کے دواوین کی اشاعت
پر خصوصی توجہ دی۔ پاکٹ بکس کا سلسلہ آگے چل کر عام ہو گیا
اور خالص تجارتی بنیادوں پر لیکن نیشنل بک ڈپو نے پاکٹ بکس
پر اس وقت توجہ دی جب کہ ابتدائی دور تھا اور حیدرآباد کی شاعت
میں اردو کے نامور اساتذہ کی صلاحیتوں سے استفادہ کیا۔
کٹ اپ میں بھی یہ پاکٹ بکس اپنی مثال آپ رہے۔ اور آج
بھی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

نیشنل پریس میں ہر نوعیت کی چیزیں شائع ہوتیں اور ہر
پریس کی طرح۔ لیکن علمی و ادبی جرائد پر اعظم صاحب کی نظر التفات
لگی رہی تھی۔ زیادہ نہیں۔ وقار خلیل اور عتیق ... صاحبان
سے پوچھ لیجیے "سب رس" اور "شگوفہ" کی اشاعت سے اعظم صاحب
کو کیسی دلچسپی تھی کوئی علمی و ادبی کام اعظم صاحب کا ایسا کام ہوتا
وہ اس خصوص میں جو بھی ہو سکتا کرتے۔

شعروادب کی خدمت کے کئی زاویے ہیں کئی انداز، کئی طریقے۔ سید احمد علی صاحب اور ان کے بعد اعظم صاحب نے شعر نہ کہا ہو، نثر نہ لکھی ہو لیکن جس زاویے سے شعروادب کی خدمت کی اس کا ادب اور ادب کی تاریخ میں کچھ نہ کچھ بیان ہونا ہی چاہیے یقین ہے حیدرآباد میں اردو ادب کی تاریخ لکھنے والے نیشنل پریس اور بک ڈپو کی خدمات کو فراموش نہیں کریں گے۔

اعظم صاحب کو میں نے کئی حالتوں میں دیکھا۔ پریس میں بھی اور گھر پر بھی۔ خالص کاروباری گفتگو کرتے ہوئے بھی اور بے تکلف بات چیت کے دوران بھی اور قوالی کی محفلوں میں بھی۔ ایک مرتبہ ان کے ہاں میر محمد عزیز کی قوالی تھی۔ میں حیدرآباد میں تھا مجھے بھی قوالی اور عشائیہ میں شرکت کی دعوت دی۔ پرتکلف اور سارے لوازمات کے ساتھ عشائیہ میرے لیے تعجب خیز نہیں تھا۔ لیکن مہمانوں کی تواضع، قوالی میں داد کا انداز اور قوال کو نوازنے کی ادا کہ بس دیکھا چاہیے۔ میں بھی دیکھتا رہا۔ یوں بھی وہ سیر و شکار کے رسیا اور دوست احباب کو کھلانے پلانے کے شوقین تھے۔ کھانے کا بھی اعلیٰ ذوق رکھتے تھے بلکہ یہ ایک طرح کی کمزوری تھی۔ ان کے قریبی عزیزوں کو ان سے یہی شکایت تھی کہ وہ پرہیز نہیں کرتے کتنی ہی روک ٹوک اور احتیاط کی جائے وہ موقع نکال ہی لیتے ہیں۔ اس سے پہلے بھی دو مرتبہ ان کے قلب پر حملہ ہو چکا تھا۔

سوائے اس کے کہ گرمیوں کی چھٹیاں ہوں اور میں ایک ڈیڑھ ماہ کے لیے حیدرآباد میں رہوں، ورنہ اعظم میاں سے میرا ملنا کم ہی ہوتا۔ رہا حیدرآباد جب بھی آتا ان سے ملنا ضرور کہ میری کسی نہ کسی کتاب کا سلسلہ جاری رہتا اور ویسے بھی ان سے ملاقات کے بغیر واپس ہونے کو بھی جی نہ چاہتا اور ملاقات بھی کیا سیدھی سادی ہوتی تھی، ملا رہے دھرم کانٹے کے سامنے سے گزر کر سیدھی طرف مڑ جائیے اور پھر بائیں طرف ۔۔۔ ذرا چہرہ اٹھائیے حمائل اگر ہوں تو سامنے پریس میں وہ اپنی کرسی پر بیٹھے دکھائی دیں گے۔ میں بھی بائیں سمت مڑ کر آگے بڑھتا اور ابھی پریس کی سیڑھیوں کے قریب ہوتا کہ اعظم میاں ایستادہ ہوتے نظر آتے سیڑھیوں کو طے کرکے ان تک پہنچنے میں ایک آدھ منٹ لگتا۔ اس دوران مصافحہ کے لیے وہ اپنا ہاتھ اس تکلف، اس اہتمام اور اس دلنوازی کے ساتھ آگے بڑھاتے، گویا کسی خزانے کی چابی حوالے کرنے والے ہوں۔ ہوتا بھی یہی کہ ان سے مصافحہ کے بعد ایک گونہ اطمینان سا ہو جاتا۔ کام ہوا بھی نہ ہو تو ان کے اسلوبِ گفتگو سے پھر بھی سکون مل جاتا گویا کام ہو چکا ہو۔ اعظم صاحب سے رشتہ داری بھی تھی لیکن رشتے داروں جیسے تعلقات نہ رہے اور کاروبار بھی رہا لیکن کاروباری مراسم نہ انھوں نے رکھے اور نہ میں نے۔ یہ ان سے بھی ممکن نہ ہوا اور نہ میرا مزاج ایسا ہے۔ نہ لین نہ دین، نہ لکھت نہ پڑت جس میں نے کہہ دیا انھوں نے ہاں کر دی۔ انھوں نے کہا میں نے مان لیا۔ ایک کتاب شائع ہوتی تو دوسری کے لیے کہتا، دوسری کتاب کی تیاری شروع۔ یہ سلسلہ جاری رہا۔ بلکہ انتقال سے ایک آدھ سال قبل میں نے ایک اور کتاب کا تقریباً نصف مسودہ ان کے حوالے کر دیا۔ پتہ نہیں کیا اور کیسے پریس میں وہ مسودہ غائب ہو گیا۔ لاکھ ڈھونڈا گیا۔ نہ ملنا تھا نہ ملا میں کیا کرتا سوائے اس کے کہ دوبارہ مسودہ فراہم کرنے کا وعدہ کیا اور ایک دو ماہ میں مسودہ دوبارہ ان کے حوالے ہوا اعظم صاحب اگر طبیعت ٹھیک نہ ہوتی یا کوئی گھریلو مصروفیت ہوتی تو پریس نہ آتے۔ ایسی صورت میں میں کوشش کرتا کہ گھر پر ملاقات ہو لیکن اشوک نگر جانے کے لیے وقت کم ہی ملتا۔ عموماً فون پر بات ہوتی۔ جی ہاں گزشتہ ۶ مئی ۔۔۔ میں ایک آدھ روز کے لیے حیدرآباد آیا تھا۔ پریس میں پتہ چلا کہ وہ گھر پر ہیں میں نے فون پر گفتگو کی انھوں نے بتایا نصابی کتابوں کی مصروفیت ہے۔ جون کے پہلے ہفتے میں میری کتاب کی کتابت شروع ہو جائے گی۔ میں ہرگز بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ اعظم صاحب سے فون پر یہ آخری گفتگو ہو رہی ہے۔ اس وقت تو ان کا مزاج بھی اچھا تھا کسے پتہ تھا کہ ٹھیک ایک ماہ بعد، جون کے پہلے ہفتے کے ختم ہوتے ہوتے ۱۶ جون کو اعظم صاحب بھی داعیٔ اجل کو لبیک کہہ دیں گے۔ اعظم

اعظم صاحب کے بندھے ٹکے معمولات تھے۔ دو ڈھائی بجے اپنی کرسی چھوڑ کر کھانے کے لیے اندر کمرے میں جاتے۔ پرہیزی کھانا۔ پھر کچھ دیر مطالعہ اور قیلولہ کرتے۔ اس دوران پانچ بج جاتے ملازمین کو ایسا ہدایت تھی۔ اس دوران کوئی ان سے مل نہیں سکتا میں بھی محتاط تھا۔ اس دوران وہاں جاتا ہی نہیں۔ ۶ رجون کو بھی معمول کے مطابق " دو بجے کے لگ بھگ وہ اندر کمرے میں گئے۔ کھانا کھایا پانچ بجے ہوں گے۔ حمام میں گرے کہتے ہوئے۔ قلب پر حملہ تھا۔ حالت بگڑنے لگی۔ کچھ ہی دیر میں انہیں دواخانہ عثمانیہ پہنچا دیا گیا۔ لیکن اسے خدا کو کیا منظور تھا۔ شام میں آٹھ ساڑھے آٹھ ہوتے ہوں گے وہ مالک حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

آج نیشنل پریس لگتا ہے۔ جیسے سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہ ہو جیسے اس کی رعنائی کسی نے چھین لی ہو۔ مشینیں چلتی ہیں پھر بھی جیسے ان کی آواز کا بانکپن کھو گیا ہو اور وہ اپنے مالک کے غم میں نوحہ کناں ہوں۔ مشینیں ہی نہیں، یہاں کے افراد بھی کھوئے کھوئے لگتے ہیں۔

کبھی گمان ہوتا ہے کہ اعظم صاحب تو ابھی اندر کمرے میں گئے ہیں۔ قیلولہ کرنے۔ ابھی آئیں گے۔ ابھی۔۔۔ ابھی آئیں گے ابھی ۔۔۔ لیکن وہاں جانے والے کب آتے ہیں۔ اعظم صاحب بھی اب کہاں آئیں گے۔ وہ تو گنبد حضرت شاہ راجو قتال رحمۃ اللہ علیہ کے احاطہ میں آسودہ خاک ہیں۔ پریس سے بے پرواہ، ایک ڈپو سے بے پرواہ رشتہ داروں، دوستوں، عزیزوں، سب سے بے پرواہ، جیسے وہ قیلولہ بے حد طویل ہوگا۔ نہ ختم ہونے والا۔ ہاں مشتاق اور امتیاز کے روپ میں وہ پریس اور بک ڈپو پر موجود رہیں گے۔ آج ان کا وجود ان دو میں بٹ چکا ہے مشتاق اور امتیاز۔ یقین ہے یہ دونوں اپنے باپ کی روایات کو برقرار رکھیں گے۔ پریس اور بک ڈپو ان کی کوششوں سے پھلتے پھولتے رہیں گے۔ ترقیوں کے نئے افق کی تلاش میں! اور گھر میں بھی سب لوگ ان کے سبب دل آسائی محسوس کریں گے۔

بقیہ الفاظ صفحہ ۳۴ سے آگے

...رہی ... ان کے پیش نظر تھی۔ " دوران " اور " دوران میں " طویل مدت تک مختلف تعصبات کے ذریعہ ... مثلاً ... لذت نے ابو الکلام اور ... الماجد دریا آبادی کے درمیان علمی حاطب ... پیدا کر رکھی۔ لکھنؤ اور دہلی دو شہر نہیں ... تھے جن کی مسابقت نے اردو کی پرورش کی۔ مولانا ظفر علی خاں نے وفات کی تھا! ... کی بہ اہلیہ ساتھ کر ... دلکوا اخبار سے نکال باہر کیا۔ دراصل بڑے لوگ سمجھتے تھے کہ صحت کی تعمیر میں جو ... حاصل ہے اس میں ایک ... الفاظ اور جس بیان بھی شامل ہے۔ دنیا کے تمام علمی اور ادبی ... اپنے اپنے ... نے ... میں ... کیے گئے ہیں کیونکہ افکار و الفاظ کا چولی دامن کا ساتھ ہے اگر افکار کے چشمے خشک ہو جائیں تو الفاظ گنگ ہو ... ہیں اور اگر الفاظ کا غیر دانش مندانہ استعمال عام ہو جائے تو افکار ... میں ٹھہر کر رہ جاتے ہیں۔

(بقیہ اردو نامہ صفحہ ۴ سے آگے)

... ۲۴ر جولائی: آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد نے ایک طنز و مزاح سے بھرپور مشاعرہ کا اہتمام کیا جس میں ... طنز و مزاح کے شاعروں نے حصہ لیا ● ۲۶ر جولائی: ڈاکٹر ... (OSD) ... ادارہ ادبیات اردو کا معائنہ کیا ● ۲۸ر جولائی: سالار جنگ میوزیم کی طرف سے سالانہ سہ لسانی مشاعرہ سعید شہیدی کی صدارت میں منعقد ہوا ... نے نظامت کی۔ علی احمد جلیلی، ... ڈاکٹر ... صادق نقوی، ... صلاح الدین نیر، ... سکندر ... اور رئیس اختر نے کلام سنایا۔

مظہر غوری

معصوم شبیہیں

شہر والوں کے چہروں پہ پژمردگی
آنسوؤں کی تھکن اور آزردگی
درد میک اپ کی تہہ سے چھلکتی ہوئی
جان پہچان کی لو سسکتی ہوئی
مضطرب، دم بخود
جانتے ہو یہ معصوم دل کون ہے
آگہی سے تہی، آشتی سے تہی
چار جانب تصنع کی گلکاریاں
کس کا مقدور ہیں
کون غالب ہوا، کون مغلوب ہے
کس کی دہشت سے چہرے اترنے لگے
خالی خالی سے آنکھوں کی پہنائیاں
جن میں محرومیوں کا بدن قید ہے
تشنگی تشنگی
بے کسی بے کسی
غور سے جھانک کر دیکھنا تم کبھی
اپنے ماحول کی اجنبی بھیڑ میں

یہ دل آشنائیں اور مضطرب تو سب سے
دور تک بکھرے بکھرے نظر آئیں گے

حمید عثمانی

نظم

اونچے اونچے درختوں کی آغوش میں
جانی پہچانی سی یہ حسین رہ گذر
اس کے سینے پہ شاہد ہوں اس وقت بھی
میرے اور تیرے قدموں کے دھندلے نشان
سوچتا ہوں میں ان پر جمی گرد کو
دھیرے دھیرے ہٹا کر ذرا دیکھ لوں
کس طرف ہم روانہ ہوئے تھے کبھی

ظفر ہاشمی

منظروں کی ایسی عریانی رہی
میرے اندر روز طغیانی رہی
وہ سفر بھی پیش آیا تھا مجھے
اس سفر کی راہ انجانی رہی
دل سمندر کی تہوں میں چھپ گیا
ساحلوں پر رات طوفانی رہی
زندگی تھی یا کوئی اک مدعا
لمحہ لمحہ مجھ کو حیرانی رہی
سامنا دشتِ بلا کا [illegible] ہوا
ریت بھی میرے لیے پانی رہی
خون، نفرت، جنگ، شعلے، نیزہ، غم
ساری چیزوں کی فراوانی رہی
میں فرازوں پر ظفر تھا گامزن
اور نشیبوں کو پریشانی رہی

ظہیر عظمت

رقصِ شام و سحر رہا جاری
زندگی کا سفر رہا جاری
راستے خوفناک تھے لیکن
راہبر کا سفر رہا جاری
نکلی گلشن سے جب بھی [illegible]
بوئے گل کا سفر رہا جاری
وہ سفر راہِ دل [illegible] اک دل
عاشقی کا سفر رہا جاری
زندگی بھر تھے لوگ تشنہ لب
شور [illegible] رہا جاری
رہا شیوہ ہمارا حق گوئی
کام بے خطر رہا جاری
بے کمالوں کی حکمرانی میں
قتلِ اہلِ ہنر رہا جاری
لفظ و معنی کا اختلاط عظمت
شام سے تا سحر رہا جاری

محمد اقبال انجم

الفاظ

ایک دن میں چند الفاظ کے معانی کی تلاش میں لغت کی ورق گردانی میں مصروف تھا۔ لغت کیا تھی الفاظ کا ایک بحر بے کراں تھا اس میں قسم قسم کے الفاظ دیکھ کر یوں لگا جیسے گل کدۂ الفاظ کا کوئی چمن آباد ہو جس کی خوشبو اس کے جہاں معانی میں قید ہو۔ میں ورق الٹتا رہا اور ہر رنگی الفاظ کا مشاہدہ کرتا رہا۔ صفحے پر بیسیوں الفاظ یوں محو استراحت تھے جیسے ذہن کے نگار خانے میں خیالات بادل کے آباد جزیرے میں امنگیں۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ شعر و نثر فقط ترتیب الفاظ کا نام ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو لغات کی مختلف کتابیں تو بازاروں میں با آسانی مل جاتی ہیں۔ ہر شخص ذخیرۂ الفاظ کے بل پر ادیب یا شاعر کیوں نہیں بن جاتا۔ دراصل حقیقت یہ ہے کہ جس طرح بعض سائنس کی کتابیں پڑھ کر کوئی سائنس داں نہیں بن سکتا اور علم عروض کا حافظ ضروری نہیں کہ شاعر بھی ہو اسی طرح ؎

ماہر جغرافیہ کتنا ہی لکھا ہے پیچ و تاب
مل نہیں سکتا اسے سیاح عالم کا خطاب

لغت میں لکھے ہوئے الفاظ اپنے اپنے معانی کے ہمراہ ورق نشین تھے لیکن پھر بھی مجھے ان پر قبروں کے کتبوں کا گمان ہوا حیرت یہ ہے کہ لغت اتنے الفاظ کی موجودگی کے باوجود خاموشی سے الماری میں پڑی رہتی ہے لیکن جب یہی الفاظ زبان و قلم سے ادا ہوتے ہیں تو کہیں قہقہوں کے فوارے ابلتے ہیں اور کہیں درد کی ٹیسیں ابھرتی ہیں۔ الفاظ ہی رشتوں کی دنیا آباد کرتے ہیں اور الفاظ ہی رقابتوں کے کھنڈر استوار کرتے ہیں، الفاظ ہی زخم لگاتے ہیں اور الفاظ ہی مرہم بن جاتے ہیں۔ الفاظ اگر پھول کی پنکھڑی ہیں تو تلوار کی دھار بھی ہیں۔ الفاظ ہی شاعروں کے رفیق ہیں اور الفاظ ہی ادیبوں کے جلیس بھی۔ الفاظ ہی شاہوں کا حکم ہیں اور فقیروں کی صدا بھی۔ الفاظ طنز کے نشتر بھی ہیں اور الفاظ ہی قصیدے اور مرثیے کی قدر مشترک ہیں
میں نے بہت غور کیا کہ آخر یہ الفاظ کیسے وجود میں آ گئے۔ پھر میں نے ان کی نوعیت اور تعداد پر نظر کی تو معلوم ہوا کہ دنیا میں انسان نے اپنے وجود کو زندہ رکھنے یا کسی جاندار اور بے جان چیزوں سے ذہن و مذہب سے خدا اور انسان سے تعلقات کرنے میں ان سے باہم رشتہ یا اپنی اپنی جگہ مطمئن رکھنے کے لیے جتنے حربے اختیار کیے ہیں اتنے ہی اس نے الفاظ وضع کر لیے ہیں
یہی وجہ ہے کہ آج دنیا میں الفاظ کی حکمرانی ہے۔ وہ پھیکے الفاظ جن کی رگوں سے جذبات کا خون نچوڑ لیا گیا ہو ایک مکمل ترین انسان منہ میں رکھی دوا پنج کی زبان کے بغیر نامکمل ہے۔ گو یہ تبصرہ زبان کے ایک پہلو کو اجاگر کرتا ہے کہ "انسان کا قول

...ت کے دونوں جملوں کے درمیان ہے"۔ لیکن زبان کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ وہ اپنے الفاظ بیچ کر انسان کے لیے عزت اور دولت خرید
سکتی ہے۔ انسان الفاظ کے ساز پر گنگناتا ہوا نغمہ ہے اور یہ دنیا بازیچۂ الفاظ ہے۔

الفاظ کا اپنا کوئی مرئی جسم نہیں ہوتا۔ الفاظ تو اشیاء کی صوتی تصویریں ہیں۔ اس لیے جب ہم پھولوں کا نام لیتے ہیں تو
...دماغ خوشبو سے مہک اٹھتا ہے۔ شیشے کا تصور کرتے ہیں تو الفاظ کے نازک جسم میں کرچیوں کی جھنجھناہٹ سنائی دے جاتی
ہے۔ الفاظ سے بنی ہوئی گالی کسی کے تن بدن کو جلا کر راکھ کر سکتی ہے۔ الفاظ تو مفلس کی جیب ہیں۔ وہ تو آواز کے زیر و بم
...اشاروں کے نشیب و فراز سے اور لہجے کے اتار چڑھاؤ سے تونگری پاتے ہیں۔ الفاظ کی ترجمانیوں میں مقاصد کا خون ...
...تو دو معاشرے کو زندگی اور تحریکوں کو انقلاب کی نوید دیتے ہیں۔ خطابت الفاظ کی ساحری ہے۔ الفاظ مشاہدات کو ...
حسن عطا کرتے ہیں۔ لفظوں سے بنے ہوئے شعر دلوں کے ترجماں ہوتے ہیں لیکن الفاظ جذب و لگن کے بغیر اس پرندے کی
...ہوتے ہیں جو پروں سے محروم ہوں۔ یہ تو طے نہیں ہو سکا کہ خیال پہلے وجود میں آتا ہے یا الفاظ۔ کیوں کہ اکثر اوقات
خیالات ذہن کے کسی گوشے میں کلبلاتے رہتے ہیں لیکن ان کے لیے پیرایۂ اظہار یا مناسب الفاظ نہیں ملتے اور بعض دفعہ الفاظ
قدرت کے باوجود خیالات عنقا ہوتے ہیں لیکن یہ بات طے ہے کہ خیالات الفاظ کی محمل میں بیٹھ کر سفر کرتے ہیں۔ اسی لیے
...لیس اختلافات کو روکنے کے لیے اخباروں پر سنسر اور زبانوں پر پہرے بٹھا دیتی ہے۔ لیکن خیالات پانی کے بہاؤ کی
...ح اپنا راستہ تلاش لیتے ہیں۔

شوق مطالعہ کے آغاز میں ایک طالب علم کتاب کے خوبصورت الفاظ و فقرات رٹنے کی کوشش کرتا ہے لیکن کثرت
مطالعہ اسے حلقۂ الفاظ سے نکال کر تاثر کی دنیا میں لے جاتا ہے اور بازیچۂ ہو کر بصیرت کہلاتا ہے اور اہل جذب قوموں کو نئی
...زندگی اور الفاظ کی نئی جہتیں عطا کرتے ہیں۔ اگر ہم اس کی مثال ڈھونڈنے نکلیں تو اقبال اس کی زندہ مثال ہیں۔ انہوں نے لفظ
...ں "کو نئی زندگی اور خودی کو نیا مفہوم دیا ہے۔

...کہتے ہیں دولت ڈھلتی چھاؤں ہے۔ آج ایک کے لیے وجہ افتخار اور کل دوسرے کا طرۂ دستار۔ لیکن شاید کم لوگوں
...علم ہو کہ دولت کی طرح الفاظ بھی بہت ہرجائی ہوتے ہیں۔ یہ بھی ابن الوقت سیاستدانوں کی طرح ایک زباں سے دوسری
...زبان میں منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ خود زبانیں بھی اپنا ذخیرۂ الفاظ بڑھانے کے لیے ... بالجبر کا ارتکاب کرتی
...ں۔ صدیوں سے یہ عمل اتنے تواتر سے جاری ہے کہ آج اکثر الفاظ کا چہرہ پہچاننا مشکل ہو گیا ہے۔ یونانی اور عبرانی نے عربی
...لیس مات کیا۔ انگریزی نے عربی اور لاطینی سے بہت کچھ حاصل کیا۔ اہل فارس نے عربی کو مفتوح کر کے اپنا دامن بھر لیا۔ فارسی اور
...کر اردو کو جنم دیا اور اردو نے سن بلوغت کو پہنچتے پہنچتے دوسری زبانوں پر ڈورے ڈالے اور ایسے مارے کہ آج وہ بلبل ہزار داستاں
...ہے۔ میں نے ایک لفظ "نیلام" لغت کے صفحے سے اٹھایا اور اس سے پوچھا کہ حضرت آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں
...پرتگال ہے۔ وہاں مجھے "لیلام" کہتے تھے۔ میں شوقِ سفر میں یہاں پہنچا تو مجھے اردو کے بازار میں نیلام کر دیا گیا۔
...نے ایک جگہ کہا تھا کہ "الفاظ پر بھی لڑکپن، جوانی اور بڑھاپے کی فصلیں چھاتی ہیں۔" زندگی کے مختلف مراحل طے کرنے کے

اور آجکل نئی نسل کے سینکڑوں "جدید" شاعروں نے اس "بلند و بالا مینار" کا سا رویہ اختیار کر کے اپنی ادبی شخصیت کو "کثافتوں" سے ملوث نہیں ہونے دیا اور اپنے [illegible] ادبی مسلک کو "عظیم"، "امید"، "کامیاب" اور "مشہور" لوگوں ہی سے داد حاصل کر کے پروان چڑھایا۔

اب حبیب حیدرآبادی ایک صاحبِ دل انسان ٹھہرے۔ ان کو اس مصلحت پسندی نے بچا لیا۔ فیض احمد فیض کی طرح بقول میر کے ع آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا کی ملتی جلتی تصویر میں بفضلِ تعالیٰ ان کو پیار کرنے والوں کی تعداد بھی سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔ اسی لیے ان سب سے امید ہے کہ وہ اپنی زندگی کے اسّی فی صد تجربات کو نظر انداز کر کے صرف ان پر اپنی توجہ مرکوز کریں گے جن سے ان کا کوئی ادبی مفاد وابستہ ہو، یہ ستم ظریفی ہو گا۔

اس کے برعکس انھوں نے "لندن کے شاعر" جیسے مضمون کی تحقیق اور تیاری میں جس محنت و جانفشانی کا ثبوت دیا ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ چھوٹے اور بڑے کی تخصیص نہ کر کے انھوں نے ہر اس شاعر کے بارے میں جنھیں وہ جانتے ہیں سیر حاصل تعارف لکھنا اپنا فرض سمجھا ہے۔ اور جہاں یہ تعارف مختصر یا ادھورا سا ہے اس کی وجہ خود شاعر کی کاہلی ہے جس نے انھیں مزید مواد فراہم نہیں کیا۔

ان کی یہی رواداری اور انسان دوستی الف سے یا تک ان کی کتاب کے ہر صفحہ میں جھلکتی ہے۔ "ہمارے مسائل" اور "انگلستان کی معیشت اور ہم" جیسے مضامین میں جہاں یہ انسان دوستی شدید شفقت پسندی اور سیاسی پختگی کا روپ دھار لیتی ہے وہیں دوسری جگہ "سفر ہے شرط" جیسے ہندوستان اور پاکستان کے سفری رپورتاژ میں یہ صوفیانہ خود سپردگی اور دلبرانہ پن ——— میں شامل ہو جاتی ہے۔

حبیب صاحب نے "انگلستان میں" جیسی کتاب کیا لکھی ہے انگلستان کے "جنگل میں منگل" منایا ہے۔ سینکڑوں شاعروں ادبی محفلوں، دوستوں کی دعوتوں، قوالی اور موسیقی کی نشستوں کے رنگا رنگ ذکر سے انگلستان کے سرد اور مرطوب موسم میں گرمی اور رونق کا سا شبہ پیدا کیا ہے، اور سب سے بڑھ کر اپنے ہزاروں ہم وطن جلاوطنوں کی صبح سے شام تک کی مصروفیتوں کو ریکارڈ کر کے ہند و پاک کی روحانی اور ثقافتی تاریخ میں ایک اہم باب کا اضافہ کیا ہے۔

(وقار لطیف۔ لندن)

نام کتاب "البیرونی اور جغرافیۂ عالم"

مصنف: (مولانا) ابوالکلام آزاد۔ ذاکر حسین انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے جس سے البیرونی کی شخصیت اور علمی کارناموں خصوصاً جغرافیۂ عالم سے متعلق اس کی سائنسی تحقیق اور تدقیق کا پتہ چلتا ہے۔ البیرونی کے علمی کارنامے ایک عرصہ تک پس پردہ رہے۔ مگر جب اس کی گرانقدر تصانیف کا سراغ ملا تو محققین نے اسے آسمانِ علم کا تابندہ ستارہ قرار دیا۔ البیرونی کو ریاضی، ہیئت، نجوم، حکمت، معدنیات، پیمائشِ ارض، علم الانسان اور جغرافیہ میں امتیاز حاصل تھا خصوصاً ہندوستانی تہذیب و ثقافت اور علم و دانش سے اسے بے حد لگاؤ تھا۔ اس نے کوئی بارہ تیرہ برس

ندوستانی علوم سیکھنے اور ہند کی تہذیب وثقافت
ے سمجھنے میں صرف کیے۔ اسی لیے وہ کئی بار ہندوستان
یا۔ اس نے سنسکرت زبان میں مہارت حاصل کی اور
سنسکرت کی دو کتابوں "سانک" اور "پاتنجلی" کا عربی
بان میں ترجمہ کیا۔ وہ بڑا جید فاضل، سائنسداں، مورخ
ر عالم متبحر تھا۔ اس کی تصانیف میں "آثار باقیہ"، "کتاب
ہند" اور "القانون" کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ وہ کئی
بانیں جانتا تھا۔ عربی، فارسی، خوارزمی اور جرجانی
بانیں اس کے بمنزلہ مادری زبان کی تھیں۔ وہ سنسکرت
انی، سریانی اور عبرانی زبانوں سے بھی واقف تھا۔

اگرچہ مولانا آزاد کو زیر نظر کتاب کا مصنف تسلیم
لیا گیا ہے مگر اہل تحقیق کے لیے ہنوز اس میں شبہ کی
نجائش ہے۔ اس کتاب کا مسودہ (قلمی مخطوطہ) انڈین
نسل فار کلچرل ریلیشنز کی لائبریری کی الماری سے
ل کیا گیا ہے جسے آزاد کلکشن کا نام دیا گیا ہے۔ صباح الحسن
روقی پرنسپل جامعہ کالج اور ڈائرکٹر ذاکر حسین
ٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ نے
ر مقدمہ البیرونی پر ایک جامع مضمون لکھ کر اس کتاب
شامل کر دیا ہے اور اس عالمانہ مقدمہ کے باعث
یرونی اور اس کے علمی کارناموں سے متعلق نئی معلومات منظر
م پر آئی ہیں۔ اس کارآمد مقدمے کے بعد جناب مسیح الحسن
احب نے اصل مخطوطے کی بابت بیان کرتے ہوئے اعتراف
یا ہے کہ اس مخطوطے سے متعلق معلومات حاصل کرنے کی
ہوں نے بہت کوشش کی۔ مولانا آزاد کی تصانیف دیکھیں
کے خطوط پڑھے۔ دوسروں کی تحریریں مطالعہ کیں مگر
ہیں مصنف کے بارے میں کوئی سراغ نہیں ملا۔ البتہ

محمد عتیق صدیقی صاحب نے انھیں بتایا تھا کہ مولانا غلام
رسول مہر سے ان کی اس سلسلے میں خط و کتابت ہوئی تھی
اور مولانا مہر نے انھیں لکھا تھا کہ شاید ۱۹۲۷ء سے پہلے
اس مقالے کا مسودہ مولانا آزاد نے بغرض اشاعت
لاہور بھیجا تھا لیکن یہ مقالہ اس وقت چھپ نہ سکا
مولانا مہر نے اپنے خط میں مقالے کے محفوظ رہنے پر خدا
کا شکر بھی ادا کیا ہے مگر زیر نظر کتاب کے صفحہ ۳۶ کے
حاشیہ سے پتہ چلتا ہے کہ مسیح الحسن صاحب کو بھی مولانا
غلام رسول مہر کا مذکورہ خط پڑھنے کا موقع نہیں ملا۔ نیز
انھیں اس کا بھی علم نہیں کہ عتیق صاحب اور مولانا مہر
کے درمیان مراسلت کب ہوئی۔ علاوہ ازیں اس مخطوطے
پر مولانا آزاد کے دستخط کہیں موجود نہیں ہیں اور نہ ہی
مخطوطہ نویس نے اس کا نام تحریر کیا ہے۔ مخطوطے پر نام نہ
ہونے کی وجہ یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ شاید یہ مولانا کی تصنیف
نہ ہو۔ اس امر کا بھی امکان ہے کہ مخطوطہ کسی دوسرے شخص
نے لکھا ہو اور مولانا آزاد نے بعد میں اصلاح کی ہو۔ چونکہ
مذکورہ تصنیف کا طرز نگارش مولانا آزاد کی دوسری
نگارشات سے بالکل مشابہہ ہے اور مخطوطے کے بعض صفحات
پر مولانا کی اصلاحیں بھی ہیں۔ اس لیے مقدمہ نگاروں نے
اس رسالے کو مولانا آزاد کی تصنیف تسلیم کر لیا ہے۔
زیر نظر کتاب کے مطالعہ سے جہاں البیرونی کے عہد، اس
کے کارناموں، عربی میں جغرافیہ، اقلیموں کی مساحت اور
کرہ کی مجموعی مساحت، خط استوا اور قبۃ الارض البیرونی
کے اطوال اور موجودہ اطوال کے باہمی فرق اور اس
کے عہد کے جغرافیائی خصوصیتوں، البیرونی اور محمود غزنوی
کے باہمی تعلقات، البیرونی کی سیاحت ہند اور

ہندوستان کے بارے میں اس کی معلومات پر روشنی پڑتی ہے نیز پہلی بار یہ انکشاف بھی ہوتا ہے کہ مولانا آزاد جغرافیہ داں بھی تھے۔

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی نے ۱۱۲ صفحات پر مشتمل یہ مجلد کتاب ڈیمائی سائز میں سادہ مگر پرکار سرورق کے ساتھ سلیقے سے شائع کی ہے۔ کاغذ، کتابت اور طباعت نہایت عمدہ اور دیدہ زیب ہے۔ پندرہ روپے میں یہ کتاب مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی، بمبئی اور علی گڑھ سے حاصل کی جا سکتی ہے اور اس قابل ہے کہ مطالعہ کے بعد اپنی لائبریری کی زینت میں اضافہ کریں۔

(وہاب عندلیب)

نام کتاب: "زندگی اے زندگی" (شاعری)

خلیل الرحمٰن اعظمی مرحوم، ڈیمائی سائز (۱۱۶ صفحات) قیمت چھ روپے، ناشر، اترپردیش اردو اکیڈمی قیصر باغ لکھنؤ۔

خلیل الرحمٰن اعظمی برصغیر کے نامور شاعر و نقاد تھے، اردو ادب کی سب سے بڑی تحریک ترقی پسند مصنفین علی گڑھ کے صاحب الرائے اصحاب اساتذہ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ پانچ سال ہو رہے ہیں انھیں بچھڑے ہوئے۔ "نیا عہد نامہ" ان کی معروف شاعری کا پہلا مجموعہ تھا جسے برصغیر ہند و پاک کے شعری و ادبی حلقوں میں بے نہایت شرف مقبولیت حاصل ہوا تھا۔ اعظمی مرحوم کا اعظم گڑھ کے علمی اور مذہبی پیر مدرسی گھرانے سے تعلق رہا۔ علی گڑھ اور مسلم یونیورسٹی نے ان کے ذہن و فکر کو روشن کیا۔ ترقی پسند تحریک اور عصری و ادبی رجحانات نے ان کے شعور و ادراک کو مہمیز کیا۔ وہ جامعہ علی گڑھ کے ایسے استاد تھے جنھوں نے اپنے فکر و نظر سے ایک ادبی و شعری تحریک اور ذہن کی تربیت کی۔ بہ حیثیت نقاد انھوں نے نابغۂ عصر جناب نیاز فتح پوری سے داد پائی۔ روایات و رجحانات اور اقدار کی پاسداری ان کا ایسا وصف ہے جس کی عصر جدید میں شاذ ہی کوئی مثال مشکل سے ملتی ہو۔ بیگم راشدہ خلیل نے ان کے زیر نظر دوسرے اور آخری مجموعہ کلام "زندگی اے زندگی" میں بالکل درست لکھا ہے کہ "موت اور زمانے سے بیک وقت مردانہ وار لڑنے کا حوصلہ بہت کم لوگوں میں ہوتا ہے، مرحوم نے بغیر کسی کی مدد کے اس جنگ کو آخر تک جاری رکھا۔" زندگی کے پیامی اس اولوالعزم سخنور کے بارے میں پروفیسر محمود الٰہی چیئرمین مجلس انتظامی اترپردیش اردو اکیڈمی نے اپنے پیش لفظ میں اعظمی مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے بجا لکھتے ہیں صاحب الرائے اصحاب کی نمائندگی کا فرض ادا کیا ہے "وہ ایک شاعر کا دل، ایک معلم کی ذہنیت اور ایک دانشور کا دماغ رکھتے تھے مگر انھیں، جینے کے لیے وہی گھر ملا تھا جہاں خود ان کے اپنے الفاظ میں اک ایسے ایک ابوجہل نے اپنا مسکن بنا لیا تھا۔" وہ جس ذہنی کرب کا شکار تھے اور جس طرح انھوں نے اس کرب سے نجات پانے کی کوشش کی یہ مجموعہ اس کا غماز ہے:

"زندگی اے زندگی" اعظمی کی ۴۲ غزلوں، متفرق اشعار، ۱۵ نظموں اور ۳ نعتوں پر مشتمل ہے۔ نامکمل اور ادھوری نظموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر

نے موت کے بے رحم رقص کے آہنگ کو لفظوں میں قید کرنے کی کوشش کی ہے۔ غزلوں میں انسانی اقدار کی تصدیق، محبت اور معصومیت کا منفرد اور دلوں میں اترنے والا موثر انداز اپنی چھاپ چھوڑ جاتا ہے۔ اتر پردیش اردو اکیڈیمی نے یہ مجموعہ شایانِ شان تو شائع نہیں کیا پھر بھی وہ خلیل شناسی کے باب میں قابلِ مبارک باد ہے۔ اچھی اور پوری شاعری کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے "زندگی اے زندگی" اہم سوغات ہے۔

(وقار خلیل)

نام کتاب "**شعاعِ فکر**" (شاعری) وکیل بھوپالی
صفحات (۱۳۶) ڈیمائی سائز مجلد معہ گرد پوش
ناشر: مدھیہ پردیش اردو اکیڈیمی پری خیبر کالونی بھوپال۔

"شعاعِ فکر" اردو کے بزرگ اور کہنہ مشق شاعر جناب وکیل بھوپالی کی (۱۳۲) غزلوں کا خیابانِ سخن ہے۔ وکیل تقریباً نصف صدی سے اردو شاعری میں کلاسیکی اسلوب و انداز سے اپنے طور پر فکر کر رہے ہیں۔ سیماب، جوش اور اختر لکھنوی کے زمانے کی یادگاریں مگر وہ شہرت کہاں؟ مدھیہ پردیش اردو اکیڈیمی نے ان کا مجموعہ کلام شائع کر کے صوبہ کے بزرگ اور اساتذۂ سخن شعراء کی جناب میں اپنا نذرانۂ خلوص ادا کیا ہے۔ اسی جذبہ کے ساتھ وکیل بھوپالی کی شاعری کو خرید کر پڑھا جا سکتا ہے کہ ان کے اشعار میں اگلے وقتوں کی فکر، شعری روایات کی شگفتگی اور زندگی کے پیچ و خم اور حوصلوں کی مہک اور دھنک رنگ اشاریت ملتی ہے۔ مجموعہ آفسیٹ طریق پر خوبصورت چھپا ہے، اور مطالعہ کی دعوت دیتا ہے۔

(وقار خلیل)

نام کتاب "**شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں**" (ناولٹ) نعمی نذیر
۸۵ صفحات، ڈیمائی سائز، مجلد، معہ گرد پوش قیمت ۱۰ روپے
ناشر اردو مجلس لندن۔ ملنے کا پتہ۔ انگور گھر ۶۹۶-۱-۲۲ بازار نور خاں، حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۲۴

نعمی نذیر چادر گھاٹ ہائی اسکول کے میرے ہم درس جامعہ عثمانیہ کے ذہین طالب علم اور حیدرآباد کے صحافتی ادبی اور دانشور حلقے کے جانے پہچانے نوجوان ہیں گزشتہ کئی سال سے وہ لندن میں مقیم ہیں اور اپنے ذہن و فکر کی احسن صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں مصروف ہیں۔ زیر نظر ناولٹ کو پڑھ کر ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا پھر ایک بار بھرپور اعتراف کرنا پڑا۔ (۱۷) صفحات اور ۱۶ ابواب پر مشتمل اس مختصر ناولٹ کو پڑھ کر اس کے کرداروں کے ساتھ چلنے کا اندازہ ہوا کہ مصنف نے سجاد ظہیر کے اولین ناولٹ لندن کی ایک رات کے تسلسل فکر کو خود ہی حسیت کے سہارے آگے بڑھایا ہے۔ سحر انگیز مناظر کا موجز ابتداء سے اختتام تک قاری کو اپنی گرفت میں رکھتا ہے علامتی اظہار نے زندگی کی قدروں اور فکر و نظر کے رنگ بدلتے زاویوں اور سمتوں کو روشن بنا دیا ہے۔ مصنف نے ناولٹ کے کرداروں کو حقیقی طور پر برت کر خوابوں کے دھنک رنگ لفظوں سے اس ناولٹ کو سجایا سنوارا ہے۔ محبوب حسین جگر، وقار لطیف ڈاکٹر مجاور حسین رضوی نے اس ناولٹ پر اپنی آراء سپرد قلم

(باقی صفحہ پر)

اردو دنیا

(وقار خلیل)

اردو کی علمی، ادبی، تہذیبی خبریں

۱۴؍ جولائی: برصغیر کے مامور نقاد اور شاعر ڈاکٹر مغنی تبسم ریڈر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کی نئی اور پانچویں کتاب "آواز اور آدمی" جو (۱۱) تنقیدی مقالوں پر مشتمل ہے اشاعت پذیر ہوئی۔ ڈاکٹر تبسم کی اس کتاب میں کلاسیک سے جدید شاعری تک عالمانہ مقالے، اقبال اور غالب کے عروضی، لسانی اور صوتی مطالعے نئے افق روشن کرتے ہیں۔ یہ کتاب الیاس ٹریڈرس حیدرآباد سے خریدی جا سکتی ہے۔

۱۶؍ جولائی: [illegible] کونسل آف انڈیا نے عید ملاپ کا اہتمام کیا۔ ڈاکٹر ایم ایل نگم ڈائرکٹر سالار جنگ میوزیم نے اس موقع پر کہا کہ قطب شاہوں نے حیدرآباد کو ناقابل فراموش تہذیبی اور علمی ورثہ دیا ہے جس سے استفادہ دکن شناسی ہوگی۔ صدر کونسل جناب تقی بلگرامی اور معتمد جیلانی بیراک نے بھی اظہار خیال کیا۔ محفل شعر میں صلاح الدین نیر اور سعد حسین نے کلام سنایا۔

۱۷؍ جولائی: قدیم مکتب سخن کے مشہور نعت گو شاعر الحاج معلم عبیدی مصنف "پرواز نظر" کا طویل علالت کے بعد ۶۵ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔

۲۰؍ جولائی: جناب سعید الوحید (جدہ) نے اپنے قیام حیدرآباد کے دوران ادارۂ ادبیات اردو کے ٹرسٹ فنڈ کے لیے ایک ہزار روپے کا عطیہ دیا اور ادارہ کی کارکردگی کی ستائش کی۔

۲۳؍ جولائی: صدر جمہوریہ ہند گیانی ذیل سنگھ نے اردو گھر میں ایک خیر مقدمی تقریب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ پورا شہر حیدرآباد ہی اردو کا گھر ہے۔ آپ نے اردو زبان و ادب کی حیدرآبادی روایات اور دکنی کلچر کو زبردست خراج ادا کرتے ہوئے کہا کہ حیدرآباد ملی جلی تہذیب اور کئی زبانوں کا گلدستہ ہے۔ اردو گھر ٹرسٹ کے بانی جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست اور ٹرسٹی جناب سید مکرم شاہ، صدر ریاستی مجلس قانون ساز کونسل کے علاوہ جناب منوہر راج سکسینہ صدر انجمن ترقی اردو حیدرآباد نے صدر ہند کا خیر مقدم کیا اور انھیں پھول پہنائے۔ محفل شعر میں سعید شہیدی، علی احمد جلیلی، کنول پرشاد کنول، نریندر لوتھر، خواجہ شوق، ڈاکٹر [illegible]، رئیس اختر، صلاح الدین نیر، حمایت اللہ اور ثریا جبیں نے کلام سنایا۔

۲۳؍ جولائی: ریاستی اردو اکیڈمی کے خبرنامے کے بموجب اکیڈمی کی طرف سے مخدوم محی الدین کے شعری مجموعہ "بساط رقص" کی اشاعت ہونے والی ہے۔

● ریاستی اردو اکیڈمی کی طرف سے ادبی رسائل کو گرانٹ کے ضمن میں "سب رس" کو سابقہ کی طرح اس بار بھی ایک ہزار روپیہ کی امداد دی گئی۔

● ادبستان دکن کی مجلس انتظامی نے طے کیا ہے کہ حیدرآباد کے استاد سخن حضرت صفی اورنگ آبادی کی کلیات کی ترتیب و اشاعت کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی ہے جس میں ڈاکٹر مغنی تبسم، محمد منظور احمد، شمس الدین تاباں اور رؤف رحیم

(باقی ص ۲۹ پر)

:UST 1983. R. N. 109?
Regd. H/HD.
The "SABRAS" Urdu Monthly
Organ of "Idara-e-Adabiyat-e-Urdu", Aiwan-e-Urdu, Hyderabad-500 004. (A. P.)

بالِ جبریل

National Fine Printing Press, Charkaman, Hyd.

سنِ اجراء: ۱۹۳۸ء

فون نمبر ۳۸۳۶۹

بیادگارِ ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ

ماہنامہ

حیدرآباد

پروفیسر علی اکبر نمبر

مدیرِ اعزازی مغنی تبسم

معاون مدیر وقار خلیل
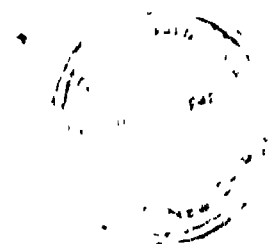
جلد (۴۳) ستمبر و اکتوبر ۱۹۸۳ء شمارہ (۹، ۱۰)

قیمت - ۴ روپے

ادارۂ ادبیاتِ اردو۔ پنجہ گٹہ روڈ حیدرآباد ۴

رسالانہ بیرونی ملکوں سے

۲۵ روپے ہوائی ڈاک سے بحری ڈاک سے

کتب خانوں سے مشرقِ وسطیٰ ۱۲ ڈالر ۵ ڈالر

۳۰ روپے امریکہ ۱۶ ڈالر ۶ ڈالر

بذریعہ رجسٹری

۴۵ روپے

پاکستان، برما، سیلون ۸ ڈالر ۳½ ڈالر

انگلستان ۷ پونڈ ۳ پونڈ

سید علی اکبر ایڈیٹر پبلشر پرنٹر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان میں چھپوا کر حیدرآباد ۴۔۔۔۔ ۵ سے شائع کیا

فہرست

نگارشاتِ سید علی اکبر

اپنی بات

پروفیسر سید علی اکبر صاحب کی ذات ستودہ صفات دانش و تہذیب کی مجسم علامت ہے۔ "ایسی شخصیتیں کسی قوم کو گاہے ماہے نصیب ہوتی ہیں"۔ ادارۂ ادبیات اردو کو فخر ہے کہ اسے اکیس (۲۱) برس تک آپ کی سرپرستی حاصل رہی۔ اب جبکہ اپنی خرابیٔ صحت کی بناء پر آپ ادارے کے عہدۂ صدارت سے سبکدوش ہو چکے ہیں لیکن مجلسِ انتظامی کے رکن کی حیثیت سے اب بھی آپ کی مشفقانہ رفاقت ہمیں حاصل ہے۔

حیدرآباد کے تمام سرکردہ علمی و ادبی اداروں کی جانب سے آپ کی خدمات کے اعتراف میں جلسۂ تہنیت ۶؍ اکتوبر ۱۹۸۳ء کو ایوانِ اردو میں منعقد کیا گیا اور ایک مومنٹو آپ کی خدمت میں ادارہ کی طرف سے پیش کیا گیا۔ اسی سلسلے میں ادارہ کی مجلسِ انتظامی نے طے کیا تھا کہ "سب رس" کا ایک خصوصی شمارہ پروفیسر سید علی اکبر کی نذر کیا جائے۔ ہماری درخواست پر مختلف اہلِ قلم اصحاب نے ادارۂ ادبیات اردو کی سرگرمیوں اور پروفیسر سید علی اکبر کی دلچسپی کے شعبوں کی مناسبت سے دکنیات، اسلامیات، تعلیم اور خطاطی کے موضوعات پر مقالے تحریر کیے جو اس شمارے میں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ سید علی اکبر صاحب کی علمی اور تعلیمی خدمات کے بارے میں چند مضامین لکھوائے گئے۔ تعلیم کے موضوع پر پروفیسر سید علی اکبر صاحب کے تین مضامین اس خصوصی شمارے کی زینت ہیں۔ شعراء کا منظوم خراج

محبین اہلِ حیدرآباد کے جذبات کا ترجمان ہے۔ ہم کو احساسِ ندامت ہے کہ محدود مالی وسائل کی وجہ سے اس خصوصی شمارے کو ممدوح کے شایانِ شان نہیں بنا سکے پھر بھی ہم اس "تحفۂ درویش" کو بصد انکسار پروفیسر سید علی اکبر کی خدمت میں پیش کرنے کی جسارت کرتے ہیں ع

گر قبول افتد زہے عز و شرف

مغنی تبسم

پیام

عالی جناب پروفیسر سید علی اکبر صاحب کی خدمات کا اعتراف ایک سعادت ہے۔ بحیثیت ایک ممتاز دانشور اور ماہرِ تعلیم کے اور بہ حیثیت صدر ادارۂ ادبیات اردو انھوں نے جو خدمات انجام دی ہیں، وہ ہم سب کے لیے موجبِ شکر و امتنان ہیں۔ انھوں نے دکنی ادب، دکنی تمدن، اسلامیات، خطاطی، خوشنویسی، اردو زبان، اس کی تعلیم کے تحفظ اور ترقی کے مسائل پر جو توجہ کی ہے اس سے ان کی دل سوزی اور گہری لگن کا پتہ چلتا ہے۔

خدا ان کو صد و سی سال سلامت رکھے اور دوسروں کو ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق دے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ

(ڈین ہیومانیٹیز اینڈ لنگویجز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دلی)

ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ

جناب سید علی اکبر صاحب

حالات و کوائف

نام :۔ سید علی اکبر

تاریخ پیدائش : ۱۶ اکتوبر ۱۸۹۰ء

مقام پیدائش :۔ آصف نگر، حیدرآباد دکن

مذہب : اسلام

والد کا نام سید محمد صاحب مرحوم

دادا کا نام: سید علی اکبر صاحب مرحوم

تعلیم :۔

(الف) پہلی جماعت سے نویں جماعت تک مدرسۂ عالیہ حیدرآباد

میٹرکولیشن : ۱۹۰۸ء ولسن کالج، بمبئی

(ب) انٹرمیڈیٹ : ۱۹۱۰ء ولسن کالج بمبئی

(ج) بی اے (فائنل) ۱۹۱۲ء ولسن کالج، بمبئی

(یورپین اسکالرشپ کے لیے انتخاب کی وجہ سے گریجویس کی تکمیل کے لیے انگلستان چلے گئے۔

(د) ایم۔ اے (معاشیات) ۱۹۱۵ء کیمبرج، انگلستان

زبانیں :۔

(الف) اردو :۔ مادری زبان، تخلیق کی زبان

(ب) فارسی :۔ موروثی زبان

(ج) عربی :۔ مذہبی زبان

(د) انگریزی : پہلی جماعت سے ایم۔ اے (کنٹب) تک اس زبان میں تعلیم پائی، تخلیق کی زبان۔

(ر) فرانسیسی :۔ ذوق کی تسکین کے لیے مطالعہ کیا۔

(س) لاطینی :۔ ایم۔ اے (ابتدائی) میں اختیاری زبان کی حیثیت سے۔

مطبوعہ تصانیف :۔

طبع زاد :۔

(الف) امپیریل ایجوکیشن کانفرنس (انگریزی رپورٹ) ۱۹۲۷ء

(ب) ایجوکیشن سسٹم آف میسور (انگریزی) ۱۹۲۹ء

(ج) دی جرمن اسکول سسٹم (انگریزی) ۱۹۳۲ء

(د) ایجوکیشن انڈر آصفجاہ دی سیون (انگریزی) ۱۹۳۵ء

(ر) ایجوکیشن اینڈ ڈیماکریسی (انگریزی) ۱۹۵۴ء

تراجم :۔

(الف) اپنے نفس کی شناخت ۱۹۲۸ء

نفسیات کے ماہر گلوور کی کتاب KNOW YOUR OWN MIND کا اردو ترجمہ

ترتیب و تدوین :۔

(الف) مہدی نواز جنگ والیوم (انگریزی) ۱۹۷۰ء

(ب) امیر خسرو سپہدار (انگریزی، اردو) ۱۹۷۵ء

غیر مطبوعہ تصانیف:۔ مختلف جرائد میں شائع شدہ اردو مضامین کا یہ مجموعہ "ادارۂ ادبیات اردو کے سلسلۂ اشاعت میں شامل ہے جس کی فہرست مندرج ہے۔

سر راس مسعود (مطبوعہ سیاست حیدرآباد ۲۶ / جنوری ۱۹۷۰ء و ماہنامہ سب رس جنوری ۱۹۷۱ء)

نواب سر مہدی یار جنگ (مطبوعہ حیدرآباد ٹیچر ۱۹۲۸ء)

مس پڈوپا دعبا (مطبوعہ سیاست ۲۴ / جون ۱۹۶۸ء)

سروجنی نائیڈو (" " ۱۵ / اگست ۱۹۶۸ء
(قسط اول و دوم)

جب ہم پڑھتے تھے (مطبوعہ سیاست حیدرآباد مطبوعہ ماہنامہ سب رس جون ۱۹۷۱ء

سجاد مرزا: علمی ادبی تعلیمی خدمات (مطبوعہ روزنامہ "سیاست" حیدرآباد (م ۳ / فروری ۱۹۷۴ء

سید علی بلگرامی (مطبوعہ سالنامہ "انوار" (انوار العلوم کالج حیدرآباد ۱۹۶۷ء)

نواب اعظم جنگ (مطبوعہ سیاست حیدرآباد)

انتظامی امور کا تجربہ:۔

(الف) صدر مہتمم تعلیمات، گلبرگہ ۱۹۲۰ء تا ۱۹۲۳ء

(ب) صدر مہتمم تعلیمات، حیدرآباد دکن ۱۹۲۳ء تا ۱۹۳۸ء

(ج) نائب ناظم تعلیمات حیدرآباد دکن ۱۹۳۸ء تا ۱۹۴۵ء

(د) پرنسپل نظام کالج، حیدرآباد دکن ۱۹۴۳ء تا ۱۹۴۵ء

(ر) ناظم تعلیمات ریاست حیدرآباد دکن ۱۹۴۵ء تا ۱۹۴۷ء

(س) پہلے پرنسپل حیدرآباد ایوننگ کالج ۱۹۴۹ء تا ۱۹۵۳ء

(ص) پرنسپل انوار العلوم کالج حیدرآباد ۱۹۵۳ء ۱۹۶۷ء

ادارت اور صحافت کا تجربہ

(الف) حیدرآباد ٹیچر (انگریزی) مدیر ۱۹۲۵ء تا ۱۹۳۸ء

(ب) حیدرآباد ٹیچر (اردو) نگران ۱۹۲۵ء تا ۱۹۳۸ء

(ج) ماہنامہ سب رس حیدرآباد نگران ۱۹۶۸ء تا ۱۹۸۳ء

تدریسی تجربہ:۔

(الف) مددگار پروفیسر تاریخ و معاشیات نظام کالج ۱۹۱۷ء تا ۱۹۲۰ء

(ب) پرنسپل نظام کالج کی حیثیت سے دو سال انٹرمیڈیٹ کو انگریزی اور بی اے طلبہ کو سیاسیات پڑھائی ۱۹۴۳ء تا ۱۹۴۵ء

(ج) پرنسپل حیدرآباد ایوننگ کالج کی حیثیت سے چار سال تک بی اے کے طلبہ کو سیاسیات پڑھائی ۱۹۴۹ء تا ۱۹۵۳ء

(د) پرنسپل انوار العلوم کالج کی حیثیت سے (۱۴) سال پی۔یو۔سی کے طلبہ کو انگریزی اور بی اے کے طلبہ کو سیاسیات پڑھائی ۱۹۵۳ء ۱۹۶۷ء

دیگر سرگرمیاں:۔

(ا) ادارۂ ادبیات اردو کے چیرمن ۱۹۶۲ء تا ۱۹۸۳ء

(ب) صغرا ہمایوں مرزا وقف کے چیرمن ۱۹۷۵ء سے

(ج) صفدریہ ہائی اسکول کمیٹی کے صدر ۱۹۷۵ء سے

(د) پولیس ایکشن کے بعد کی تحقیقاتی سہ رکنی کمیٹی کے معزز رکن ۱۹۴۸ء

(ر) آل انڈیا فیڈریشن آف ٹیچرس کے وائس پریسیڈنٹ ۱۹۲۷ء تا ۱۹۳۰ء

(س) مسز سروجنی نائیڈو میموریل ٹرسٹ کے ٹرسٹی ۱۹۸۱ء سے

شادی:۔ سید محمد علی مرزا صاحب مرحوم کی صاحبزادی شاہجہاں بیگم صاحبہ سے ۱۱ / جون ۱۹۱۸ء

اولاد:۔ چار صاحبزادے اور تین صاحبزادیاں

صاحبزادے:۔

(۱) سید حمید اکبر صاحب پیدائش ستمبر ۱۹۲۱ء جنرل منیجر (حال مقیم پاکستان)

(۲) سید مصطفیٰ اکبر صاحب پیدائش جولائی ۱۹۲۳ء
(ڈائرکٹر کراچی لوکل باڈی)
(۳) سید مسعود اکبر صاحب مرحوم پیدائش ستمبر ۱۹۲۹ء
وفات ۹ر جون ۱۹۶۲ء (کیپٹن انڈین آرمی)
(۴) سید سراج اکبر پیدائش ۱۲ر مارچ ۱۹۳۸ء
(ریجنل منیجر، ویمکو، بمبئی)

صاحبزادیاں :-

(۱) محترمہ صفیہ بیگم صاحبہ مرحومہ (اہلیہ کریم الدین صاحب)
پیدائش ۲۷ر ستمبر ۱۹۱۹ء وفات، اگست ۱۹۸۳ء
(۲) محترمہ صبیحہ بیگم صاحبہ (اہلیہ سید نور الحسن جعفری صاحب
آئی۔ اے۔ ایس ریٹائرڈ) ریڈر انگلش عثمانیہ
یونیورسٹی حیدرآباد پیدائش جولائی ۱۹۲۶ء
(۳) محترمہ ساجدہ بیگم صاحبہ (اہلیہ مرزا عابد مرحوم
سکریٹری سینک بورڈ رنگا ریڈی ڈسٹرکٹ اے پی)
پیدائش اپریل ۱۹۲۸ء

بیرونی سفر :-

(۱) بحیثیت طالب علم ۱۹۱۲ء انگلستان
(۲) امپیریل ایجوکیشن کانفرنس کے نمائندے کی
حیثیت سے ۱۹۲۷ء انگلستان، جرمنی
(۳) تعلیمی دورے پر نواب صاحب چھتاری کے ہمراہ ۱۹۳۱ء
انگلستان، جرمنی، فرانس، اٹلی، سوئزرلینڈ
اسکاٹ لینڈ۔

اعزازات :-

(۱) تمغۂ آصفی، خدمات کے اعتراف میں ۱۹۴۶ء
(۱) لائنس کلب آف سکندرآباد کی جانب سے
مومنٹو ۵ر ستمبر ۱۹۷۵ء

(۳) انوار العلوم کالج میں سید علی اکبر ہال کا قیام ۱۹۷۵ء
(۴) خدمات کے اعتراف میں کئی علمی، ادبی اور ثقافتی
اداروں کی جانب بمقام ایوان اردو ایک
عظیم الشان جلسہ کا انعقاد عمل میں آیا۔ ۶ر
اکتوبر ۱۹۸۳ء بصدارت حبیب الرحمن صاحب۔
پروفیسر حبیب الرحمن صاحب، جناب اکبر علی خاں
صاحب سابق گورنر اڑیسہ، جناب محامد علی عباسی
صاحب صدر ادارۂ ادبیات اردو،
جناب عابد علی خاں صاحب، نواب شاہ عالم
خاں صاحب، ڈاکٹر رحیم الدین کمال، جناب
سید کاظم صاحب نے آپ کی علمی اور سماجی
خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے خراج
تحسین پیش کیا۔ [illegible]
محترمہ بانو طاہرہ سعید اور مصلح الدین خاں
صاحب حیدرآبادی نے منظوم خراج تحسین پیش کیا
پدم شری عابد علی خاں صاحب ایڈیٹر
سیاست نے جناب سید علی اکبر صاحب کی
خدمت میں ادارہ کی طرف سے "مومنٹو" پیش کیا۔

صاحب حیدرآبادی

قطعہ تاریخ و نظم تہنیت

نذر پروفیسر سیّد علی اکبر

فیصلہ ارباب دانش کا ہوا صورت پذیر
ہے دیدہ روشن کن برقِ خیالِ اہلِ فہم
سال صاحب کو ملا، سب نے کیا جب اعتراف
جشن خدماتِ علی اکبر کمالِ اہلِ مہم
۱۹۸۳ء

لیے تعظیم خم ہیں سر، یہاں ارباب دانش کے
مبارک ہو تمھیں یہ مرتبہ سید علی اکبر

رہے تم ناظم تعلیم برسوں اس ریاست کے
تمھارے ہی قدم سے پھیلی ضیا سید علی اکبر

شرافت کے نمونے اب کہیں کچھ باقی ہیں دنیا میں
ہر اک نے تم سے مل کر یہ کہا سید علی اکبر

تمھیں جس نے بھی دیکھا اُس نے تہذیب دکن دیکھی
مرقع تم ہو اس آئین کا سید علی اکبر

صدارت پر تمھاری یہ ادارہ ناز کرتا ہے
تمھارا نام اس کو مل گیا سید علی اکبر

ہیں جتنے اہل محفل سب ہی دل سے معترف اس کے
تمھارے کام ہیں سب بے ریا سید علی اکبر

تمھارا جشن کر کے جیسے اپنی ہوشمندی کو
دکن والوں نے ثابت کر دیا سید علی اکبر

علی اکبر بھی اک وابستۂ دامان اردو ہیں
کیا وہ کام جو باقی رہا سید علی اکبر

نہ جائے گی کبھی محنت تمھاری رائیگاں ہرگز
ہے نیکی خود بھی نیکی کا صلہ سید علی اکبر

ادارہ زور صاحب کا قیامت تک پھلے پھولے
اگر مل جائے کوئی دوسرا سید علی اکبر

رہے اردو زباں جب تک رہے ایوان اردو بھی
بصدق دل ہے صاحب کی دعا سید علی اکبر

نوعیت کا واحد شبینہ کالج تھا اس کے پہلے پرنسپل ہونے کا اعزاز ملا، یہاں سے سبکدوش ہوئے تو انجمن تعلیمی انوار ال
کی مقامی منتظران پر پڑی اور وہ انھیں اپنے ساتھ لے گئی اور وہ یہاں کے پرنسپل بنائے گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ حیدرآباد
نئے حالات سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کرتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ انوار العلوم کالج اقلیتوں کا پہلا بڑا کالج تھا
بلکہ حیدرآباد میں خانگی اعلیٰ تعلیم کے لیے انوار العلوم کے علاوہ کوئی دوسری بڑی درس گاہ نہ تھی۔

۱۹۵۴ء میں وہ یہاں کے پرنسپل ہوئے جب کہ کالج محض نشن میں تھا، صرف آرٹس اور کامرس کی کلاسز
قائم تھیں طلباء کی تعداد صرف ۲۲ تھی۔ سید علی اکبر صاحب نے یہاں اس بات کی کوشش کی اور ایسے مواقع پیدا کیے
کہ انوار العلوم ایک مکمل اور مثالی درس گاہ بن جائے جو جدید علوم سائنس سماجیات کامرس کے ساتھ ساتھ دیگر علوم
اس امر میں مسکن ہو جائے جہاں حیرت انگیز اخلاقی اور تعجب خیز صنائع و بدائع قدیم کے خزانے فراہم کیے جائیں۔

انوار العلوم جیسی درس گاہ اور عظیم سائنس کی تخلیق و تعمیر صرف انہی کا کام ہے۔ یہ وہ ادارہ ہے جہاں تاریخ
سیاسیات، عمرانیات، معاشیات، نظم و نسق، طبیعات، کیمیا، حیوانیات، نباتات اور حصری الکٹرانکس کی تعلیم دی جا
تی ہے اس کی ابتدا میرے عظیم بزرگ نے کی۔ آزادی کے بعد جو سخت طلوع ہوئی تھی اس میں حیدرآباد کے عوام اور خاص
اقلیتوں کو نیند سے بیدار کرنا بڑا اہم کام تھا۔ انھوں نے ذخیرۂ علم کے ساتھ نئے ماحول میں لا کھڑا کرنا تھا۔ سید
علی اکبر صاحب مختلف طالب علموں کو ایسے پال رہے تھے اور اپنی داد و دہش کے مطابق ان کے حوصلے بڑھاتے جس طرح
نسیمِ سحر غنچہ کو گدگدا کر صبح بہاری کا پیام دیتی ہے اسی طرح انھوں نے طالب علموں کو ان کے مستقبل کی راہیں
بتلائیں۔ اس علم دوست شخصیت نے اس کالج کو آگے بڑھانے کے لیے سائنسی علوم کے ساتھ مخلوط تعلیم کی طرف بھی
قدم اٹھایا تھا۔ ۱۹۵۸ء میں اس جانب اقدام کیا۔ اس طرح یہ درس گاہ پھلنے پھولنے لگی اور اب ایک تناور درخت بن گئی

انوار العلوم کے فیض یاب آپ کو ملک اور بیرون ملک کے ہر گوشے میں ملیں گے۔ اس ادارے نے ذی حوصلہ
صاحب علم اور اہلِ دل افراد پیدا کیے جو اپنی زندگیاں علمی و ادبی جد و جہد میں گزار رہے ہیں۔ سید علی اکبر صاحب نے
علم نواز اور علم پرور فضا میں دوسروں کو جتنا سکھایا خود بھی سیکھا ہے۔ انھوں نے چن چن کر ایسے اساتذہ کو انوار
العلوم میں جمع کیا ہے جس کی مثال دوسری درسگاہوں میں نہیں ملتی یہاں کے جو بھی اساتذہ باہر گئے خوب نام کما

اس درس گاہ نے یہاں کے طالب علموں کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کا جو سامان جمع کیا اور علم و عمل کے جو جوہر
کھلائے ہیں اس کی تفصیل اس مختصر مضمون میں پیش نہیں کی جا سکتی۔ یہ وہ درس گاہ ہے جس کی آغوش تربیت میں ہ
حیدرآبادی اور کئی بیرونی طلبا کی تربیت ہوئی۔ یہاں سے کئی سپوت جو ذہنی و اخلاقی جلا کے ساتھ باہر آئے
ملک اور بیرون ملک زندگی کے کئی شعبوں میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا رہے ہیں۔ علی اکبر صاحب کے دور میں یہاں کے
فرزند درخشاں نتائج کے ساتھ اس طرح جگمگانے لگے کہ کئی دوسری درسگاہیں ٹمٹماتی رہ گئیں۔ اب یہ ایک درسگاہ ہی
نہیں بلکہ ایک چھوٹی سی جامعہ ہے۔

میرے بزرگ محترم نہ صرف اس کالج کے نگہبان تھے بلکہ خود بھی درس و تدریس کے فرائض بڑی خوبصورتی سے انجام دیتے تھے۔ لڑکوں کو انگریزی کی تعلیم دیتے اور خوب دیتے۔ ذاتی طور پر طالب علموں کی پڑھائی میں دلچسپی لیتے، غریب لڑکوں کو وظائف دلانے نظام ٹرسٹ کو ان کا ایک خط چلا جاتا تو فوراً اسکالرشپ منظور ہو جاتا۔ اچھے اور ہوشیار طالب علموں کو ENCOURAGE کرنے کے لیے اپنی طرف سے انعامات دیتے۔ سید علی اکبر صاحب کا چونکہ محکمۂ تعلیمات سے کئی برسوں تک تعلق رہا تھا اس لیے انتظامی معاملات میں یہاں دشواریاں حائل نہیں تھیں۔ اس وقت کے ڈائرکٹر تعلیمات اور وائس چانسلر سے خاصے تعلقات تھے۔ وائس چانسلر جناب ڈی ایس ریڈی صاحب نے ایک مرتبہ کالج کے جلسے میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ I DO NOT CALL THIS COLLEGE AS ANWARULOOM COLLEGE I WILL ... IS ALI AKBER COLLEGE اس سے علی اکبر صاحب کی غیر معمولی مقبولیت اور شخصیت کا اندازہ ہوتا ہے اور ہمیں انوار العلوم کا جتنی آرکیٹیک کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

جن لوگوں کو بھی اس شخصیت نے کالج کے قریب کیا یہ نہیں کہ ان پر کیا سحر پھونکا جاتا کہ ان میں ایسا DEDICATION پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ کالج کا ہو کر رہ جاتا۔ گو وہ یہاں سے چلے بھی جائے تو زندگی بھر کالج کو نہیں بھولتے اس کالج میں علی اکبر صاحب نے شام میں ملازمین کی سہولت کے لیے DIPLOMA IN COMMERCE کی کلاسس شروع کیں۔ افسوس کہ وہ زیادہ دنوں تک جاری نہیں رہ سکیں انوار العلوم ایوننگ کالج بھی ان ہی کی کاوشوں کا ثمر ہے۔ لڑکوں میں غیر معمولی ڈسپلن تھا ذاتی طور پر یہ خود کلاسس لیتے اور دوسروں کو پڑھانے کی ترغیب دیتے، اکثر یہ کہ اتوار کو بھی کلاسس لیتے اور چھٹی میں کالج آتے انگریزی اخبار لاکر لڑکوں کو پڑھاتے اور اس میں جو غلطیاں ہوتیں انھیں بتاتے اور درست کراتے۔ امتحانات کے بعد جب نتائج نکلتے اور نتائج بالعموم اچھے ہوتے تو ایسے خوش ہوتے کہ جیسے یہ خود امتحان میں کامیاب ہوئے ہوں اور دوست احباب سے کہتے پھرتے کہ دیکھئے ہمارے کالج کے نتائج کتنے اچھے ہیں۔ اتنے درجہ اول میں کامیاب ہوئے ہیں وغیرہ۔ علی اکبر صاحب پڑھائی کے علاوہ اسپورٹس میں بھی کافی دلچسپی لیتے، خود بھی کرکٹ کھیلتے۔ ڈسپلن اور وقت کی پابندی جوانوں کی طرح پھرتی ان میں موجود تھی اور آج بھی یہ بات میں محسوس کرتا ہوں۔

انوار العلوم کالج بڑا خوش قسمت ہے کہ اسے علی اکبر صاحب جیسا ایک اچھا تجربہ کار اور ماہر تعلیم پرنسپل ابتداء ہی سے ملا جس کی وجہ سے یہ کالج اپنے آغاز ہی سے ترقی کر گیا۔ ہمارے شہر میں کئی ادارے ناکام اسی لیے ہوئے ہیں کہ انھیں اچھے لوگ نہ مل سکے۔

علی اکبر صاحب نے یہاں جو اساتذہ جمع کیے انھوں نے نہ صرف تعلیم کے اسلوب کو بنایا، طالب علموں کو زندگی کے جینے سکھائے بلکہ نت نئے طریقوں سے ان کے دامن کو علم سے بھر دیا۔ ان اساتذہ کو کالج کا درخشاں ستارہ کہنا چاہئے۔

اب ہمارا مقصد علی اکبر صاحب کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اس کالج کو نئی دنیا کی زیب و زینت بنانا
اور یہاں کے طالب علموں کو اس قابل بنانا ہے کہ وہ اس ملک کی زندگی کے ہر شعبہ ہائے حیات پر چھا جائیں اور یہ
ان کی میراث بن جائے۔ اس وقت کالج کی عمارتیں اپنے طول و عرض کی دلکشیوں کے ساتھ ایک نئی دنیا معلوم ہوتی ہیں
اس کے نشیب و فراز اور ٹھنڈی ہواؤں میں جو کیف ہے وہ اور جگہ نہیں۔ اس کی عمارتیں حیدرآباد کی لطیف تہذیب کی
زندہ یادگار ہیں۔ علی اکبر صاحب کے ذریعہ تجربوں کی بدولت یہاں بڑی بھاری تبدیلیاں ہوئیں۔ اور یہ میری بڑی خوش قسمتی
ہے کہ میں نے انھیں قریب سے دیکھا ہے۔ اور کسی نہ کسی حیثیت سے مجھے ان کے ساتھ رہنے کا موقع ملا ہے۔ انوار العلوم کی
ترقی میں ان کا جو حصہ ہے اس کی وجہ سے انوار العلوم کو ان کے بغیر نہیں پہچانا جا سکتا، اور انوار العلوم کے ایک عظیم معمار
کی حیثیت سے ان کا کارنامہ بڑا غیر معمولی ہے۔ انھوں نے اس کی خدمت انجام دی ہے اس وجہ سے اس کالج کے
CENTRAL HALL کو علی اکبر ہال کے نام سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر پورے کالج کو بھی ان کے
نام سے موسوم کر دیا جائے تو کمی کا ہے۔ مجھے فخر ہے کہ میرے بزرگ محترم اپنی ذات سے خود ایک ادارہ ہیں

سید علی اکبر صاحب بحیثیت پرنسپل انوار العلوم کالج میں ۱۹۶۷ء تک رہے۔ اس کالج کی تعمیر، ترقی و خوش حالی میں ان کا
بڑا حصہ ہے۔ اس کے لیے انھوں نے فراخدلی میں وہ کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ انوار العلوم کے مالیہ کو مستحکم کرنے کے لیے گھر گھر جا کر عطیات
جمع کیے۔ کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے علاحدہ ہونے کے بعد بھی وہ انوار العلوم ایجوکیشنل سوسائٹی میں معتمد اور کالج بورڈ کے
ممبر کی حیثیت سے طویل عرصہ تک کام کرتے رہے اور مشورے دیتے رہے۔ کالج سے ان کے لگاؤ اور محبت کا اندازہ اس بات سے
لگایا جا سکتا ہے کہ اسی پیرانہ سالی اور گرانی صحت کے باوجود اس کی سلور جوبلی تقاریب میں شرکت فرمائی۔

علی اکبر صاحب ہمارے لیے طاقت کا ایک مینار ہیں، ان کی موجودگی اور مشورے ہم میں حالات کا
مقابلہ کرنے کی ہمت اور صلاحیت پیدا کرتی ہے۔ میری تمنا ہے کہ میرے بزرگ ہمارے درمیان مزید موجود
رہیں تاکہ ہم ان کے تجربہ اور صلاحیتوں سے فائدہ اٹھا سکیں اور مقصد کو حاصل کریں۔ علی اکبر صاحب نے جو کانٹا
کہا ہے ان کا گذر اس شاداب وادی میں ہے، جہاں ان کے لیے پھول ہی پھول ہیں۔ میری تمنا ہے کہ وہ اپنے
دامن کو ان پھولوں سے بھر لیں۔

اب حالات بدل چکے ہیں وہ ماحول وہ فضا نہیں لیکن میں مایوس نہیں ہوں۔ علامہ اقبال کے الفاظ میں

مضطرب باغ کے ہر غنچہ میں ہے بوئے نیاز
تو ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز
نغمے بے تاب ہیں تاروں سے نکلنے کے لیے
طور مضطر ہے اسی آگ میں جلنے کے لیے

—・・・—

تعلق رکھتا تھا ہر معائنے کے موقع پر احمد حسین خاں صاحب کا معمول یہ تھا کہ وہ اپنی سن ہیٹ ہاتھ میں لیے ہوئے صدر مہتمم صاحب کے ہمراہ یکے بعد دیگرے ایک ایک درجے میں داخل ہو کے پورا معائنہ ہونے تک متعلقہ درجے کی دیوار یا کھمبے سے ٹیک لگائے چپ چاپ کھڑے رہتے۔ ہماری تیسری جماعت کے معائنہ کا واقعہ ہے کہ عین معائنے کے دن صبح کو موسلا دھار بارش ہو کے تھم چکی تھی، اور اسکول کے وسیع صحن کے نشیبی حصے میں بارش کا جمع شدہ پانی دکھائی دے رہا تھا۔ مولوی علی اکبر صاحب نے اس جماعت کے ایک کم عمر لڑکے سے جغرافیہ کا یہ سوال کیا کہ بارش کے پانی کے چاروں طرف جو خشکی کا حصہ ہے اس سے یہ جزیرہ کہلائے گا یا جزیرہ نما؟ لڑکے نے اس کا غلط جواب دیا تو صدر مہتمم صاحب نے ازراہ تفنن پرنسپل صاحب کو LOOK AT HIM MR AHMADHUSAIN سے مخاطب کرتے ہوئے اپنا معائنہ جاری رکھا۔

راقم الحروف دارالعلوم میں شروع سے نویں درجے تک کلاس ماسٹر رہا جو انگریزی، فارسی اور اردو کی حد تک اپنے ساتھیوں میں کسی قدر تیز سمجھا جاتا تھا چنانچہ صدر مہتمم صاحب اپنے معائنے کے وقت جب کبھی انگریزی کی عبارت خوانی اور املا نویسی کے بعد متعلقہ جماعت کے طلبہ سے چند اردو جملوں کا انگریزی ترجمہ کرا کے فرداً فرداً پوری جماعت کے لڑکوں کی کاپیاں جانچتے اور راقم الحروف کی کاپی پر کبھی GOOD اور کبھی VERY GOOD تحریر فرما دیتے تو احمد حسین خاں صاحب پھولے نہ سماتے۔

احمد حسین خاں صاحب کے جانشین مولوی سید ظہور علی صاحب بھی خوب آدمی تھے، باوقار شکل و شباہت اور سفید براق سی گھنی داڑھی سے وہ سرسید کے نسخے معلوم ہوتے تھے پیرانہ سالی کے باوجود جسمانی صحت اور اعضائے بدن کی پھرتی اس غضب کی تھی کہ گویا کمانی کے بنے ہوئے ہوں۔ وہ اپنے منصبی کی انتظامی صلاحیت کے ساتھ ساتھ انگریزی گرامر اور ترجمے کے فن پر انھیں ایسی غیر معمولی قدرت حاصل تھی کہ بڑی مڈل اور میٹرک کے طلبہ کو انگریزی کا مقررہ نصاب پڑھانے کے علاوہ انگریزی سے اردو اور اردو سے انگریزی میں معیاری ترجموں کے اچھے اچھے نمونے اور گرامر کے بنیادی گُر فل اسکیپ سائز کے کاغذات پر اپنے قلم سے لکھ کر ہر ہفتے بلا ناغہ نوٹس بورڈ پر آویزاں کروانے تھے پھر نوٹس بورڈ سے کوئی کاغذ کبھی بھی نکالا نہیں جاتا تھا تاکہ متعلقہ طالب علم ذہن میں ہے اور انھیں تحریروں کو تمام و کمال نقل کر لیں۔ مولوی ظہور علی صاحب کے عہد صدارت میں ایک مرتبہ جب مولوی علی اکبر صاحب کا معائنہ ہو رہا تھا میں ساتویں درجے میں زیر تعلیم تھا۔ حسب عادت معائنہ اس طرح شروع ہوا کہ انگریزی . . . کی نصابی کتاب کی جستہ جستہ عبارت خوانی کرائی گئی اور ڈکٹیشن کے بعد اردو کے چھوٹے چھوٹے جملے انگریزی میں ترجمہ کرنے کے لیے دیے گئے ان میں سے ایک جملے میں "توقع" کا لفظ استعمال ہوا تھا جس کا انگریزی مترادف میں نے HOPE لکھ دیا جب وہ صدر مہتمم صاحب کی نظر سے گزرا تو انھوں نے اسے قلم زد کرتے ہوئے مجھ سے فرمایا "ابھی ابھی آپ نے اپنی کتاب میں EXPECT کا لفظ پڑھا ہے پھر HOPE کیوں لکھا؟" میں نے عرض کیا کہ یہ کیا ضروری ہے کہ ہم کتابی لفظ کی تقلید کریں۔ فرمانے لگے توقع کے لیے انگریزی میں EXPECT ہی استعمال ہوتا ہے اور امید کے لیے HOPE۔ اسی طرح دوسرے سال کے معائنے میں

انگریزی ترجمے کی غرض سے ہمیں بدستور اردو جملے لکھوائے گئے، ایک جملہ "اگرچہ" سے شروع ہوا اور اس کا دوسرا جزو "لیکن" سے میرے تمام ساتھیوں نے "لیکن" کا ترجمہ "BUT" کیا اور میں نے مطلوبہ ترجمے میں ALTHOUGH اور YET کا محل استعمال کیا۔ اس ترجمے کی جانچ کے وقت میری کاپی پر VERY GOOD لکھ کر مولوی اکبر صاحب نے پوچھا WHO IS THIS BOY ? انگریزی، ریاضی اور تاریخ ہند پر متعدد سوالات کر کے صدر مہتمم صاحب اپنی کرسی سے اٹھنا ہی چاہتے تھے کہ میں نے کلاس مانیٹر کی حیثیت سے انھیں یاد دلایا کہ فارسی اور اردو کا مضمون معائنے سے رہ گیا۔ یہ سن کر مجھ سے پوچھا "جی؟" میں نے اپنا جملہ دہرایا تو مولوی ظہور علی صاحب پرنسپل وسٹ سے انگریزی میں مخاطب ہوئے کہ "یہ لڑکا بڑا شوخ اور گستاخ معلوم ہوتا ہے، مجھے سکھانا ہے"۔ اس وقت مولوی ظہور علی صاحب میری بنچ سے متصل میری طرف پیٹھ کیے کھڑے ہوئے تھے، جھٹ سے میری جانب اس طرح پلٹے جیسے ڈرل کرنے والے بچے ڈرل ماسٹر کا کاشن پاتے ہی ABOUT TURN کرتے ہوں۔ ایک ذرا خمیدہ ہو کر مجھے گھرکی دی کہ "تمھیں اس سے کیا مطلب؟" میں اس وقت زیر لب مسکرا کر چپکا ہو رہا۔ چونکہ ہر مہینے کے ختم پر کلاس رجسٹر کے اندراجات پر صدر صاحب سے دستخط لینا پڑتا تھا اس لیے مذکورہ بالا معائنے کے چند ہی روز بعد جب میں اجلاس پرنسپل پر رجسٹر لیے ہوئے پہنچا تو مولوی ظہور علی صاحب نے فرمایا "صدر مہتمم صاحب نے تم کو شوخ اور گستاخ کہا"۔ میں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ دوسرے مہینے میں وہی الفاظ سنے پھر بھی چپ رہا۔ تیسرے مہینے میں جب اس جملے کا اعادہ ہوا تو ظہور علی صاحب سے میں نے کہا کیوں صاحب کیا یاد دہانی بھی داخل جرم ہے؟ ہنستے ہوئے جواب دیا سب کے طبائع یکساں نہیں ہوتے تمھیں اس کا تجربہ نہیں ہے۔

یہ تو ہوئیں تعلیمی معائنے کی باتیں اس کے علاوہ ماتحتوں کے ساتھ مولوی علی اکبر صاحب کا حسن سلوک بھی قابل ذکر ہے

دارالعلوم کے یگانۂ روزگار استاد اردو و فارسی مولوی مرزا الصدق حسین صدق جائسی مرحوم جو سراپا مستعلیق انسان تھے مولوی علی اکبر صاحب سے اپنی ملاقاتوں کا حال اس خوبی سے بیان فرماتے تھے کہ ہر سننے والے کو آنکھوں دیکھا حال معلوم ہونے لگتا۔ چنانچہ موصوف نے ایک دفعہ اپنی ملاقات کا نقشہ اس طرح کھینچا کہ موسم گرما کی ایک سہ پہر کو میں علی اکبر صاحب کے دولت کدے پر اس مقصد سے پہنچا کہ انھیں اپنا تازہ ترین قصیدہ سناؤں جس میں اظہار مدعا یہ تھا کہ حیدرآباد سے ضلع نظام آباد پر میرا تبادلہ کر دیا گیا ہے مجھے پھر حیدرآباد بلا لیجئے۔ ممدوح نے قصیدہ سن کر اپنے نوکر کو حکم دیا کہ صدق صاحب کے لیے شربت فالسہ لاؤ۔ ذرا دیر میں شربت کے گلاس آ گئے اور ہم دونوں دیر تک جرعہ جرعہ شربت پینے میں بات چیت کرتے رہے۔ مولوی علی اکبر صاحب نے میرے قصیدے کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کے صلے میں نظام آباد سے آپ کا تبادلہ کر دیا جائے گا۔ میں نے جواباً کہا کہ صلہ نہ فرمائیے۔ اگر آپ صلہ ہی دینا چاہتے ہیں تو اس کے لیے میری

تین شرطیں ہیں انہوں نے کہا۔ پہلی شرط تو یہ ہے کہ نظام آباد سے حیدرآباد کے کسی اسکول میں میرا تبادلہ کر دیجیے دوسری شرط یہ کہ محکمۂ آرائش بلدہ کا اے کلاس مکان کرایہ پر دلوایئے تیسری شرط یہ ہے کہ ضلع پر تبادلہ ہونے کی وجہ سے میں کافی زیر بار ہو چکا ہوں اس لیے سر رشتے سے ایک مُشت دو ہزار روپے دلوایئے۔ یہ سن کر فرمانے لگے آپ کی پہلی دونوں شرطیں منظور ہیں تیسری شرط سر دست ملتوی کی جاتی ہے۔ انشاءاللہ آئندہ میں آپ کو دو ہزار سے زیادہ کا فائدہ پہنچاؤں گا۔

ایسے مردم شناس ماتحت نوازوں کے شریفانہ احسانات مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اب قصۂ پارینہ ہو چکے ہیں۔ الغرض مولوی سید علی اکبر صاحب کا وجود ذی جود فنِ تدریس کے استادِ کامل، تعلیمی نظم و نسق کے ماہر اور اوصافِ حمیدہ کے حامل انسان کی حیثیت سے نہ صرف قابلِ قدر بلکہ ہمارے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔
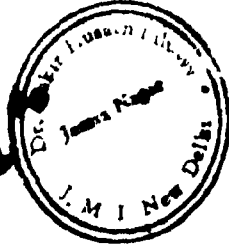
محمد منظور احمد

پروفیسر سیّد علی اکبر ۔ چند یادیں، چند باتیں

شخصیت کی تشکیل و تعمیر قوتِ ارادی، قوتِ عمل، عزم و ہمت اور مستقل مزاجی کا کرشمہ ہے۔ نامساعد اور ناموافق حالات یا حالات کے تقاضے سے ہی شخصیتیں ابھرتی ہیں۔ قدرت صلاحیتوں کی بخشش و عطا میں ہمیشہ فیاض رہی ہے بشرطیکہ خود ہوشمند اس کے اہل ہوں ؎

کوئی قابل ہو تو ہم شانِ کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والے کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

اقبال نے بجا طور پر کہا تھا کہ اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے، اس لیے اگر آدمی ہر وقت بیدار ہو جائے اور زندگی جیسی نعمتِ غیر مترقبہ سے بہتر طور پر استفادہ کی کوشش کرے تو سماج میں نہ صرف وہ خود اعلیٰ مقام حاصل کر سکتا ہے بلکہ جہدِ مسلسل سے انسانی سماج کی خدمت بھی انجام دے سکتا ہے۔

پروفیسر سید علی اکبر سابق صدر ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد کی زندگی اعلیٰ اخلاقی اور انسانی اقدار سے عبارت ہے۔ انھیں دیکھنے اور جاننے کے بعد کوئی شخص بھی انسانیت کی بقا اور تابناک مستقبل سے مایوس نہیں ہو سکتا۔ میں یہ بات بلا تامل کہوں گا کہ پروفیسر سید علی اکبر کی مثالی زندگی موجودہ بے لگام نئی نسل کے لیے ایک قابلِ تقلید نمونہ ہے۔

صحت مند علمی، ادبی اور سماجی مصروفیات کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دینا ستائش کی تمنا اور صلہ کی پروا کیے بغیر خاموش طریقے سے مسلسل مستقل طور پر کام کیے جانا پروفیسر صاحب کا امتیازی وصف رہا ہے۔

جناب پروفیسر سید علی اکبر کو میں نے پہلی بار اس وقت دیکھا تھا جب وہ مہتمم تعلیمات بلدہ کی حیثیت سے گورنمنٹ مڈل اسکول کاچی گوڑہ کے معائنہ کے لیے تشریف لائے تھے۔ مرحوم عبدالسلام خاں سابق انسپکٹر جنرل پولیس آندھرا پردیش کے والد جناب عبدالوہاب اس اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ اسکول کی عمارت دو منزلہ اور ڈاکٹر عبدالغنی کی ملکیت تھی۔ میں اس وقت ساتویں جماعت کا طالب علم تھا۔ یہ سال تعلیمی ۱۹۳۷-۳۸ء یعنی آج سے کوئی (۴۵) سال قبل کی بات ہے۔

پچھلے ۴۵ سال میں اصول تعلیم، طریقہ تعلیم، تدریس، نصاب تعلیم، طالب علم، استاذ، صدر مدرس اور تعلیمات کے اعلیٰ عہدیدار، حکومت کی مشنری کے ادنیٰ اور اعلیٰ کل پرزوں میں زبردست تبدیلیاں واقع ہوئیں اور بعض نہایت افسوسناک قسم کے موڑ آئے۔ گزشتہ تین دہوں میں تعلیم کے میدان میں شکست و ریخت کی گرم بازاری

زیادہ رہی. مثالی طالب علم اور مثالی استاد اب خال خال نظر آتے ہیں. پروفیسر سید علی اکبر نے اس دور میں بھی فرائض ادا کرنے میں ہمیشہ اپنے اعلیٰ معیار کو قائم و برقرار رکھا؛ حالانکہ موجودہ فضا اور ماحول میں مستقل کرب بے چینی اور گھٹن سی محسوس ہوتی ہے۔

تعلیمات کے اعلیٰ عہدیدار کے کسی اسکول کے معائنے کے لیے آنے کو ہماری طالب علمی کے دور میں بڑی اہمیت دی جاتی تھی. عہدیدار تعلیمات بھی پوری دلچسپی اور انہماک سے اسکول کی ہر کلاس کا معائنہ کرتے، اور معائنہ کے بعد، اپنی رپورٹ کی ایک کاپی لازمی طور پر اسکول کے صدر مدرس کے نام ارسال کرتے تاکہ وہ اپنے اسکول کے اساتذہ کی میٹنگ طلب کر کے اس رپورٹ پر غور کرے اور رپورٹ میں تحریر کردہ ہدایتوں اور مشوروں پر خود عمل کرے اور اساتذہ کو اس پر عمل کرنے کا پابند کروائے

ہمارے مڈل اسکول کے معائنہ کے سلسلے میں پروفیسر سید علی اکبر کے تشریف لانے کی اطلاع، ایک طالب علم کی حیثیت سے میرے لئے بڑی اہمیت رکھتی تھی. معائنہ کے معنی یہی تھے کہ طالب علم، اساتذہ، صدر مدرس اور اسکول کے ذمہ کا پورا امتحان ہے۔ چنانچہ اسکول نے اسی حساب سے تیاری شروع کر دی. اسکول کی فضا میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی. ہر طالب علم یہی سوچ رہا تھا کہ نہ جانے ہماری کلاس میں کس طالب علم سے سوالات پوچھے جائیں گے. سوالات کس مضمون سے متعلق ہوں گے اور معائنہ کے وقت ہماری کلاس میں کس مضمون کا پریڈ چل رہا ہوگا. میں نے سوچا کہ تاریخ، جغرافیہ، شہریت، سائنس، دینیات و اخلاقیات یا اردو جیسے مضامین میں سے کوئی مضمون ہو تو مجھے جوابات دینے میں سہولت اور دلچسپی ہوگی. دل ہی دل میں یہ دعا بھی تھی کہ خدا کرے کہ ریاضی کا پریڈ نہ ہو کیونکہ اس میں اپنا ہاتھ، اڑیل قسم کا تھا. بلکہ سچ پوچھیے تو چلتا ہی نہ تھا۔

ادھر اساتذہ کے چہرے سمندر کی سطح کے سکون کا منظر پیش کر رہے تھے، اور وہ اپنے اپنے مضامین میں طلبا کو حتی المقدور تیار کروا رہے تھے. باقاعدہ ریہرسل کا سلسلہ شروع ہو گیا. اس طرح معائنے کی تاریخ آتے آتے ہر جماعت میں تمام مضامین کا بڑی عمدگی اور سلیقہ سے اعادہ ہوتا رہا. طالب علموں میں مسابقت کے جذبہ نے زندگی کی لہر دوڑا دی. ان تیاریوں کے بعد ہر طالب علم کو یہ تمنا تھی کہ سوالات سب سے پہلے اسی سے شروع ہوں بشرطیکہ اجازت جواب دہی میں پہل وہی کرے گا. اس طرح اپنی کلاس، اپنے مدرسہ، اپنے استاد، اپنے صدر مدرس اور اپنے والدین کا نام روشن کرے گا ہر کلاس کے مانیٹر کے ذریعہ تمام مضامین کی ہوم ورک کی کاپیاں جمع کروا کے سلیقے سے رکھ دی گئیں. بالآخر خدا خدا کر کے معائنہ کا دن اور وقت آن پہنچا. طالب علم صاف ستھرے لباس میں ٹائم ٹیبل (نظام الاوقات) کے مطابق کتابیں اپنے ہاتھوں میں تھامے ہوئے مقررہ وقت سے دس منٹ قبل ہی اپنی جماعت میں حاضر تھے. پورے اسکول میں مکمل خاموشی تھی. البتہ سب کے دل سینوں میں دھڑک رہے تھے. معائنہ کی یہ گھڑی گویا محشر کی گھڑی تھی اور ہم سب عرصۂ محشر میں تھے. اور ہمارے اعمال کے دفتر چند منٹ میں پیش کیے جانے والے تھے. بالآخر چپراسی نے اطلاع دی کہ پروفیسر سید علی اکبر صاحب تشریف لا چکے ہیں [illegible] اطلاع ملی کہ وہ صدر مدرس صاحب کے ساتھ کلاسوں کے معائنہ کے

لے کل چکے ہیں۔ ہمارے طالب علمی کے دور کی یہ روایت تھی اور طلبا اسے اپنا فرض سمجھتے تھے کہ کلاس میں ٹیچر، صدر مدرس یا کوئی اعلیٰ عہدیدار داخل ہوتو ادباً اور احتراماً کھڑے ہو جائیں چنانچہ ہماری کلاس میں جیسے ہی صدر مدرس صاحب کے ساتھ جناب پروفیسر سید علی اکبر داخل ہوئے ہم سب طلبا ایستادہ ہو گئے۔ اس کے بعد جناب محترم نے ہم سب سے کہا کہ بیٹھ جائیے۔ طلبا بیٹھ گئے۔ معائنہ شروع ہوا۔ ہوم ورک کی کاپیاں دیکھی گئیں۔ مقررہ نصاب کے بارے میں متعلقہ مدرس صاحب سے سوالات کیے گئے ختم شدہ اور ختم شدنی نصاب کی جانچ کی گئی۔ حاضری کا رجسٹر دیکھا گیا۔ ٹائم ٹیبل کے مطابق مضمون سے متعلق چند طلبا سے سوالات کیے گئے۔

پروفیسر سید علی اکبر کا پُر وقار چہرہ ہم سب کی توجہ کا مرکز تھا۔ اب مجھے یہ یاد نہیں ہے کہ کس قسم کے سوالات کیے گئے۔ البتہ یہ ضرور یاد ہے کہ مجھ سے کوئی سوال پوچھا نہ گیا۔ مجھ جیسے بعض اور طالب علم بھی تھے جو اضطراب و اشتیاق کے ساتھ سوالات کے منتظر رہے۔ معائنہ کے ختم ہونے تک تمام طالب علموں پر برزخ کی سی کیفیت طاری رہی۔ لیکن ہم سب کے لیے یہ بات باعث مسرت تھی کہ معائنہ اطمینان بخش رہا، اور معائنہ کنندہ عہدیدار کی زبان سے تعریف و تحسین کے الفاظ سننے کا ہمیں موقع ملا۔ ان کے کلاس سے باہر تشریف لے جاتے ہی ہمارے مدرس صاحب نے طالب علموں کی ذہانت مستعدی اور حاضر جوابی کی تعریف کی۔ اسکول کے معائنہ کے اختتام پر صدر مدرس کی طرف سے تعطیل کے اعلان نے تمام طلبا کی مسرت میں دوگنا اضافہ کر دیا۔

یہ ۴۵ سال قبل کی باتیں ہیں اور آج ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں۔ اب نہ وہ طالب علم رہے اور نہ وہ استاد کس کس کا ماتم کریں اس کس کو روئیں اور کب تک؟

ہر دور کے رونے کو کہاں سے جگر آئے؟

تعلیم اب عام ہو گئی ہے حصول تعلیم کے سلسلے میں ہر طرح کی سہولتیں مہیا کرنے کے اعلانات ہوتے رہتے ہیں لیکن تحصیل علم کا شوق بازار کی کوئی جنس تو نہیں کہ اُسے خرید کر مہیا کر دیا جائے۔

جناب پروفیسر سید علی اکبر، علم کا چشمہ ہیں۔ ان کی شخصیت آج کے طالب علم، اور استاد کے لیے مینارِ نور ہے۔

کاش! یہ مینارۂ نور، طالب علم اور استاد سب کا مرکز نظر ہو جائے اور اکتساب و فیضِ علم کا پُر خلوص جذبہ صحیح معنوں میں عام ہو جائے۔

سید کاظم

پروفیسر علی اکبر: ماہر تعلیم
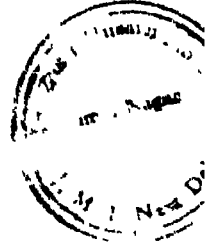
(پروفیسر سید علی اکبر صاحب کی خدمات کے اعتراف میں منعقدہ جلسۂ تہنیت مورخہ ۹ اکتوبر ۱۹۸۳ء
(ایوان اردو) میں کی گئی تقریر)

آج ہم اس لیے یہاں جمع ہوئے ہیں کہ ریاست حیدرآباد میں تعلیم کی ترقی و توسیع کے سلسلے میں سید علی اکبر صاحب کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں خراج تحسین پیش کریں۔

علی اکبر صاحب نے ابتدائی تعلیم مدرسۂ عالیہ حیدرآباد اور ولسن کالج بمبئی میں حاصل کی بعد ازاں انھوں نے انگلستان جا کر کیمبرج یونیورسٹی سے آنرز کی ڈگری حاصل کی۔ وہاں سے لوٹنے پر نظام کالج میں ان کا تقرر عمل میں آیا۔ کچھ عرصہ بعد محکمۂ تعلیمات نے ان کی خدمات حاصل کرلیں اور انھیں ڈویژنل انسپکٹر آف اسکول کی حیثیت سے گلبرگہ بھیجا گیا بعد ازاں وہ تبدیل ہوکر حیدرآباد آگئے۔ حیدرآباد ڈویژن میں وہ مدارس بھی شامل تھے جو سکندرآباد کنٹونمنٹ اور ریذیڈنسی کے برطانوی زیر انتظام علاقوں میں واقع تھے۔ سر راس مسعود نے جو اس وقت ناظم تعلیمات تھے حیدرآباد میں تعلیمی اداروں کو ترقی دینے اور ان کی تنظیم جدید کے سلسلے میں علی اکبر صاحب کی خدمات کی بے حد ستائش کی ریذیڈنسی کی طرف سے برطانوی زیر انتظام علاقوں میں ان کی تعلیمی خدمات کو سراہتے ہوئے اظہار تشکر کیا گیا۔

اپنے پیشے سے اساتذہ کی دل بستگی میں اضافہ کرنے کی غرض سے علی اکبر صاحب نے ٹیچرس اسوسی ایشن کی بنا رکھی اور ایک ذولسانی (انگریزی اردو) مجلّہ "حیدرآباد ٹیچر" کے نام سے جاری کیا۔

محکمۂ تعلیمات میں اپنی تیس سالہ ملازمت کے دوران وہ مختلف عہدوں پر فائز رہے اور مختلف قسم کی ذمہ داریاں ان کے سپرد رہیں۔ بورڈ آف ایجوکیشن کے سکریٹری رہے۔ پھر اسپشل افسر بنائے گئے بعد ازاں فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے جہاں انھوں نے اساسی نوعیت کے اہم کام انجام دیئے۔ ناظم تعلیمات کے عہدے پر ترقی پانے سے دو سال قبل وہ نظام کالج کے پرنسپل بنائے گئے۔ وہ جہاں بھی گئے انھوں نے تعلیم کے جمہوری اصولوں کو فروغ دیا۔

علی اکبر صاحب ۱۹۴۸ء میں ناظم تعلیمات کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے لیکن ان کی اعلیٰ صلاحیتوں سے استفادہ کرنے کی غرض سے ان کو بار بار مامور کیا گیا اور وہ حیدرآباد ایوننگ کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ اس خدمت پر وہ ۱۹۵۳ء تک فائز رہے۔ یہاں سے ریٹائر ہوئے تو انوار العلوم کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے ان کی خدمات

حاصل کی گئیں۔ انھوں نے اس کالج کو معمولی حالت سے اٹھا کر ریاست کا بڑا تعلیمی مرکز بنا دیا۔

علی اکبر صاحب عظیم ماہر تعلیم ہونے کے علاوہ انگریزی اور اردو کے مصنف کی حیثیت سے بھی شہرت رکھتے ہیں۔ انھوں نے جرمنی کے مدارس اور تعلیمی نظام کا مطالعہ کیا اور ایک کتاب THE GERMAN SCHOOL SYSTEM کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ٹائمز ایجوکیشنل سپلیمنٹ لندن نے لکھا کہ "یہ جرمنی کی مابعد جنگ تعلیمی اصلاحات کا ماہرانہ اور مستند جائزہ ہے۔" علی اکبر صاحب کی اردو تصانیف میں "میسور میں اردو تعلیم"، "ورنفسیات" برگلو ورکی کتاب KNOW YOUR OWN MIND کا ترجمہ قابل ذکر ہیں۔

اس تمام عرصے میں وہ اسلامک کلچر بورڈ کے نائب صدر کی حیثیت سے اسلامک کلچر میگزین کے نگراں رہے اس کے علاوہ ادارۂ ادبیات اردو کے صدر کی حیثیت سے اس کے علمی، ادبی اور تحقیقی کاموں کی رہنمائی کرتے رہے۔

وہ اب بھی علمی اور تعلیمی میدان میں سرگرم عمل ہیں اور اپنی پیرانہ سالی کے باوجود جب کبھی کوئی علمی، ادبی یا تعلیمی ادارہ آپ سے مشاورت کا خواہاں ہوتا ہے تو آپ بخوشی اس کے لیے اپنا وقت دیتے ہیں۔

ایک قابل ایڈمنسٹریٹر، بلند پایہ عالم اور ماہر تعلیم کی حیثیت سے علی اکبر صاحب کی شہرت مسلّم ہو چکی ہے۔ وہ اپنی شرافت طبع کی وجہ سے عوام و خواص میں یکساں طور پر مقبول ہیں۔ نہایت خلیق اور متواضع انسان ہیں اور ہر ایک کی ممکنہ مدد فرماتے ہیں۔

جناب والا! میں اسلامک کلچر میگزین کی جانب سے آپ کی ان خدمات کے لیے جو آغاز سے لے کر اب تک اس رسالے کی ترقی کے لیے آپ نے انجام دیں ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ سے میری دعا ہے کہ مدتوں تک آپ کی سرپرستی اور رہنمائی میں یہ رسالہ پروان چڑھتا رہے۔ آمین۔

تصوف اور شاعری صفحہ ۲۰ سے آگے
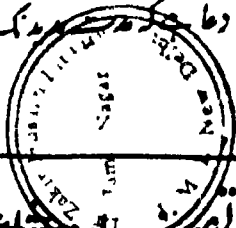
رہا بسا نہ ہوتا تو آج کی نسل میں شاید وہ روحانی اور اخلاقی قدریں بھی نہ ہوتیں جو ہیں۔ اگر آج کا دور، نئرا دِ نو اپنے ورثے کو پہچانے، اس گنج گراں مایہ کی قدر کرے اور ان بے بہا جواہر پاروں سے استفادہ کرے تو یہ ہمارے کئی روحانی اور اخلاقی امراض کا علاج اور کئی دردوں کا درماں ہوگا اور اس سے ایک صالح معاشرے کی تشکیل میں اعانت ہوگی۔ دیکھیں یہ خواب کب حقیقت بنتا ہے، کب اپنی منزل کو پاتا ہے؟۔

پروفیسر سید علی اکبر

سابق ریاست حیدرآباد میں تعلیم

انیسویں صدی کے وسط تک ریاست حیدرآباد میں تعلیم کی اشاعت حکومت کے دائرۂ عمل میں شامل نہیں تھی اور تعلیم کے لیے سہولتیں مہیا کرنا خانگی اداروں پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ حکومت کی جانب سے رعایا کی تعلیم کا انتظام اولاً ریاست کے پُرمغز، دوراندیش اور روشن الخیال مدار المہام سالار جنگ نے ۱۸۵۴ء میں مدرسہ دارالعلوم قائم کیا جس میں السنۂ مشرقیہ کی تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ ۱۸۵۹ء میں عوام کی تعلیم کے لیے ہر تعلقہ میں دو مدارس کھولے گئے۔ ایک فارسی اور دوسرا علاقائی زبان میں تعلیم کے لیے۔ ۱۸۶۹ء میں سررشتۂ تعلیمات کا قیام عمل میں آیا۔ مسٹر ولکنسن پہلے ناظم تعلیمات تھے۔ ۱۸۷۲ء میں نواب عماد الملک اس عہدہ پر مامور کیے گئے اور ۔۔ پرائمری اسکول کھولے گئے ۔۔ لڑکوں کے لیے اور ۔۔ لڑکیوں کے لیے تھے۔ ۱۸۷۰ء اور ۱۸۸۰ء کے درمیان بلدۂ حیدرآباد میں سٹی ہائی اسکول چادرگھاٹ ہائی اسکول اور اورنگ آباد اور گلبرگہ میں ایک ایک ہائی اسکول قائم کیا گیا۔ بلدۂ حیدرآباد میں تین ممتاز امدادی انگلش ہائی اسکول پہلے ہی سے موجود تھے یعنی سینٹ جارج گرامر اسکول، آل سینٹس ہائی اسکول اور محبوب کالج سکندرآباد۔ ۱۸۷۲ء میں مدرسۂ عالیہ کی بنا پڑی۔ اسی سال چادرگھاٹ ہائی اسکول کو سکنڈ گریڈ کالج کا درجہ دے کر اس کو حیدرآباد کالج کے نام سے موسوم کیا گیا اور مسز سروجنی نائیڈو کے والد ڈاکٹر اگھورناتھ چٹوپادھیا کو اس کا پرنسپل مقرر کیا گیا اور ۱۸۸۱ء میں یہ کالج مدراس یونیورسٹی کا ملحقہ فرسٹ گریڈ کالج بن گیا۔ ۱۸۸۴ء میں چادرگھاٹ ہائی اسکول کی کالج کی جماعتوں کو مدرسۂ عالیہ میں منتقل کیا جا کر اس کالج کو نظام کالج کا نام دیا گیا۔

۱۸۷۱ء میں ہر ضلع کے لیے ایک ناظر تعلیمات اور ۱۸۸۵ء میں ہر صوبہ کے لیے ایک مہتمم تعلیمات مامور کیا گیا۔ ۱۸۹۰ء میں تحتانیہ مدارس کے مدرسین کی ٹریننگ کے لیے بلدۂ حیدرآباد میں ایک گورنمنٹ نارمل اسکول کا انتظام کیا گیا۔ انیسویں صدی کے اواخر میں بلدۂ حیدرآباد میں ایک انجینئرنگ اسکول، ایک میڈیکل اسکول قائم تھا۔ ۱۸۹۰ء میں ایک زنانہ اسکول قائم ہوا۔ اس سے پہلے لڑکیوں کے لیے کوئی ثانوی مدرسہ نہیں تھا۔ ۱۹۰۷ء میں اس کو ہائی اسکول کا درجہ دیا گیا۔ اسی سال محبوبیہ گرلز ہائی اسکول کا افتتاح ہوا۔ اس مدرسہ میں طالبات کو کیمبرج لوکل سرٹیفکیٹ امتحانات کے لیے تیار کیا جاتا تھا۔ اس کے اسٹاف میں علاوہ پرنسپل کے چار پانچ

اور بورڈ میں معلمات امور کی جاتی تھیں۔

۱۹۱۱ء میں جب اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں تخت نشین ہوئے تو اس وقت ریاست میں اعلیٰ تعلیم کے دو ادارے تھے۔ نظام کالج جو مدراس یونیورسٹی سے ملحق تھا (اور جس میں ۱۵۲ طلبہ زیر تعلیم تھے) اور دارالعلوم جہاں طلبہ کو پنجاب یونیورسٹی کے السنۂ شرقیہ کے امتحانات کے لیے تیار کیا جاتا تھا۔ ثانوی مدارس کی تعداد ۸۰ تھی جن میں ۱۶۳۲۶ طلبہ زیر تعلیم تھے اور مدارس تحتانیہ کی تعداد ۹۲۱ تھی اور ان میں طلبہ کی تعداد ۴۸,۱۱۲ تھی۔ تعلیم پر ریاست ۴ لاکھ روپے صرف کرتی تھی۔ نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ ششم کے دور حکومت میں ہی تعلیم کی پست حالت کو محسوس کر کے ۱۹۱۰ء ایک ماہر تعلیم مسٹر میہیو کی خدمات دو سال کے لیے مستعار لی گئیں تاکہ وہ ریاست کی تعلیمی حالت کا جائزہ لے کر رپورٹ مرتب کریں اور تعلیمی توسیع اور اصلاح کے لیے سفارشات پیش کریں۔

مسٹر میہیو نے اپنی رپورٹ ۱۹۱۱ء کے آخر میں پیش کی۔ ان کی سفارشات کی بنا پر ہر ضلع کے لیے ایک مہتمم تعلیمات اور انگلش ہائی اسکولوں کے لیے ایک ڈپٹی انسپکٹر اور مدارس نسواں کے لیے ایک مہتمم کا تقرر کیا گیا۔ مسٹر میہیو نے تحتانی تعلیم کی توسیع کی جو اسکیم پیش کی اس پر عمل کیے جانے کے بعد مدارس تحتانیہ کی تعداد جو ۱۹۱۵ء میں ۱۹۴۳ تھی ۱۹۲۰ء میں تقریباً چار ہزار تک پہنچ گئی اور ان مدارس میں طلبہ کی تعداد ۶۰,۰۰۰ سے بڑھ کر دو لاکھ تک پہنچ گئی۔ ۱۹۲۲ء میں حضور نظام کے فرمان کے ذریعہ مدارس تحتانیہ میں طلبہ کی فیس معاف کر دی گئی۔ لڑکیوں کے مدارس کی تعداد ۱۹۱۱ء میں صرف ۹۰ تھی ۱۹۲۱ء تک ان کی تعداد ۵۰۸ تک بڑھ گئی۔ تعلیم نسواں میں سب سے بڑی رکاوٹ ٹرینڈ معلمات کی کمی تھی۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۰ء کے دوران ظہیرآباد، ورنگل، اورنگ آباد اور گلبرگہ میں ایک ایک ٹریننگ اسکول قائم کیا گیا۔ ذکور کے لیے گورنمنٹ نارمل اسکول حیدرآباد کے علاوہ گلبرگہ اور ورنگل میں بھی ایک ایک ٹریننگ اسکول قائم کیا گیا۔

۱۹۱۱ء میں امتحان مدراس میٹرک سے جو غیر معمولی ہماری ریاست کے انگلش ہائی اسکولوں میں .... امتحان ہائی اسکول لیونگ سرٹیفکیٹ رائج کیا گیا جس کی وجہ سے ان مدارس کو ترقی دینے میں کافی مدد ملی۔ اسی اثنا میں پنجاب یونیورسٹی سے دارالعلوم کا الحاق ختم ہو گیا اور سررشتہ تعلیمات کے السنۂ مشرقیہ کے امتحانات کی تدریج عمل میں آئی۔ مدارس فوقانیہ جہاں سررشتہ کے امتحانات منشی و مولوی کے لیے طلبہ کو تیار کیا جاتا تھا کامیاب ثابت نہیں ہو رہے تھے۔ اس لیے ۱۹۱۵ء میں بجز تین مدارس فوقانیہ کے باقی کو مڈل اسکولوں میں تبدیل کیا گیا۔ ۱۹۱۱ء اور ۱۹۲۱ء کے درمیان ۸ ثانوی مدارس کا اضافہ کیا گیا۔ ثانوی مدارس میں طلبہ کی تعداد میں ۷,۵۰۰ کی بیشی ہوئی۔ ۱۹۱۸ء میں ہر صوبہ میں ایک صدر مہتمم تعلیمات کا تقرر کیا گیا اور مہتمم تعلیمات کی جائیداد کو صدر مہتمم تعلیمات کی جائیداد قرار دیا گیا۔ ۱۹۲۳ء میں جاگیرداروں کے لڑکوں کے لیے جاگیردار کالج کے نام سے ایک اقامتی ہائی اسکول قائم کیا گیا جس میں کیمبرج اسکول سرٹیفکیٹ کے امتحانات کا انتساب رائج کیا گیا۔

اس درس گاہ کے اخراجات کے لیے جاگیرداروں سے ان کی جاگیر کی آمدنی کے تناسب کے لحاظ سے حصہ وصول کیا جاتا تھا۔ انڈین یونین میں ریاست کے انضمام کے بعد جاگیردار کالج کو ایک پبلک اسکول بنا دیا گیا۔

۱۹۱۸ء میں جامعہ عثمانیہ کی تاسیس سے ریاست حیدرآباد میں تعلیم کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا ہندوستان میں اپنی نوعیت کی یہ پہلی یونیورسٹی تھی۔ ایک عرض داشت میں جس کو معتمد تعلیمات وقت مسٹر حیدری نے (جو بعد میں رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری ہوئے) پیش گاہ خسروی میں گزرانی اور ان دشواریوں کا ذکر کیا گیا جو طلبہ کو ایک بدیسی زبان کے ذریعہ تعلیم حاصل کرنے میں پیش آتی ہیں۔

ان دشواریوں کے مدنظر جامعہ عثمانیہ میں اردو کو ذریعہ تعلیم قرار دیا گیا جو سرکاری زبان ہونے کے علاوہ ریاست میں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی تھی لیکن اس کے ساتھ انگریزی بطور زبان لازمی قرار دی گئی۔ جامعہ عثمانیہ کی تاسیس میں سر اکبر حیدری کے علاوہ نواب مسعود جنگ (بعد میں سر راس مسعود) ناظم تعلیمات وقت نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ علمی لسانی مضامین میں نصاب کی کتابوں کی تیاری کے لیے ایک دارالترجمہ قائم کیا گیا۔ جامعہ عثمانیہ کا پہلا امتحان میٹرک ۱۹۱۸ء میں منعقد ہوا۔ اور ۱۹۱۹ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کالج کا افتتاح ہوا۔ امتحان انٹرمیڈیٹ پہلی دفعہ ۱۹۲۱ء میں منعقد ہوا۔ ۱۹۲۲ء اور ۱۹۲۶ء کے درمیان ایک کالج قائم کیا گیا اور سٹی ہائی اسکول، زنانہ نامپلی ہائی اسکول، اورنگ آباد ہائی اسکول اور ورنگل ۱۹۲۳ء میں گلبرگہ ہائی اسکول کو بھی انٹرمیڈیٹ کالج کا درجہ دیا گیا۔ ایک سال بعد نامپلی زنانہ انٹرمیڈیٹ کالج کو ڈگری کالج کا درجہ دیا گیا اور اسکو یونیورسٹی کالج برائے اناث کے نام سے موسوم کیا گیا۔ نامپلی زنانہ اسکول کی حیثیت دوبارہ ایک ہائی اسکول کی ہوگئی۔ ۱۹۲۶ء میں میڈیکل اسکول کے بجائے جہاں اسسٹنٹ سرجن اور سب اسسٹنٹ سرجن کی جائیدادوں کے لیے طلبہ کو تیار کیا جاتا تھا۔ ایک میڈیکل کالج قائم کیا گیا ۱۹۲۸ء میں انجنیئرنگ کالج اور ٹیچرز ٹریننگ کالج اور چند سال بعد اگریکلچرل کالج اور وٹرنری کالج کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۹۳۹ء میں اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں بہادر نے آرٹس کالج کی شاندار عمارت کا افتتاح کیا جو ہندو اور مسلم فن تعمیر کے امتزاج کا بہترین نمونہ ہے اور جس کی تعمیر پر ڈیڑھ کروڑ روپے کے مصارف عائد ہوئے۔ ۱۹۴۴ء میں لے اندر اسٹمپل اور اس کے بعد سائنس کالج اور انجنیئرنگ کالج کی عمارتوں کی تعمیر تکمیل کو پہنچی۔ ۱۹۴۴ء میں پرنسپل آرٹس کالج کے ایک پرو وائس چانسلر کی جائیداد منظور ہوئی اور ۱۹۴۷ء میں بجائے پرو وائس چانسلر کے ایک ہمہ وقتی وائس چانسلر کا تقرر عمل میں آیا۔ اس وقت تک صدر المہام تعلیمات بہ حیثیت عہدہ وائس چانسلر بھی ہوتا تھا۔ یونیورسٹی کا آغاز ایک کالج اور ۱۲۹ طلبہ سے ہوا تھا۔ ۱۹۴۷ء تک کالجوں کی تعداد ۲۹، اور طلبہ کی تعداد دس ہزار تک پہنچ گئی تھی۔

عثمانیہ یونیورسٹی کے دوش بدوش نظام کالج بھی ترقی کرتا رہا۔ اس کالج میں طلبہ کی تعداد جو ۱۹۲۱ء میں

۳۰ تھی ۱۹۴۷ء میں ..۷ تک بڑھ گئی۔ اسی دوران مدراس یونیورسٹی کے امتحانات میں نتائج بھی اچھے برآمد ہوتے تھے۔ ۱۹۳۰ء میں سائنس کے لیے ایک علیحدہ عمارت کی تعمیر مکمل ہوئی۔

۱۹۲۱ء میں بی اے آنرز کی جماعتوں کا آغاز ہوا، اور اس کے پندرہ سال بعد مدراس یونیورسٹی کی منظوری سے ایم اے کی تعلیم شروع کی گئی۔ ۱۹۴۷ء میں مدراس یونیورسٹی سے نظام کالج کا الحاق ختم کیا گیا اور کالج میں انگریزی ذریعہ تعلیم کو برقرار رکھتے ہوئے اس کو عثمانیہ یونیورسٹی کا ایک اسوسی ایٹیڈ کالج قرار دیا گیا۔ جامعہ عثمانیہ کا قیام کے ساتھ جامعاتی اور ثانوی تعلیم کے اخراجات میں قابل لحاظ بیشی ہوتی اور پرائمری تعلیم کی توسیع میں رکاوٹ پیدا ہوگئی چنانچہ ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء کے درمیان صرف ۲۹۱ جدید پرائمری اسکول کھولے گئے ۱۹۳۶ء میں جب کہ ثانوی تعلیم پر تقریباً اکتیس لاکھ اور جامعاتی تعلیم پر تقریباً سوا بائیس لاکھ روپے کے اخراجات عائد ہوئے۔ پرائمری تعلیم پر صرف چوبیس لاکھ روپے صرف کیے گئے۔ ۱۹۳۸ء میں پرائمری تعلیم کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے حکومت نے اپنی پالیسی بدل دی اور ۱۹۴۱ء میں پرائمری تعلیم کی توسیع کے لیے ایک پنج سالہ اسکیم کی منظوری دی۔ اس اسکیم کے تحت لوکل فنڈ کے مدارس کو جن میں کم مواجب مدرسین مامور تھے اور جن کی کارکردگی غیر اطمینان بخش تھی سرکاری مدارس کی حیثیت دی گئی اور حکومت نے یہ اعلان کیا کہ آئندہ پرائمری تعلیم کی توسیع اور اصلاح کی ذمہ داری خود سرکار پر رہے گی اور لوکل فنڈ کی آمدنی تعمیر مکان، فراہمی فرنیچر و آلات پر صرف کی جائے گی۔ اور پنج سالہ پروگرام کی بدولت پرائمری مدارس کی تعداد جو ۱۹۳۹ء میں ۴۰۵۲ تھی ۱۹۴۳ء میں ۵۳۷۰ ہوگئی اور طلبہ کی تعداد ۲۹،۸۰۰ سے بڑھ کر ۳۴،۲۵۰ ہوگئی اور اس دوران پرائمری تعلیم کے اخراجات میں تقریباً ۱۷ لاکھ روپے کا اضافہ ہوا۔ پرائمری تعلیم کی اصلاح کے سلسلہ میں جملہ سرکاری یک مدرسی مدارس کو دو مدرسی مدارس میں تبدیل کیا گیا۔ ۱۹۴۴ء میں مابعد جنگ ترقی تعلیم کا ایک ۱۴ سالہ منصوبہ تیار کیا گیا۔ اس کے نفاذ کے بعد پرائمری تعلیم کی ترقی کی رفتار اور بھی زیادہ تیز ہوگئی۔ دو سال کی قلیل مدت میں پرائمری مدارس کی تعداد میں ۵۰۶، اور طلبہ کی تعداد میں تقریباً ۲۸۰۰۰ کی بیشی ہوئی۔ ۱۹۴۶ء میں تین سو دیہات میں اسکول کمیٹیاں ترتیب دی گئیں جن کا کام یہ تھا کہ متعلقہ گاؤں میں طلبہ کی حاضری کی نگرانی کریں اور والدین کو ترغیب دیں کہ پرائمری نصاب کی تکمیل تک اپنے بچوں کو مدرسہ ترک نہ کرنے دیں۔ جون ۱۹۴۷ء میں چھ سال سے گیارہ سال کی عمر کے لڑکیوں کے لیے ابتدائی تعلیم کو لازمی قرار دیا گیا بشمول حیدرآباد چھ شہری رقبوں اور چار منتخب دیہی رقبوں کے لیے البتہ پہلے سال جبری تعلیم کی عمر ۶ تا ۸ سال مقرر کی گئی تھی اور لازمی تعلیم کی اسکیم کے نفاذ کے لیے حکومت نے دس لاکھ روپے کی متوالی رقم منظور کی اور طلبہ کو کتابیں، قلم اور کاپیاں فراہم کرنے کے لیے ۳۵ لاکھ روپیوں کی غیر متوالی رقم منظور کی گئی۔

پنج سالہ توسیع تعلیم کی اسکیم کے تحت لڑکیوں کے لیے تقریباً سو جدید پرائمری اسکول کھولے گئے لیکن اس کے باوجود ۱۹۴۷ء میں مدارس نسواں کی تعداد نو سو سے بھی کم تھی جن میں کم و بیش ۵۰ ہزار طالبات

زیر تعلیم نہیں جب کہ قابل تعلیم لڑکوں کا اوسط فی صد ۳۲ تھا، قابل تعلیم لڑکیوں کا فی صد صرف ۸¼ تھا۔ تعلیم نسواں کی ترقی کی سست رفتار کی دو تین وجوہات تھیں ایک تو والدین کی عدم توجہی، دوسرے معلمات کی کمی اور تیسرے یہ کہ لڑکیوں کے لیے سواری کا بھی انتظام کرنا پڑتا تھا۔

پرائمری تعلیم کی توسیع کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ ثانوی تعلیم کی مانگ بڑھ گئی۔ ثانوی مدارس کی تعداد جو ۱۹۴۳ء میں ۳۵ تھی ۱۹۴۷ء میں ۲۹۰ ہوگئی ان مدارس میں طلبہ کی تعداد میں ۱۴½ سو طلبہ کا اضافہ ہوا جن میں ۹۰ ہائی اسکول اور باقی مڈل اسکول تھے۔ ۱۹۳۹ء میں مجلس تعلیم ثانوی کا قیام عمل میں آیا جس میں سر رشتہ تعلیمات اور جامعہ عثمانیہ کے نمائندوں کے علاوہ چند پبلک نمائندے بھی شریک تھے۔ ۱۹۴۳ء میں امتحانات ایچ ایس ایل سی اور عثمانیہ میٹرک منسوخ کر دیے گئے اور ان کے بجائے اردو اور انگریزی ذریعہ تعلیم کے امیدواروں کے لیے ایک مشترک امتحان ہائیر سکنڈری امتحان کے نام سے لازمی کیا گیا۔

ذریعہ تعلیم کے بارے میں ابتدا سے حکومت کی پالیسی یہی رہی کہ پرائمری تعلیم مادری زبان کے ذریعہ سے دی جائے۔ ۱۹۴۶ء میں حکومت نے احکام جاری کیے کہ آئندہ امدادی اور غیر سرکاری مدارس میں مڈل اور ہائی اسکول کی تعلیم علاوہ اردو کے دیگر زبانوں میں دی جا سکتی ہے البتہ لڑکوں کی حد تک یہ شرط عائد کی گئی کہ اردو بھی لازمی زبان کی حیثیت سے پڑھائی جائے۔ ان لڑکیوں کے لیے بھی اس کا پاس کرنا لازمی کیا گیا جو آئندہ عثمانیہ یونیورسٹی میں شریک ہونا چاہیں۔

ریاست حیدرآباد میں صرف چند صنعتی مدارس تھے۔ صنعتی اور پیشہ ورانہ تعلیم کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے ۱۹۳۸ء میں ٹکنیکل اور ووکیشنل ڈپارٹمنٹ کے نام سے ایک جداگانہ محکمہ قائم کیا اور ٹکنیکل اور پیشہ ورانہ تعلیم کی توسیع کے بارے میں مشورہ دینے کے لیے مسٹر ایبٹ چیف انسپکٹر ٹکنیکل اسکولز انگلینڈ کو مدعو کیا گیا۔ مسٹر ایبٹ نے اپنی رپورٹ میں جو سفارشات پیش کیں ان کی بنا پر ۱۲ مابعد تحتانیہ مدارس صنعت و حرفت ایک بلدۂ حیدرآباد میں اور باقی اضلاع میں نیز مدارس فوقانیہ صنعت و حرفت لڑکوں کے لیے اور دو مابعد وسطانیہ مدارس صنعت و حرفت لڑکیوں کے لیے ایک اسکول آف کامرس ایک اسکول آف فائن آرٹس اور ایک مدرسۂ فنون لطیفہ کا قیام عمل میں آیا۔ یہ بھی طے پایا کہ پربھنی میں ایک مدرسۂ فوقانیہ زرعی قائم کیا جائے۔

۱۹۴۷ء مدارس مذکورہ بالا میں ۲ ہزار لڑکے اور چار سو لڑکیاں زیر تعلیم تھیں۔ پرائمری مدارس کی تعداد جو ۱۹۳۸ء میں ۴۸۵۲ تھی ۱۹۴۲ء میں ۵۳۷۰ ہوگئی اور ان میں طلبہ کی تعداد ۲۹۸۰۰۰ سے بڑھ کر ۳۲۲۵۰۰ ہوگئی اور اسی دوران پرائمری تعلیم کے اخراجات میں تقریباً ستر لاکھ روپے کا اضافہ ہوا۔ ۱۹۴۴ء میں تعلیم کی ترقی کے لیے ایک مابعد جنگ ۱۴ سال کا منصوبہ تیار کیا گیا اس کے نفاذ کے بعد پرائمری تعلیم کی ترقی کی رفتار اور بھی زیادہ تیز ہوگئی۔ دو سال کی قلیل مدت میں پرائمری اسکول کی تعداد میں ۵۰۶، اور طلبہ کی تعداد میں تقریباً ۳۸۰۰۰ کی بیشی ہوئی۔

...
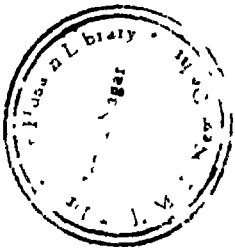
پروفیسر سید علی اکبر

تعلیم اور فرقہ وارانہ میل ملاپ

عصر جدید میں بعض ممالک جیسے روس اور ترکی نے جو ترقی کی ہے اس سے ہندوستان کو ایک بڑا سبق مل سکتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اگر کسی ملک کے باشندے متحد ہو کر اپنی حالت کو درست کرنے کا تہیہ کر لیں تو چند برسوں میں نہیں بلکہ چند ہی سال میں وہ ترقی کے میدان میں کہاں سے کہاں پہنچ سکتے ہیں۔ ہندوستانیوں میں نہ اتفاق ہے اور نہ ایسے ارادے کی قوت ہمارے آپس کے اختلافات اس درجہ بڑھ گئے ہیں کہ بہت سے وطن پرست ہندو اور مسلمان قائدین جنہوں نے ہندوستانیوں کو ایک قوم بنانے کی کوشش میں اپنی عمر کا بیشتر حصہ صرف کیا تھا وہ بھی اب اس سے مایوس ہو چکے ہیں لیکن اگر ہندوستان کی سیاسی گتھی کا حل پاکستان ہی ہو سکتا ہے تو پھر بھی ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت باقی رہے گی، کیونکہ پاکستان کے مجوزہ علاقوں میں جو ہندو بسے ہوئے ہوں وہ کہیں نہیں جا سکتے اور نہ دوسرے علاقہ کے مسلمان پاکستان کو اپنا وطن بنا سکیں گے۔ بہر حال نہ تو ہندو مسلمانوں سے اور نہ مسلمان ہندوؤں سے جدا ہو سکتے ہیں۔ اسی سرزمین میں ہم سب پیدا ہوئے اور اسی میں ہم کو جینا مرنا ہے۔ اس سرزمین کی فلاح و بہبود ہم سب کا مشترکہ مقصد ہونا چاہیے۔ ہمارا ملک اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک کہ ہم ذاتی مفاد یا فرقہ وارانہ اغراض کے مقابلہ میں ملک کے اغراض کو مقدم نہ سمجھنے لگیں اور ملک کی فلاح و بہبود کے لئے ایثار اور قربانی پر آمادہ نہ ہو جائیں۔

بچوں کو تعلیم اس لیے دی جاتی ہے کہ آئندہ چل کر وہ نہ صرف اپنی ذات بلکہ ملک کے لیے بھی مفید ثابت ہوں۔ اس لیے ان کو بہترین قسم کی تربیت دینا ضروری ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کی تاریخ پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قومی اتحاد اور حب الوطنی کی نشو و نما میں ان ممالک کے نظام تعلیم کا بڑا حصہ ہے۔ فرقہ وارانہ علمی اداروں سے یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ قومی اتحاد کی بنیاد اسی وقت مضبوط ہو سکتی ہے جب کہ وہ بچپن میں ڈالی جائے جو بڑا ہی نقش پذیر زمانہ ہوتا ہے۔ اس لیے سب سے بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ ابتدا ہی سے ہندو اور مسلمان بچوں کو ایک ساتھ پڑھنے لکھنے اور کھیلنے کا موقع دیا جائے جس میں خوشگوار تعلقات آپس میں پیدا ہوتے ہیں وہ آگے چل کر بھی قائم رہتے ہیں اور اس ذہنی اور یگانگت سے بہت سی غلط فہمیاں دور ہوتی ہیں۔

فرقہ وارانہ ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے محض اوقات مدرسہ میں ان کا یکجا ہونا کافی نہیں ہے۔ مدرسہ کا ماحول ایسا ہونا چاہیے کہ طلبا میں اسکول اسپرٹ کی نشوونما ہو سکے اور مدرسہ سے وہ انس اور محبت کرنے لگیں۔ اس مقصد کے حاصل کرنے اور طلبہ کو شہریت کی تربیت دینے کے لیے زائد از نصاب مصروفیات مثلاً میدانی کھیل، تعلیمی تفریح اور اسکاوٹنگ کا انتظام کرنے کی ضرورت ہے۔ ان مصروفیات کے ذریعے سے طلبہ کو ایک دوسرے سے دوستی پیدا کرنے مل کر کام کرنے اور کسی مشترک مقصد کے حاصل کرنے کے لیے اجتماعی کوشش کرنے کا موقع ملتا ہے۔ جب کسی مدرسہ کی فٹبال، کرکٹ یا ہاکی ٹیم کسی دوسری ٹیم کے مقابلہ میں کھیلتی ہے تو نہ صرف کھیلنے والے لڑکوں بلکہ کھیل دیکھنے والے طلبہ کے دلوں میں بھی مدرسہ کی محبت موجزن رہتی ہے۔ سب بچوں کی ایک ہی آرزو رہتی ہے اور وہ یہ کہ ان کی ٹیم جیت جائے تاکہ مدرسہ کی شہرت اور نیک نامی میں اضافہ ہو۔ طلبہ میں اس قسم کا جوش پیدا کرنا حب الوطنی کی بنیاد ڈالنا ہے۔ آج کے لڑکے کل شہری بنیں گے۔ تعلیمی تفریح میں طلبہ کو آپس میں ملنے جلنے اور ایک دوسرے سے دوستی پیدا کرنے کا جو موقع ملتا ہے وہ مدرسہ میں انھیں نہیں ملتا۔ زائد از نصاب مصروفیات میں سب سے زیادہ بوائے اسکاوٹنگ کو حاصل ہے۔ بوائے اسکاوٹس کے آپس کے تعلقات برادرانہ ہوتے ہیں اور ہر ایک بوائے اسکاوٹ کو یہ اقرار و اثق کرنا پڑتا ہے کہ وہ ملک کی خدمت کرے گا اور بلالحاظ قوم و ملت دوسروں کی مدد کرے گا۔ جب کسی ٹروپ کے ہندو اور مسلمان اسکاوٹ کیمپ میں یکجا رہ کر اسکاوٹنگ کی تربیت حاصل کرتے ہیں تو وہ آپس میں شیر و شکر بن جاتے ہیں اور ان کو مذہب کے اختلاف کا احساس تک نہیں ہوتا۔ بہر حال مدرسہ میں اتحاد کا سبق اسی وقت کارگر ہو سکتا ہے جب کہ طلبہ کو عمل کا زیادہ سے زیادہ موقع دیا جائے۔

میں نے نہ صرف یورپ بلکہ مصر میں بھی دیکھا ہے کہ ہر مدرسہ کا اپنا یونیفارم ہوتا ہے۔ ہندوستان میں جہاں عام طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے لباس میں فرق ہے۔ طلبہ کے لیے یونیفارم کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے ممالک محروسہ سرکار عالی کے جن مدارس میں یونیفارم رائج کیا گیا ہے وہاں اس سے طلبہ میں اتحاد اور اسکول اسپرٹ پیدا کرنے میں بڑی مدد ملی ہے۔

ایک ہی مدرسہ میں تعلیم پانے کے ساتھ اگر ہندو اور مسلمان لڑکے ایک ہی دارالاقامہ میں رہیں تو ان کو باہم دوست بننے کا اور بھی زیادہ موقع مل سکتا ہے۔ دارالاقامہ کی دوستی مدرسہ کی دوستی سے بھی زیادہ گہری اور پائیدار ہوتی ہے۔ ہندوستان میں بہت کم مدارس کے ساتھ دارالاقامہ ہوتے ہیں اور خانگی کوششوں سے جو دارالاقامے قائم کیے جاتے ہیں وہ عموماً فرقہ واری ہوتے ہیں۔ اگر ہندو اور مسلمان لڑکے ایک ہی دسترخوان پر کھانا نہ کھا سکیں تو کم از کم ان کو ایک ہی جگہ رکھ کر ایک دوسرے کی صحبت سے فائدہ اٹھانے کا موقع دینا چاہیے۔

زبان کے اختلاف کے لحاظ سے برٹش انڈیا اور بعض دیسی ریاستوں میں پرائمری اور ٹدل کی تعلیم کے لیے علحدہ علحدہ مدرسے قائم کیے گئے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ فرقہ واری مدارس بن جاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ابتدائی تعلیم مادری زبان میں دینا نہایت ضروری ہے جس مقام پر دو زبانیں بولی جاتی ہیں وہاں ایک ہی مدرسہ میں متعادل جماعتیں آسانی سے قائم کی جاسکتی ہیں جس سے اخراجات میں بھی کفایت ہوتی ہے اور دو مختلف زبانیں بولنے والے طلبہ کو یکجا ہونے کا موقع بھی حاصل رہتا ہے۔ ممالک محروسہ سرکار عالی میں پرائمری تعلیم کا انتظام اسی طریقہ پر کیا گیا ہے چنانچہ مرہٹواڑی کے مدارس تحتانیہ میں اردو اور مرہٹی۔ تلنگانہ کے مدارس میں اردو اور تلنگی اور کرناٹک کے مدارس میں اردو اور کنڑی کی جماعتیں ساتھ ساتھ قائم کی گئی ہیں۔ لڑکیوں کے لیے منزل ادنیٰ۔ ثانوی کے اختتام یعنی جماعت ہشتم تک ذریعہ تعلیم مادری زبان ہے۔ سرکاری مدارس نسواں وسطانیہ اور فوقانیہ میں پانچویں جماعت سے آٹھویں جماعت تک متعادل جماعتیں اسی طرح قائم کی گئی ہیں جس طرح لڑکوں اور لڑکیوں کے مدارس تحتانیہ میں قائم ہیں۔ لڑکیوں کے لیے جماعت نہم سے ذریعہ تعلیم ثانوی اردو ہے یا انگریزی اور چند سال کے بعد ان مدارس میں بھی جہاں ذریعہ تعلیم انگریزی ہے اردو میں تعلیم دی جایا کرے گی البتہ ایسے مدارس اگر چاہیں تو جامعہ کیمبرج کے امتحانات کے لیے اپنے طلبہ کو تیار کر سکیں گے۔ مختلف فرقوں میں میل ملاپ کے لیے کسی مشترک زبان کا ہونا ضروری ہے۔ ہمارے ملک کی مشترک زبان صرف ہندوستانی ہو سکتی ہے جس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول سے جنم لیا۔ ہندوستانی ممالک محروسہ میں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے اور ان طلبہ کے لیے جن کی مادری زبان تلنگی، مرہٹی یا کنڑی ہے انگریزی کے مقابلہ میں جو ایک بالکل اجنبی زبان ہے بہت زیادہ آسان اور مانوس ہے۔

نصاب تعلیم ایسا ہونا چاہیے کہ ایک طرف تو وہ مختلف فرقوں کی ضروریات کو پورا کرے اور دوسری طرف ان میں اتحاد اور اتفاق پیدا کرے۔ ہندو اور مسلمان طلبا میں یگانگت پیدا کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ ایک دوسرے کی زبان سیکھیں۔ بلجیم میں دو زبانیں رائج ہیں فلیمش اور فرانسیسی لہٰذا ہر مدرسہ میں دونوں زبانوں کی تعلیم دی جاتی ہے۔ جن طلبہ کی مادری زبان فرانسیسی ہے ان کے لیے ذریعہ تعلیم فرانسیسی ہے لیکن فلیمش بطور زبان دوم پڑھنا لازمی ہے اسی طرح جن لڑکوں کی مادری زبان فلیمش ہے وہ فرانسیسی بطور زبان دوم کے پڑھتے ہیں۔ ممالک محروسہ سرکار عالی میں ہندو لڑکوں کو جماعت دوم سے اردو بطور زبان دوم پڑھنا پڑتا ہے۔

چند سال پہلے مسلمان لڑکوں کی زبان دوم فارسی ہوا کرتی تھی لیکن جدید نصاب کے لحاظ سے ان کے لیے جماعت دوم سے مقامی ملکی زبان کا بطور زبان دوم پڑھنا لازمی قرار دیا گیا ہے۔ شہری رقبوں میں صرف ان لڑکوں کو جماعت دوم سے فارسی یا جماعت سوم سے عربی پڑھنے کی اجازت

دی گئی ہے جو آئندہ چل کر ثانوی تعلیم حاصل کرنے کی خواہش مند ہوں اور ثانوی منزل میں فارسی یا عربی اختیاری زبان کے طور پر لینا چاہتے ہوں۔ گزشتہ چار پانچ سال سے سررشتہ تعلیمات مسلسل اس امر کی کوشش کر رہا ہے کہ تلنگانہ میں وہ لڑکے جن کی مادری زبان اردو ہے مقامی ملکی زبان بحیثیت زبان دوم پڑھیں اور اس کوشش میں بڑی حد تک کامیابی بھی ہوئی ہے۔ بعض دیسی ریاستوں اور برٹش انڈیا کے ان حصوں میں جہاں ہندو اور مسلمان الگ الگ زبان بولتے ہیں۔ نہ تو ہندو لڑکوں کو اردو اور نہ مسلمان لڑکوں کو مقامی زبان سیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ ہندو اور مسلمان طلبہ کے علیحدہ مدارس میں تعلیم پانے اور ایک دوسرے کی زبان سے ناواقف رہنے کا نتیجہ یہ ہے کہ ممالک محروسہ سرکار عالی کے مقابلہ میں ان علاقوں کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں زیادہ اجنبیت ہے۔

تعلیمی کتابوں کے انتخاب میں بڑی اہمیت کی ضرورت ہے۔ سررشتہ تعلیمات سرکار عالی خاص طور پر اس بات کی چھان بین کرتا ہے کہ کسی درسی کتاب میں ایک جملہ بھی ایسا نہ ہو جس میں مذہب یا فرقہ یا اس کے پیروؤں پر کسی قسم کا بھی حملہ ہو۔ جو درسی کتابیں سررشتہ کی نگرانی میں تیار کرائی گئی ہیں مثلاً انجمن ترقی اردو کی اردو کتابوں کا سلسلہ ان میں ایسے سبق شامل کیے گئے ہیں جن کے ذریعہ سے ہندو اور مسلمان طلبا کو ایک دوسرے کے کلچر سے واقف کرایا جا سکے۔ سررشتہ تعلیمات نے جماعت سوم سے جماعت ہشتم تک طلبہ کے لیے تاریخ کی جو جدید کتابیں تیار کروائی ہیں وہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کتابوں کی خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

(۱) ان کتابوں کو نہایت دلچسپ بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان کی زبان بھی نہایت سادہ ہے۔
(۲) تاریخی واقعات نہایت صحت سے درج کیے گئے ہیں
(۳) تاریخ ہند کے سماجی اور ثقافتی پہلو کو خاص طور پر اہمیت دی گئی ہے۔
(۴) ہندوؤں کے کلچر اور کارناموں کی عظمت مسلمان طلبہ اور مسلمانوں کے کلچر اور کارناموں کی عظمت ہندو طلبہ کے دلوں میں پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

بہرحال یہ کتابیں ایسی ہیں جن کے پڑھنے سے مختلف فرقوں کے طلبہ میں رواداری اور ملک اور ممالک کی خدمت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

نصاب کی ترتیب سے بھی زیادہ اہم مدرس کے انتخاب کا مسئلہ ہے۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور باہمی رواداری کے نقطہ نظر سے نصاب کتنا ہی متوازن کیوں نہ ہو اگر اس کا پڑھانے والا تعصب سے خالی نہ ہو تو نصاب کا یہ مقصد بالکل فوت ہو جائے گا۔ ہندوستان کے حالات کے لحاظ سے یہاں کے مدرسین کی ذمہ داری دوسرے ممالک کے مدرسین سے بڑھی ہوئی ہے۔ ہندوستان کے مدارس کے لیے فرقہ وارانہ خیالات رکھنے والے مدرس کا وجود خواہ وہ کتنا ہی قابل کیوں نہ ہو کسی طرح مفید نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ مدرس کے انتخاب میں نہایت

احتیاط سے کام لیا جائے۔ پیشۂ مدرسی کے لیے وہی شخص موزوں ہو سکتا ہے جس کو بچوں سے محبت ہو، اور خواہ وہ مسلمان ہو یا ہندو یا عیسائی سب کے ساتھ اس کا برتاؤ مشفقانہ اور مساویانہ ہو۔ اس کا فرض صرف یہی نہیں ہے کہ اپنے ہندو یا مسلمان شاگردوں میں کسی قسم کا امتیاز نہ کرے بلکہ یہ بھی ہے کہ ان میں اتحاد و یکجہتی پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ میں نے بعض مدرسوں میں یہ دیکھا ہے کہ جماعت میں ہندو اور مسلمان لڑکے الگ الگ بیٹھتے ہیں اور مدرسین اس طرف مطلق توجہ نہیں کرتے۔ مدرسین کا طرز عمل اور ان کی تعلیم و تربیت ایسی ہونی چاہیے کہ طلبہ میں فرقہ وارانہ خیالات اور جذبات پیدا ہی نہ ہونے پائیں اور اگر بدقسمتی سے پہلے سے موجود ہوں تو وہ دور ہو جائیں۔ تاریخ ہند کے پڑھانے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ یہ مضمون ایسے مدرسین کے تفویض کیا جائے جن کی نظر وسیع ہو اور جو ان ہستیوں کے حالات جنھوں نے ملک کی خدمت کی ہے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان مثلاً راجہ بکرماجیت اور اکبر اس طرح پیش کر سکیں کہ وہ سب طلبہ بلا لحاظ فرقہ ان ہستیوں پر فخر کریں۔ اسی طرح دینیات اور اخلاقیات کی تعلیم ایسے مدرسین کے تفویض کرنا چاہیے جو تعصب سے بالکل خالی ہوں۔

طلبہ میں رواداری اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے مدرسہ کی کوشش اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہیں جب کہ والدین بھی مدرسہ کا ہاتھ بٹائیں۔ والدین کو چاہیے کہ طلبہ کے سامنے ایسی گفتگو نہ کریں جس سے بچوں میں فرقہ وارانہ خیالات کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہو۔ آج کل کے حالات کے لحاظ سے اس امر کی بھی ضرورت ہے کہ مدرسین اور والدین متحدہ کوشش کر کے طلبہ کو سیاسی اور فرقہ وارانہ تحریکات سے باز رکھیں۔ طلبہ کو فرقہ وارانہ رنگ کے اخبار، رسائل اور کتابیں نہ تو گھر پر اور نہ مدرسہ میں پڑھنے کے لیے دی جائیں۔ سیاسیات کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے لیکن اگر وہ سیاسیات میں عملی حصہ لینے لگیں تو مدرسہ کا ڈسپلن متاثر ہوگا، ان کے خیالات منتشر ہو جائیں گے اور ان کی تعلیم میں سخت خلل واقع ہوگا۔
لہٰذا مدرس کا فرض ہے کہ وہ طلبہ سے قریبی ربط قائم کرے، اور آج کل ان کی ذہنیتوں پر ان کے ماحول اور بیرونی واقعات کا جو اثر پڑ رہا ہے اس کا بغور مطالعہ کر کے ان کے سرپرستوں کے تعاون سے مشفقانہ طور پر صحیح رہنمائی کرے۔ اگر ہم اپنے مدارس کو فرقہ وارانہ وبا سے محفوظ رکھنے میں کامیاب ہو جائیں تو پھر ہم کو اپنے ملک کے مستقبل سے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہوگی۔

پروفیسر سید علی اکبر

سروجنی نائیڈو

یوم آزادی منانے کا ایک مقصد یہ ہے کہ اس موقع پر ہم ان ہستیوں کو یاد کریں جن کی انتھک کوششوں اور قربانیوں کی بدولت ہندوستان کو آزادی نصیب ہوئی اور جو اب ہم میں موجود نہیں ہیں۔ ان ہستیوں میں حیدرآباد کی ایک ممتاز خاتون یعنی سروجنی نائیڈو بھی شامل ہیں۔

سروجنی نائیڈو کے والد ڈاکٹر اگھور ناتھ چٹوپادھیائے بنگالی تھے لیکن ۱۸۷۸ء میں حیدرآباد آنے کے بعد انھوں نے اور ان کی بیوی وردا سندری نے اس شہر کو اپنا وطن بنا لیا تھا اور یہاں کے کلچر کو اپنا لیا تھا۔ ایک سال بعد سروجنی نے جو ان کی سب سے بڑی اولاد تھیں یہیں جنم لیا۔ ان کے بعد تین لڑکیاں اور چار لڑکے پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر اگھور ناتھ کے حیدرآباد میں وارد ہونے کے تھوڑے عرصہ بعد یہاں انگریزی ذریعہ تعلیم کا پہلا کالج حیدرآباد کالج کے نام سے قائم ہوا، اور وہ اس کے پرنسپل مقرر ہوئے، بعد میں جب اس کی جگہ نظام کالج نے لی تو وہاں کیمسٹری کی پروفیسری پر ان کا تبادلہ عمل میں آیا۔

ڈاکٹر اگھور ناتھ ایک بڑے ماہر علم اور بلند پایہ سائنسداں اور نہایت روشن خیال فراخ دل اور وسیع النظر انسان تھے۔ بنگالی اور انگریزی کے علاوہ اردو پر بھی حاوی تھے، نیز سنسکرت، فرانسیسی اور جرمن میں اچھی استعداد رکھتے تھے۔ وہ محض عالم نہیں تھے بلکہ عالم باعمل تھے۔ حیدرآباد میں تعلیم نسواں کی پست حالت کو دیکھ کر ۱۸۹۰ء میں انھوں نے [illegible] گرلز اسکول کی بنا ڈالی جس میں انگریزی، تلنگی، ٹامل اور دوسرے مضامین کے ساتھ اردو کی بھی تعلیم کا انتظام کیا گیا تھا۔ ۸۰ طالبات اس مدرسہ میں شریک تھیں۔ ڈاکٹر اگھور ناتھ کا مکان، جو موجودہ جواہرلال نہرو روڈ پر واقع تھا علاوہ ان کے شاگردوں کے جن میں وہ بہت ہر دلعزیز تھے علم دوست اشخاص جمع ہوتے تھے۔ ان میں ہندو، مسلمان، عیسائی اور پارسی شریک تھے۔ علمی مباحث میں تبادلۂ خیال کرنے کی غرض سے انھوں نے اپنے عزیز دوست علامہ عبدالقیوم کے اشتراک سے ایک انجمن قائم کی جس کا نام "انجمن اخوان الصفا" تھا۔ سروجنی نائیڈو اپنے باپ کے بارے میں یہ کہا کرتی تھیں کہ پورے ہندوستان میں ان سے بڑھ کر عالم اور ہر دلعزیز انسان کم ہوں گے۔ سروجنی نائیڈو کی والدہ ایک مہمان نواز، سلیقہ مند اور نیک خاتون تھیں، انھوں نے چند بنگالی گیت لکھے تھے۔ حیدرآباد آنے کے بعد انگریزی اور اردو بھی سیکھی تھی۔ اردو

اور باپ انگریزی میں گفتگو کرتے تھے۔

سروجنی دیوی کے بچپن ہی سے ڈاکٹر اگھور ناتھ نے ان کی تعلیم کی جانب خاص توجہ کی وہ چاہتے تھے کہ ان کی لڑکی ماہر ریاضی یا ماہر سائنس بنے لیکن سروجنی نائیڈو کا میلان طبع کچھ اور رہا۔ ایک دن وہ الجبرا کا سوال حل کرنے بیٹھیں۔ سوال حل نہیں ہو رہا تھا۔ دفعتاً ان کے دماغ میں چند اشعار آئے اور انھوں نے ایک پوری نظم لکھ ڈالی۔ اس طرح ان کی شاعری کا آغاز ہوا اس وقت ان کی عمر گیارہ سال کی تھی چونکہ اس زمانے میں حیدرآباد میں لڑکیوں کا کوئی اچھا اسکول نہیں تھا اس لیے وہ مدراس بھیج دی گئیں جہاں انھوں نے میٹرک بارہ سال کی عمر میں درجۂ اول کامیاب کیا اس کے بعد وہ گھر پر مطالعہ کرتی اور نظمیں لکھتی رہیں۔ ان کی غیر معمولی ذہانت کا علم ہونے پر نظام وقت میر محبوب علی خاں نے جن کی وفات کے بعد سروجنی نائیڈو نے ان کی ہر دلعزیزی اور فیاضی کے بارے میں "یا محبوب" کے عنوان سے ایک نظم لکھی۔ انگلستان میں اعلیٰ تعلیم پانے کے لیے ان کو وظیفہ عطا کیا ۱۸۹۲ء میں جب کہ وہ سولہ سال کی تھیں وہ انگلستان گئیں وہاں وہ پہلے کنگس کالج لندن اور بعد میں گرٹن کالج کیمبرج میں شریک ہوئیں۔ وہ تین سال انگلستان میں رہیں لیکن انھوں نے کوئی امتحان کامیاب نہیں کیا۔

بجائے امتحان کی تیاری کرنے کے وہ نظمیں لکھتی رہیں یا ایسی کتابوں کا مطالعہ کرتی رہتیں جن کا نصاب سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ جب وہ انگلستان کے مشہور ادیب اڈمنڈ گوس سے ملنے گئیں تو انھوں نے اس نوجوان شاعرہ کی صلاحیتوں کا اندازہ کر کے انھیں یہ مشورہ دیا کہ اپنی نظموں میں مغربی رنگ ترک کر کے ہندوستانی رنگ پیدا کریں۔ اس ملاقات کے بعد سروجنی دیوی ہندوستانی پس منظر کے ساتھ نظمیں لکھنے لگیں۔ اڈمنڈ گوس کے علاوہ ایک اور مشہور ادیب آرتھر سائمنز نے بھی ان کی حوصلہ افزائی کی اور ان کی صلاحیتوں کو جلا دی۔ سروجنی نے کیمبرج میں جو نظمیں لکھیں ان میں ایک نظم گرٹن کالج پر بھی تھی۔ ۱۹۱۲ء میں جب میں کیمبرج یونیورسٹی میں شریک ہونے کے لیے جا رہا تھا مسز نائیڈو نے مجھے ایک تعارفی خط گرٹن کالج کی صدر مس مائیر (۱۹۲۶ء - ۱۸۴۱ء) کے نام دیا اس وقت تک ان کی نظموں کی پہلی کتاب "گولڈن تھریشولڈ" (آستان زریں) شائع ہو چکی تھی۔ بلبل ہند کی شہرت دور دور تک پھیل چکی۔ جب میں مس مائیر سے ملا تو انھوں نے کہا کہ گرٹن کالج کو اس بات پر فخر ہے کہ سروجنی نائیڈو اس کالج کی طالب علم تھیں۔

انگلستان کی مرطوب آب و ہوا کا سروجنی دیوی کی صحت پر برا اثر پڑا۔ وہاں سے وہ سوئزرلینڈ گئیں اور صحت پانے کے بعد اٹلی کی سیر کی ۱۸۹۵ء میں حیدرآباد واپس ہونے کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ان کی شادی ڈاکٹر گوبند راجلو نائیڈو سے ہوئی جو اس وقت حیدرآباد امپیریل سروس ٹروپس کے میڈیکل افسر تھے اور بعد میں فوج باقاعدہ کے چیف میڈیکل افسر اور حضور نظام میر عثمان علی خاں کے ذاتی طبیب مقرر ہوئے اس

زمانے کے سماجی حالات کا لحاظ کرتے ہوئے یہ شادی اپنی آپ نظیر تھی کیوں کر دولہن بنگالی برہمن اور دولہا ایک غیر برہمن تھا لیکن نہ صرف دولہن بلکہ اس کے والدین بھی ذات پات کے امتیاز سے بالاتر تھے۔

۱۹۰۵ء تک مسز نائیڈو چار بچوں کی ماں بن چکی تھیں۔ اس اثناء میں انھوں نے کئی نظمیں لکھیں اور ساتھ ہی تعلیم نسواں اور سماجی بھلائی کے کاموں میں دلچسپی لینے لگیں۔ ۱۹۰۷ء میں محبوبیہ گرلز اسکول کے قیام میں انھوں نے نمایاں حصہ لیا اور ابتداء میں اس کے انتظام کے لیے جو کمیٹی تشکیل دی گئی اس میں لیڈی کیسن، ڈاکٹر لیڈی حیدری، بیگم خدیو جنگ اور مسز سندری کے ساتھ مسز نائیڈو بھی شریک تھیں۔ ان کی دونوں صاحبزادیاں پدمجا اور لیلامنی نے اس اسکول میں تعلیم پائی۔ ۱۹۰۸ء میں موسیٰ ندی کی طغیانی سے متاثر ہونے والوں کی امداد کے لیے مسز نائیڈو نے شاندار خدمات انجام دیں جس کے صلہ میں برطانوی حکومت نے ان کو قیصر ہند کا طلائی تمغہ عطا کیا۔ ۱۹۱۹ء میں سول نافرمانی کی تحریک کے آغاز پر انھوں نے یہ تمغہ واپس کر دیا۔

سروجنی نائیڈو عورتوں کی آزادی اور ہندو مسلم اتحاد کی زبردست علمبردار تھیں۔ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۳ء تک انھوں نے ملک کے مختلف مقامات کا سفر کیا اور اپنی تقریروں میں ان دونوں مسائل کی اہمیت واضح کرتی رہیں۔ ۱۹۰۶ء میں انھوں نے کلکتہ میں آل انڈیا نیشنل کانفرنس میں جو تقریر کی اس پر مسٹر گوکھلے نے ان کو پرجوش مبارکباد دی۔ اکثر قومی مسائل پر وہ مسٹر گوکھلے کی ہم خیال تھیں۔ مسٹر گوکھلے نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی زندگی خداداد شاعرانہ قابلیت، قوت تقریر، فکر اور اپنی شخصیت کی دلکشی سب وطن کی خدمت کے لیے وقف کر دیں۔ یہی اب سروجنی نائیڈو کی زندگی کا مقصد ہو گیا۔

سروجنی نائیڈو کی نظموں کی دوسری کتاب برڈ آف ٹائم (طائر وقت) ۱۹۱۲ء میں شائع ہوئی۔ ۱۹۱۴ء میں وہ انگلستان گئیں۔ ۱۹۱۴ء میں گاندھی جی جب لندن پہونچے تو وہاں ان سے مسز نائیڈو کی پہلی ملاقات ہوئی اس ملاقات کے بعد انھوں گاندھی جی کے دوش بدوش ہندوستان کی آزادی کے لیے کام کرنے کا عزم کر لیا۔

انگلستان میں مسز نائیڈو کے قیام کے زمانہ میں ان کے دوست احباب اور دوسرے قدردانوں نے ان کے اعزاز میں ایک پرتکلف عشائیہ ترتیب دیا۔ اس میں شریک ہونے کی غرض سے میں اور سید محمد اعظم (نواب اعظم جنگ بہادر) کیمبرج سے لندن گئے۔ اس موقع پر مسز نائیڈو کے ہندوستانی پرستاروں کے علاوہ متعدد انگریز شعراء اور ادیب موجود تھے۔ ان کو خراج تحسین پیش کرنے والوں میں ایڈمنڈ گوس، آرتھر سائمز، آئرلینڈ کے مشہور شاعر ئیٹس، سر فریڈرک پولک، سرکرشنا گپتا اور سید حسین شامل تھے۔

اکتوبر ۱۹۱۴ء میں مسز نائیڈو ہندوستان واپس ہوئیں تو مختلف مقامات پر ان کی تقاریر کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا۔ ۱۹۱۷ء میں ان کی نظموں کی تیسری اور آخری کتاب بروکن ونگ (شکستہ پر) منظر عام پر آئی۔ اس کے

بعد شاعری کو ترک کر کے وہ اپنا پورا وقت کانگریس کے لیے وقف کرنے لگیں۔ اس اثنا میں ان کی ملاقات جواہر لال نہرو سے ہوئی۔ اور ان سے جو قریبی ربط پیدا ہو گیا تھا وہ مرتے دم تک قائم رہا۔ ۱۹۲۵ء میں وہ کانگریس کی صدر منتخب ہوئیں۔ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۴۲ء کے درمیان وہ تین دفعہ جیل گئیں۔ ان کی سیاسی زندگی کی تفصیلات سے سب واقف ہیں اس لیے اس کا یہاں ذکر کرنا غیر ضروری ہے۔ ہندو مسلم اتحاد کے لیے وہ ہمیشہ کوشاں رہیں، یورپ، امریکہ، کینیڈا اور افریقہ میں جہاں کہیں انھوں نے سفر کیا انھوں نے ہندوستانی وقار کو بلند کیا۔ ان کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی تھا کہ انھوں نے کانگریس کے مختلف الخیال لوگوں کو ایک مرکز پر لانے کی سعی کی جو بسا اوقات کامیاب رہی۔ مقرر کی حیثیت سے مسز نائیڈو اتنی مشہور ہوئیں جتنی کہ شاعر کی حیثیت ان کی تقاریر سننے کا مجھے حیدرآباد اور حیدرآباد کے باہر کئی دفعہ موقع ملا۔ وہ جب کبھی بولنے کھڑی ہو جاتیں تو سننے والے محو حیرت ہو جاتے۔ انگریزی زبان پر ان کو غیر معمولی عبور تھا، تقریر میں آبشار کی سی روانی تھی اور اس میں شاعرانہ انداز بھی اور بلاغت ایسی تھی کہ تقریر کے ختم ہونے پر سننے والے کو ان کے خیالات کا تجزیہ کرنے میں دشواری پیش آتی تھی۔ ان کا حافظہ بلا کا تھا۔ ان کی سب تقریریں فی البدیہہ ہوتی تھیں یہاں تک کہ یو۔ پی مجلس مقننہ میں انھوں نے بحیثیت گورنر بغیر کسی نوٹس کے فی البدیہہ تقریر کی جس کی مثال مشکل سے کہیں ملے گی۔

مسز نائیڈو کو جمالیات کا بڑا ذوق تھا اور ان کی طبیعت میں بڑی نفاست تھی۔ گاندھی جی کو وہ اپنا گرو سمجھتی تھیں لیکن انھوں نے اپنی انفرادیت کو کبھی مٹنے نہیں دیا۔ وہ اچھی غذا اور اچھے لباس کی شوقین تھیں۔ کھادی کی ساڑی پہنتی تھیں تو اس میں جمالیاتی پہلو نظر آتا تھا۔ ان کے ڈرائنگ روم سے بھی ان کی خوش ذوقی کا پتہ چلتا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں یو۔ پی کی گورنری کا عہدہ سنبھالنے کے تھوڑے ہی دن بعد انھوں نے لکھنؤ کے راج بھون کو ایسا بارونق بنا دیا کہ سب لوگ اس کی تعریف کرتے تھے۔

شادی بیاہ کی فضول رسومات ان کو سخت ناپسند تھیں چنانچہ ۱۹۱۸ء میں جب میں اپنی شادی کی دعوت دینے کے لیے ان کے پاس گیا اور انھیں بتایا کہ میں شادی اس شرط کے ساتھ کر رہا ہوں کہ کوئی رسومات نہیں ہوں گی تو وہ بہت خوش ہوئیں اور عقد کے روز مجھے خود اپنی موٹر میں دولہن کے گھر لے گئیں۔ شادی کے تحفہ کے طور پر انھوں نے مجھے برڈ آف ٹائم کا ایک نسخہ دیا جو اب تک میرے پاس موجود ہے اور اسے میں بہت عزیز رکھتا ہوں۔

مسز نائیڈو بہت مہمان نواز تھیں۔ جب کبھی وہ حیدرآباد آتی تھیں تو ان کے گھر پر اکثر چائے یا رات کے کھانے کی دعوت ہوتی تھی۔ دعوت عموماً بالمشافہ یا ٹیلیفون پر دی جاتی تھی۔ بعض وقت ان کو یاد نہیں رہتا تھا کہ کتنے مہمان آنے والے ہیں اور اندیشہ ہوتا تھا کہ کھانے کا جو انتظام کیا گیا ہے وہ شاید ناکافی ثابت ہو۔ ایسے موقعوں پر

مہمانوں میں ان کے جو بے تکلف دوست ہوتے تھے ان سے وہ ٹیلیفون پر کوئی سالن یا میٹھا لانے کی فرمائش کرتی تھیں۔

داؤد جنگ کا دالچہ ان کو بہت پسند تھا۔ یہ معلوم کر کے جب کبھی گولڈن تھرشہولڈ میں دعوت ہوتی وہ کافی مقدار میں اپنے گھر سے دالچہ روانہ کرتے تھے۔ کھانے کے بعد اکثر موسیقی کی محفل ترتیب دی جاتی تھی اور مسز نائیڈو کی ایک بنگالی خاتون دوست جو نجمی بہت اچھا گاتی تھیں اپنی موسیقی سے مہمانوں کو محظوظ کرتی تھیں۔ بعض وقت جب کسی شاعر کو مدعو کرتی تھیں تو اس کو اپنا کلام سنانے پر مجبور کرتیں مجھے گولڈن تھرشہولڈ میں جوش ملیح آبادی کا کلام سننے کا کئی دفعہ اتفاق ہوا۔ مسز نائیڈو کو اردو شاعری کا خاصا ذوق تھا اور ان کو بیسیوں اشعار یاد تھے کبھی کبھی وہ اپنی تقریروں میں اردو کے ایک دو اشعار بھی سنایا کرتی تھیں۔

حیدرآباد سے مسز نائیڈو کو دلی لگاؤ تھا۔ جب کبھی ان کو اپنی سیاسی سرگرمیوں سے فرصت ملتی تھی تو آرام لینے اور چھٹی منانے حیدرآباد آتی تھیں۔ یہاں کی معروفیات گھریلو اور سماجی قسم کی ہوتی تھیں۔ ان کے مکان پر ملاقاتیوں کے آنے جانے کا سلسلہ بندھا رہتا تھا۔ ان میں مختلف مکاتیب کے سیاسی کارکنوں اور بڑے بڑے عہدہ داروں اور جاگیرداروں سے لے کر غریب طالب علم شامل تھے، وہ ہر ایک سے اس کی دلچسپی کی باتیں کرتی تھیں سیاسی اختلافات کو شخصی تعلقات میں کبھی حائل ہونے دیتی تھیں یہی وجہ ہے کہ انگریز افسروں سے بھی ان کے مراسم دوستانہ تھے اور حضور نظام نواب میر عثمان علی خاں کے پاس بھی ان کا آنا جانا تھا وہ بڑی ہمدرد اور دریا دل تھیں۔ غریب اور نادار طلبا کو مالی امداد دیتی تھیں اور سفارش کر کے بیروزگار نوجوانوں کو ملازمت دلاتی تھیں۔

سروجنی نائیڈو ایک ایسے کلچر کی حامی تھیں جس میں ہندو مسلم اور مغربی کلچر کے بہترین اجزا شامل تھے۔ گو ان کا مسلک برہمو سماج تھا لیکن اسلام، عیسائی اور بدھ مت سے بھی وہ بخوبی واقف تھیں اور مذہبی پیشواؤں کا ان کے دل میں بڑا احترام تھا حقیقت یہ ہے کہ ان کا مذہب انسانیت تھا۔ ۱۹۴۹ء میں سروجنی نائیڈو کے انتقال سے ملک کے ادبی سماجی اور سیاسی حلقوں میں جو خلا پیدا ہوا وہ مدتوں پورا نہیں ہو سکے گا۔ جو لوگ ان کو جانتے تھے وہ ان کی خوبیوں کو کبھی نہیں بھول سکتے اور نہ وہ بیش بہا خدمات بھلائی جا سکتی ہیں جو انھوں نے دیس کے لیے انجام دیں۔

حیدرآباد دکن روضۂ رضواں شدہ است — ساز و برگِ طرب و عیش فراواں شدہ است (غالب)

یہ دنیا کہتی جاتی ہے صداقت کی قسم کھا کر — عروج و شان و شوکت میں ذرا ملک دکن دیکھو (نظام بعد سالع)

مجھ کو لندن کی فضا راس نہ آئی اب تک — حیدرآباد سا دلدار کہاں سے لاؤں (اکبر حیدرآبادی)

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی

حضرت گیسو درازؒ کا نظریۂ توحید

توحید اسلام کی بنیاد ہے اور اس پر ہمارے علماء اور فلاسفہ نے ایسی دیدہ ریزی سے موشگافیاں کی ہیں کہ ان کا سرسری جائزہ لینا بہت دشوار ہے۔ اس کا دامن ایک طرف عقیدے سے بندھا ہے جس کی بنیاد وحی الٰہی اور پیغام رسالت پر ہے جہاں عقل کو صرف ایک خاص حد تک جانے کی اجازت ہے۔ دوسری طرف یہ فلسفے کا ایک نہایت دلچسپ موضوع ہے جس کے اپنے مفروضات و مسائل ہیں اور جہاں عقل الٹے پیروں سے بار بار لوٹتی ہے مگر اس کی دلیلیں خود ہی ایک دوسرے کی نقیض بن جاتی ہیں اور یہ بحث اگرچہ بہت طویل اور پیچیدہ ہو جاتی ہے مگر سمجھ میں کچھ آتا نہیں ہو بقول اکبر۔

جو سمجھ میں آگیا پھر وہ خدا کیونکر ہوا

اس کا تیسرا پہلو وجدانی ہے جسے آپ کشفی یا روحانی بھی کہہ سکتے ہیں۔ کشف کا تعلق نہ فلسفے سے ہے نہ منطق سے۔ لیکن ہمارے صوفیاء میں شیخ اکبر محی الدین ابن العربی، امام الغزالی اور شیخ احمد سرہندی جیسے لوگ ہی ایسے ہیں جنھوں نے اپنے مباحث کی بنیاد اپنے مکشوفات پر رکھی ہے۔ ہمارے لیے دو ہی صورتیں ممکن ہیں یا ان مکشوفات کو جھٹلائیں یا ان کی تصدیق کریں۔ پہلی صورت میں ہم صرف فلسفے سے استنباط کر سکتے ہیں جس سے کلام کو کچھ زیادہ سروکار نہیں دوسری صورت میں بحث کی گنجائش ہی نہیں۔ وجدان سے دلیل لانا قرآن سے بھی ثابت ہے۔ حضرت یوسف کے قصے میں یعقوب علیہ السلام کا قول موجود ہے انی لاجد ریح یوسف لولا ان تفندون (یوسف ۹۴) اور خضر و موسیٰ کے قصے میں حضرت خضر کی ساری دلیلیں کشفی و وجدانی ہیں لہٰذا کشف کو ماننا تو پڑے گا مگر میں یہ فیصلہ کرنے سے قاصر ہوں کہ ہم مختلف حضرات کے مکشوفات پر عمل کس طرح کریں گے اور یہ کیسے ثابت ہوگا کہ ابن عربی کو جو کشف ہوا وہ غلط تھا اور شیخ سرہندی پر جو مکشوف ہوا وہ صحیح تھا۔ آخر میں یہ بحث فلسفے میں ہی محصور ہو جاتی ہے لیکن ہمارے علماء نے اس کو فلسفے کی جال سے نکالنے کے لیے ایک اور کارگر ترکیب استعمال کی اور ان مباحث کے لیے باقاعدہ ایک فن وضع کرلیا جسے "علم الکلام" کہا گیا۔ اس میں اور فلسفے میں یہی فرق ہے کہ وہاں عقیدہ بے دخل کر دیا جاتا ہے اور یہاں وہ نافذ العمل رہتا ہے۔

اسی لیے نظریۂ توحید پر جو بحث ہوگی وہ علم الکلام کے دائرے میں آتی ہے۔ توحید کو امام ابوحنیفہ نے

"الفقہ الاکبر" کہا ہے کیونکہ یہ تمام اسلامی عقائد کی اصل الاصول اور لب لباب ہے۔ کنہ توحید تک رسائی کے تین ممکنہ ذرائع ہیں۔ ایک علم و نظر کا وسیلہ، دوسرا مشاہدہ و عرفان کا ذریعہ ہے۔ مشاہدہ بھی دو طرح کا ہوتا ہے ایک وہ جو دلائلِ عقلیہ و نقلیہ پر مبنی ہو، دوسرا یعنی درجہ کشف و وجدان کا ہے۔ اسلام کی طرح توحید کا بھی ایک ظاہر ہے اور ایک اس کا باطن ہے۔ ظاہر پر ہم گفتگو کر سکتے ہیں اور حکم لگا سکتے ہیں لیکن اس کے باطن تک رسائی اہلِ دل اور اولیاء اللہ ہی کو ہوتی ہے۔ بعض پر توحید کی حقیقت اس طرح منکشف ہو جاتی ہے کہ پھر وہ اس موضوع پر گفتگو ہی نہیں کرتے۔

اسرارِ ازل را نہ تو دانی و نہ من		ایں حرفِ معمّا نہ تو خوانی و نہ من
ہست از پسِ پردہ گفتگوئے من و تو		چوں پردہ بیفتد نہ تو مانی و نہ من

توحید یہ ہے کہ اللہ ایک ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس کی ایک احدیت ہے جس کے اعتبار سے وہی موجودِ مطلق ہے، وہی واجب الوجود ہے وہی موجودِ حقیقی ہے، کائنات کا وجود وہمی و اعتباری ہے بقول میر:

یہ توہّم کا کارخانہ ہے
یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

اس لحاظ سے موجودِ حقیقی کی ذات اور صفات کے سوا سب ذوات و صفات ہیچ ہیں "کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ وَّیَبْقٰی وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ"۔

خدا کی ذات اور صفات پر بحث کا دروازہ عیسائی علماء اور فلسفیوں نے کھولا۔ اس کے زیرِ اثر ایک وہ گروہ پیدا ہوا جو مشبّہہ اور مجسّمہ کہلاتا ہے، یعنی خدا کے جسم اور اس کی شکل و شبیہ کا قائل ہے اس لیے کہ قرآن میں ایسی آیات موجود ہیں جن سے خدا کی جسمانیت ثابت ہو سکتی ہے مثلاً "ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ" یا "وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰی" یا "یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ" وغیرہ۔

دوسرا فرقہ وہ ہوا جو صفات کا منکر ہو گیا اور توحیدِ خالص کی بنیاد "ذاتِ بحت" کو قرار دینے لگا۔ یہ معطّلہ کہلاتے ہیں یعنی خدا کو صفات سے معطّل (خالی) کرنے والے ان میں معتزلہ پیش پیش تھے۔ اسی انکارِ صفات کی وجہ سے وہ رویتِ حق کے بھی منکر ہو گئے کیونکہ از روئے منطق رویت کے واسطے جسم، جہت اور لون (رنگ) ہونا ضروری ہے۔ حالانکہ قرآن میں "وُجُوْهٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰی رَبِّهَا نَاظِرَةٌ" موجود ہے لیکن ان کا استدلال "لَنْ تَرَانِیْ" سے رہا۔ شیعہ فرقے نے بھی یہی عقیدہ اپنا لیا اور ان کا کہنا ہے کہ ان آنکھوں سے ہم خدا کو نہیں دیکھ سکتے۔ تیسرا فرقہ جو راہِ اعتدال پر گامزن ہوا اسے اصطلاح میں صفاتیہ بھی کہتے ہیں اور یہ جمہور مسلمین کا مسلک رہا ہے، اس کے پہلے علمبردار ابوالحسن الاشعری تھے۔ بعد میں ہمارے علماء نے توحید کے بارہ بنیادی اصول وضع کیے جن کے گرد سارے [illegible]

۱۔ یہ عقیدہ کہ اجسام حادث ہیں
۲۔ اس عالم کا ایک ہی خالق ہے اور وہ اللہ ہے
۳۔ اللہ ایک ہے اور اس کا کوئی شریک اُلوہیت نہیں
۴۔ اس کا کسی طرح کوئی مثل و مشابہ ہو نہیں
۵۔ اُس کی رویت ممکن ہے / یا نہیں
۶۔ اُس کی صفات ذات سے خارج ہیں / یا نہیں
۷۔ انسان کے افعال کا خالق کون ہے ؟ (عقیدہ جبر و اختیار)
۸۔ اللہ ظلم و شر کا وجود چاہتا ہے / یا نہیں
۹۔ گناہِ کبیرہ کے مرتکب کا ایمان باقی رہتا ہے / یا نہیں
۱۰۔ نبوّۃ کے عمومی دلائل
۱۱۔ رسالتِ محمدیہ کے خصوصی دلائل
۱۲۔ مسئلہ امامت

یہ بنیادی مباحث ہیں جن پر سارے علم الکلام کی عمارت کھڑی ہے اور انھیں مباحث کے نتیجے میں بہت سے فرقے پیدا ہوئے جن میں چھ فرقے زیادہ نمایاں ہیں۔

۱۔ اہل السنّۃ والجماعۃ ۔ ۲۔ مُشبّہ ۔ ۳۔ مُعتزلہ ۔ ۴۔ مُرجئہ ۔ ۵۔ شیعہ ۔ ۶۔ خوارج ۔

اہل السنّۃ میں ابوبکر باقلانی نے عقیدۂ توحید وغیرہ کے لیے عقلی مقدمات اور دلائل وضع کیے مگر اصول اپنی دلیلوں کو منوانے پر اتنا اصرار کیا کہ وہ فلسفہ عقیدے کا لازمی جزو بننے لگا ۔ باقلانی کا کہنا تھا کہ اگر دلیل کمزور یا باطل ہے تو مدلول بھی کمزور اور باطل مانا جائے گا ۔ اس لیے عقیدے کی مضبوط دلیل فراہم کرنا بھی ضروری ہے اور اس پر اصرار کرنا بھی۔ لیکن اس سخت گیری کا نتیجہ یہ ہوا کہ عقیدہ فلسفے کے چنگل میں گرفتار ہو گیا اور فلسفے کا تو یہ ہے کہ وہ پہلے دلیل ڈھونڈتا ہے پھر اس کو پرکھتا ہے پھر یقین کرتا ہے ۔

امام غزالی کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے پہلے عقیدے کو قائم کیا اور پھر اس کے لیے فلسفیانہ دلیلیں تلاش کیں مگر اسے استدلال کی قید سے آزاد بھی رکھا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ہندوستانی فلسفیانہ فکر میں توحید کا کیا تصوّر ہے تاکہ اس الزام کی حقیقت سامنے آسکے کہ وحدت الوجودی صوفیا ویدانت سے متاثر ہیں۔ اپنشد کہتے ہیں کہ واجب الوجود ایک حقیقتِ مطلقہ و حقیقت اعلیٰ ہے اس کا کوئی شریک نہیں. کوئی اس کے سوا "موجود" نہیں تمام اشیاء کا وجود اعتباری ہے" ایکم ۔ برہم دوتیوناستے۔ لاموجود الا اللہ ولامؤثر فی الوجود الاّ اللہ ۔

اپنشدوں میں خدا کو واجب الوجود، کائنات کو ممکن الوجود اور صفاتِ خداوندی کو بالفعل ظاہر کہا گیا ہے۔ شیخ اکبر انھیں تصورات کو صورِ علمیّہ و اعیانِ ثابتہ کا نام دیتے ہیں۔ حضرت مجدّد الف ثانی کا کہنا ہے کہ وجود ایک نہیں ہے، دیکھنے میں ایک معلوم ہوتا ہے۔ یہی وحدت شہود ہے۔ ان کے قول کے مطابق خدا نے کائنات کو مرتبۂ وہم میں تخلیق کیا جو ہمیں موجود نظر آتی ہے مگر درحقیقت موہوم ہے یعنی اس کی نمود تو ہے وجود نہیں۔ خدا اپنی ذات سے غیر متغیّر ہے "الآن کما کان" کا یہی مفہوم ہے۔ مگر وہ اپنی صفات میں متحرک ہے جیسا کہ "کلّ یوم ھو فی شان" سے ملتا ہے۔ وحدانیت کی شرح شنکراچاریہ نے کی اور وحدت الوجود کا فلسفہ شیخ اکبر نے پیش کیا، مگر اس کا کوئی قرینہ موجود نہیں ہے کہ شنکراچاریہ کی تصانیف شیخ کے ملاحظہ سے گزری ہوں۔ بظاہر دونوں کو غور و فکر نے ایک جیسے نتائج تک پہنچایا عربی، فارسی اور اردو میں شیخ اکبر کی متعدد شرحیں لکھی گئیں اور ان کا ایسا متضاد ردِ عمل ہوا کہ ان کے معتقدین نے اقوالِ شیخ کو قرآن و حدیث کے بعد سب سے زیادہ مستند قرار دیا اور منکرین نے ان کی تکفیر سے بھی دریغ نہیں کیا دراصل یہ مباحث عوام میں لاکر بحث کرنے کے لیے ہی نہیں اور ان کا بڑا حصہ کشفی امور پر منحصر تھا۔ شیخ کے عقائد عام طور پر وہی ہیں جن کی تعلیم ہمیں قرآن سے ملتی ہے اور جن کی تفسیر احادیث میں آئی ہے لیکن جہاں انھوں نے اپنے مکشوفات کا بیان کیا ہے ان کی رد و کد کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں۔ یہ مکشوفات حضرت مجدّد الف ثانی کی تحریروں میں بھی بکثرت بیان ہوئے ہیں اور ان میں سے بعض پر علمائے امّت نے شبہات بھی وارد کیے ہیں

شیخ اکبر لکھتے ہیں کہ خدا ایک ہے، وہ اپنی الوہیت میں لاثانی ہے۔ منزّہ ہے۔ خدا یہ موجود ہے۔ وہ کسی کا محتاج نہیں اور سب اس کے محتاج ہیں اس لیے تمام کائنات اسی سے موجود ہے اور حقیقی وجود کی صفت سے صرف وہی موصوف ہے۔ اس کی مثال یوں ہے کہ جھومر، ٹیکا، ہنسلی، پازیب، کنگن طرح طرح کے اور نت نئی شکلوں کے زیورات ہیں مگر ان کا اپنا وجود کچھ بھی نہیں موہوم ہے۔ اصل وجود تو سونے کا ہے۔ جب سارے زیور کٹھالی میں ڈال کر گلا دیئے جائیں گے تو سب کی شکلیں فنا ہو جائیں گی، صرف سونا باقی رہ جائے گا۔ "کلّ من علیھا فانٍ و یبقیٰ وجہ ربّک ذوالجلال والاکرام" کا بھی مفہوم ہے

اس کا جسم نہیں جہت بھی نہیں۔ کوئی زمانہ اسے محدود کر سکتا ہے نہ کسی مکان میں وہ سما سکتا ہے مگر زمان، مکان، دنیا، آخرت سب اسی سے قائم ہیں۔ وہ اپنی صفات سے بھی قدیم ہے وہ اشیاء کو ان کے وجود سے پہلے بھی جانتا تھا۔ سب کچھ اس کے علم کے احاطے میں ہے اور اس کے ارادے کے متعلق ہے اور اس کا ارادہ ازلی ہے۔ عالم بالذات معدوم اور غیر موجود فی الخارج ہے مگر ذات خداوندی میں "موجود ذہنی" کے طور پر ثابت ہے۔

شیخ اکبرؒ فرماتے ہیں کہ میں اللہ کو اس کے فرشتوں کو تمام مخلوق کو اور تم کو اپنے نفس پر گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں توحید الٰہی کا قائل ہوں اور اس پر عقیدہ رکھتا ہوں۔ اسی طرح میں محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے رکرہ

خلائق ہونے پر ایمان رکھتا ہوں اور جو کچھ احکام رسالت مآب لائے ہیں ان سب پر ایمان لاتا ہوں چاہے ان احکام کا مجھے علم ہو یا نہ ہو۔

شیخ اکبر کے اعمال اور عقائد کے بارے میں تو اتنا ہی جاننا ہمارے لیے کافی ہے۔ لیکن چند باتیں ان کے فلسفے کے بارے میں یہاں بیان کردینا ضروری ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "وجود بالذات" یعنی وجود حقیقی اللہ کا ہے ماسوا کا وجود بالعرض ہے۔ اعیان ثابتہ اور حقائق کونیہ پر اسماء و صفات الٰہی کی تجلی ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ علم الٰہی اور قدرت الٰہی کے لیے ہی ممکنات کا وجود ہوتا ہے اس لیے انسان و حقائق کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ ایسے کیوں ہیں؟ تمام کائنات کی بنا جبر پر ہے اسی الزام پر شیخ فرماتے ہیں کہ وجود علمی کو ثبوت اور وجود خارجی کو وجود کہتے ہیں لہذا اعیان ثابتہ جو علم میں ہیں غیر موجود فی الخارج اور معدوم ہیں۔

شیخ اکبر کا انتقال ۶۳۸ھ میں ہوا اور اس سے دو سال قبل ۶۳۶ھ میں فتوحات مکیہ مکمل ہوئی تھی لیکن آٹھویں صدی ہجری کے آغاز تک شیخ کی تصانیف ہندوستان کے صوفیاء کے حلقوں میں عام نہیں ہوئی تھیں۔ حضرت نظام الدین اولیاء کے ملفوظات کا جو مستند ذخیرہ ہمارے پاس ہے اس میں کہیں شیخ اکبر کا ذکر نہیں اگرچہ ... لکھا ہے کہ وہ ... فصوص الحکم کو اپنے زیر مطالعہ رکھتے تھے۔ حضرت نظام الدین اولیاء کے زمانے میں شیخ اکبر کے افکار کا ... پہنچے تھے لیکن ان کے انتقال کے بعد فیروز شاہ تغلق کے عہد میں شیخ کی تصانیف علمی حلقوں میں بحث و نظر کا موضوع بن چکی تھیں اور ان کی ... اور ... کا آغاز بھی ہو گیا تھا جس کا اثر ... میں مسعود بک کی زندگی اور ان کے کلام ... میں ملتا ہے۔ ان کی تصنیف "مرآۃ العارفین" کا موضوع بھی وحدت الوجود ہے اور کتاب کے مطالعے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شیخ اکبر کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ حضرت مسعود بک اسی سلسلۂ چشتیہ نظامیہ میں بیعت تھے۔ صاحب گلزار ابرار نے ان کو حضرت چراغ دہلیؒ سے مرید بتایا ہے اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی انہیں شیخ رکن الدین ... کا مرید بتاتے ہیں جو شیخ شہاب الدین امام کے بیٹے تھے موخر الذکر حضرت نظام الدین اولیاء کی خانقاہ میں امامت کرتے تھے اور ... ان کے انتقال کے بعد بھی خانقاہ کے احاطے میں مدفون ہوئے تھے

آٹھویں صدی ہجری کے نصف آخر میں شیخ اکبر کی تصانیف کی ... جس میں سید علی ہمدانی کی شرح فصوص الحکم ممکن ہے سب سے پہلی ہو۔ لیکن فتوحات اور فصوص کی مخالفت علماء و شرع کے طبقہ میں بھی ... سے شروع ہوگئی تھی اور اس کا سبب یہ تھا کہ ہمارے تمام مشائخ ... اصول و عقائد کی تعلیم حاصل کرتے تھے اور علوم دینیہ میں فقہ کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے تھے یہی وجہ ہے کہ ان کے اعمال احکام شرعیہ سے سرمو متجاوز نظر نہیں آتے وہ طریقت کو شریعت کا تابع سمجھتے تھے اسی لیے حضرت چراغ دہلیؒ نے ایک موقع پر صاف کہہ دیا "مسائل پیر حجت نمی شود، دلیل از کتاب و سنت می باید"

وحدت الوجود کے فلسفیانہ مباحث عام آدمی کے سمجھنے کے لیے کبھی بھی ... تھے اس زمانے کے علماء بھی ... کی

مخالفت میں فلسفے سے بدگمان ہو گئے تھے اور وہ ان مباحث کو بنیادی اسلامی عقائد کا نقیض سمجھتے تھے اس لیے وحدت الوجود کی بحثوں میں انھیں شرک کا احتمال نظر آتا تھا۔ تاریخ فیروز شاہی جیسی کتابوں سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ بعض دنیادار متصوفین نے عقائد کا فتنہ بھی پیدا کر دیا تھا۔ شاید اسی لیے مسعود بک کے قتل کا فتویٰ دیا گیا اور ان کا وہی انجام ہوا جو منصور حلاج، عین القضاۃ ہمدانی اور بعد میں سرمد کا ہوا تھا۔

تیمور کے حملے سے پہلے کی دلی میں جب حضرت گیسو دراز وہاں تشریف فرما تھے ان موضوعات پر خوب بحثیں ہو رہی تھیں "جوامع الکلام" سے پہلے کے حضرت گیسو دراز کے ملفوظات دہلی میں شیخ علاء الدین گوالیری نے "انوار المجالس" کے نام سے جمع کیے تھے یہ بیش بہا کتاب اب نایاب ہے مگر اس کے متفرق حصے بعض دوسری کتابوں میں مل جاتے ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت کی ان مجلسوں میں سید اشرف جہانگیر سمنانی بھی شریک ہوتے تھے وہ حضرت علاء الدولہ سمنانی کے شاگرد اور خلیفہ ہیں اور حضرت علاء الدولہ شیخ اکبر کے سخت مخالف ہیں۔ غالباً یہی سبب ہے کہ حضرت گیسو دراز بھی شیخ اکبر کے بہت مخالف ہیں۔

اور ایک موقع پر تو عقیدہ وحدت الوجود کو "شرک" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اپنی تصنیف "اسمار الاسرار" کی ۸ ویں سمر کو انھوں نے عقائد شیخ اکبر سے بحث کرنے کے لیے مخصوص کیا ہے۔ وہ اپنے نظریۂ توحید کو ان اشعار میں بیان فرماتے ہیں

آنجا نہ اسم باشد نے رسم نے صفت	نے فرش نے تری نہ اشارت نہ ترجمان
جملہ یکے بود نبود از دوئی اثر	توحید بے مشارکت این حاشو دمیاں
این قطرۂ زقلزم توحید بیش نیست	تا بہ تعین حقیقت توحید در میان

ان اشعار میں تو کوئی بات شیخ اکبر کے عقیدے سے متغائر نہیں ہے لیکن حضرت فرماتے ہیں کہ اہل تصوف کو جو توحید کا ادراک ہوتا ہے وہ اگرچہ عالم باطن سے ہوتا ہے مگر شریعت کے موافق ہوتا ہے اور علمائے ظاہر اس میں نامشروع باتوں کی آمیزش کر دیتے ہیں۔ حضرت گیسو دراز فرماتے ہیں "شیخ محی الدین اعرابی (کذا) و چند طائفہ متابعان او می گویند کہ ورائے این وجودات وجود دیگر نیست . . . . استغفر اللہ، لاحول و لاقوۃ الا باللہ این سخن در ایمان شرک است۔ محی الدین عالم غیب گذاشتہ است و عالم شاہد راضی شدہ است۔ او قائل برین صور و اشکال است کہ تمثل و تشکل را مقصود داند، بر این ختم می کند، از ورا و الورا دستورے ندارد۔" حضرت گیسو دراز نے یہ بھی فرمایا کہ اگر شیخ میرے زمانے میں ہوتے تو میں انھیں ان شواہد سے باز رکھتا، اور ان سے زیادہ بلند مقام پر لے جاتا۔" ایمان بہ تجدید آوردے مسلمان از سر شدے۔" یہ صور و اشکال کی بحث خالص فلسفیانہ موضوع ہے میں اس پر کوئی محاکمہ نہیں کر سکتا لیکن ایک بات یہی طور پر سمجھ میں آتی ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی نے اپنے نظریۂ وحدت الشہود میں جو مباحث پیش کیے ہیں ان کی ابتدائی شکل میں حضرت گیسو دراز کے ان فرمودات میں مل جاتی ہے۔ یہ دراصل وہی "فلسفۂ خودی" ہے جسے اقبال نے رومی سے ... طور پر اس کی تعبیر و تشریح کی۔ حضرت گیسو دراز کے نظریۂ توحید ہی نہیں سلوک و معرفت کی بنیاد بھی "عشق" پر ہے

اس لیے وہ یہ فرماتے ہیں کہ جب تک عاشق ہے دوئی باقی ہے، عاشق و معشوق کا وصال ایسا ہوگا جیسے ہم گوندلگا کر دو کاغذوں کو باہم پیوست کردیں جو دیکھنے میں ایک ہوجائیں گے مگر عقلی طور پر ان میں دوئی باقی رہے گی۔

وہ فرماتے ہیں کہ شیخ محی الدین صاحبِ فصوص لکھتے ہیں کہ منصور حلاج کو تجلّی ذاتی ہوئی تھی اگر تجلّی ذات ہوتی تو وہ ہرگز "انا الحق" نہ کہتا کیونکہ جو تجلّی ذات میں محو ہوگیا اسے کیا خبر ہوسکتی ہے کہ میں کون ہوں کیا ہوں۔ تجلّی ذات میں کلام نہیں بلکہ تجلّیِ صفات میں کلام ہے۔ کیونکہ تجلّی ذات مقام فردانیت ہے جو اس مقام کو پالے گا وہ اپنی خودی کو چھوڑ دے گا، اور دونوں ایک ہوجائیں گے اور اس سکرِ وصال سے باہر نہیں آئیں گے، یہ احقِ خاص کا حال ہے اور یہ تجلّی ذات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مخصوص تھی دوسروں کے لیے نہیں ہے۔

بہرحال یہ صرف چند مباحث کا ایک سرسری جائزہ ہے اور اس سے ان کا ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ فلسفہ وحدت شہود اور فلسفہ خودی کی بنیاد ہم حضرت گیسو دراز کی تحریروں میں تلاش کرسکتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد علی اثر

قدیم دکنی کے غیر مطبوعہ مرثیے

۱۔ ظہور ابن ظہوری

ظہور عادل شاہی دور کا ایک ممتاز شاعر ہے۔ اس کے والد نورالدین ظہوری ترشیزی فارسی کے مشہور شاعر تھے جنھوں نے ۹۸۵ھ میں ابراہیم عادل شاہ ثانی کے دربار میں رسائی حاصل کی تھی اور "نورس" کا دیباچہ لکھا تھا جو "سہ نثر ظہوری" کے نام سے مشہور ہے۔ ظہور نے بیجاپور کی ادبی فضا میں پرورش پائی اور فارسی کے دیگر شعرا، سالک یزدی، حکیم آتشی شیرازی، محمد زمانی اور مقیمی استرآبادی کی طرح اردو میں بھی دادِ سخن دی ہے۔ ظہور نے محمد عادل شاہ (۱۶۲۶ء - ۱۶۵۶ء) کے حکم سے ۱۰۶۹ھ میں "محمد نامہ" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جس کا ایک قلمی نسخہ جناب اکبر صدیقی امروہی کی ملکیت ہے[1]۔ ظہور کی دکنی غزلوں کے نمونے "دکنی ادب کی تاریخ"[2] اور "دکن میں اردو"[3] میں موجود ہیں۔

ذیل میں ظہور کا ایک غیر مطبوعہ مرثیہ پیش کیا جاتا ہے۔ یہ مرثیہ راقم الحروف کو کتب خانہ سالار جنگ کی ایک قلمی بیاض[4] سے دستیاب ہوا ہے۔ ظہور چونکہ فارسی کا بھی ایک خوش گو شاعر تھا اس لیے اس کے دکنی کلام میں بھی فارسی کے اثرات نمایاں ہیں چنانچہ اس مرثیے میں بھی فارسی تراکیب اور اضافتیں ملتی ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ع ۱۔ یوں داغِ تازہ برجگرِ مصطفیٰ ہوا

۲۔ ماتم زِ عرش تو عیشِ مزا ہوا

۳۔ جبرئیل کا سینہ ہوا حسرت سرا ہوا

---

۱ بحوالہ ڈاکٹر جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اردو (جلد اول) لاہور ایڈیشن صفحہ ۲۷۵

۲ ڈاکٹر محی الدین قادری زور۔ دکنی ادب کی تاریخ صفحہ ۳۷

۳ نصیر الدین ہاشمی۔ دکن میں اردو صفحہ ۲۴۴

۴ بیاض مراثی نمبر ۴۲۔ کتب خانہ سالار جنگ حیدرآباد

سے پہلے ان کا کوئی کلام دستیاب ہوا ہے۔ کتب خانہ سالار جنگ کے ایک قدیم مخطوطے میں طالعی کا ایک مرثیہ دستیاب ہوا ہے۔[۳۶] اس بیاض میں دکنی کے حسب ذیل شعرا کے مرثیے بھی شامل ہیں
۱۔ غواصی۔ ۲۔ ملک خوشنود۔ ۳۔ علی عادل شاہی۔ ۴۔ فائز۔ ۵۔ احمد۔ ۶۔ عشقی۔ ۷۔ حیدری
۸۔ حمزہ۔ ۹۔ عابد۔ ۱۰۔ نصیرتی۔ ۱۱۔ جلالی۔ ۱۲۔ عاصی۔ ۱۳۔ علی رضا۔ ۱۴۔ صادق،
۱۵۔ حسن شوقی۔ ۱۶۔ شفیع وغیرہ۔

مرثیہ

لیایا[۳۷] ہے چاند غم کی خبر ہائے ہائے ہائے | انم گیا جہاں میں گذر ہائے ہائے
ٹھارا[۳۸] کیا دلاں میں جتا غم حسین کا | نیں ذکر کچ زباں کوں اگر ہائے ہائے
رو رو اسی مراق سوں بیتاب ہو رہے | ماہی و مرغ و حش و بشر ہائے ہائے
جس[۳۹] کے جیو تیں گے رو رقامت کو عاصیاں | ویسے کوں یوں نہ بے ضرر ہائے ہائے
دنیا میں دے کے[۴۰] حور و جا سرور حسین | را کھے[۴۱] تھے عاقبت بہ نظر ہائے ہائے

پُرسوز مرثیہ یو پڑے طالعی سدا
رو رو نین[۴۲] سوں خون جگر ہائے ہائے

---

[۳۶] بیاض مراثی کتب خانہ سالار جنگ بیاض نمبر ۷۔ [۳۷] لایا۔ [۳۸] ٹھارا کرنا، قیام کرنا
[۳۹] جس کی بدولت۔ [۴۰] دیکھ کر [۴۱] رکھے ہوئے تھے [۴۲] آنکھیں۔

۴۔ محمد زماں فائز

فائز قطب شاہی دور کا ایک بلند پایہ شاعر تھا۔ وہ ابوالحسن تانا شاہ کے عہد حکومت (۱۶۷۲ء ۱۶۸۷ء) میں بقید حیات تھا فائز نے ۱۰۹۴ھ/۱۶۸۲ء میں "رضواں شاہ و روح افزا" کے نام سے ایک مثنوی لکھی تھی جو دبستان دکن کی آخری بلند پایہ مثنوی سمجھی جاتی ہے۔ اس مثنوی کو مولوی سید محمد صاحب نے مرتب کر کے مجلس اشاعت دکنی مخطوطات کی جانب سے ۱۹۵۶ء میں شائع کیا ہے۔ رضوان شاہ و روح افزا کے مقدمے میں سید محمد صاحب تحریر کرتے ہیں۔

"شاعر (فائز) کے حالات زندگی کے بارے میں ہمیں بہت کچھ تلاش کے باوجود کوئی اطلاع نہیں ملی۔ مثنوی رضواں شاہ و روح افزا ہی اس کی واحد یادگار ہے۔ اس میں بھی اس نے اپنے حالات کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا۔" [۱]

---

[۱] سید محمد۔ مثنوی رضوان شاہ و روح افزا۔ صفحہ ۳۔

ڈاکٹر چراغ علی کو فائز کا ایک نامکمل مرثیہ دستیاب ہوا تھا، جس کے دو شعر انھوں نے اپنی کتاب "اردو مرثیے کا ارتقا، بیجاپور اور گولکنڈہ میں" میں نقل کیے ہیں[۱]۔ فائز کے متعلق وہ لکھتے ہیں۔

"فائز کے نام کا پتہ نہیں چلا۔ اور نہ اس کے حالات معلوم ہوسکے۔"

راقم الحروف کو کتب خانہ سالار جنگ کی ایک قلمی بیاض[۲] میں فائز کے ایک مرثیہ کا پتہ چلا ہے جو ۱۲ اشعار پر مشتمل ہے اور غزل کی ہیئت میں ہے۔ اس مرثیے کے اوپر سرخ روشنائی سے درج ذیل عبارت لکھی ہوئی ہے۔

"مرثیہ حضرت امام حسینؑ من کلام فائق عرف محمد زماں"

جس سے پتہ چلتا ہے کہ محمد زماں، فائز کا نام یا عرفیت ہے۔ فائز تخلص اس کی مثنوی "رضوان شاہ و روح افزا" میں بھی بالکل اسی طرح "فائق" لکھا ہوا ہے[۳] جس طرح زیر نظر بیاض کی سرخی اور مقطع میں درج ہے۔

مرثیہ

سوز[۴] رفعت کے فلک کا یا حسین　　نور احمد کے جبیں[۵] کا یا حسین

کیوں کیا عالم لوں بیکس کر دو جا　　شاہ لولاک کے تئیں[۶] کا یا حسین

اس دکھ دش[۷] رہا کا دل تے جاں جائے　　مال کیا تولوں حسن کا یا حسین

لیلی اس دو جاگ[۸] سوں جیوں ہوئی　　چھوڑ دیا مال و دھن[۹] کا یا حسین

مار غم دے غرق بیر رو ہے ملک　　شور غم سن مرد و زن کا یا حسین

دل ہو ٹوکڑا[۱۱] اس چھتیں[۱۲] کلیاں[۱۳] ہے بہار　　سر گیا[۱۰] پانی بین کا یا حسین

گل کے لعو ہوئیں نے نکلا سب　　نہیں اب سینے میں من کا یا حسین

سرو میں اس درد تے نکلا ہے آہ　　چھوڑ کر سایہ چمن کا یا حسین

دیکھ سیسا عبد لبیوں کا چھوٹیا[۱۴]　　چاک گل کے پیرہن کا یا حسین

اسناں سوں جیم کے اس دکھ نے بھرا　　ن ہو گیس جیم کا یا حسین

دیکھنے بن تیر میں مُدے اچھو[۱۵]　　کر دو مال اپنے لفن کا یا حسین

آسماں کوں حال[۱۶] فائق کا ستم کیا

سوز فائق کے سخن کا یا حسین

---

[۱] ڈاکٹر چراغ علی۔ اردو مرثیے کا ارتقا۔ صفحہ ۱۲۱
[۲] ساتھی مراثی (سہادت نامے اور مرثیے) مخطوطہ ۲۸ کتب خانہ سالار جنگ حیدرآباد
[۳] ڈاکٹر محی الدین قادری زور۔ تذکرہ مخطوطات ادارہ ادبیات اردو۔ صفحہ ۵۱ - ۵۲
[۴] سوز [۵] سورج [۶] آنکھیں [۷] کے شہر [۸] اس دکھ کی وجہ سے [۹] مصیبت [۱۰] دولت [۱۱] ٹکڑے [۱۲] اس کے بعد [۱۳] نکلا [۱۴] باہر [۱۵] ختم ہوگیا، مالی ہوگیا [۱۶] چھوٹ گیا۔ آنسو [۱۹] ملاکر۔

صادق نقوی

تاریخِ حیدرآباد

پیار، اخلاص، وفا، عزم، تمنائے حیات
حیدرآباد کی تاریخ فقط اتنی ہے

اس کی بنیاد ہی الفت کا چلن ٹھہری تھی
اس کے ذرّوں کو سکھایا گیا آئینِ وفا
اس کی باہوں میں بنے عزم و عمل کے سانچے
اس کی گلیوں میں سمایا گیا آئینِ وفا
دل پہ شاہوں نے محبت سے حکومت کی تھی
حیدرآباد کی تاریخ فقط اتنی ہے

یہ عمارات یہ سڑکیں یہ حسیں باغیچے
یہ مساجد یہ منادر یہ بزرگوں کے مزار
اینٹ مٹی سے بنائے یہ تقدس کے مکاں
پیار کے عشق کے ما سدیہ تمدن کے وقار
ان کی دہلیز پہ شاہوں نے وفا مانگی تھی
حیدرآباد کی تاریخ فقط اتنی ہے

کوئی مانے کہ نہ مانے یہ حقیقت ہے یہی
تخت کے تاج کے وارث نے قسم کھائی تھی
رودِ موسیٰ کو محبت کا نگر کر دوں گا
اپنی دھرتی پہ اسی دن تو بہار آئی تھی
زندگانی کے لبوں پر بھی ہنسی آئی تھی
حیدرآباد کی تاریخ فقط اتنی ہے

پھر ہوا یوں کہ زمیں رشکِ جناں کہلائی
چار مینار بنا اپنی بلندی کا نشاں
چار سو چار کمانوں نے سنوارا اس کو
جن کی باہوں میں پلا اور بڑھا عزمِ جواں
عشق نے حسن کو جینے کی ادا بخشی تھی
حیدرآباد کی تاریخ فقط اتنی ہے

اے قطب شاہ تری ہستی تری رفعت کو سلام
حیدرآباد کے بانی تری عظمت کو سلام
تیری انسان سے بے لوث محبت کو سلام
عشقِ صادق تھا ترا تیری صداقت کو سلام
چار صدیوں سے محبت کی پذیرائی تھی!
حیدرآباد کی تاریخ فقط اتنی ہے

آج ہے یومِ قلی آؤ ارادہ کر لیں ــــ!
اپنی دھرتی پہ نہ لاشوں کی تجارت ہوگی
خونِ مظلوم کا ہوگا نہ شقاوت ہوگی
گھر جلیں گے نہ مذاہب کی تجارت ہوگی
اپنی تاریخ محبت تھی محبت ہوگی!
زندگی پیار ہے الفت ہے عبادت ہوگی

○

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید

تصوّف: اُردو شاعری کے دبستانِ دکن میں

تصوف اردو شاعری کا وصف خاص رہا ہے۔ اس دور میں جب کہ معاشرے اور معاشرت پر مذہب کی گرفت زیادہ تھی تصوف کو جو اردو شاعری میں قدر اول کی حیثیت حاصل تھی۔ نہ صرف ان شاعروں نے تصوف جن کا ذوق بھی تھا اور زندگی بھی اپنے کلام کو تصوف سے مزین کیا بلکہ ایسے شاعروں کی تعداد بھی کم نہیں تھی جو بقول شیخ علی حزیںؔ "تصوف برائے شعر گفتن خوب است" کے قائل تھے۔ یہ سچ ہے ہم بعض شاعروں کو ان کے معاشرے اور مزاج کی روشنی میں صوفی شاعر قرار دیتے ہیں، بلکہ پہلے صوفی اور بعد ازاں شاعر لیکن واقعہ یہ ہے کہ محض اشعار کی روشنی میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کون شاعر کس حد تک صوفی ہے اور کس حد تک نہیں۔ اس کا باعث اور کچھ نہیں سوائے اس کے کہ تصوف ہمارے ماحول اور رہن سہن میں رچ بس گیا تھا۔ ہماری تہذیب کی شناخت اور ہماری زندگی کی پہچان بن چکا تھا۔ اس حد تک کہ عام فرد بھی کسی نہ کسی طرح تصوف کے اثر میں تھا۔ یہ ایک رو کی طرح جاری اور روح کی طرح ساری تھا۔ چنانچہ تعجب نہیں کیا جانا چاہیے کہ ان شاعروں سے قطع نظر جو واقعی صوفی شاعر کہے جاسکتے ہیں اور شاعروں نے بھی صوفیانہ مسائل اور موضوعات پر یوں اظہار خیال کیا ہے کہ ان میں کوئی امتیاز برتا نہیں جاسکتا۔

اردو شاعری کی شروعات ہی دکن میں نہیں ہوئیں بلکہ اردو شاعری کو عروج اقبال اور اعتبار بھی دکن میں ملا۔ یہ زمانہ یوں بھی اہمیت رکھتا ہے کہ اہل اللہ اور صوفیائے کرام نے اپنے عقائد کی تبلیغ و اشاعت کے لیے فارسی کی بجائے دکنی کو وسیلۂ اظہار بنایا۔ اس دور کے شاہی کارنامے بھی رفعت و وقار کے حامل ہیں لیکن بہرکیف [illegible] مقابلہ میں شاعری عوام کے لیے جاذب نظر اور دلکش ہوا کرتی ہے فطری طور پر ان اہل اللہ اور صوفیائے کرام [illegible] شاعری کو اپنے پیغام کی اشاعت کے لیے استعمال کیا اور ان ہی کا فیضان [illegible] کے دل نشین ہو چکے ہیں اور سارا زمانہ آج بھی ان پر درود و سلام بھیجتا ہے

ڈاکٹر حفیظ قتیلؔ کی تحقیق کے مطابق "معراج العاشقین" خواجہ بندہ نوازؒ سے محض ایک [illegible] رسالہ [illegible] پہلے صوفی بزرگ جن کا کلام مستقل طور پر ملتا ہے [illegible] شاہ میراں جی شمس العشاق [illegible] "وصال شمس العشاق" سے [illegible] . . . . [illegible]

اپنے عہد کے معاشرتی حالات کو [illegible]

کو گرفت نہ ملا تھا ہر طرف خلفشار اور اختلال تھا۔ بلندیاں زیر زمین ہوتی جا رہی تھیں تصوف میراں جی کی میراث بھی تھی اور مزاج بھی! دوسرے حالات نے بھی ان کے ذوق و ذہن کو تقویت دی۔ تصوف شمس العشاق کی زیست کا مرکز و محور اور ان کی شاعری کا حاصل ہے۔ انھوں نے ماحول کے بگاڑ کا اندازہ کیا، صحیح اندازہ اور پھر تصوف کو عوام کی ذہنی تربیت اور معاشرتی اصلاح کے لیے کام میں لایا۔ مریدین کے لیے ہی نہیں اور سب کی ہدایت کے لیے بھی تصوف سے فزوں کوئی وسیلہ ان کے پاس نہیں تھا۔ ان کی چار طویل اور مختصر منظومات "خوش نغز" "شہادت التحقیق" "خوش نامہ" اور "مغز مرغوب" ہیں۔ "خوش نغز" میں عرفان روح، عرفان عالم، عرفان مراقبہ عرفان ذوق نور اور عقل و عشق کے مسائل کی توضیح کی گئی ہے۔ "شہادت التحقیق" میں شریعت و طریقت کے مسائل کی تفہیم یوں کی گئی ہے کہ احادیث نبوی کی تشریح اور واجب الوجود و مسائل سلوک کی بحث بھی آ گئی ہے۔ "شہادت التحقیق" کا امتیازی وصف یہ ہے کہ حروف تہجی کے ذریعہ کنایاتی طور پر تصوف کے نکات بیان کیے گئے ہیں۔ "خوش نامہ" سے یہ شعر ملاحظہ ہو۔ وحدت الوجود کے مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے ؎

تجھے ہی قدرت کوں زور تجھے نور پورا نا
تجھتے سب کا سبھی بنا تج میں سب ہیں بگانا

میراں جی شمس العشاق نے بیجاپور کی سلطنت کی ابتدا نہ دیکھی تھی یوسف عادل شاہ نے ۱۴۸۹ء میں بیجاپور کی خود مختاری کا اعلان کرتے ہوئے عادل شاہی سلطنت قائم کی۔ عادل شاہی فرمانروا خود بھی شاعر تھے اور اعلیٰ درجے کے شاعر اور اسی کے ساتھ وہ علم دوست شاعروں اور ادیبوں کے سرپرست اور فیاض حکمراں۔ بقول جمیل جالبی "وجود کا فلسفہ بیجاپوری تصوف کا بنیادی فلسفہ ہے۔ ساری عمارت اس کی بنیاد پر رکھی گئی ہے۔" یہاں اس عہد میں فلسفہ اور تصوف تخلیقی دور سے گزر رہے تھے۔ ہندوستانی فلسفہ اور اسلامی تصوف ایک دوسرے کو لیتے دیتے ایک دوسرے کو متاثر کرتے اور ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوتے جا رہے تھے یوں ایک نئی شکل سامنے آ رہی تھی جس کو دونوں کا امتزاج قرار دیا جا سکتا ہے ـــــ مختصر یہ کہ بیجاپور کے شعر و ادب میں تصوف کو جلد ہی اساسی حیثیت حاصل ہو گئی جس کی بھرپور نمائندگی شاہ برہان الدین جانم متوفی (۱۵۸۲ء) فرماتے ہیں۔ یہ کیا کم تھا کہ جانم، میراں جی شمس العشاق کے صاحبزادے اور خلیفہ تھے اور خود اپنے مزاج اور ذوق کے باعث تصوف کو اپنے پل پل کی زندگی بنا لیا تھا۔ وجودی فلسفہ کی تہذیب و تشکیل میں جانم کا قابل قدر حصہ ہے۔ توحید وجود کا ماحصل یہ ہے کہ خدائے لم یزل ہر شے میں جاری و ساری ہے۔ وہ ذرہ ذرہ میں جلوہ نما ہے ظاہر میں بھی باطن میں بھی۔ رنگ و بو اور نور کی شکل میں وہی اور صرف وہی ہے۔ اس کا ظہور مکاں میں بھی ہے اور لامکاں میں بھی کوئی شئے کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں اس کا وجود نہ ہو۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

سب میں تو وہ دستا ہے — سب تجھے الپٹ لسا ہے
ہر اک شئے میں دیکھ بچار — محیط تسے ٹھاریں ٹھار

جانم نے تصوف کے بیشتر مسائل کو اپنی شاعری میں سمو کر ہندوستان کے صوفیا میں ایک امتیازی مقام کے مالک بن گ

ہیں۔ برہان الدین جانم نے نظم و نثر کی کئی تصانیف چھوڑی ہیں۔ جن کا موضوع صرف اور صرف تصوف ہے۔ "وصیت الہادی" "بشارت الذکر" "سکھ سہیلا" "منفعت الایمان" "زبان از دیوان" اور "ارشاد نامہ" وغیرہ شعری فن پارے ہیں۔ صرف "ارشاد نامہ" کا جائزہ لیں تو اندازہ ہوگا کہ ذات و صفات، جبر و قدر، شہود و وجود، روح و نفس، سلوک و معرفت اور تصوف کے ایسے ہی کئی نازک مسائل پر جانم نے کتنی قدرت اور مہارت کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے کہ بات ایک عامی کے فہم میں بھی آجاتی ہے۔ ان کی نظم "منفعت الایمان" کی یہی کیفیت ہے۔ اس نظم کے دو اشعار میں عشق کی حقیقت واضح ہوتی ہے ؎

کوئی کہیں سب عشق تمام عشق کی آنکھیں کیا ہے فہام
عشق لیا ہے سب پھر باس عشق تھے سگلا ہوگ بلاس

تصوف کا ایک اہم مسئلہ خدا اور بندے کا تعلق ہے۔ خدا بندے سے جدا ہے یا نہیں اور یہ جوڑ دل میں کیوں اور کیسے؟ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ہم تو بندے کی شہ رگ سے بھی قریب ہیں اور یہ بھی کہ ہم نے بندے میں اپنی روح پھونکی۔ اس خصوص میں جانم کہتے ہیں ؎

تجھ میں داخل اچھے بول وہ تجھ ن خارج دسنا کیوں
نور کرل روح کر دتیا تانوں روح ہو تن میں پکڑیا ٹھانوں
تجھ میں رکھیا یوں مل جائے جوں پانی میں پاؤ سمائے

اس دور کا ایک اور شاعر ہے۔ شہباز حسینی قادری بیجاپوری (متوفی ۱۶۰۶ء) شہباز کا کلام اگرچہ زیادہ نہیں ملتا لیکن اس کے صوفی مشرب ہونے میں کوئی شک نہیں۔ اس نے بھی تصوف کے مختلف موضوعات پر اظہار خیال کرتے ہوئے خاص طور پر تطہیر قلب پر زور دیا ہے۔ ایک شعر درج ہے۔

شہباز اچہ تجد کھوئے کر، ہر دو جہاں دل دھوئے کر
دل جہان اللہ کب ہوئے کرنب پاکا دیدار توں

شیخ غلام محمد داول (متوفی ۱۶۵۷ء؟) نے سراجی شمس العشاق اور برہان الدین جانم کی پیروی کی۔ شیخ داول برہان الدین جانم کے مرید تھے تصوف سے بنیادی طور پر دلچسپی بھی کہ طریق زندگی بن چکا تھا۔ اور وہ صلح بھی تھا کہ رشد و ہدایت کا کام۔ شیخ داول نے تصوف کے گمبھیر مسائل کو آسان زبان اور سیدھے سادے اسلوب میں پیش کر دیا۔ ان کی تصانیف میں چہار شہادت "کشف الانوار" "کشف الوجود" اور "ماری نامہ" ہیں۔ خاص طور پر "چہار شہادت" میں مسئلہ وحدت الوجود پر سیر حاصل انداز میں گفتگو کی گئی ہے۔ ان دو تین اشعار سے اندازہ ہوگا ؎

اللہ دا مد سرجن ہار جن تک عالم جس بھی مار
ظاہر باطن اپنا روپ ذات منزہ سبھ سروپ

دائم قائم آپیں آپ — جو نا پنگوڑے اور ماں باپ

شاہ برہان الدین جانم کے دوسرے خلیفہ کی حیثیت سے محمود الحق خوش دہاں کی ذات گرامی اہمیت رکھتی ہے انھوں نے تصوف اور شاعری میں ان ہی روایات کی پاسداری کی جو انھیں اپنے بزرگوں اور مرشد سے ملی تھیں خوش دہاں نے فارسی میں لکھا، ہاں ان کے ترجمے اردو میں ضرور ہوئے ہیں.

لیکن اس دور کی ایک اہم شخصیت شاہ امین الدین اعلیٰ (۱۵۸۲ء - ۱۶۷۵ء) کی ہے جو حضرت شاہ برہان الدین جانم کے صاحبزادے تھے. صوفی خاندان، صوفی سلسلہ، صوفی باپ اور صوفی ماحول — اور کیا چاہئے تھا. گویا تصوف میں سب کچھ ان کو اپنے آپ سے مل گیا. کہا جا سکتا ہے کہ تصوف ان کی رگ و پے میں اس طرح سمایا تھا. شاخ گل میں جس طرح باد سحر گاہی کا نم. انھوں نے نہ صرف وحدت الوجود کے مسئلہ کا اظہار خیال کیا بلکہ وحدت وجود کے فلسفے کی تکمیل کا سہرا انھی کے سر باندھا جاتا ہے. شریعت اور طریقت کے متعدد مسائل کی انھوں نے سیدھے سادے اور دلکش انداز میں ترجمانی کی. "رموز السالکین" میں انھوں نے روح دل اور وصال حق جیسے موضوعات پر نہایت ہم انداز میں روشنی ڈالی ہے. ان کی دیگر منظومات میں محب نامہ، کلام اعلیٰ، اور وجودیہ نظم وجود کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

نفس کا دوڑنا ہی اس شمار — تو نوا ہے نفس بچار
نفس کو لیا دو تو دم کی جاگا — لائق دل نہیں تو جائے بھاگا

علی عادل شاہ ثانی کے دور کا ایک نامور شاعر سید میراں میاں خاں ہاشمی ہے جس کی معروف مثنوی ہے "یوسف زلیخا" — "یوسف زلیخا" کا موضوع عشق ہے عشق مجازی. جب کہ ہاشمی نے مثنوی میں عشق حقیقی کی گنجائش نکال ہی لی ہے. خاص طور پر یہ اشعار ؎

کہ جس عشق کا سب کو بستار ہے — وہی عشق معمور سب ٹھار ہے
نہیں عشق پیدا کیا آج کل — ہوا ہے یوں پیدا ازل سے اول

عادل شاہی عہد میں اور کئی نامور اور برآوردہ شعرا گزرے ہیں. اشرف بیابانی جن کی قابل ذکر تصنیف "نوسرہار" ہے خود ابراہیم عادل شاہ (کتاب نورس) عبدل (ابراہیم نامہ) مقیمی (چندر بدن و مہیار) عاجز (لیلیٰ مجنوں، یوسف زلیخا) ملک خوشنود (جنت سنگار) حسن شوقی (فتح نامہ نظام شاہ، میزبانی نامہ) نصرتی (گلشن عشق، علی نامہ) وزیر خواجہ محمد دہدار فانی مرزا محمد مقیم، علی عادل شاہ ثانی شاہی وغیرہ — شاعرانہ تصوف سے کام کس نے نہیں لیا. ان شعراء کے ہاں بھی ایسے اشعار مل جاتے ہیں. ان میں خواجہ محمد دہدار خاں کے ہاں کچھ زیادہ — سچ پوچھئے تو ان شاعروں نے بس شاعرانہ تصوف سے کام لیا ہے. عشق مجازی کی دنیا ہی ان کی دنیا رہی. چنانچہ حسن و عشق کے موضوعات کی حامل ان کی مثنویاں اور غزلیں اپنی مثال آپ ہیں. دبستان گولکنڈہ کی اہمیت اردو شاعری میں کئی زاویوں سے ہے. عادل شاہی سلاطین کے مقابلے میں قطب شاہی سلاطین کو [illegible] وغیرہ سے نسبتاً زیادہ مراسم رہے. یہاں کے شاعروں نے یوں بھی عربی اور فارسی سے زیادہ

ستفادہ کیا اور بیجاپور کے مقابلے میں اپنی زبان کو ہندی اثرات سے دور رکھتے ہوے یوں کہیے کہ دکنی کو فارسی کے قالب
میں ڈھالنے کی سعی کی۔ زبان و بیان ہی کی حد تک نہیں جہاں تک تصوف کا تعلق ہے بیجاپور اور گولکنڈہ کے صوفیانہ
رجحانات کے مابین بھی فرق باآسانی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ بیجاپور میں ہندوستانی تصوف پر اسلامی اثرات واضح
ہیں اور جیسا کہ سطور بالا میں کہیں عرض کیا گیا ہے ان اثرات کی آمیزش سے تصوف کا ایک ایسا دبستان سامنے آتا
ہے جس کو ہم تصوف کا ہندوستانی دبستان یا ہندوستانی فلسفہ قرار دے سکتے ہیں۔

قطب شاہی سلطنت کے شاعروں میں سب سے پہلے فیروز، محمود اور خیالی کے نام سامنے آتے ہیں۔ ان سب
نے دراصل اپنی روایات کی پرورش کی جو آگے چل کر دبستان گولکنڈہ کی نام آوری اور رونق و وقار کا باعث ہوئی ہیں
فیروز کا تعلق بیدر سے تھا لیکن بہمنی سلطنت کے سقوط کے بعد یہ گولکنڈہ چلا آیا اس کی شہرہ آفاق تصنیف "پرت نامہ"
ہے "پرت نامہ" کا موضوع ایک حد تک مذہبی ہے کہ اس میں غوث اعظم حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کی مدح کر کے اپنے
مرشد حضرت شیخ ابراہیم مخدوم جیؒ کی توصیف کی گئی ہے لیکن اس میں تصوف کے مسائل کا ایسا بیان نہیں یہی حال اس
کی غزلوں کا بھی ہے جن کا مرکز و محور عشق مجازی ہے سوائے اس کے کہ کہیں کہیں عشق حقیقی کا تذکرہ ہو جاتا ہے۔

محمود بھی شمالی ہند سے دکن آیا تھا محمود دراصل غزل کا شاعر ہے اور ٹھیٹ غزل کا۔ اس نے ظاہری اور معنوی
دونوں حیثیتوں سے غزل کا استعمال کیا ہے۔ شراب و شباب کے ساتھ زندگی کے مسائل ذیلی ضمنی طور پر آ جاتے ہیں لیکن تصوف
کی سمت اس کا رجحان برائے نام رہا

ملا خیالی کا شعری سرمایہ بہت کم ملتا ہے اور جو بھی ملتا ہے اس کی روشنی میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس نے فیروز
اور محمود کی طرح حسن و عشق کے موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے۔

دبستان گولکنڈہ کا نامور ترین شاعر محمد قلی قطب شاہ (۱۵۶۵ء – ۱۶۱۱ء) ہے۔ بادشاہ ہوتے ہوے جہاں اس نے
شاعری کی شاعری کی سلطنت میں آج بھی اس کی بادشاہت مسلم ہے۔ محمد قلی حسن کا پرستار تھا عشق اس کی گھٹی میں
پڑا ہوا تھا اور شراب و شباب کا رسیا ـــــ اس تناظر میں ممکن ہے بعض گوشے محمد قلی کو صوفی شاعر قرار دیں لیکن کلیات قلی
قطب شاہ کے مطالعے سے ظاہر ہوگا کہ تصوف سے محمد قلی کو غیر معمولی لگاؤ تھا اس نے حافظ شیرازی کی کئی غزلوں کو اردو کے
قالب میں ڈھالا جس سے حافظ کی شاعری شخصیت اور مسلک سے اس کی وابستگی کا اندازہ ہوتا ہے تصوف سے اس کی
دلچسپی کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے۔ ونیز بقول ڈاکٹر زور "اس کی فطری آزادہ روی اور ظاہر پرستی کے عنصر نے اس کو واقعی
ایک پختہ کار صوفی مشرب بنا دیا تھا" محمد قلی کی شاعری کے موضوعات زیادہ تر عشق مجازی سے تعلق رکھتے ہیں تاہم ایسا
لگتا ہے کہ یہی عشق مجازی، عشق حقیقی تک اس کی رسائی کا وسیلہ بن گیا۔ صوفیا عشق حقیقی پر زور دیتے ہیں لیکن عشق مجازی
کو بھی صوفیا نے نظر انداز نہیں کیا ہے۔ ذات الٰہی تک رسائی اور انکشاف ذات کے لیے ارتکاز توجہ کی ضرورت ہوتی ہے اور
صوفیا ابتداً عشق مجازی ہی کو مرکز توجہ بناتے ہیں۔ جب توجہ ایک ہی نقطہ پر مرکوز ہو جاتی ہے تو عشق مجازی کے باب ہی میں

اس سے ولی اور وہ شعرا جن سے ولی نے ملاقات کی ہو جس قدر بھی متاثر ہوئے ہوں مجموعی طور پر اردو شاعری کے دبستان دکن اور دبستان دہلی پر گہرے اثرات ترتیب پاتے ہیں۔ دونوں کی تقدیر بدل جاتی ہے۔ ولی اپنے مزاج کے اعتبار سے کس قدر صوفی تھے؟ عشق مجازی اور عشق حقیقی سے ان کی شاعری کس قدر مملو ہے؟ یہ اور ایسے سوالات جو بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہوں لیکن ولی کی زندگی اور ان کی شاعری کے مطالعے سے بآسانی کہا جاسکتا ہے کہ ولی نے تصوف کو اپنی زیست بنالیا تھا۔ کن کن مسائل کا ذکر کیا جائے۔ ولی نے ان سب پر بڑی عمدگی، بے حد خوبی اور خاصے بھرپور طریقے سے اظہار خیال کیا ہے۔ یہ نہیں محسوس ہوتا کہ تصوف کے ان نازک معاملات پر ولی اظہار خیال کر رہے ہیں بلکہ یوں لگتا ہے یہ معاملات ولی کے کلام میں اپنی جگہ آپ بنا رہے ہیں۔ وحدت الوجود کا نظریہ اس زمانہ کا ایک عمومی اور صوفی شعرا کے نزدیک مقبول ترین نظریہ تھا۔ ہر سمت خدا ہے اور خدا کے سوائے کچھ نہیں۔ ہر شئے میں خدا ہے اور خدا کے سوائے کچھ نہیں۔ ظاہر و باطن، عالم و غائب اور مکان و لامکان، حتیٰ کہ حق ہی نہیں باطل میں بھی خدا کا جلوہ ہے۔ جیسا کہ شیخ اوحد الدین مغربی نے ایک شعر میں کہتے ہیں باطل کا بھی انکار کرو کیونکہ یہ بھی حق ہی کا ظہور ہے ولی بھی وحدت الوجود کے نظریے کے شدت سے قائل رہے۔ ان کے کلام میں اس کی جلوہ گری بار بار ملتی ہے ایک ہی غزل کے دو شعر ہیں ؎

عیاں ہے ہر طرف عالم میں حسن بے حجاب اس کا ۔ بغیر از دیدۂ حیراں نہیں جگ میں نقاب اس کا

ہوا ہے مجھ کوں شمع بزم یک رنگی سوں یوں روشن
کہ ہر ذرہ اُپر تاباں ہے دائم آفتاب اس کا

یہی حال عشق حقیقی کا ہے۔ ولی نے عشق مجازی کو بھی اپنے کلام میں جگہ دی ہے لیکن سچ پوچھئے تو ولی کا عشق خیالی یا مجازی نہیں صرف اور صرف حقیقی ہے عشق وہ جو قرب الٰہی، تہذیب نفس اور تزکیہ و تالیف قلب کا واحد ذریعہ ہے عشق حقیقی کا رنگ ان کے کلام میں بے حد گہرا ہے اور اس کی نوا خاصی تیز اور خاصی بھرپور اور پھر ولی کی زبان اس کا اسلوب، ان کا لہجہ ۔ اور تصوف کے دیگر موضوعات پر ولی کے شعر ہیں ؎

وہ صنم جب سوں بسا دیدۂ حیران میں آ
آتش عشق پڑی عقل کے سامان میں آ

سجن کے باج عالم میں دگر نیست ۔ ہمیں میں ہے ولے ہم کو خبر نیست

خود فنا ہو کے ذات میں ملنا ۔ یہ تماشا حباب میں دیکھا

ضروری ہے اول خالی ہوا سے دل ۔ اگر اس شمع روشن کی لگن ہے

عشق میں لازم ہے اول ذات کو خالی کرے
ہو فنا فی اللہ دائم یاد یزدانی کرے

ولی کے بعد فراقی او فقیر اللہ آزاد کے نام بھی ملتے ہیں ان کا کلام اپنے دور کے عمومی رنگ کی نمائندگی کرتا ہے اور بس! فراقی کا

ب شعر ؎ منجہ اس مکتب مجازی میں جو عشق استاد نہ ہوتا
تو میرے دل کی کثرت کا سبق برباد نہ ہوتا

داؤد اورنگ آبادی اپنے رنگ میں کامل اور سحر پور رہے۔ دلستان دکن میں داؤد کی اپنی اہمیت ہے۔ لیکن تصوف ۔۔۔ کا مزاج نہیں رہا۔ البتہ داؤد کے بعد سراج اورنگ آبادی (۱۷۱۵ - ۱۷۶۳ء) نے اردو شاعری میں تصوف کو ۔۔۔ سنے افق اور نئی رفعت سے ہم آہنگ کر دیا۔ حق تو یہ ہے کہ سراج اردو شاعری کا پہلا عظیم صوفی شاعر ہے ہر معنی اور ۔۔۔ مفہوم میں۔ تصوف سراج کی زندگی تھی۔ ان کی شخصیت تھی۔ ان کا مسلک ان کی دنیا۔ ان کا عملی ۔۔۔ عبدالقادر سروری ۔۔۔ بجا طور پر لکھا ہے: "سراج ایک خدا رسیدہ بزرگ ایک صوفی ایک تارک الدنیا بلکہ ایک ولی سمجھے گئے اور اسی حیثیت ۔۔۔ مشہور ہوئے۔"

شاعری تو سراج کے لیے ذیلی اور ضمنی حیثیت رکھتی تھی بلکہ کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتی تھی۔ انہوں نے علیہ الرحمہ اپنے مرشد ۔۔۔ ہدایت کی تعمیل کرتے ہوئے شاعری ترک کر دی اور تصوف کے ہو گئے۔ سراج صاحب دل بھی تھے اور صاحب باطن ۔۔۔ چنانچہ چند برسوں کی سراج کی شاعری میں تصوف کے بھرپور نقوش ملتے ہیں۔ ان کی شاعری شاعری نہیں تصوف اور ۔۔۔ تصوف ہے، وہ بھی سراج کا تصوف اتفاقی نہیں ان کے باطن اور ان کی روح کا ترجمان اور اس کا عکس ہے۔ تصوف ۔۔۔ شاید ہی کوئی پہلو ہوگا جس پر سراج نے اظہار خیال نہ کیا ہو۔ سراج کی معروف غزل "خبر تحیر عشق سن ۔۔۔ ۔۔۔ قطع نظر جس کا ہر شعر تصوف کے مسئلہ کی جامع اور وسیع تصویر ہے۔ ان کی دیگر غزلوں میں بھی ایسے اشعار کمی نہیں۔ ان ۔۔۔ مثنوی "بوستان خیال" بھی صوفیانہ شاعری کی عمدہ مثال قرار دی جاسکتی ہے جس میں انہوں نے حقیقت کو مجاز کے پردے ۔۔۔ میں بیان کیا ہے۔

عشق حسن کے بارے میں حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز نے "اسما الاسرار" میں فرمایا ہے۔ "عشق خواہ خیال ہے عشق ۔۔۔ کوئی صورت نہیں، عشق ہر صورت میں ظاہر و پنہاں ہے۔ عشق عظیم الشان ہے، عشق رحیم و رحمٰن ہے، عشق ہی بت پرست ہے، عشق ۔۔۔ بت شکن ہے۔ عشق عشق خدا سے جدا نہیں۔" تو سراج کی زندگی بھی وہ کہتے ہیں ؎

سراج یہ مجھے استاد مہرباں نے کہا
کہ علم عشق سے بہتر نہیں ہے کوئی علوم

گر حقیقت کی سیر ہے خواہش
راہ عشق مجاز لازم ہے

اور عاشقوں مثال مجھے ہم نہ بوجھیو
سب مبتلائے عام ہیں میں مبتلائے خاص

جل گیا عشق کے شعلوں میں سراج
ایک دل ست جس میں بے دار کیا

عشق کے شعلوں میں جل جانا ہی عشق حقیقی کی رفعت ہے، معراج ہے فنا ہی عشق ۔۔۔ کا حاصل ہے اور اسی

فنا میں عاشق کی بقاء پوشیدہ ہے۔ نیستی ہی میں ہستی ہے کیونکہ یہ نیستی نیستی نہیں، فنا ہونا فنا ہونا نہیں بلکہ اپنے میں موجود انسانی صفات کو مٹا کر اپنی ذات میں ممکنہ حد تک صفات اللہ پیدا کرنا ہے کہ اس سے بقائے دوام ممکن ہے۔

سراج نے کہا ہے ؎

تو فنا ہو اگر بقا چاہے
نیستی میں تو دیکھ ہستی ہے

صوفیا کے نزدیک ظاہر و باطن میں کوئی فرق نہیں کوئی امتیاز نہیں کیونکہ ہم جسے ظاہر کہہ کر باطن سے جدا کر رہے ہیں وہ ظاہر ہوتے ہوئے بھی باطن سے جدا نہیں یہی حال باطن کا ہے وہ باطن ہوتے ہوئے بھی ظاہر سے جدا نہیں کیوں کہ ذات الٰہی تو ظاہر میں بھی ہے اور باطن میں بھی۔ نہ ذات الٰہی کے بغیر ظاہر ظاہر ہے اور نہ باطن باطن۔ ذات الٰہی کا جلوہ سب میں موجود ہے۔ سراج کے اشعار میں ؎

ہو نہاں اس کو دکھایا نہیں
ہو ظاہر اس کو چھپایا نہیں

کہیں آپ دستا ہے محبوب ہو کہیں آپ چھپتا ہے محجوب ہو

[illegible] اشعار بھی قابل توجہ ہیں ؎

دوئی کوں ترک کر اور آپ کوں بوجھ
سخن کہتا ہوں خلوت میں حقانی

شراب شوق پی کر دو جہاں کا جس نے غم بھولا
حال تم اسرار باطن و ظاہر جام جم بھولا
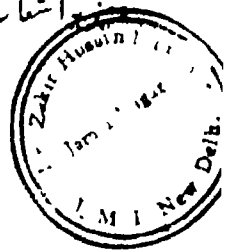
بیجاپور اور گولکنڈہ کی سلطنتوں کے سقوط کے بعد دکن اور شمال کے درمیان روابط فزوں ہونے لگے دکن کی زبان اور ادب کی امتیازی اور انفرادی حیثیت ختم ہوتی۔ اسی کے ساتھ شمال اور دکن نے لسانی طور پر ایک دوسرے کو اس حد تک متاثر کیا کہ زبان کا ایک نیا روپ سامنے آنے لگا جو اردو سے موسوم ہوا اور یہ ولی، سراج اور اس دور کے دیگر شعراء دراصل درمیانی کڑیوں کی حیثیت رکھتے ہیں اور دبستان دکن کے آخری شعراء میں شمار ہوتے ہیں یوں دبستان دکن کا خاتمہ ہوتا ہے۔ لیکن دبستان دکن کی اردو شاعری میں تصوف کی جو کارفرمائی رہی اور ہمارے شاعروں نے تصوف کو جس طرح اپنی زیست اور اپنی شاعری سا بنایا آج بھی ان کے کلیات سے واضح اور اردو ادب کا وقیع سرمایہ ہے۔ تاریخی اور ادبی زاویوں سے بھی ان کی حیثیت ممتاز اور موقر ہے۔

اسی طرح صوفیانہ نقطۂ نظر سے بھی آج یہ فن پارے، یہ کارنامے رشد و ہدایت کا وسیلہ ہیں۔ عوام کی تہذیب نفس اور تزکیۂ قلب کا بڑا ذریعہ ہیں۔ ایک نیک اچھی اور سچی زندگی کے لیے مینارۂ نور اور چشمۂ فیضان ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ اگر تصوف ان شاعروں کی حیات اور شاعری میں

(باقی صفحہ ۲۳ پر)

اعجاز زاہدی

فنِ خطاطی

قوموں کے عروج و زوال کے سفر میں بسا اوقات ایسے مرحلے بھی آتے ہیں جب قوم اپنے پورے تہذیبی سلیقے کے ساتھ تباہ و برباد ہو کر زمین کی گہری تہوں میں دب کر اپنا وجود کھو دیتی ہے۔ بڑی بڑی خوبصورت عمارتیں، شاندار محلات، حسین کلس، عجوبۂ روزگار تعمیرات محض کھنڈر بن کر آنے والوں کے لیے عبرت کا سامان رہ جاتے ہیں۔ علم، ادب، تہذیب، ترقی، بادشاہوں کی جبروت اور فیاضی کی کہانیاں اور بہادر سورماؤں کی داستانیں یوں گم ہو جاتی ہیں جیسے ان کا وجود کبھی اس زمین پر نہ تھا اور ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ پوری تہذیب کا نام تاریخ کے چہرے سے مٹ جاتا ہے اور یوں لگتا ہے جیسے اس زمین پر تاریخ نے کبھی کسی شائستہ تہذیب و تمدن اور ترقی یافتہ انسان کو نہ دیکھا ہو اور یوں صدیاں گزر جاتی ہیں۔

پھر یکایک کنواں کھودتے ہوئے، نہر نکالتے ہوئے کسی بڑی عمارت کے لیے بنیادیں اٹھاتے ہوئے یا جنگل میں بکریاں چراتے ہوئے محض ایک تختی کسی کے ہاتھ لگ جاتی ہے جس پر الٹے سیدھے نشان یا تصویریں کندہ ہوتی ہیں۔ تختی (حسنِ اتفاق سے) مختلف ہاتھوں سے ہوتی ہوئی اسکالرز (ماہرینِ آثار اور بشریات) تک پہنچ جاتی ہے اور پھر اچانک جوش سے بھرپور آواز ابھرتی ہے۔ ایک ہزار سالہ تہذیب، دس ہزار سالہ تہذیب، پچاس ہزار سالہ تہذیب۔ پانچ لاکھ سالہ تہذیب اور پھر ان تہذیبوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ سومیری تہذیب، اکادی تہذیب، آشوری تہذیب، مصری، عبرانی، بابلی اور بے شمار تہذیبیں ابھرنے لگتی ہیں۔ چھوٹی سی مختصر تختی جس پر الٹے سیدھے خط یا بے ترتیب سی تصویریں نظر آتی ہیں دیکھتے ہی دیکھتے ہزاروں سالہ تہذیبِ انسانی کا انکشاف بن جاتی ہیں۔ تختی کی عبارت اور مفہوم دنیا بھر میں بحث کا موجب بن جاتا ہے۔ اور بڑے بڑے ماہرینِ آثار، ماہرینِ عمرانیات، ماہرینِ بشریات اور ماہرینِ لسانیات سر جوڑ کر تہذیبوں کے عروج و زوال کی کڑیاں جوڑنے لگتے ہیں۔ علامتیں مفہوم بن جاتی ہیں۔ تجزیہ ہوتا ہے سن و سال دریافت ہوتے ہیں۔ تہذیبوں کے لوگوں کے رنگ و نسل، اقوام، حکومتیں، فنونِ لطیفہ، ادب و تعمیر سب کچھ سامنے آ جاتا ہے اور چھوٹی سی تختی جس پر کسی ہاتھ نے اپنے فن کا جوہر بکھیرا تھا کھوئی ہوئی انسانی کڑی کی دریافت کا سبب بن جاتی ہے۔ اس سارے پس منظر کو سامنے رکھ کر جائزہ لیا جائے تو کتنی حیرت ہوتی ہے کہ ادب، شعر، رقص، موسیقی، مصوری حتیٰ کہ تعمیرات کو بھی فنونِ لطیفہ میں جگہ حاصل ہے مگر فنِ خطاطی جو ان تمام علوم و فنون کی محافظ اور تہذیبوں، ثقافتوں کی امین ہے اسے اب تک وہ مقام حاصل نہ ہو سکا جس کا یہ متقاضی ہے۔ یہ عجیب سی بات ہے کہ ہم تہذیب کی شائستگی کی بات کرتے ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ وہ قوم فنِ تحریر سے بھی واقف تھی

مگر جواب میں اس فن کو اب تک نظر انداز ہی کیا گیا مثلاً اگر آپ فنون لطیفہ کے دوسرے تمام موسیقی، رقص، تھیٹر، مصوری، ا
شعر کو دیکھیں تو اردو، عربی، فارسی اور دوسری زبانوں میں بے شمار کتب مل جائیں گی مگر فن خطاطی پر نظر دوڑائیں تو ماسوا
بکھرے بکھرے مضامین کے کچھ ہاتھ نہیں آتا عربی، فارسی میں تو پھر بھی کچھ مواد مل جاتا ہے مگر اردو کا دامن اس فن کی تا
اور ارتقا سے قطعی خالی ہے۔

اور یوں لگتا ہے جیسے اس فن کو اب تک فن کی حیثیت سے تسلیم ہی نہیں کیا اور نہ دانش کی سطح پر لے جانے سے دانستہ
گریز کیا گیا ہے۔ شاید اسی لیے صدیوں کے سفر کے باوجود اب تک ہمارے ہاں اس میں کوئی ارتقا نظر نہیں آتا۔

عربوں کی ایجاد فن خطاطی ایران پہنچی تو ایرانیوں نے اس فن کو اوج ثریا تک پہنچانے کے لیے نہ صرف عربی کے مروجہ
خطوں میں اجتہاد کیا بلکہ اپنی صلاحیتوں کو منوانے کے لئے نئی خط ایجاد بھی کیے۔ مغربی اور مشرقی عرب علاقوں، ہسپانیہ،
افریقہ تک میں عربی خطوں میں اضافے اور ترامیم کے ساتھ انھوں نے اپنا رنگ بھرا۔ مگر ہم نے فارسی سے جو خط حاصل
کیا اپنا سارا وقت اس کا استاد بننے میں صرف کر دیا۔ ممکن ہے اس کے حسن میں ہم نے اضافے کیے ہوں۔ مگر حروف کے
ساختیاتی ڈھانچے میں کوئی تبدیلی نہ لا سکے۔

جیسا میں نے اوپر کہا ہے کہ خطاطی جس نے کھوئی ہوئی قوموں کا سراغ لگایا خود اس کی تاریخ مرتب کرتے ہوئے
ہمیں شدید مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور لے دے کر جو معلومات ہم تک پہنچی ہیں وہ مغربی اسکالرز کے وسیلے سے۔ مگر ہم
کلیتاً ان پر اعتماد بھی نہیں کر سکتے کہ مغرب کی تہذیبی صفت ان کے اپنے مفادات سے متصف ہے۔ چنانچہ مشرق کی عظمت کے
اصلی جوہر تک وہ کیوں کمند لگانے لگے۔ شاید اسی لیے مغرب کے بہت سے اسکالرز نے خود تحقیق کی بجائے پہلوؤں پر نقد
کیا۔ اور نمونوں کو جمع کر کے پہلے کی کہی بات دہرائی۔ جس کے سبب تاریخ کے بہت سے پہلو گم ہو کر رہ گئے ماسوائے چند اہم
اسکالرز کے جنھوں نے فن خطاطی کی تاریخ مرتب کرنے کی کوشش کی اردو میں شدید کم مائیگی کا احساس ہوتا ہے اور برصغیر
ہندو پاک میں پڑھا لکھا طبقہ بھی فن خطاطی کے رجحانات، ارتقاء اور عروج و زوال کی تاریخ سے آشنا نہیں۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ خطاطی جس نے مردہ تہذیبوں کی دریافت میں اہم کردار ادا کیا ہے اسے اسلامی دور میں آکر
اہم مقام حاصل ہوا، اور دیکھتے ہی دیکھتے فن خطاطی اوج ثریا پر نظر آنے لگی۔ بہرکیف یہ فن ماضی میں بری طرح متاثر ہوا۔
اور اگر آج اس کی حفاظت نہ کی گئی تو آنے والے زمانوں میں جب مشین انسان کی جگہ لے لے گی تو یہ محض فن تحریر رہ جائے
جس میں سے مسلمانوں کی عظیم روایات کی روح مر چکی۔

اردو رسم الخط اور خطاطی اردو زبان کے ساتھ ہی وارد ہوئی جس طرح زبان کی تاریخ زیادہ قدیم نہیں اسی طرح
اردو میں فن خطاطی کی عمر زیادہ نہیں۔ مگر یہ دلچسپ بات ہے کہ عربی رسم الخط جسے پورے عالم اسلام نے اپنایا تھا اردو زبان
کی آمد سے صدیوں پہلے ہندوستان میں داخل ہو چکا تھا۔ اور جب اردو زبان نے آنکھ کھولی تو اسی رسم الخط میں تشکیل ہو کر جو
میں فارسی دربار میں مل رہی تھی۔ چنانچہ فارسی کے مروجہ خط نستعلیق، نسخ، تعلیق اور شکستہ اردو خطاطی کو روز اول

سے ہی حاصل ہو گئے تھے۔

خطِ نسخ نے خطِ کوفی کے ساتھ عجم کی سرزمین پر قدم رکھا تھا۔ جہاں ایرانیوں کی فن کی قدر دانی اور مصورانہ طبع نے تعلیق، نستعلیق، شکستہ اور کئی دوسرے خطوط کی دریافت کی۔

عربی رسم الخط کے بارے میں مغربی محققین خطاطی کا خیال ہے کہ یہ سرزمینِ عرب اور ارد گرد کی زبانوں خصوصی طور پر اپنی ہم ماخذ پہلوی، کھروشتی، عبرانی کی نسبت خاصی تاخیر سے متعارف ہوئی لیکن میرے نزدیک یہ پہلو قابلِ قبول نہیں کیونکہ عرب اقوام میں زمانہ ماقبل تاریخ ایسے شواہد مل جاتے ہیں کہ عرب اقوام میں فن تحریر رائج تھا تقریباً تمام محققین نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ نبطی قوم عرب سرزمین سے ہی تعلق رکھتی تھی۔ (بعض نے اسے قوم عرب بھی قرار دیا ہے) اور نبطی قوم عرب کی بنیادی خصوصیات خانہ بدوشی اور تجارت سے متصف نظر آتی ہے۔ یہ قوم ایک منفرد خط کی امین تھی جس کا ذکر ہم پچھلے باب میں کر چکے ہیں۔

عرب تمدن کے پس منظر میں جھانکا جائے تو تجارت کے پیچھے معاشی زندگی کے وسائل کی کمی خانہ بدوشی کو تجارت میں بدلتی نظر آتی ہے اور زمانہ ماقبل تاریخ عرب کے یورپ و ہند کے ساتھ تجارتی روابط کسی شبہ سے بالاتر ہیں دنیا کی تاریخ لسانیات اور تاریخ فن تحریر پر نظر دوڑائیں تو یہ بات سمجھنے میں دیر نہیں لگتی کہ فن تحریر کی ایجاد کے پیچھے مذہب حکومت اور تجارت تین ایسے صیغے ہیں جنھیں سب سے زیادہ فن تحریر کی ضرورت پڑتی ہے اور کسی نہ کسی صورت میں فن تحریر کی ایجاد کے طور پر ان میں سے کسی ایک کا وجود ضرور نظر آتا ہے۔

چنانچہ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ عرب قوم کے تجارتی روابط بہت دور تک یعنی زمانہ ماقبل تاریخ بھی نظر آتے ہیں اور مذہبی روایت کے مطابق حضرت یوسف علیہ السلام کو مصر پہنچانے والا قافلہ تجارت ہند سے عرب ہی آ رہا تھا۔ تو ایسی صورت میں یہ بات قرینِ قیاس نظر نہیں آتی کہ عرب قوم اپنے ارد گرد علم و فضل کے کمالات سے متاثر نہ ہوئی ہوگی اور فنِ تحریر جو تجارت کی بنیادی ضروریات سے ہے کو عربوں نے اختیار نہ کیا ہوگا۔

اگر ہم شمال، مغربی اور جنوبی عرب ریاستوں کے ارتقاء کی بات حجاز کا نام لیے بغیر مکمل کرتے ہیں تو اس کا قطعی یہ مطلب نہیں کہ عرب اقوام کو غیر مہذب کارنامے کی توقع نہیں لگانی چاہیے یقینی طور پر حجاز پہلے مرکز نہ رہا ہوگا۔ اور یہ خطے عرب مختلف ادوار میں مرکزیت کے حامل رہے۔ چنانچہ کسی حصے میں بھی خط کا پایا جانا عرب تمدن کا ہی حصہ قرار پائے گا۔

میں سمجھتا ہوں مغربی مستشرقین کے اولین نمائندوں نے جو لکیر کھینچی تھی بعد کے آنے والوں نے اس سے روگردانی نہیں کی اور ہر ایک نے اس بات پر بات جوڑی کہ عرب رسم الخط بہت دیر سے پیدا ہوا۔ جس کے سبب آج عرب رسم الخط کے ماخذ کی تلاش واقعتاً مشکل ہو گئی ہے مگر ابھی بھی بے شمار ایسے شواہد موجود ہیں جن سے عربی رسم الخط کی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔

بہر کیف جس وقت رسولِ مقبول صلعم نے اعلانِ نبوت فرمایا۔ اس وقت حجاز میں فن تحریر آغاز پا چکا تھا۔ جسے ہم آج

خطِ قدیم کوفی، حیرہ یا حمیرہ کہتے ہیں۔ یہ دراصل ایک ہی خط تھا اور اسے اسلام کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ ارتقا کی وہ منزلیں نصیب ہوئیں کہ تاریخِ خطاطی کا سب سے مقبول خط بن گیا۔ اور اسلامی قلمرو کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی وسعت اختیار کرتا چلا گیا۔ اس خط کی ایجاد کہاں کیسے اور کس کے ہاتھوں ہوئی۔ اب تک یہ نہیں معلوم ہو سکا کیوں کہ تاریخ کے صفحات پر دھند چھا گئی ہے مگر مختلف ادوار کے حوالے سے ہم حقیقت کے قریب تر چلے جاتے ہیں اور فنِ خطاطی کی تاریخ کی کڑیاں ایک تسلسل میں نظر آنے لگتی ہیں۔

خطِ نبطی کے بارے میں اوپر تفصیلاً ذکر آچکا ہے کہ نہ صرف دوسری صدی کے اوائل میں رومیوں کے ہاتھوں تباہ ہونے کے بعد اس قوم کے افراد مسلسل دوسرے علاقوں کا رخ کیا بلکہ اس سے قبل ہی یہ لوگ دمشق تک آ گئے تھے چنانچہ نبطی قوم کے یہی لوگ حیرہ اور انبار میں بھی آکر آباد ہوئے۔

تحقیقات سے بھی اس بات کا اظہار ملتا ہے کہ خطِ نبطی حیرہ میں پہلے پہنچ گیا تھا اور جب حیرہ سے یمن اور کوفہ پہنچا تو اس میں جدید خط کے تمام اثرات آ چکے تھے

چنانچہ پتہ چلتا ہے کہ نبطی خط نادر خوبصورت اور دلکش ہو کر حیرہ میں رائج ہوا عرب کی ادبی تاریخ سے ثابت طلب کریں تو یہ حال کہ اس یقین کو تقویت پہنچتی ہے کہ عرب اقوام اور خصوصاً انبار، حیرہ اور غسان کی ریاستوں اور شہروں میں ادب کا بڑا چرچا تھا اور فنِ خطاطی پر نبطی رنگ چھایا ہوا تھا اور ان کا خط نبطیوں کے خط سے ہی متعلق رکھتا تھا اور یہ ان نبطیوں سے حاصل کیا گیا تھا جو رومیوں کے ہاتھوں تباہی کے بعد سینا، پطرہ، بصرہ اور حجرہ سے آکر یہاں آباد ہو گئے تھے۔

گو بنیادی طور پر یہ خط خطِ نبطی ہی تھا مگر مقامی رنگ کی آمیزش سے یہ اب علیحدہ خط انبار و حیرہ میں خط حیرہ اور حمیرہ کہلایا اور اسلام کی آمد اور کوفہ کی آبادی کے بعد کوفی کے نام سے مستعمل ہوا۔ ایک خیال یہ بھی ظاہر کیا جاتا ہے کہ خطِ مسند حمیری دراصل خطِ نبطی اور خطِ سطرنجیلی کی آمیزش سے ایجاد ہوا، اور یہی آگے چل کر خطِ کوفی کہلایا ہے۔ لیکن اس کو یمن والوں نے اہلِ حیرہ کی وساطت سے ہی حاصل کیا تھا، اور بعد ازاں یہاں مقامی رنگ کے بعد ایک خط کی صورت سامنے آیا مگر عربی خط کے جو قدیم نمونے دستیاب ہوئے ہیں اس سے ایک طرف تو یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ عربی رسم الخط دوسری صدی عیسوی میں رواج پا چکا تھا اور دوسری طرف اس کی مناسبت خطِ نبطی سے ہوتی ہے اور نبطیوں کی طرح ہی یہ رسم الخط غیر منقوط غیر اعرابی اور غیر ارتباطی تھا بہرطور نبطیوں کے خط کو عربوں نے مقامی رنگ میں رنگنے کے بعد رواج دیا اگر روایات کا سہارا لیا جائے تو روایات کے مطابق فنِ خطاطی دوسری صدی کی ابتداء میں آغاز پا رہی تھی اور نبطیوں پر قیامت ٹوٹ چکی تھی۔ کتبات کا سہارا لیا جائے تو یہ روایت تاریخ تیسری صدی عیسوی کے وسط تک چلی جاتی ہے۔ اُم الجمال کی شاعری جس کا زمانہ ۲۵۰ء کے لگ بھگ کا ہے۔ اس اعتبار سے عربی رسم الخط کی مماثلت سے خطِ حیرہ یا قدیم کوفی سے ہوتی ہے تیسری صدی میں عرب میں رائج ہو چکا تھا اور یوں لگتا ہے جیسے حیرہ اور انبار کی ابتدائی صورت گری تو دوسری صدی کے اواخر میں ہو چکی تھی

چوتھی صدی عیسوی میں ملوک الطعین کی مکتبہ خط حیرہ کی مکمل شکل میں ملتا ہے۔ چوتھی صدی عیسوی کی ابتدا میں عکس نمارت (تاریخ تحریر ۳۲۸ء) کی تمام خصوصیات کا حامل تھا۔
نقش زبد اور نقش حران ایک حلب اور دوسرا جبل الاروز کے گرجے کے دروازے پر آویزاں ملے ہیں چھٹی صدی کے آواخر سے تعلق رکھتے ہیں

خطِ کوفی کا ارتقا، اس میں کوئی شک نہیں کہ خطاطی کو قرآن حکیم نے عروج تک لے جانے میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ ابتدائی دورِ اسلام میں جب قرآن کی تدوین کے بعد اسے عام مسلمانوں تک پہنچانے کا عمل شروع ہوا جنگی فتوحات نے اسلام کا دائرہ لامحدود کر دیا تھا۔ نئے نئے مذہب کے سبب قرآن پڑھنا، قرآن لکھنا اور اسے پھیلانا ایک مقدس وظیفہ سمجھا گیا۔ چنانچہ جہاں اس طرف قرآن پڑھنے میں حسنِ قرات کمال کو پہنچی وہیں قرآن کی خطاطی نے بھی کمالِ فن حاصل کیا۔ چنانچہ قرآن کی خطاطی میں پوری توانائیوں کا مظاہرہ اسی طرح فرض اور مقدس مانا گیا جس قدر خود کلام اللہ، چنانچہ ایک طرف تقدس اور مذہبی عقیدے اور دوسری طرف جمالیاتی حسن کاری نے خطاطی کو تخلیقی توانائی سے لبریز کر دیا۔

اب خطِ کوفی روایتی انداز اور قاعدوں کے شکنجے سے نکل کر منہاج رفعت پر چل نکلا۔ اور ارتقا کے کئی مرحلے طے کرتا رہا ہیں اور آرائش کی نئی راہیں تراشنے لگا اب خطِ کوفی کھجور کی چھال، پتھر کی تختیوں، لکڑی کے صفحات، کھال اور ہڈی کے قرطاس سے آگے بڑھ کر کاغذ پر اپنے فن کا مظاہرہ کرنے لگا تھا۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ خلافتِ علوی میں اسلامی مملکت کی مرکزیت مدینہ منورہ سے نکل کر کوفہ کی سمت بڑھ چکی تھی اور دورِ امیہ میں اس کا رخ دمشق کی طرف ہوا۔ چنانچہ مکہ، مدینہ، کوفہ کے بعد علمی، ادبی مرکز بھی تبدیل ہو کر دمشق پہنچے لیکن خطاطی کے حوالے سے کوفہ کی حیثیت مرکزی ہوتی جا رہی تھی۔ دورِ امیہ میں خطِ کوفی قرآنی خطاطی کے ساتھ امورِ مملکت میں ہاتھ بٹانے لگا تھا۔ ساتویں صدی عیسوی تک بلا شرکتِ غیرے مذہبی اور غیر مذہبی سبھی امور طے کرتا رہا۔

خطِ کوفی کے بارے میں ایک نظریہ یہ بھی تھا کہ اسے خدا کی طرف سے قرآن کی خطاطی کے لیے مختص کیا گیا ہے جب کہ کسی دور میں بھی صرف قرآن کے لیے مختص نہ تھا اور نہ ہی اسے آخری خط کبھی سمجھا گیا جو کہ نزولِ قرآن کے زمانے میں رائج تھا اور اس دور میں نہ صرف قرآنی بلکہ خط و کتابت کی طرف منتقل ہو گیا۔ اس وقت تک خطاطی ایک اہم مسلمہ فن کی حیثیت اختیار کر چکی تھی اس میں اتنا حسن اور معتبرانہ شان پیدا ہو چکی تھی کہ سسلی کے بادشاہ راجر دوم نے اپنے شاہی لبادہ فاخرہ نیم مدار حاشیے پر خطِ کوفی میں کلمات تحریر کرا لیے تھے چنانچہ جب عباسی دور شروع ہوا تو خطاطی کے دل کش ماحول کو ایک توانا روایت ورثہ میں ملی۔

ابتدائی عباسی دور میں پہلا استادِ فن ضحاک بن عجلان نظر آتا ہے اس نے قطبہ بن المحرر کے چار قلموں کا تصرف

نوک پلک سنواری بلکہ اصلاح کر کے اس کے نئے نئے زاویے تلاش کیے۔
منصور عباسی کے دور میں اسحاق بن حماد کا بڑا چرچا ہوا۔ اس نے ضحاک قلموں میں اصلاح کے ساتھ کوفی کو نئی طرز میں لکھنے کی کوشش کی۔

اسحاق کی تقلید کرنے والوں میں یوسف لقوہ اور ابراہیم کا بڑا نام ہے۔ اسحاق ہی کے شاگردوں میں شبیر عبد الجبار، رومی، شعرانی، عمرو بن سعدہ، الابرش، سلیم خادم جعفر برمکی کے علاوہ ایک خاتون شنار نے بھی اسحاق کے سامنے زانوئے ادب طے کیا۔ ابن ندیم "الفہرست" میں اسلام محمد بن اسحاق کے حوالے سے ذکر کرتا ہے کہ مہدی عباسی کے اواخر تک اسلام میں چار خط واضح ہو چکے تھے۔ مدنی، مکی، بصری اور کوفی۔ مگر جب ہم ان خطوط کا جائزہ لیتے ہیں تو بھی ان میں ماسوائے قدرے مقامی رنگ کے چندے فرق محسوس نہیں ہوتا۔ یہ قدیم کوفی ہی تھا جو اساتذہ فن کے کمالات سے مہذب ہو چکا تھا۔
بہرکیف خط کوفی کا جدید دور خلیفہ ہارون رشید کی خلافت سے قدرے پہلے شروع ہوتا ہے جب خلیل بن احمد نحوی نے نہ صرف کوفی خط میں اصلاحات کے وسیلے سے اسے زیادہ دل آویز بنایا ہے بلکہ رسم الخط اعراب اور منقوط حرفوں کو از سر نو ترتیب دیا۔

اسحاق بن حماد کے شاگردوں میں دو نام ایسے بھی ممتاز ہیں جنھوں نے فن خطاطی کو کمال فن عطا کیا۔ یہ ابراہیم السجزی اور یوسف السجزی تھے۔ الثلثین ابراہیم السجزی کا ایجاد ہے جس کو خط کوفی کی عام طرز کی نسبت سبک رفتار قلم کہا گیا ہے۔ اس میں ہر لفظ کا متن چوتھائی لکھا جاتا تھا۔ اور غالباً اس نے آگے بڑھ کر خط ثلث کی صورت اختیار کی ہے جسے عربی خطاطی میں بڑی شہرت ملی۔

ابراہیم کے بھائی یوسف نے الثلثین سے بھی زیادہ سبک قلم ایجاد کیا جسے توقیعات کے نام سے موسوم کیا گیا، اور اسی قلم میں تمام فرامین شاہیہ لکھے جانے لگے، اور دوسرے تمام امور کے لیے اسے ہی استعمال کیا جا رہا ہے۔
خط کوفی شہر کوفہ کی نسبت سے ممتاز ہے اور کوفہ جو طلوع اسلام کے بعد ۱۷ھ میں آباد تھا۔ حقیقت میں ثقافت حیرہ کا وارث تھا، اور حیرہ ایک زمانہ تک ایک طاقتور علمی، ادبی اور ثقافتی مرکز رہا۔ چنانچہ خط حیرہ اس کی روزمرہ کی زندگی کا حصہ بن چکا تھا اور جو قبل از اسلام حجاز میں داخل ہوا، تو بالآخر خط واحد کی حیثیت سے مصحف کی تحریر میں آنے کا اولین شرف بھی اسے ہی حاصل ہوا۔
۸۰ھ کے بعد فن خطاطی میں تزئین کا آرائشی رویہ سامنے آیا۔ اور ۹۶ھ میں ایک نادر روزگار خطاط خالد بن الہیاج نے فن خطاطی کا مظاہرہ کیا اور پہلی بار مسجد نبوی میں سورت الشمس کی خطاطی کر کے مصورانہ خطاطی کی اولاً بنیاد رکھی۔ خالد بن الہیاج نے یہ صورت خط کوفی میں لکھی تھی چنانچہ خط کوفی کی مصورانہ حیثیت اجاگر ہونے لگی۔ خالد نے بڑے خوبصورت انداز میں قرآن کی کتابت بھی کی جب عمر بن عبدالعزیز نے ان کے کمال فن کو دیکھا تو اپنے لیے ایک قرآن لکھنے کی فرمائش کی۔ مگر جب خالد سونے کے پانی سے قرآن کی کتابت کر کے قرآن لایا تو عمر بن عبدالعزیز نے اس عمدہ

کرایا جس نے خطاطی کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔

ابن مقلہ سے قبل خطاطی کے لیے کوئی خاص قواعد وضوابط نہ تھے۔ چنانچہ فنکار جو چاہتا کرتا تھا جس خطاطی میں ایک تنظیم نہیں ہو پاتی تھی اور توازن وتناسب کے بغیر فنکار کی ذرا سی چوک خط کے حسن کو مجروح کر دیتی تھی چنانچہ ابن مقلہ نے سب سے پہلے خطاطی کے قواعد وضوابط وضع کر کے خطاطی میں تنظیم کی ایک بنیاد رکھی۔ حروف ابجد کی ترتیب متعین کی جو اب ت ث ج ح خ وغیرہ موجودہ طرز ہے۔

گرامر کو از سر نو ترتیب دیا۔ اعراب ثلاثہ، جزم، تشدید اور تنوین کے ساتھ فرہنگ درست کی اور بالآخر ۳۱۰ھ میں اس نے وہ کارنامہ انجام دیا جس کے سبب اس کا نام تاریخ سے کبھی خارج نہ ہو سکے گا۔ وہ چھ نئے خطوں کی ایجاد تھا۔

ثلث، ریحان، نسخ، توقیع، رقاع اور محقق ابن مقلہ نے چھ خط ایجاد کرنے کے بعد ان کے قواعد بھی وضع کیے اسے تحریری مقاصد سے نکال کر اسلامی فنون لطیفہ کا ایک طاقتور شعبہ بنانے میں اجتہاد کیا

خطاطی میں ایک تنظیم قائم ہونے سے عربی خط میں ایک حسن کاری کے ساتھ صوتی موسیقیت پیدا کر دی جیسے پیالوں سے ابھرنے والے سُر ایک دوسرے کے توازن کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ اسی طرح ابن مقلہ نے عربی خط میں توازن وتناسب کا ایک ایسا صوتی نظم قائم کر دیا جو اس کے صوری حسن میں بے پناہ حسن کا باعث بنا۔

ابن مقلہ کے فنی اجتہاد نے فن خطاطی کو نئے جہانوں سے روشناس کرایا۔ چنانچہ اس کی نئی روایات کو عروج تک پہنچانے کے لیے ابوالحسن بن ہلال البواب، زینت احمد، الاہرابہ، یاقوت اول۔ یاقوت دوم، یاقوت سوم مستعصمی میں سے یاقوت سوم یاقوت بن عبداللہ رومی مستعصمی ایک ایسا استاد فن تھا جس نے خط نسخ میں کمال فن حاصل کیا۔ اس کے تلامذہ میں استادانہ کشش کا نہ کا بڑا چرچا ہے جن میں ارغون بن عبداللہ کامل یوسف شاہ مشہدی، سید میر حیدر جلی نویس، شیخ زادہ احمد سہروردی، مبارک شاہ بن قطب تبریزی، نصر اللہ طبیب، صدر عراقی وہ صاحب قلم خطاط تھے جس سے آگے سلسلۂ خطاطی دراز ہوا۔

یاقوت سوم آخری عباسی خلیفہ کے دربار سے وابستہ تھے۔ چنانچہ تاتاریوں نے جب بغداد کو تباہ کر دیا تو عرب مرکزیت مختصر ٹکڑوں میں بٹ کر رہ گئی اور اس طرح ایک نیا مرکز ایران بنا۔

ایران کا جدید دور

بارھویں صدی ق م فنیقیوں نے حرف تہجی اختیار کر کے فن تحریر کی دنیا میں انقلاب آفریں دور کا آغاز کر دیا۔ خامہ آرامیوں نے اسے سنوار کر پھیلایا۔ اور اس سے بے شمار شاخیں پھوٹیں۔ ان میں عبرانی، عربی، کوشی، براہمی کے ساتھ ساتھ پہلوی رسم الخط بھی تھا۔

کسی بھی تہذیب کی ترقی یافتہ ہونے کی دلیل اس کے رسم الخط سے عیاں ہوتی ہے اس لحاظ سے ایران اپنی روایات میں ایک طاقتور ثقافتی علمی، ادبی، تہذیبی ورثے کا مالک ہے۔ اسلام کے ایران پر غلبہ اور ساسانی

حکومت کے خاتمے سے جہاں آتش پرستی کے مذہب کو دیس نکالا ملا۔ وہیں قدیم پہلوی رسم الخط بھی رخصت ہوا اور پہلوی زبان کے لیے عربی رسم الخط اختیار کر لیا گیا۔

عربی رسم الخط کی تیزی سے قبولیت کے پیچھے بھی وہی فلسفہ کارفرما تھا جس کے تحت دوسرے علاقوں میں عربی کے ساتھ عربی رسم الخط قبول ہوا۔ ایران میں اسلام کے پھیلتے زاویوں میں قرآن کی تعلیم کا رجحان بھی بڑھا اور قرآن کی تعلیم کے بنیادی عناصر میں خطاطی کا فن اتنا ہی اہم ہے جتنا پڑھنا۔ چنانچہ عربی خطاطی نے بہت جلد ایران میں اپنے لیے جگہ بنا لی اور آٹھویں صدی تک پہنچتے پہنچتے نہ صرف عربی رسم الخط پوری ایرانی زندگی پر محیط ہو گیا بلکہ اس میں اصلاح کی طرف توجہ دی جانے لگی۔

خلیفہ مامون الرشید کے زمانے میں خراسان علم و فن کا مرکز بن گیا تھا اور آہستہ آہستہ تمام علوم و فنون کے ماہر خراسان کا رخ کرنے لگے تھے۔ یہ بات ان تمام علاقوں میں مشترک نظر آتی ہے کہ جہاں جہاں اسلام گیا وہاں وہاں اخلاق مساوات اور تعلیم بلا امتیاز رنگ و نسل مسلم ثقافت کے ایک واضح رخ کو ظاہر کرتی چلی گئی۔

ایران میں بھی یہی ہوا مسلمانوں کی آمد سے صرف ان کا مذہب متاثر نہیں ہوا، زبان، رسم الخط، ادب اور ثقافت بھی نئے رنگ، نئے رنگ اختیار کرنے لگی۔ چنانچہ فارسی کا سارا شعری نظام عربی سے مستعار ہے۔ عربی رسم الخط کے تمام ارتقائی مرحلے مرحلہ در مرحلہ ایران میں مقامی رنگ اور ذوق کے اعلیٰ مذاق کے سبب زیادہ تیزی سے طے ہوتے چلے گئے، چنانچہ چوتھی صدی میں جب عرب میں چھ خط ایجاد ہوئے تو ساتویں صدی میں ایران نے رقاع اور توقیع کی آمیزش اور قلمِ بریدہ سے ایک نیا خط ایجاد کر لیا جس کا نام تعلیق ہوا۔ یہ خط حسن بن حسین علی فارسی کے قلم کا کارنامہ تھا عربی حروف فارسی آوازوں کے لیے ناکافی سمجھے جاتے تھے اور کئی آوازیں ایسی تھیں جس کے لیے عربی میں حروف نہ تھے۔ چنانچہ عربی رسم الخط میں اصلاح کی پہلی کوشش خواجہ عبدالعالی بیگ نے کی اور پ، چ، ژ، گ ایجاد کیے اور ساتھ ساتھ ہی خطِ تعلیق میں اصلاحات کیں۔ نئے حروف کی ایجاد سے جہاں ایک طرف عربی حروف فارسی آوازوں سے ہم آمیز ہوئے وہیں تعلیق کے حسن میں بھی اضافہ ہوا۔ تعلیق میں مسلسل اصلاحات کے سبب محققین کو غلط فہمی ہوئی اور انھوں نے خواجہ عبدالعالی کو خطِ تعلیق کا موجد لکھنا شروع کر دیا۔ تعلیق کے سلسلے میں مولانا درویش کا نام بھی بڑا اہم ہے جن کے علاوہ تعلیق کے ضمن میں خواجہ عبداللہ صیرفی، ملا محی الدین شیرازی، ملا عبداللہ آتش پر ہروی، ملا ابوبکر ملا شیخ محمود، حافظ حفیظ اور خواجہ عبداللہ مروارید بھی آگے چل کر نامور ماہرین تعلیق ہوتے ہیں۔ اور ان مشاہیر فن کو استادانِ ہفت قلم کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ اسی دوران ترکیہ میں ان خطوط سے دمشقی، دیوانی اور رقاع قلم ایجاد ہوئے۔

ایرانیوں کو جب منگولوں کے حملوں سے نجات ملی اور امیر تیمور مسند اقتدار پر پہنچا تو خطاطی کی دنیا میں انقلاب آفریں تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔ مگر ابھی یہ فن کسی قدرداں کی نظرِ کرم کا منتظر تھا۔

تعلیق ایران کی نجی زندگی اور نسخ مذہبی کتب کی کتابت کے لیے مخصوص ہو چکے تھے۔ ثلث آرائش اور روزمرہ

ذرا بھی کہیں کہیں نظر آتے۔

تیرھویں صدی کے اواخر اور چودھویں صدی کے وسط تک ایرانی خطاطی عروج پر نظر آتی ہے۔ اب بھی اس کا فریضہ مصاحف کی خطاطی ہی تھا۔ مگر اس کی آرائشی اور فنِ تعمیر میں مشارکت سے نئے رجحانات نمایاں ہونے لگے تھے۔ اس دوران مصاحف کی کتابت میں شاندار ارتقا نظر آتا ہے۔ کیونکہ تاتاریوں کے قبولِ اسلام کے بعد انھوں نے فنِ مصوری اور خطاطی کے اختلاط سے آرائشی اور مصوری خطاطی کے رنگ ظاہر ہونے لگے۔ خوبصورت رنگوں کی آمیزش سے قرآن کی خطاطی ایک نئے دور میں داخل ہوتی دکھائی دیتی ہے۔

قرآن کی جدید خطاطی اور نئے رنگ ڈھنگ تک آنے کے لیے ایک مختصر جائزہ لیتے ہیں۔ جو ایلخانی دور اس سے ذرا قبل کی خطاطی کے بارے میں کئی سوالوں کا جواب مہیا کرتا ہے۔

جیسا کہ میں نے اوپر تفصیل سے بات کی تھی کہ ایران کے قبولِ اسلام کے بعد عربی رسم الخط بھی ایرانیوں نے اپنا لیا۔ اس وقت عربی خط میں خطِ کوفی مستعمل تھا۔ اور ابھی اس نے نیا نیا مصاحف کی خطاطی کا فریضہ سنبھالا تھا۔ چنانچہ جب خطِ کوفی ایران میں آیا تو اس کے افقی اور ملفوظ زاویوں کی نسبت عمودی حصوں پر زیادہ توجہ مرکوز کی گئی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خطِ کوفی کی ایران میں قدرے مختلف شکل سامنے آئی اور اس کے آرائشی پہلوؤں اور قد پر توجہ مرکوز ہوئی کہ جب حرف جملے میں بدلتا تو ایک غیر محسوس منظم صورت اس کے حسن کو دوبالا کر دیتی۔ یہ ابتدائی تشکیلات تھیں اور اس خط میں لکھا ہوا قرآن جو چرمی کاغذ پر ہے اسے دیکھ کر بہت بعد میں سامنے آنے والے نیا سمہ دور کے آرائشی خطوط سے مشابہت ایرانیوں کے ذوقِ کمال کی داد طلب کرتی ہے۔

چھوٹی تقطیع پر لکھے ہوئے ایک چرمی قرآن کے چند اوراق میٹرو پولیٹن میوزیم نیو یارک میں اب تک محفوظ ہیں ان کی سورہ کے عنوانات کی طلمکاری حاسی دور کے نقش و نگار سے مشابہت رکھتی ہے

پانچویں صدی ہجری کے اوائل سے چھٹی صدی ہجری کے اختتام تک سلجوقیوں کا دور بھی فنِ خطاطی کے لیے بڑا مبارک ثابت ہوا۔ اس دور میں خطِ کوفی معراج کی انتہاؤں پر نظر آتا ہے۔ دراصل اس دور میں صرف مصحف کی خطاطی میں کمال نظر آتا ہے بلکہ آرائشی خطاطی اور دوسری خطاطی میں بھی حسن و تہذیب کی انتہا پر تھا۔ صفحہ کے گرد حاشیہ اور نقش و نگار میں کوفی میں کمال دکھائی دیتا ہے۔ برٹش میوزیم میں اب تک چند ایسے صفحات موجود ہیں جن کو دیکھ کر سلجوقیوں کے مصوری اور خطاطی کی داد دینی پڑتی ہے ان مصاحف کو ابو القاسم بن ابراہیم نے کتابت سے آراستہ کیا تھا اس پر ۴۲۷ھ (۱۰۲۹ء) کی تاریخ درج ہے۔ اسی دور کے دو صفحات میٹرو پولیٹن میوزیم نیو یارک میں بھی محفوظ ہیں۔ یہ ایرانی کوفی میں ہیں اور سلجوقیوں کے ذوقِ نقش نگاری سے کماحقہ آراستہ ہیں۔

ایک ورق پر سورت کا عنوان لکھا ہے دوسرے ورق پر متعدد رنگوں (خصوصاً سنہرے رنگ کے ساتھ سورہ کی کتابت کی گئی ہے۔ اور اس صفحہ پر سورہ کی ابتدا سیاہی روشنائی سے جلی حرفوں میں تحریر دکھائی دیتی ہے۔

بعدازاں تعلیق اور نسخ کی خوبیوں کو یک جا کرکے خواجہ میر علی تبریزی نے نستعلیق کو ایجاد کیا۔ نسخ اور تعلیق کی نسبت نستعلیق کی پیوندکاری میں سبک اور زیبائی بہت پیدا ہوگئی اور لفظ کے صوری حسن میں بے پناہ اضافہ ہوا۔

علامہ ابوالفضل نے اس سے اتفاق نہیں کیا اور ان کا خیال ہے کہ پانچویں صدی ہجری کے ابتدائی دور میں نستعلیق کے نمونے دکھائی دیتے ہیں۔ مگر اس صدی ہجری کے ابتدائی دور میں نستعلیق کے نمونے دکھائی دینے کی کوئی دلیل دکھائی نہیں دیتی۔ بہرکیف اگر تسلیم بھی کرلیا جائے کہ یہ خط کسی لاشعوری اور بغیر نام کے پہلے موجود بھی تھا، تو خواجہ میر علی تبریزی کی امتیازی حیثیت مجروح نہیں ہوتی کہ اشیاء تو بہرحال پہلے سے موجود ہوتی ہیں۔ موجد انہیں قاعدے اور کلیہ کے ساتھ متعارف کرتا ہے۔ اس نسبت سے خواجہ میر علی تبریزی کی حیثیت موجد نستعلیق کی ہی ہے اور محققین نے ان کی اس حیثیت کو چیلنج نہیں کیا۔ خواجہ میر علی تبریزی سے کسب فیض کرنے والوں میں مولانا جعفر تبریزی، مولانا اظہر اور سلطان علی مشہدی کا نام اہم ہے۔ سلطان علی مشہدی ہرات میں سلطان حسین مرزا کے دربار سے وابستہ تھے۔ اور مرزا سلطان علی مشہدی کو سلطان حسین مرزا نے قبلۃ الکتاب کا خطاب دیا تھا۔ ۸۰ سال کی عمر میں ۹۱۹ھ (۱۵۱۲ء) میں وفات پائی۔ ان کے شاگردوں میں سات خطاط جنہیں اساتذان فن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے نستعلیق کے صاحب طرز خطاط تھے۔ ان میں سلطان محمد خندان، سلطان محمد نور، علاؤالدین محمد ہروی، زین الدین محمود، عبدی نیشاپوری، مولانا محمد قاسم شادی شاہ، مولانا محمد عبداللہ ہروی اور میر علی الکاتب ہروی شامل ہیں۔ سلطان علی مشہدی کے ہم نام چار خطاط بھی تھے۔ سلطان علی قاینی، سلطان علی خراسانی مشہدی، سلطان علی قرہ بنی ان چاروں کی وصلیاں ہندوستان میں بھی مشہور رہی ہیں۔

تیموری دور میں کتابوں کی آرائش میں فن خطاطی نے بڑا عروج حاصل کیا۔ حرفوں میں پرندوں، جانوروں کی شبیہیں بھی نظر آنے لگی تھیں۔ ان کے رنگوں کی آمیزش سے نہ صرف حرف حرف نکھر کر عجیب شوخی دکھانے تھے بلکہ پورے صفحہ کا حسن اپنی طرف کھینچ لیتا تھا۔ اور ان کے عمدہ ذوق کا اظہار ہوتا تھا نا سنہرے، قرمزی، آسمانی، سرخ اور سبز رنگوں سے حرفوں کی تزئین کرنے اس ضمن میں امیر تیمور کے بیٹے شاہ رخ اور بائسنقر مرزا کے ہاتھوں کے لکھے ہوئے اور مزین تحریریں بہترین مثال ہیں۔

ہرات کی خطاطی کے دبستان کا نفیس ترین قلمی نسخہ ۱۴۲۹ء کا ہے جس میں اس دور کے معروف رنگ اور ڈھنگ نظر آتے ہیں۔

تیموری دور کے بعد صفوی دور میں بھی فن خطاطی کو بدستور عروج حاصل ہوا، اس دور میں کمال الدین ہزاد، سلطان محمد نور (پسر سلطان علی مشہدی) شاہ محمود نیشاپوری، میر عماد حسین گوہر شاد بیگم علاؤالدین تبریزی، مرزا احمد تبریزی اور محمد ہاشم تبریزی کا نام بڑا روشن ہے۔

صفوی دربار (تبریز) میں سلطان محمد نور کو بڑا مقام حاصل تھا۔ ۱۵۲۲ء کا ایک نسخہ اب تک اس کے فن کا شاندار اظہار ہے۔

شاہ محمود دو سلاطین شاہ اسماعیل اور شاہ طہماسپ کے دربار سے منسلک تھے۔
اس دور میں ملا محمد حسین تبریزی، میر سید احمد مشہدی، ملا حسن علی مشہدی، ملا شاہ محمد نیشاپوری، میر معز کاشی اور مرزا ابراہیم اصفہانی قابل ذکر خطاط تھے۔
اس کے علاوہ میر علی الکاتب کے تلامذہ میں خواجہ اسحاق شہابی، سید احمد الحسینی شمع ریز، میر حسین حسینی، علی رضا تبریزی، بابا شاہ اصفہانی اور قاجاری دور کے خطاطین میں مرزا کوچک، زمال شیرازی، زین العابدین اشرف الکتاب، علی رضا پرتو اور نامور خاتون مریم بانو بیگمی کے ذکر کے بغیر تاریخ مکمل نہیں ہوتی۔

اب میں ایران کے باب کو اختتام تک لانے کے لیے میر عماد الحسینی سیفی قزوینی کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے ساری زندگی فقیرانہ بسر کی مگر فن کی دنیا میں انھیں جو مقام حاصل ہوا اس کی نظیر بہت کم دکھائی دیتی ہے۔ میر عماد کو استادانِ فنِ خطاطی میں سے ایک سمجھا جاتا ہے جنھوں نے نستعلیق کی بلند و بالا عمارت کھڑی کی۔ ہند و پاک میں شاید ہی کوئی خطاط ایسا ہو جس کا سلسلہ تلامذہ میر عماد سے جا کر ملتا ہو۔
میر عماد کو نستعلیق کے استاد تھے مگر انھیں ہفت قلم ماہر خطاط کا بھی درجہ حاصل تھا۔ تبریز کی اکثر عمارتوں پر اس کے لکھے ہوئے کتبات اور وصلیاں اب تک محفوظ ہیں۔
میر عماد کی شہرت اس کی زندگی میں اس قدر ہو چکی تھی کہ ترک، ہند اور عرب تک اس کے نام کے چرچے تھے۔
میر عماد نے کتابازیں تعلیمی رنگ کا را اور تبریز میں ملا محمد حسین تبریزی سے تربیت حاصل کی۔ میر عماد نستعلیق نگاری کے ضرب المثل ہیں۔ شاہ عباس صفوی کے دربار سے وابستہ تھے۔ ایک بار شاہ عباس نے حکم دیا کہ شاہنامہ فردوسی کو خط نستعلیق میں تحریر کیا جائے۔ اس سے آگے کئی روایات ہیں۔ چنانچہ جو زیادہ حوالے کے طور پر آتی ہیں ان کا تذکرہ ذیل میں کیا جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اس کے دور میں ایک کاتب رضا علی عباسی اس سے دشمنی کی حد تک حسد کرتا تھا جب ایک سال بعد شاہ نے پیغام بھیجا کہ شاہنامہ لکھا جا چکا ہے کہ نہیں اور ساتھ ہی سو تومان بھی ارسال کیے۔
میر عماد نے جواب دیا کہ ستر اشعار لکھے ہیں اور پیغام دیا کہ سو تومان کی رقم اس سے زیادہ کتابت نہیں کر سکتی۔ شاہ نے سنا تو وہ بہت ناراض ہوا، اور اس نے یہ اشعار لوٹا دیے۔ میر نے شاہ کی ناراضگی کی پرواہ کیے بغیر انھیں اپنے شاگردوں میں تقسیم کر دیا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ جب میر نے ستر شعر دیے تو شاہ نے ستر تومان عطا کیے تو میر نے حلاف شان سمجھ کر واپس کر دیے جس سے شاہ نے اپنی توہین محسوس کی۔
تیسری روایت ہے کہ جب شاہ عباس نے میر عماد کو یہ کام سونپا تو اس نے شاہ سے کہا کہ اسے ایک باغ دیا جائے جس میں ایک خوبصورت تالاب ہو جس میں عرق گلاب بھروا دیا جائے۔
شاہ عباس نے مطالبہ پورا کر دیا۔ مگر ایک سال کے بعد جب شاہ نے شاہنامے کے بارے میں پوچھا تو میر نے

جاتا ہے کہ صرف ستر بیت کتابت ہوئے ہیں۔ شاہ سخت ناراض ہوا، اور اس نے میر سے کہا کہ وہ اب تک لاکھوں تومان صرف خرچ کر چکا ہے ایک دن کے اندر لوٹائے۔

میر عماد واپس آیا۔ اور اس نے وہی ستر اشعار فروخت کر کے آدھے دن میں رقم لوٹا دی۔ جسے شاہ نے اپنی توہین سمجھا اور وہ سخت ناراض ہوا۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ میر عماد سنی العقیدہ تھا اور شاہ شیعہ تھا۔ چنانچہ رضا عباسی نے حسد اور انتقام میں شاہ کے سامنے ایسی باتیں کیں کہ وہ ناراض ہو گیا۔

اس میں سے حقیقت کچھ بھی رہی ہو، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میر عماد جس کی عمر اس وقت ۶۲ سال تھی ایک شام حمام گیا وہاں سے وہ باہر نکل رہا تھا کہ اسے قتل کر دیا گیا۔ محققین اس بات پر متفق ہیں کہ اس کو قتل کر دیا گیا۔ مصنفین اس بات پر بھی متفق ہیں کہ اس کے قتل میں شاہ عباس کا کینہ شامل تھا اور اس طرح فن خطاطی اپنے استاد وقت سے محروم ہو گئی۔

مغل دور کا آغاز

سلجوقیوں کے اقتدار نے خلیفہ کے اثر کو اصلاً ختم کر کے اسے علامتی خلیفہ بنا دیا تھا لیکن مغلوں کی آمد پر خلیفہ کی یہ حیثیت بھی باقی نہ رہی اور ہلاکو خان نے ۱۲۵۸ء میں آخری عباسی خلیفہ کا اقتدار ختم کر کے اپنی ایک نئی ریاست کی بنیاد ڈالی جو اتحاد کی طرز پر سلطنت کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

مغلوں کے بڑھتے ہوئے ثقافتی سیلاب نے اسلامی دنیا پر تسلط ہونے، اسلامی علوم و فنون کے آگے بڑھنے کے راستے ہی کو نہ روکا بلکہ ان علاقوں میں اس کے ارتقاء کے امکانات بھی ختم کر دئے۔ امیر تیمور نے اپنی تمام تر وحشت و بربریت کے باوجود اپنی طرز کے اسلامی آرٹ کی نشو و نما کے لیے بڑا کام کیا۔

سولہویں صدی میں مغلوں نے ہندوستان کا رخ کیا۔ بابر اور ہمایوں کے ادوار میں ایرانی اثرات ہند کی نو مروج فنی اصناف پر چھائی رہی۔ مگر اکبر کے دور میں آکر ایرانی اثرات کم ہونے لگے، اور رفتہ رفتہ ہند میں مغلوں کی ایک ثقافتی لہر پیدا ہونے لگی۔

بابر کو فنون لطیفہ کے مربی کی حیثیت حاصل ہے۔ انھوں نے فن مصوری، فن تعمیر اور فن خطاطی پر بڑی توجہ دی۔ فن خطاطی اس کے اجداد کا پسندیدہ فن تھا۔ چنانچہ بابر نے اس فن کو سیکھا اور ہفت قلم کہلایا۔ بابر جب ہندوستان آیا تو جہاں وہ مصوروں، سنگ تراشوں، ماہرین تعمیرات، شاعر، ادیب اور مورخ لایا وہیں خطاطوں میں خواجہ عبدالصمد میر سید علی شیخ زین خوافی بھی اس کے ساتھ آئے۔

بابر کے بعد ہمایوں ۹۶۳ھ کے تخت نشین ہوا۔ مگر شیر شاہ سوری کے ہاتھوں شکست کھا کر ایران چلا گیا اور برسوں کی جلاوطنی کے بعد جب دلی کے پایہ تخت پر قابض ہوا تو وہ قابل استاذان فن خواجہ عبدالصمد شیرازی اور میر سید علی کو دربار میں لے آیا اور ان سے مصوری اور خطاطی کے شاہکار تخلیق کرائے۔

بابر نے فن خطاطی کی جس طرح بنیاد رکھی تھی ہمایوں نے بھی اس انداز سے اس کی آبیاری کو جاری

مگر وہ زیادہ دیر تک زندہ نہ رہا۔

ہمایوں کے دربار میں عبدالحی کے علاوہ عہد ہمایونی کے نامور خطاط خواجہ سلطان علی بھی تھے جنہیں بعد میں اکبر نے افضل خاں کا خطاب عطا کیا تھا۔

میں اوپر بیان کر چکا ہوں کہ خطاطی باعث عزت پیشہ گردانا جاتا تھا چنانچہ ملکہ گلبدن نے جہاں ہمایوں میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے وہیں فن خطاطی میں اس نے کمال حاصل کیا اور اس کا نتیجہ تھا کہ نور جہاں آرا اور زینت النساء مخفی نے جہاں شعر و ادب میں اپنا سکہ جمایا وہیں فن خطاطی میں جوہر دکھائے۔

اکبر کا دور صحیح معنوں میں سلطنت کے بام عروج کا دور رہا ہے۔ یہاں فن خطاطی نے ابتدائی ارتقائی منازل طے کیں۔ اکبر مصوری کا دلدادہ تھا چنانچہ فن مصوری میں آرائشی خطاطی نے ایک نئے انداز سے پر پھیلائے۔

اس دور میں استعمال مصوری کرنے کا رجحان رواج پا رہا تھا۔ چنانچہ بے شمار کتب آرائشی خطاطی اور مصوری کے ساتھ سامنے آئیں جن میں استادان فن اپنی مہارت اور ہنرمندی کے جوہر دکھا رہے تھے۔ اس دور کی مصورانہ خطاطی کے بیشتر نمونے آج بھی دنیا کی مختلف لائبریریوں خاص طور پر برٹش و بوڈلین میوزیم امریکہ میں موجود ہیں۔

مغلیہ دور میں بے شمار نامور خطاط پیدا ہوئے جن میں محمد حسین کشمیری، خواجہ عبدالصمد شیرازی، دوست، مولا عبدالعزیز، خواجہ محمد شریف، عبدالرشید دیلمی، امانت خاں شیرازی، مرزا عبدالرحیم خان خاناں، میر معصوم قندھاری اور مولانا معصوم ہروی، مسکین کابلی، احمد حسین حسینی، علی احمد ہرکنا، مرزا محمد حسین، میر عبداللہ تبریزی، خسرو شہزادہ سلطان پرویز شہزادہ، محمد بن اسحاق، احمد علی ارشد، عبدالباقی مدار، عارف یاقوت رقم، میر محمد کاشی، سید علی حسینی اور دوسرے بہت سے نامور خطاط گزرے ہیں۔

جس کی دو شکلیں ـــــ نسخی اور مغربی کے روپ میں ظاہر ہوئیں۔ نسخی نے آگے چل کر نویں صدی عیسوی میں خط نسخ کی شکل اختیار کی۔ اس خط نے عباسی دور میں کافی ترقی کی۔ اس کا سب سے بڑا کاتب جمال الدین یاقوت المستعصمی (المتوفی ۶۹۸ھ) ہے۔ ہرمن و منر مشرقیہ کے مخطوطات اس خط میں دستیاب ہیں۔ عباسی دور طویل ہونے کی وجہ سے خطاطی، جلد سازی، مذہب کاری اور مصوری کے لیے ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہارون رشید کے حکم سے کاغذ کا استعمال عام ہوا۔ خطِ کوفی کتبات، عنوانات اور عمارتوں کی جالیوں کے لیے مخصوص ہوگیا۔ عنوان اور سرلوح ایجاد ہوئے۔ لاجوری روشنائی تیار کی گئی۔ یاقوت سے پہلے ابوعلی محمد بن علی المشہور بہ ابن مقلہ اور ابوالحسن علی بن ہلال المعروف بہ ابن بواب نے کافی شہرت حاصل کی۔ ثلث اور نسخ خطوط نے اپنا ایک مستقل مقام بنالیا۔ طرز مرصع بھی مقبول رہا۔ یاقوت کے ساتھ ہی مرقعات کا دور بھی شروع ہوا۔ تیرھویں صدی عیسوی تک خطِ نسخ ساری دنیائے اسلام کا خط تھا۔

تاتاری یلغار کے بعد اسلامی تہذیب کا گہوارہ ایران قرار پایا۔ بعد ازاں خطاطی کا مرکز بھی ایران قرار پایا۔ گیارھویں صدی عیسوی کے لگ بھگ ایرانیوں نے فارسی زبان و ادب کے لیے خط تعلیق ایجاد کیا۔ یہ خط بھی اپنے تکلف و خوبصورتی کی وجہ سے زیادہ مقبول نہیں ہوا مگر چودھویں صدی عیسوی تک اس کا رواج رہا اور اخیر چودھویں صدی عیسوی سے مکمل اور بہترین خط، خطِ نستعلیق کو جنم دیا جو ستائی پختہ کاری اور دائروں و نقاط کا ماہرانہ استعمال اس خط کی خصوصیات ہیں۔ نستعلیق کے ممتاز کاتب ہیں میر علی تبریزی، جعفر و نظر تبریزی، سلطان علی مشہدی، سلطان محمد نور، خندان، میر علی ہروی اور میر عماد وغیرہ۔ ایرانی خطاطی و مصوری نے اسلامی مخطوطات کو خوبصورتی اور وقار بخشا۔ ایران کے معاصر ترکی نے اپنے زبان و ادب کے لیے خطِ دیوانی ایجاد کیا جو نہایت دقیق اور پیچیدہ تھا۔ اسی کو آسان بنانے کے لیے خط رقعہ معرض ظہور میں آیا۔ ترکوں کی اہم ایجاد طغرا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ عربی طرز طغرا کی ترقی یافتہ شکل ہو لیکن طغرا کی ایجاد کی تاریخ متعین نہیں جب کہ خطِ دیوانی و رقعہ تیرھویں صدی کی ایجاد ہیں اس کے بعد طرزِ طغرا بھی ملنے لگتا ہے۔ اس میں کسی کسی رسم الخط کو اس طور سے لکھا جاتا ہے کہ یہ عبارت سرسری نظر میں ڈیزائن یا جالی یا تصویر نظر آتی ہے۔ اسی طرز نے سب سے زیادہ مقبولیت حاصل کی اور آج تک رائج ہے۔ اس کے مختلف شکلوں کے مختلف نام ہیں جیسے طاؤس، ہلال اور معکوس وغیرہ۔ ترکی طرز سباق پڑھنے والے کی ذہنی فکر کا امتحان ہے اور اس کی اگلی شکل طرز معمہ ہے۔ نستعلیق کی خوبصورتی اور پختہ کاری نے کاتبوں کو مجبور کیا کہ وہ زود نویسی کے لیے کوئی خط اپنائیں۔ خطِ شکستہ جو سترھویں صدی عیسوی کی پیدائش ہے، اسی مشق کا نتیجہ ہے۔ خطِ شکستہ کی اصل و ارتقا شکل خطِ شفیعہ ہے جو ایران میں مقبول ہے جب کہ خطِ شکستہ نے ہندوستان میں ترقی کی۔

تقریباً بارھویں صدی عیسوی سے خطاطی کا مرکز ہندوستان منتقل ہونے لگا۔ خاندانِ غلامان کے عظیم الشان بادشاہوں نے کھلے دل سے اس فن کی سرپرستی کی۔ کہتے ہیں خود سلطان ناصر الدین خواجہ بہترین خطاط تھا قطب الدین ایبک، التمش اور رضیہ وغیرہ نے بھی اس فن کو ابھرنے کے مواقع فراہم کیے خلجی، تغلق، اور لودھی سلاطین، نے بھی خطاطی کی ترقی میں

اخذ لانہ رویہ اختیار کیا۔ ابتدائی نسخی رسم الخط کتابت میں دستیاب ہوا ہے جو دوسری صدی ہجری مطابق آٹھویں صدی عیسوی سے تعلق رکھتے ہیں۔ نسخ دور سلطنت کا مقبول ترین خط رہا۔ عربی و فارسی دونوں کے لیے مستعمل تھا۔ فن خطاطی کو سلطنت دور نے ایک نیا ہندوستانی خط بخشا جو آج خط بہار کے نام سے مشہور ہے اس خط میں لکھے گئے ابتدائی سولہویں صدی عیسوی کے کئی قرآن مجید سالار جنگ میوزیم میں دیکھے جا سکتے ہیں لیکن یہاں کا قدیم نسخہ "تاج المآثر" کی ایک نقل ہے جسے محمود کاتب نے ۱۵۳۱ء میں نقل کیا۔ ہمارا خیال ہے کہ بیرونی کاغذ بارہویں صدی عیسوی میں ہندوستان میں درآمد کیا جاتا تھا۔ طلائی اور سجاوٹ کا کام عمدہ ہوتا تھا لیکن مصور نسخے نایاب ہیں۔ کوفی، ناریخ، توقیع اور ریحان سرخیوں کے استعمال ہوتے تھے۔ قدیم اردو کی صورت گری اسی دور میں ہوئی۔ بھکتی تحریک اور تصوف شائع ہوئے۔

عربوں اور ایرانیوں کا تعلق جنوبی ہند سے بھی قدیم ہے۔ ملابار اور سورت، کیرالا اور گجرات کے ایسے سواحل ہیں جہاں عرب و ایرانی زمانہ قدیم سے آمد و رفت رکھتے۔ خلجی دور میں مسلمانوں کی زیادہ تعداد پہنچی حسن کا نسخہ عزت دور محمد تغلق سے مختلف سیاسی اور تہذیبی عوامل کے باعث سلطنت بہمنیہ کا وجود عمل میں آیا۔ سلاطین بہمنی فارسی زبان و ادب کے بڑے دلدادہ و سرپرست تھے۔ خط کوفی، ثلث، ریحان اور نسخ عام خطوط تھے۔ ابتدائی نستعلیق کی جھلکیاں بھی اسی دور کے خط میں صاف صاف دکھائی دیتی ہیں۔ دولت آبادی نامہ اور بیدر کے ظروف اسی دور کی نمایاں اشیا ہیں۔ زبان کی نشو و نما بھی بہمنی دور کا اہم کارنامہ ہے کئی ہندوستانی الفاظ رد و بدل کے ساتھ فارسی میں داخل ہوئے اور اسی طرح کئی مقامی زبانوں اور خصوصاً مرہٹی پر فارسی کے زبردست اثرات نمایاں ہونے لگے۔ ابتدائی تعلیم میں طالب علم کو پہلے سبق دیا جاتا تھا اس سبق کا نام تختی کا نسخہ تھا۔ عبدالقادر، علی صوفی خطاط، نعمت شیرازی، شکر اللہ قزوینی، شیخ ابراہیم طہرانی اور ملا داؤد بیدری اس دور کے اعلیٰ کاتب تھے۔

شمالی ہند کے لیے سولہویں صدی عیسوی اس لیے بھی اہم ہے کہ اس صدی میں جلیل القدر مغلوں نے اپنی مضبوط و مستحکم اور معیاری حکومت قائم کر لی۔ اس دور کی نمایاں خصوصیات میں خط نستعلیق کا عام رواج ہے کتابت کا کھلے عام استعمال دربار و زبان فارسی کی ترقی کے علاوہ مصور قلمی و مصوری کی مقبولیت ہے۔ مغل بادشاہوں اور شہزادوں نے علم و ادب کے پرچم کو بلند کیا۔ ان کے علاوہ امرا و وزرا میں عبدالرحیم خان خاناں کی سرپرستی قابل ذکر ہے۔ عبدالصمد شیرازی، محمد حسین کاشمیری، عبدالرحیم، عبدالرشید دیلمی اور راجہ النفاء موسوی وغیرہ اس دور کے مشہور کاتب ہیں خط نستعلیق کے علاوہ ثلث، نسخ، ریحان اور طرز ہائے جلی، خفی اور طغرا بھی مقبول تھے۔

اس سلسلہ کی ایک اہم چیز خط شکستہ کا چلن ہے۔ ابتدائے دور جہانگیری ہی سے اس خط نے بڑا مقبول عام حاصل کیا۔ مرقعات نے بھی فروغ پایا۔ اس دور کے دیگر اہم طرز ہیں غبار، زلف عروس، گلزار، پیچاں، مرغول، رنگین، جواہر، سلیمانی، رسم لاہوری وغیرہ۔ مغلوں ہی کے اثر سے راجستھان، گجرات، بنگال اور کشمیر میں بھی خطاطی نے غیر معمولی ترقی کی۔

آندھرا پردیش شاندار ماضی کی بازیافت کی طرف رواں دواں

آندھرا پردیش اپنا شاندار ماضی رکھتا ہے۔ یہ علاقہ زرخیز اور ترقی یافتہ رہا ہے اور یہاں کے لوگ بہادر اور حوصلہ مند رہے ہیں۔ اس زمانہ میں صنعت و حرفت نے نمایاں ترقی کی تھی۔

ستیہ واہنہ، اکشواکو، کاکتیہ اور وجے نگرم کے سلاطین کے دور حکومت میں تلگو زبان ملک کے کونے کونے میں پھیل چکی تھی۔ نئی حکومت جو مسٹر این ٹی راما راؤ کی زیر قیادت قائم ہوئی ہے، چاہتی ہے کہ دوبارہ وہی ماضی کی خوشحالی اور بہتری لوٹ کر آئے۔ اس سلسلے میں ۳ ماہ کی قلیل مدت میں نئی حکومت نے بڑے اہم فیصلے کیے ہیں۔ ریاست کے کسانوں کے لیے ۲۰ روپے فی کنٹل کے حساب سے سب سیڈی کا فائدہ ہوا ہے۔ ۲ء۲ لاکھ مکانات کمزور طبقوں کے لیے تعمیر کیے گئے ہیں اور غریبوں کے لیے ۲ روپے فی کیلو چاول مہیا کیا گیا ہے۔ اسمبلی میں ایک قرارداد کے ذریعہ خواتین کی فلاح و بہبود کو پیش نظر رکھتے ہوئے جائداد کے مساوی حقوق پر زور دیا گیا ہے۔ آئندہ تعلیمی سال سے ترو پتی میں خواتین کے لیے ایک یونیورسٹی کے قیام کا منصوبہ روبہ عمل لایا جائے گا۔

۶۲ لاکھ اسکول کے طلباء کے لیے دوپہر کے مفت کھانے کا انتظام بھی روبہ عمل ہے۔ اسمبلی میں ایک قرارداد کے ذریعہ لجسلیٹو کونسل کے اس حکم کو منسوخ کیا گیا ہے جس میں کسان رکن اسمبلی کو وظیفہ نہ دیئے جانے کی سفارش کی گئی تھی۔ سرکاری ملازمین کے وظیفہ کی عمر ۵۸ سال سے گھٹا کر ۵۵ سال کر دی گئی ہے تاکہ بے روزگار افراد کو روزگار مہیا ہو سکے

ریاستی کارپوریشنوں کی تعداد کو گھٹایا گیا ہے۔ دھرما مہا منترا آفس کے قیام کے ذریعہ عوامی زندگی سے کرپشن کو ختم کیا جائے گا۔ تلگو سکریٹریٹ کی سطح تک دفتری زبان ہوگی۔ تمام عوام کی فلاح و بہبود اور ہمہ جہتی ترقی کے لیے ایک ۲۰ نکاتی پروگرام کو روبہ عمل لایا گیا ہے جو ترقی کے اُفق روشن کرے گا جس کے تحت پینے کے پانی اور غریب طبقات کی فلاح و بہبود اور ان کے مکانات نیز دیہی علاقوں میں بجلی کی فراہمی اور زرعی اصلاحات پر زور دیا گیا ہے مختصر یہ کہ یہ سارے تحرکات ایک پائیدار اور عوامی حکومت کی ترقی کے مظہر ہیں اور یہ حکومت عوام کی اُمیدوں اور خواہشوں کو پورا کرنا چاہتی ہے۔

ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ آندھرا پردیش

DIPR NO 3:/1/C 2/83

سب رس

سنِ اجراء : ۱۹۳۸ء

فون نمبر : ۲۸۴۶۹

بیادگار ڈاکٹر محی الدین قادری زور

ماہنامہ

حیدرآباد

مدیر اعزازی : مغنی تبسم

معاون مدیر : وقار خلیل

جلد (۴۳) نومبر سنہ ۱۹۸۳ء شمارہ (۱۱)

قیمت : ۲ روپے ۲۵ پیسے

ادارۂ ادبیاتِ اردو ۔ پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد ۔ ۵۰۰۰۰۴

زرِ سالانہ : ۲۵ روپے، کتب خانوں سے : ۳۰ روپے

بیرونی ملکوں سے : (بذریعہ رجسٹری : ۴۵ روپے)

	ہوائی ڈاک سے	بحری ڈاک سے
مشرقِ وسطیٰ	۱۲ ڈالر	۵ ڈالر
امریکہ	۱۶ ڈالر	۶ ڈالر
پاکستان، برما، سیلون	۸ ڈالر	۳/۱/۲ ڈالر
انگلستان	۷ پونڈ	۳ پونڈ

● سید علی اکبر ایڈیٹر، پبلشر، پرنٹر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان میں چھپوا کر حیدرآباد ۔ ۲ سے شائع کیا۔

فہرست

وفیات

۱۲ اگست ۱۹۸۳ء کو حیدرآباد کے قادر الکلام سخنور حضرت اوج یعقوبی قلب پر حملہ کے باعث انتقال کر گئے شہر غزل حیدرآباد کی عصری شعری محفلوں میں ان کے دم قدم سے بڑی رونق رہا کرتی۔ کتنے ہی شائقین شعر کو انھوں نے شاعر بنا دیا۔ چار مینار کے ادھر کی شعری انجمنیں مدتوں اوج کو یاد کرتی رہیں گی۔ علم شعر اور شعری کلاسیک پر ان کی استادانہ نظر نے ایک نئے ادبیہ فکر کو روشن کیا۔ حضرت اوج کو ریاستی حکومت نے اردو کے ملک الشعراء کا اعزاز اور وظیفہ بھی مقرر کیا تھا، جس سے آخری دنوں میں وہ کسی حد تک معاشی دشواریوں سے عہدہ برآر ہے۔ جب نئی حکومت نے اقتدار سنبھالا تو اعزاز اور عہدہ سے محروم کر دیئے گئے زندگی کے ہر موڑ پر مسکرا کر حالات کا مقابلہ کرنا اوج خوب جانتے تھے۔ جیسے تیسے انھوں نے اپنے شعری مشن کو جاری رکھا۔ کثیر العیال فرد تھے، معاشی طور پر فراغت سے محروم، ریاستی حکومت پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ سماج اور معاشرہ کی بہتری کے لئے کام کرنے اور سوچنے والوں کے افراد خاندان کی ضرورتوں کا مداوا کرے۔ حضرت اوج نے مختصر مدت ادارۂ ادبیات اردو میں ملازمت بھی کی اور ان کی صلاحیتوں کا بانیٔ ادارہ ڈاکٹر زورؔ مرحوم کو بڑا پاس و لحاظ تھا۔ خدا مغفرت کرے۔

جناب اوج کی وفات کا زخم تازہ تھا کہ قزاقِ اجل نے ۲۷ ستمبر ۱۹۸۳ء کو نامور دانشور، مفکر اور عالم

شمس الحق عثمانی

نظیر کی شناخت

(سلیم احمد کی یاد میں)

نظیر اکبرآبادی شاعر ہی نہیں ایک تہذیب بھی ہیں، جس طرح کسی تہذیب کے عناصر وقت کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ ابھرتے اور ڈوبتے رہتے ہیں مگر کلیتاً فنا نہیں ہوتے اسی طرح کلام نظیر کے عناصر بھی مختلف ادوار میں اپنی مختلف خصوصیات کو واضح کرتے رہے ہیں لیکن جیسے ہر تہذیب کی مکمل شناخت اس کے چند عناصر کی بجائے ان کی وحدت کے ذریعہ ہی ممکن ہے، ایسے ہی نظیر اکبرآبادی کی مکمل شناخت بھی اسی وقت ممکن ہے کہ ہم آدمی نامہ، بنجارہ نامہ، یا قومی، اخلاقی، دنیاوی، ابتذالی اور فحش نگار جیسے شعبوں میں بٹے ہوئے نظیر کو ایک وحدت کے طور دیکھنے میں کامیاب ہو سکیں۔

مطبع نول کشور سے شائع شدہ ساڑھے نو انچ لمبی اور سات انچ چوڑی کلیات نظیر کے کل دس سو نواسی صفحات میں سے نو سو انسٹھ صفحات پر نظیر کا کلام پھیلا ہوا ہے۔ ان نو سو انسٹھ صفحات کی سیاحی کے دوران ایک سوال بار بار ذہن و دل کا دامن تھامتا ہے۔ سید ولی محمد میں آخر وہ کون سی قوت تھی جس نے اسے نظیر اکبرآبادی بنا دیا۔ ... سادہ ہے کہ اس کے جواب پر سماجی علوم اور فلسفوں کا رنگ بہ آسانی چڑھایا جا سکتا ہے اور داد طلب کی جا سکتی ہے، لیکن چونکہ "مقدمہ" والے "مولانا حالی" کی راہ پر بے تیشۂ نگاہ چلنے والے ناقدین کے ہاتھوں بیشتر کلاسیکی شاعری کے ایسے ہی سیدھے سادھے سوالوں کے جوابات پر چڑھایا گیا رنگ و روغن اتر چکا ہے اس لئے حقیقت پسندی کا تقاضا یہی ہے کہ کلام نظیر سے براہِ راست اور بے لاگ رشتہ استوار کیا جائے کہ ادب کی حقیقی شناخت اور تفہیم کی راہ یقیناً یہی ہے۔

نظیر کی ایک غزل دیکھئے، اس کی ردیف، ہر قافیے کے بعد استعمال ہونے والا ایک لفظ نہیں، بلکہ

اس قوت کی جانب ایک مسلسل اشارہ ہے جس نے یہ ولی محمد کو نظیر اکبرآبادی بنایا ہے ؎

ہو کیوں نہ ترے کام میں حیران تماشا
یا رب! تری قدرت میں ہے ہر آن تماشا
لے عرش سے تا فرش، نئے رنگ نئے ڈھنگ
ہر شکل عجائب ہے ہر اک آن تماشا
افلاک پہ تاروں کی جھمکتی ہے طلسمات
اور روئے زمیں پر، گل و ریحان تماشا
جنات، پری، دیو، ملک، حور بھی نادر
انسان عجوبہ ہیں تو حیوان تماشا
جب حسن کے جاتی ہے مرقع پہ نظر، آہ
کیا کیا نظر آتا ہے! ہر اک آن تماشا
چوٹی کی کہیں دھاوٹ، کہیں دکھلاتی ہے لہریں
رکھتی ہے کہیں زلف پریشان تماشا
گر عشق کے کوچے میں گزر کیجیے تو واں بھی
ہر وقت نئی لہر ہے، ہر آن تماشا
منہ زرد، بدن خشک، جگر چاک، الم ناک
غل، شور، تپش، نالہ و افغان تماشا
ہم پست نگاہوں کی نظر میں تو نظیر آہ
سب ارض و سما کا ہے گلستان تماشا

کلیاتِ نظیر میں یوں تو قدم قدم پر "تماشا" کی معنویت اور اس سے نظیر کے بے پناہ شغف کا اندازہ ہوتا ہے لیکن اس غزل کے تسلسل میں ان کا یہ ایک مطلع ملاحظہ کیجیے ؎

دیکھ لے اس چمنِ دہر کو جی بھر کے نظیر
پھر ترا، کاہے کو، اس باغ میں آنا ہوگا

مذکورہ غزل اور مقطعے میں جس شوقِ تماشا[1] کا اشارہ ہے، وہی نظیر کے شعری مزاج کا جزوِ اعظم ہے اور نظیر نے اپنی اسی دیدار طلبی کو اپنے پورے کلام میں برتا ہے یہ بات یوں بھی کہی جا سکتی ہے کہ نظیر نے شوقِ تماشا اور دیدار طلبی سے حاصل ہونے والے تجربات کے اظہار کے لئے شاعری کو EXPLOIT کیا ہے۔ گویا، نظیر کا اساسی مطمحِ نظر، فنِ شعرگوئی سے زیادہ، چمنِ دہر میں شوقِ تماشا کی تسکین کرنا تھا۔ جب انتظار حسین نے لکھا کہ :

"..... غالب نے کہا تھا، مگر نظیر نے اس سچائی کو اپنے شعور کا ایک حصہ بنایا ہے :
یک ذرّہ زمیں نہیں بے کار باغ کا ..."

(رسالہ ادبِ لطیف۔ نومبر دسمبر ۱۹۶۴ء۔ ص : ۴)

تو انتظار حسین کے ذہن کے کسی گوشے میں یقیناً یہ پہلو رہا ہوگا کہ نظیر و غالب میں برتنے اور کہنے کا فرق ہے۔ یعنی نظیر کا اصل اصرار، شوقِ تماشا کو بروئے کار لانے پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے شعور کا غالب حصہ "تماشا" پر مرکوز رہتا ہے اور وہ فنِ شعرگوئی پر زیادہ توجہ نہیں دے پاتے۔ نظیر نے تماشا پر شعوری انداز میں جو توجہ صرف کی ہے اس کا اندازہ مذکورہ بالا غزل کی اس تقسیم سے کیا جا سکتا ہے : پہلا حصہ :-

ہو کیوں نہ ترے کام میں حیران تماشا
یا رب! تری قدرت میں ہے ہر آن تماشا

---

[1] بخشے ہے جلوۂ گل، ذوقِ تماشا غالب
چشم کو چاہیے، ہر رنگ میں وا ہو جانا

دوسرا حصّہ :-

لے عرش سے تا فرش، نئے رنگ نئے ڈھنگ
ہر شکل عجائب ہے، ہر اک آن تماشا
افلاک پہ تاروں کی جھلکتی ہے طلسمات
اور روئے زمیں پر گل و ریحان تماشا

تیسرا حصّہ :-

جنّات، پری، دیو، ملک، حور بھی نادر

چوتھا حصّہ :-

انسان عجوبہ ہیں تو حیوان تماشا

پانچواں حصّہ :-

جب حسن کے جاتی ہے مرقّع پہ نظر، آہ
کیا کیا نظر آتا ہے! ہر اک آن تماشا
چوٹی کی گندھاوٹ، کہیں دکھلاتی ہے لہریں
رکھتی ہے کہیں زلفِ پریشان تماشا

چھٹا حصّہ :-

گر عشق کے کوچے میں گزر کیجے تو واں بھی
ہر وقت نئی لہر ہے، ہر آن تماشا
منہ زرد، بدن خشک، جگر چاک، الم ناک
غل، شور، تپش، نالہ و افغان تماشا

ساتواں حصّہ :-

ہم پست نگاہوں کی نظر میں تو نظیرؔ، آہ
سب ارض و سما کا ہے گلستان تماشا

غزل کا پہلا حصّہ : خالقِ کائنات کی عجوبہ کاری کے تئیں ایک (GENERAL RECOGNITION) ہے۔ یعنی یہ بابت ایک کلیّہ کے طور پر تسلیم کی گئی ہے (خالقِ کائنات کے ہر عمل میں اک تحیّر زا عنصر لازمے کی حد تک، جاری و ساری ہے۔ اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے بعد،

دوسرا حصّہ :- تماشے کے اوّلین مظہر کے ذکر پر منحصر ہے۔ اس حصّے کے مشمولات کی وضاحت 'مناظرِ فطرت' کے عنوان سے کی جاسکتی ہے۔

تیسرا حصّہ :- ایسی غیر آدم زاد مخلوقات کی اہم تماری پر مشتمل ہے جو انسانی آنکھ سے بالعموم اوجھل رہتی ہے

چوتھا حصّہ :- انسان اور حیوان کا ذکر کرتا ہے کیونکہ یہ حصّہ ایک شعر کے مصرعۂ ثانی پر مشتمل ہے اور مصرعۂ ثانی میں قافیے کا التزام ضروری تھا اس لئے نظیرؔ اس مصرعے میں آنے والے انسان اور حیوان کے ذکر کو حسبِ منشا ترتیب نہ دے سکے۔ ورنہ محسوس یہی ہوتا ہے کہ وہ حیوان کا ذکر مصرعۂ اولا ہی کے تسلسل میں لانا چاہتے تھے اور اس ذکر کے بعد انسان کو "عجوبہ" کہنا چاہتے تھے

اس ذکر کے فوراً بعد : نظیرؔ نے انسان کے دم قدم سے خطۂ ارض پر جلوہ نما ہونے والے دو ایسے موضوعات کو علاحدہ علاحدہ بیان کیا ہے جو اپنی جداگانہ اہمیت بھی رکھتے ہیں اور ایک دوسرے سے پیوست بھی ہیں۔

بہ الفاظِ دیگر : چوتھے حصّے میں نظیرؔ انسان کی ایک مجموعی صفت (عجوبہ) بیان کرنے کے بعد، پانچویں اور چھٹے حصّے میں اس صفت کی دو جہات (حسن اور عشق) متعین کرتے ہیں۔

اس طرح اپنے دیدار نامے یعنی کلیات کا

(SYNOPSIS) پیش کرنے کے بعد،
ساتویں یعنی آخری حصے میں، قابل عارفانہ کے
وسیلے سے اپنی نگاہوں کو "پست" کر کے دراصل کہنا
یہ چاہتے ہیں کہ ارض و سما پر ظاہر ہونے والی خالق
کائنات کی گوناگوں قدرت کی دید اسی وقت ممکن
اور درست ہو سکتی ہے کہ جب اس ظہور کو
اس گلستاں کے تماشے کی حیثیت دی جائے۔

غزل کا مطلع واضح کرتا ہے کہ نظیر 'خدا' کے
وجود، اس کی قدرت و قوت اور بالادستی کے
قائل ہیں۔ اور ان کا ایمان ہے کہ اس کائنات
میں وقوع پذیر یہ تمام تبدیلیوں میں ذات باری
کی مصلحتیں کارفرما ہیں۔ مقطعے میں حالانکہ صیغہ
جمع متکلم استعمال ہوا ہے لیکن اس کی زیریں
لہر، خود کلامی کا انداز رکھتی ہے اور اس میں استعمال
کیا گیا لفظ "آہ" اک تاسف و افسردگی کا اظہار
کرتا ہے۔

اس غزل کے مطلعے اور مقطعے کو اگر سرگوشی
کے انداز میں کئی بار پڑھا جائے اور پھر ایک دو
بار تمام اشعار بھی ان دونوں کے درمیان پڑھ
لئے جائیں تو غزل کے کئی پہلو منکشف ہو سکتے
ہیں۔ غزل کی ایسی خواندگی محسوس کرا سکتی ہے
کہ مطلع کائنات نے اپنی ذات اور ہم انسانوں
کے گرد ارض و سما کا جو گلستاں سجایا ہے وہ
اس کے اور ہمارے درمیان حائل اک پردہ
اور رکاوٹ ہوتے ہوئے بھی اس کی شناخت
کا وسیلہ ہے۔ یہ گلستاں، اس کی ہر آن تبدیل
ہوتی ہوئی قدرت و مصلحت کی بنا پر، بہار و
خزاں سے دوچار ہوتا رہتا ہے۔ اس گلستاں
کی دل آویزی، سرّیت اور گرم بازاری کا باعث
متحرک مناظر فطرت (بیان: مذکورہ غزل کے
چار مصرعوں میں)، آنکھوں سے اوجھل غیر آدم زاد
مخلوقات (بیان: ایک مصرعے میں) اور گوناگوں
انسانی صفات (بیان: آٹھ مصرعوں میں) ہیں
اور اس سب کچھ کا اختتام، ہم انسانوں پر ہوتا
ہے کہ انسان، کائنات کا حرف آخر ہے۔
(جیسے: مقطع غزل کا اختتام ہے) — یہ تمام
دل آویزی، یہ تمام سرّیت اور یہ تمام گرم بازاری
اس وقت ہر اس انسان کے لئے ختم ہو جاتی
ہے۔ فنا ہو جاتی ہے — جب وہ اس تماشا
گاہ کی تبدیلیوں کے زیر اثر، فنا کے گھاٹ
جا اترتا ہے اور جو باقی رہ جاتا ہے وہ اس
گرم بازاری کے طویل سلسلے کو فنا و خزاں پر
اختتام پذیر ہوتے دیکھ کر، گہری افسردگی میں
ڈوبی ایک آہ کھینچنے کے سوا اور کوئی راہ نہیں
پاتا۔ گویا ارض و سما کے تمام مظاہر ایک بظاہر
محکم لیکن عیاں انداز میں آمد و رفت کے اسیر
ہیں۔ مظاہر کی یہ لمحہ بہ لمحہ نمو اور فنا، ذوق تماشا
سے محروم آنکھ کے لئے تو کسی معنویت اور تاثر
کی حامل نہیں لیکن حصار آب و گل کے بیچ خود کو
روشن و بیدار رکھنے والی، ایسی آنکھ جو منظر کے
ظاہر اور باطن کی تہوں میں پیوست ہونے کی
قوت رکھتی ہو، مظاہر کی صورت اور معنی سے

ان کا حقیقی تاثر قبول کرتی ہے ؎

یہ جواہر خانۂ دنیا جو ہے باآب و تاب
اہلِ صورت کا ہے دریا، اہلِ معنی کا سراب

صورت و معنی سے ہر ممکنہ حد تک سیراب ہونے والے نظیر اکبرآبادی کی سوانح اور کلیات سے اندازہ ہوتا ہے کہ نظیر کی شخصیت اور شاعری مختلف رنگوں، پرچھائیوں اور کیفیتوں کے تصادمات کا محور ہے۔ نظیر کے شعری کردار اور ان کے فن کی آڑی ترچھی، روشن مدھم، نمایاں اور دھندلی کیفیات کے تہہ در تہہ جہانوں کی شناخت کے لئے جب ہم نظیر کے عہد پر غور کرتے ہیں تو یاد آتا ہے کہ اس زمانے میں اردو شعرا کا قطار اندر قطار معاشرہ تھا، جو دنیا کے اسرار و رموز سے اپنی آگہی کا ثبوت دینے کے لئے بار بار کہتا تھا کہ توہم کا یہ کارخانہ ان بے ثبات حبابوں کا منظر نامہ ہے جسے فریب نظر کے لئے قدرت نے بنایا اور جس میں زیادہ سمجھ بوجھ رکھنے والے انسان محض فقیرانہ انداز میں صداؤں کی ادائیں دکھا کر رخصت ہو جاتے ہیں ——— مگر، جب میاں نظیر اپنے زمانے کی بولی بولنے کے لئے وقتاً فوقتاً اس بے ثبات کائنات کی سیر پر نکلتے ہیں تو ان کے ساتھ کچھ اور ہی واقعہ پیش آتا ہے : وہ ایسے موقع پر رنگ رلیوں میں شرابور ان بے ثباتی میں مسرت اور بہجت سے دل کو لگانے اور لگانے کے گوشے تلاش کر لیتے ہیں اور پھر اچانک زندگی اور کائنات کے بارے میں، بہت سادے، بہت سیدھے اور کھرے لہجے میں ایسا سوال کرتے ہیں جس سے سارا منظر : روشن اور نیم روشن، اداس اور مسرور فضاؤں کا کینوس بن جاتا ہے ؛

گر عیش سے عشرت میں کٹی رات، تو پھر کیا؟
اور غم میں بسر ہو گئی اوقات، تو پھر کیا؟
حد بوس و کنار اور جو تھا اس کے سوا، آہ
گر وہ بھی میسر ہوا، ہیہات، تو پھر کیا؟
پھر اڑ گئی اک آن میں سب حشمت و شان ان
لے شرق سے تا غرب لگا ہات، تو پھر کیا؟
دولت ہی کا ملنا ہے بڑی چیز، نظیر آہ
بالفرض ہوئی اس سے ملاقات، تو پھر کیا؟

رمبو کی ایک نظم کا مصرع ہے ع

" روح بے داغ ہے تو پھر کیا "

سارتر نے اس نظم اور اس سطر کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ اس مصرع میں نہ کسی سے سوال کیا گیا ہے، نہ کوئی سوال کر رہا ہے۔ شاعر کی اپنی شخصیت بھی شامل نہیں ہے اور یہ سوال نہ کسی جواب کا متحمل ہے، نہ اس کا کوئی جواب دیا جا سکتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ سوال خود اپنا جواب ہے۔ سارتر کہتا ہے کہ اگر نثر کے ضوابط کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ سوال خود بے معنی ہے۔ سارتر کے مطابق یہ بے معنویت ہی شاعری کی اصل جدلیاتی قوت ہے اور شاعر نے ایک ایسا سوال کیا ہے جو مطلق،

کامل، خود مختار، غیر پابند اور مطلق العنان سوال ہے اس سوال کے ذریعے شاعر نے روح کے حسین لفظ کو ایک استفہامی وجود (INTERROGA-TIVE EXISTENCE) عطا کر دیا ہے۔

نظیر نے مذکورہ غزل کے ہر قافیے اور ردیف کے ساتھ استعجاب کی ایک ایک کیفیت کو کچھ یوں نمایاں کیا ہے کہ زندگی کے بے شمار واقعات اور بے شمار سفر اور بے شمار تماشے، ایک ناگفتنی سوال کا پیش خیمہ بن کر باہم سے متصادم ہوتے ہیں۔ "تو پھر کیا؟" میں عیش و عشرت اور غم میں بسر شدہ اوقات بھی ہے اور مشرق سے غرب تک سفر اور تماشے کی بے حاصلی بھی، میاں نظیر ارض و سماوات چھان لینے کے باوجود بھی سفر کو منزل سے بے تعلق پاتے ہیں اور کسی بھی گوہر مقصود کے حصول کو مقصد اور منزل نہیں بلکہ سوالوں کے سفر کی اذیت کا پیش خیمہ تصور کرتے ہیں ——— گویا ان کے نزدیک تمام تر تخلیقی احساس ایک سفر کا کرب ہے جو ان تمام سے گذرتا ہے جن سے ہومر کا اوڈیسس گزرا تھا اور دنیا جہاں کی خاک چھاننے کے بعد منزل پر پہنچ کر ایک نئے کرب اور نئی اذیت سے دوچار ہوا تھا۔ اوڈیسس کی بیوی، اپنے عاشقوں کے ہجوم میں گھری ہوئی، کچھ اور ہی ذہنی اذیتوں سے دوچار تھی ——— اور ان دو افراد کی اذیتیں ایک لمبے سفر اور وقت کی پرچھائیوں میں نئے سوالات سے دوچار تھیں۔

نظیر کا سفرِ آگہی ایسی ہی تصادم انگیز اذیتوں کا بسیط و عریض صحرا ہے جس میں میاں نظیر دنیا کی تمام لذتوں، تمام مسرتوں اور تمام کلفتوں کے مقابل ایک تنہا مسافر اور تماشائی کے روپ میں اپنی گذشتنی کا احوال سناتے نظر آتے ہیں۔

نظیر نے اپنی گزشتنی کا احوال بیان کرنے کیلئے جو اسلوب وضع کیا ہے وہ اپنی انفرادیت کی شناخت ایک ماورائی زاویۂ نظر کے وسیلے سے قائم کرتا ہے مشرق و مغرب کے مناظر، اشیاء اور انسانی واردات کو آنکھوں میں سمیٹ لینے کے باوجود نظیر کے یہاں جو ایک بے تعلقی اور غیر جذباتیت کارفرما ہے وہ ایسی ماورائی ——— یا بے تعلق و ناوابستہ زاویۂ نظر کی دین ہے۔

مظاہر کائنات کو دیکھنے، چھونے، چکھنے، برتنے اور سننے کے لئے نظیر جس قدر بے تاب و وارفتہ رہے ہیں اور اس دوران میں انھوں نے جس جس طرح اپنی آنکھوں کو ہر دو جانب ——— ظاہر و باطن — کے لئے کھلا رکھا ہے وہ کسی ایک فلسفے، کسی ایک دبستانِ فکر یا کسی ایک مشروط و محدود نقطۂ نظر کی اصطلاحوں میں مقید ہونے والی شئے نہیں ہے یعنی ان کا ذہنی سفر افقی اور عمودی دونوں سمتوں میں رہا ہے اور ایک سمت میں دوسری سمت کا ادراک شامل رہا ہے۔

سماجی انتشار و ابتلا اور نجی حالات کی غیر یقینی صورت حال سے دوچار ہوتے ہوئے بھی کلام نظیر سے جس پُراعتماد، چاق و چوبند اور ہمہ جہت

شخصیت کے حامل: نظیر، کا خاکہ مرتب ہوتا ہے وہ یقیناً ایک پورے آدمی کا تعارف نامہ ہے۔

"پورے ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں"

(نظیر)

یہ پورا آدمی، زندگی کے ہمہ رنگ بکھیڑوں اور مظاہر و رسوم سے گہرے شغف کے باوصف اگر ان کے پس منظر سے احساسی طور پر ہم آہنگ محسوس نہیں ہوتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بار بار پورے آدمی کی جانب متوجہ ہوتا ہے اور کیونکہ نظیر کے نزدیک پورے آدمی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ عاشق کے روپ میں اس دل بر کی پہچان کرنا چاہتا ہے، جس کا ذکر "عاشق نامہ" میں آیا ہے:

پنہاں اسے اپنے دلِ تنگ میں پہچان
ہر باغ میں، ہر دشت میں، ہر سنگ میں پہچان
بے رنگ میں، با رنگ میں، نیرنگ میں پہچان
منزل میں، مقامات میں، فرسنگ میں پہچان
ہر روم میں اور ہند میں اور زنگ میں پہچان
ہر راہ میں، ہر ساتھ میں، ہر سنگ میں پہچان
ہر عزم ارادے میں، ہر آہنگ میں پہچان
ہر دھوم میں، ہر صلح میں، ہر جنگ میں پہچان
ہر آن میں، ہر بات میں، ہر ڈھنگ میں پہچان
عاشق ہے تو دل بر کو ہر اک رنگ میں پہچان

تماشے کے ذریعے شناخت کے عمل میں بار بار اس دل بر کا عمل دخل اور پھر "شخصیت کے مذہب" پر اصرار ایک دوسرے میں آمیز ہو کر اسی امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ شوقِ تماشا سے لبریز نظیر کی آنکھ صرف خارج ہی کی تمام جہات میں نہیں بلکہ باطن کے تمام ابعاد میں بھی محو نظارہ اور نظارہ طلب ہے۔ کلام نظیر سے مستفیض ہونے کے دوران، ایک باشعور قاری کو زندگی سے قربت اور یگانگت کا جو احساس ہوتا ہے وہ یقیناً خارج و باطن کی اسی وحدت کا زائیدہ ہے

ہمارے ادب کی تاریخ میں ایسے شعرا اور تحریکات کا ذکر موجود ہے جنھوں نے زندگی اور معاملاتِ زندگی کے تئیں یک رُخا رویہ اختیار کیا، ایسے شعرا اور ایسی تحریکات سے منسلک ہونے والوں کی تحریریں اسی لئے زندگی کو ایک وحدت کے طور پر خلق کرنے میں ناکام رہی ہیں کہ انھوں نے اپنی آنکھوں کی کسی ایک ہی قوت کو سب کچھ جانا اور باقی ماندہ دوسری قوت کو بروئے کار نہیں لائے۔ یا شاید وہ اس کرب کے متحمل ہی نہ ہوں کہ کم از کم پانچ حواس کو بروئے کار لا سکیں۔ یا انھیں علم ہوتا کہ اعلا تخلیقی ذہن، چھٹی حس کا بھی حامل ہوتا ہے۔

کلام نظیر کی پرکھ اور جائزے کے دوران، زیادہ تر ہی ناقدین اپنی ناگواری و ناپسندیدگی کا اظہار کرتے رہے ہیں جنھوں نے کلام نظیر کو یا تو صرف سماجی اخلاقیات کی کسوٹی پر کسنا چاہا، یا پھر اس کے ادبی مرتبے کے تعین میں صرف ادبی نظریات کو بروئے کار لائے ہیں۔ تاریخِ ادب میں نظیر کے مرتبے کا صحیح تعین صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ نقاد بھی زندگی اور فن کی اسی وحدت کو ملحوظ رکھے جو نظیر نے اردو شاعری میں

پہلی بار قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔

"ہماری مشرقی تنقید ہمارے تہذیبی تصور کا عطیہ ہے۔ جس میں جاگیردارانہ دور کی تمام خصوصیات جلوہ گر ہیں۔ اس کا تہذیبی تصور شہروں اور ان کی ایک مخصوص فضا ہی تک محدود تھا۔ اس کے فن کا تصور زبان کے ایک ادھورے تصور کا غماز ہے۔ تنقیدی شعور تو تخلیقی شعور کے ساتھ ساتھ چلتا ہے مگر تنقیدی کارنامے ہر دور میں تخلیقی کارناموں سے پیچھے چلے ہیں۔ چنانچہ ہمارے تذکرے اور تنقید زبان اور فن کے خواص پسند تصور سے عرصے تک آزاد نہ ہو سکے۔ میر کم اور نظیر زیادہ اس تصور کا شکار ہوئے مگر میر اور نظیر میں جو تعلق ہے اسے بھی نظرانداز نہ کرنا چاہیئے۔ میر کی غزلوں میں ہماری مشترک تہذیب و تمدن کا وہی جلوہ صد رنگ ملتا ہے جو نظیر کی نظموں میں پہنچ کر ایک مخصوص آہنگ اور لے اختیار کر لیتا ہے اور نظم کے فارم کی سہولتوں کی وجہ سے زیادہ روشن ہو جاتا ہے۔ آزاد نے غلط نہیں کہا تھا کہ نظیر کے کچھ اشعار میر سے پہلو مارتے ہیں۔"

(آل احمد سرور "مسرت سے بصیرت تک" ص: ۲۱)

یہ بات درست ہے کہ نظیر نے متعدد مواقع پر فنی آداب اور لسانی نزاکتوں کو ملحوظ نہیں رکھا۔ لیکن بہت سے عظیم فن کاروں میں قواعد اور عالموں کی بورژوازی اصول پسندی سے بغاوت کی روش عام رہی ہے یہ بات بھی غالباً اتنی اہم ہے کہ نظیر نے اپنے عہد کے انتشار و ابتلا اور خوں آشامی کے باوجود ہر موقعے پر زندگی کے رشتے کو بالا ہی رکھا اور کسی بھی مرحلے میں اس کو حقیر نہیں جانا۔ اپنے اس عمل میں نظیر کی سب سے بڑی سچائی اور خلوص یہ ہے کہ ہم کلام نظیر اور نظیر اکبرآبادی کا علاحدہ علاحدہ تصور کرنے میں قطعاً ناکام رہتے ہیں یعنی: جب ہم نظیر کی شخصیت کا تصور کرتے ہیں تو کلام نظیر کے عناصر مجسم ہو کر ہمارے سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں اور جب ہم ان کے فن سے دوچار ہوتے ہیں تو فن کے وسیلے سے تعمیر ہونے والی ان کی شخصیت نگاہ و ذہن پر حاوی ہو جاتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ کلام نظیر کی صحیح تنقید و تحسین غالباً اسی وقت ممکن ہے کہ جب نظیر اور کلام نظیر کے حصے بخرے کرنے کے بجائے اس کی آئینہ اور پشت آئینہ جیسی وحدت کا احترام کرتے ہوئے اسے ہمہ جہتی کے ساتھ قبول کیا جائے۔ ——— یہ بات عرض کرتے ہوئے مجھے احساس ہے کہ خالصتاً فنی و جمالیاتی اصولوں اور عہد نظیر کے صرف خارجی عوامل کی مدد سے کلام نظیر کے پرکھنے والوں کو میری یہ بات شاید پسند نہ آئے، کیونکہ وہ تو ہر شاعر اور ادیب کو کسی ایک، یعنی اپنی پسندیدہ، کسوٹی پر ہی پرکھنا چاہیں گے

لیکن میں کسی تفصیل کے بغیر دریافت کرنا چاہوں گا کہ اس بات کی حقیقی وجہ کیا ہے کہ مورخینِ ادب نے نظیر اکبرآبادی کے ذکر کو کسی ایک عہد یا رجحان سے مشروط کرنے کے بجائے ' ان کے لیے تاریخ میں ایک جداگانہ گوشہ مخصوص کیا ہے ؟

میرے نزدیک ' اس سوال کا ایک فوری جواب تو یہی ہے کہ کلامِ نظیر کی انتہائی منفرد خصوصیات نے مورخینِ ادب کو اس عمل پر مجبور کیا۔ دوسری اور غالباً اہم ترین ' وجہ یہ ہے کہ مورخینِ ادب کو غیر شعوری طور پر ' صرف کلامِ نظیر ہی ایک ناقابلِ تقسیم وحدت محسوس ہوتا ہے ' ایک ایسی وحدت جس میں خارج و باطن ' بلند و پست ' خوب و زشت ' خیال و عمل ' بے نیازی و تقاضا ' جزا و سزا ' بربادی و آبادی ' زمین ' دنیا و آخرت [illegible] نظم و غزل وغیرہ نے باہم آمیز ہو کر ایسی شکل اختیار کر لی ہے کہ اسے تاریخ کے [illegible] ادوار [illegible] کے لحاظ سے اس پر منطبق [illegible]

گویا ' جیسا آدمی ویسا ہی کلام [illegible] یہاں تک نکتہ چینی کے [illegible] بات کو بھی ٹھیس نہیں لگاتا [illegible] یہی شعر [illegible] پارکھوں نے میر و غالب کے بارے میں [illegible] مدت کے بعد اس حقیقت کا اظہار کیا کہ ان کی شاعری کسی ایک عہد کی اسیر نہیں لیکن انھوں نے نظیر اکبرآبادی کو اسی انوکھی و یگانہ عظمت کی پاداش میں ابھی تک اپنی عدالت کے کٹہرے سے بری نہیں کیا ہے

نتیجہ : ابھی ہمارے عہد کے سر پر یہ قرض باقی ہے کہ سید ولی محمد نظیر اکبرآبادی کو آزاد نصابوں سے ہم کنار کیا جائے تاکہ پورے اور مکمل نظیر کو شناخت کیا جا سکے۔ ●●

(بقیہ [illegible] اردو [illegible])

[illegible] کا [illegible] لکھ دیا۔ [illegible] نے [illegible] اور [illegible] صلاح الدین [illegible] ظاہر [illegible] ۳۰ اکتوبر [illegible] جلسہ [illegible] علام محمد [illegible] خاں کی صدارت میں منعقد ہوا۔ [illegible] اور [illegible] سے علمی مضامین سنائے اور شعراء نے کلام پیش کیا۔ جناب صلاح الدین [illegible] نے [illegible] اور شکریہ ادا کیا۔

مصحف اقبال توصیفی

ایک نظم

سانحہ ہوئی
نیلے آکاش پہ اڑتے پنچھی
پیڑوں کی شاخوں پر لوٹے
میں بھی اس انجانے شہر کی بھیڑ سے ہٹ کر
سڑکوں کے اس پھیلے بکھرے جال سے کٹ کر
اپنے گاؤں کی گاڑی میں بیٹھوں
ٹوٹا پھوٹا ڈبے کی کھڑکی سے ——
اپنے گھر کا آنگن
اپنی گلی کا منظر سوچوں'
بابا کے ہونٹوں کی دیوار پہ
اپنے نام کا سایہ دیکھوں
اپنا چہرہ یاد نہ آئے
اپنے خال و خد
ماں سے پوچھوں

○

شاید میرے عہدِ گذشتہ کی بوسیدہ
پامال کتابوں میں' کوئی
ایسی تحریر ہو۔ ایسا لفظ ہو' حرف کوئی
جو گہری نیند سے آنکھیں ملتا اٹھ جائے:
میرے [illegible] اچکن' بالوں والی ٹوپی پہنے
مجھ کو لینے۔
اسٹیشن پر آئے!!

مصحف اقبال توصیفی

غزل

اپنے گھر دستک دیتا ہوں
ہر اتوار کو آتا ہوں
تیری کھوج میں نکلا ہوں
میں جنگل کا رستہ ہوں
اک ساحل کی آس لئے
ایک ہی لہر پہ بہتا ہوں
تو نے اتنی دیر میں جانا
غیر نہیں ہوں —— اپنا ہوں
چوم لے میری بھیگی پلکیں!
رخصت ہوتا لمحہ ہوں
باسی پھول کی خوشبو ہوں
بیتی رت کا جھونکا ہوں
لوگ مجھے حیرت سے دیکھیں
تجھ سے بچھڑ کر زندہ ہوں

پلکیں نیند سے بوجھل ہیں
میں صدیوں کا جاگا ہوں

ڈاکٹر رضیہ صدیقی

شاہ ثانی سلطان کی حیات اور تصانیف

شاہ ثانی سلطان کے حالات زندگی اب تک بالکلیہ تاریکی میں تھے بلکہ مخطوطات کی دو ایک توضیحی فہرستوں میں انھیں گولکنڈہ کا شاعر بتایا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں جب میں نے چھان بین کی تو پتہ چلا کہ سلطان کا تعلق گولکنڈہ سے نہیں بلکہ قدیم اردو کے دوسرے اہم مرکز بیجاپور سے ہے۔ ذیل سلطان کے حالات مخطوطات کا بیشتر حصہ مجھے حیدرآباد، علی گڑھ اور بعض خانگی کتب خانوں میں ملا۔ سلطان کے حالات زندگی کا پتہ چلانے اور اس مقصد کے لئے دوسری بڑی یا چھوٹی تصانیف کی تلاش میں چھان بین کی گئی تو دکنی شعرا میں سلطان تخلص کے دو شعراء ملے جن کی اہم یا غیر اہم تصانیف اور چند غزلیں، مرثیے وغیرہ مخطوطات کے ذخیروں میں بکھرے ہوئے ملتے ہیں

سلطان کے خاندانی حالات سید اکبر صاحب سجادہ نشین درگاہ حضرت سید شاہ سلطان کے ذریعہ دستیاب ہوئے جو دکنی میں مرقوم ہیں۔ پھر کچھ حالات سید عثمان حسینی، متولی خانقاہ سید شاہ شمس اللہ محمد الحسینی بیدری کے ہاں دستیاب ہوئے جو فارسی میں ہیں۔ مجموعی حالات سے پتہ چلتا ہے کہ سلطان کا تعلق سادات حسینی سے ہے۔ آپ کے والد کا نام سید فخر سلطان حسینی اور آپ کا اصل نام سید سلطان غالب حسینی ہے۔ آپ ثانی سلطان گمانی کے نام سے بھی معروف ہیں۔ آپ کے والد روم کے کسی علاقے کے حکمراں تھے۔ جب ان پر جذبۂ الٰہی طاری ہوا امارت کو خیرباد کہہ کر اپنے خاندان کے ساتھ لا بندر سورت میں داخل ہوئے۔ شاہ ثانی سلطان کے بعض اشعار سے ان کے شاہی سے دستبردار ہونے کی تصدیق ہوتی ہے۔

اتھا سلطان سو شاہی جو معشوق کی خاطر　　لیے ونیاگ کو چھوڑ کر خوشی سوں دل لگا یا تھا

بندر سورت سے یہ لوگ گجرات، بیجاپور اور گلبرگہ سے ہوتے ہوئے بیدر پہنچے۔ آپ کے والد الوہیت کا خود طالب بھی تھا، اس لیے تلاش پیر کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ان دنوں بیدر میں حضرت شاہ محمد اکبر حسینی کا چرچا تھا، جو حضرت خواجہ بندہ نواز کی اولاد سے ہیں۔ حضرت فخر سلطان آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، بیعت سے مشرف ہو کر شیخ کے بتائے ہوئے شغل میں مصروف۔ بعد تکمیل سلوک خلافت سے مشرف ہوئے وہاں سے ۱۰۶۹ھ میں مدراس چلے آئے اور اسی قصبہ اگر میں امامت کی۔ اس وقت شاہ ثانی سلطان کی عمر ۱۳ سال تھی اس لحاظ سے سنہ ولادت ۱۰۵۶ھ قرار پاتا ہے "حالات سلطان" مولفہ سید اکبر صاحب میں لکھا ہے کہ شاہ سلطان نے ۱۱ رمضان ۱۰۹۶ھ م ۱۶۸۵ء میں وفات پائی اس لحاظ سے ثانی سلطان کی عمر ۱۶۸۵ء کی عمر ۲۹ سال متعین کی جا سکتی ہے۔ ثانی سلطان کا مزار "درگاہ اوبنتی"

خانقاہ مدراس میں ہے جہاں کے والد سید فخر سلطان کے مزار سے متصل ہے۔

سید فخر سلطان کے بعد شاہ سلطان نے مسند ارشاد پر جلوہ افروز ہو کر ہدایت کا سلسلہ جاری فرمایا شاہ ثانی سلطان نے سیاحت بھی کی تھی، چنانچہ ایک شعر میں اس کا ذکر بھی کیا ہے ؎

بت کے بدل ست دیس کوں و بانگ کے پردیس کوں لیا   جا گر گدائی بھیس کوں نگری نگر جونا بھلا

آپ کے مریدوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہا جن اہل خاندان سے مرتضیٰ گیانی اور جمال علی شاہ ہر دو کو بعد تکمیل سلوک خلافت بخشی سید شاہ مرتضیٰ گیانی سے اس سلسلہ کا کافی پھیلاؤ ہوا۔ اس سلسلہ کی آخری کڑی خواجہ شاہ حبیب اللہ تھے جن کا انتقال ۱۹۷۳ء میں ملیبار میں ہوا۔ ”کاروان“[1] کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ شاہ ثانی سلطان صاحب اولاد تھے شجرہ سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کو ایک لڑکا بھی تھا جس کے نام کی صراحت نہیں ہے البتہ آپ کی ایک صاحبزادی مسماۃ صاحبانی صاحبہ تھیں جن کا عقد سید احمد عرف جعفر صاحب سے ہوا۔ شاہ سلطان کا نسب نامہ انتھک کوشش کے باوجود دستیاب نہ ہو سکا۔

سید فخر سلطان حسینی صرف چشتیہ سلسلے کے مرید و خلیفہ تھے، چنانچہ ”سلوک اوراد و حبیب“[2] مع شجرہ ہائے سلاسل کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مرتضیٰ گیانی متوفی ۱۷۰۹ء نے سلسلۂ چشت میں ثانی سلطان سے بیعت کی ہے نیز سلطان کی ایک تصنیف بعنوان ”ذخیرہ“ جو ادارۂ ادبیاتِ اردو اور کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔ اس میں انہوں نے لاہوت، ناسوت اور جبروت کی اصطلاحات استعمال کی ہیں جو خانوادۂ چشت سے متعلق ہیں اور اس سے اس بات پر روشنی پڑتی ہے کہ ثانی سلطان سلسلۂ چشت کی خلافت سے مشرف تھے۔

سلطان کا شمار دبستان بیجاپور کے آخری زمانہ کے شعراء میں ہوتا ہے اس زمانے میں دکنی زبان نہ صرف بولی جاتی تھی بلکہ ایک متمدن اور ادبی زبان بن چکی تھی اور اسی دور میں فارسی شاعری کا سایہ نمایاں طور پر دکنی شاعری کے کارناموں پر پڑنے لگا تھا فارسی کا مشہور ادیب ملا ظہوری بیجاپور ہی میں مقیم تھا کوئی تعجب نہیں کہ شعرائے بیجاپور اس کی طرف متوجہ ہو گئے اور دربار کے علمی ماحول نے دکنی شاعروں کو فارسی شاعری کی ان مخصوص خصوصیات کی طرف مائل کیا جو اس زمانے میں شاعری کا جوہر سمجھی جاتی تھیں۔

دیوان سلطان چار سو اسی (۴۸۰) غزلیات پر مشتمل ہے جن میں تین ہزار دو سو بیالیس اشعار ملتے ہیں۔ سلطان کے کلام کا آغاز عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی میں منتقل ہوا ہے۔ ابتداً بجائے حمد و نعت کے وہ والہانہ اور عاشقانہ انداز میں عشقِ حقیقی کے وجدانی کیفیات کی ترجمانی ملتی ہے۔ ان کی ابتدائی غزلوں کے مطالعہ سے ان کی کیفیاتِ عشق کا اندازہ ممکن ہے۔ جہاں سلطان کا ضخیم دیوان تصوف سے بھرپور ہے وہیں

---

[1] مولوی عبدالرحمن سنعاف   [2] شاہ حبیب اللہ

گفتم کہ از مہر ہیبت سلطاں سو گشتم گدا　　گفنا کہ عاجز مہ کہتے مجھو دارا ویر سلطان ہیں

جیسا کہ سلطاں کی شاعری مجازی و حقیقی شاعری کا امتزاج ہے۔ ان کی بیشتر غزلیں تصوف کے مضامین سے پُر ہیں جن میں وحدانیت کو پیش کیا گیا ہے غزل ملاحظہ ہو ؎

جنگل و گلزار میں واحد اللہ واحد اللہ　　میوہ و گل نار میں واحد اللہ واحد اللہ

کعبہ و بت خانہ کر اسم جدا ہے اما　　دین و کفار میں واحد اللہ واحد اللہ

مستی و ہشیار حالِ دیگر جاں ذت　　مجنوں و ہشیار میں واحد اللہ واحد اللہ

شاہد و مشہود ایک روپ سے دو نہ دیک　　محو ہو نرنار میں واحد اللہ واحد اللہ

مسکین و سلطاں کوں زیر و زبر نا سمجھ　　حسنہ و مختار میں واحد اللہ واحد اللہ

الغرض سلطان کا سارا کلام کیف و مستی میں ڈوبا ہوا ہے اور یہ کیف و مستی عشقِ مجازی نہیں بلکہ عشقِ حقیقی کے واردات کا بین ثبوت ہے۔

دیوان سلطاں کا ذکر سب سے پہلے ڈاکٹر زور نے اپنے مخطوطات کی جلد اول مطبوعہ ۱۹۴۳ء میں اس طرح کیا ہے۔　　" یہ ایک بڑے صوفی شاعر تھے سلطان میراں شاہ معروف کے خلیفہ تھے۔ چنانچہ افضل نے محی الدین نامہ میں لکھا ہے کہ:

" میراں شاہ معروف او دستگیر "
" کہ دل میرا کر پاک روشن ضمیر "
" دیے دست بیعت مرے سات میں "
" دیئے مجکو سلطان کے ہات میں "

ان اشعار سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ واقعی معروف نے افضل کو اپنے خلیفہ سلطان کے سپرد کیا تھا لیکن مندرجہ بالا اشعار کی روشنی میں ڈاکٹر زور کا خیال کہ میراں شاہ معروف کے مرید سلطان ہیں اور انھوں نے افضل کو اپنے مرید شاہ سلطان کے حوالہ کیا تھا درست نہیں۔ کیونکہ اولیا کا یہ دستور رہا کہ اپنے مرید کو اپنے مرشد کی جانب برائے برکات اور دعا رجوع کیا کرتے ہیں۔ متذکرہ بالا اشعار میں میراں شاہ معروف کے مرید افضل کو شاہ سلطاں کے تفویض کرنا ظاہر کیا گیا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ میراں شاہ معروف خود سلطان کے مرید میں جنھوں نے اپنے مرید افضل کو اپنے سے اونچی شخصیت (شاہ سلطاں) کے حوالے کیا تھا۔

شاہ سلطاں کو میراں صاحب معروف کا "محی الدین نامہ" مصنفہ افضل کی بنا پر قرار دیا گیا ہے لیکن محی الدین نامہ میں لفظِ "سلطان" سے جو مخاطب ہے وہ شاہ سلطاں سے نہیں بلکہ حضرت غوث پاک سے ہے اور تصنیف کا عنوان "محی الدین نامہ" اس بات کا شاہد ہے کہ اس سے متعلق تمام اشعار حضرت غوث اعظمؒ ہی سے منسوب ہوں گے۔ محی الدین نامہ کے

چند اشعار جن سے ثابت ہوتا ہے کہ محی الدین نامہ غوث اعظم کی مدح میں لکھا گیا ہے اور جس لفظ "سلطان" سے تخاطب غوث پاک سے کیا گیا ہے۔ درج ذیل ہیں ؎

محی الدین سلطان سو پیر ہے　　دسا دین میں وہ جہانگیر ہے
محی الدین سلطان قادر قبول　　لیو ہے گود میں آکر آلِ رسول
دیے پیر سلطان غوث الاعظم　　اسے عشق کا پیالہ ہوے ھضم (ہضم)
نول حضرت محی الدین سلطان ہے　　تو جیو ہے مرے قربان ہے
میراں شاہ معروف مقبول ہے　　محی الدین کے باغ کا پھول ہے
محی الدین دریا ہے موتی ہے جان　　سچا شاہ معروف میراں سو جان

محی الدین نامہ کے ایک مخصوص شعر میں افضل نے اپنے مرشد میراں شاہ معروف اور حضرت غوث پاک دونوں کو "ابن دو" سے مخاطب کیا ہے۔

تصدق کیا جیو اون دو اپر　　کیا ختم افضل تا سر بسر

مندرجہ بالا اشعار میں لفظ "سلطان" سے ڈاکٹر زور کو شبہ ہوا ہے لہٰذا سلطان کا سلسلہ شیخ شاہ معروف سے قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ شاہ معروف کو سلطان ان کا مرید قرار دیا جا سکتا ہے۔

دوسرے تذکرہ نگار جناب نصیر الدین ہاشمی ہیں جنھوں نے "دکن میں اردو" مطبوعہ ۱۹۶۰ء اردو مرکز لاہور میں سلطان کا ذکر اس طرح کیا ہے

"شاہ سلطان قطب شاہی دور کے شاعر ہیں۔ آپ کے متعلق یہ پتا چلتا ہے کہ ایک صوفی بزرگ شیخ میراں شاہ معروف کے مرید تھے۔ حالات کچھ نہ ملی تھی۔"

موصوف کو کتب خانہ آصفیہ کے مخطوطات کی وضاحتی فہرست کی ترتیب کے دوران ان کا ایک مخطوطہ ملا تھا اس میں بھی حالات مصنف میں کوئی اضافہ نہیں ہے۔ ہاشمی صاحب کا شاہ سلطان کو قطب شاہی دور کا شاعر قرار دینا ٹھوس بنیادوں پر مبنی نہیں۔ چونکہ افضل مصنف "محی الدین نامہ" قطب شاہی دور کا شاعر تھا اور اس نے اپنی تصنیف میں حضرت غوث اعظم کو لفظ سلطان سے مخاطب کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہاشمی صاحب اس لفظ "سلطان" کو شاہ سلطان اور افضل کو مرید تصور کرتے ہوئے شاہ سلطان کو بھی قطب شاہی دور کا شاعر قرار دیا ہو۔ راقم سطور کے خیال میں شاہ سلطان کو قطب شاہی عہد کا شاعر قرار دینے کے بجائے دبستان بیجاپور کا شاعر قرار دیں تو سلطان کے حالات زندگی کی گرہ کھل جاتی ہے۔ اس خصوص میں میں نے جو چھان بین کی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ سلطان نام جات گلبرگہ، بیدر، مدراس، نیلور اور آخری زمانہ واڑی گڑہ پونڈی میں رہا۔

شاہ سلطان کے دو نثری تصانیف ہیں (۱) زرالاسرار (۲) زنجیرہ۔

درالاسرار سے متعلق ڈاکٹر زورؔ ادارہ ادبیات اردو کے مخطوطہ نمبر (۲۱۸) میں تحریر فرماتے ہیں۔

"یہ اردو نثر کا ایک رسالہ ہے جس کا مصنف مشہور صوفی شاعر
سلطان کا مرید تھا۔۔ اس سلسلہ کا نام "درالاسرار" رکھیا ہوں۔"

ادارہ کے ایک اور نسخہ درالاسرار نمبر (۱۱۷) کے بارے میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں۔

"زیر نظر کتاب بھی اردو نثر میں ہے لیکن ٹھیک طور پر نہیں
کہا جا سکتا ہے کہ یہ خواجہ بندہ نواز ہی کی زبان ہے۔"

نصیر الدین ہاشمی تذکرۂ مخطوطات کتب خانہ سالار جنگ مرحوم میں دُرّالاسرار کے مخطوطہ نمبر (۲۱۷) کے تعلق سے لکھتے ہیں۔

"اس رسالہ کے مصنف کا نام معلوم نہیں ہوا۔ گمان
غالب ہے کہ خواجہ بندہ نواز سید محمد حسینی گیسو دراز کے
سلسلہ کے کسی بزرگ نے لکھا ہے۔"

ڈاکٹر زورؔ کے فہرست مخطوطات ادارہ ادبیات اردو میں ایک مقام پر دُرّالاسرار کو خواجہ بندہ نواز کی تصنیف ہونے کا شبہ ظاہر کیا ہے اور اس فہرست کے دوسرے اوراق میں درّالاسرار کا مصنف "مرید سلطان" کو قرار دیا ہے اور نصیر الدین ہاشمی نے بھی اپنی وضاحتی فہرست میں اسے شاہ سلطان کی تصنیف ہونے کا شبہ ظاہر کیا ہے اور "دکن میں اردو" میں صاف و صریح طور پر شاہ سلطان کی تصنیف قرار دے دیا ہے لیکن نصیر الدین ہاشمی کی نسبت ڈاکٹر زورؔ کا خیال کہ وہ درالاسرار کو "مرید سلطان" کی تصنیف قرار دیتے ہیں چونکہ شاہ تانی سلطان اپنے والد فخر سلطان کے مرید و خلیفہ تھے اس لئے انہوں نے اپنی تصنیف کا آغاز لفظ "سلطان" ہی سے کیا ہے۔

میرے خیال میں یہ تصنیف نہ تو خواجہ بندہ نواز کی ہے اور نہ ہی مرید سلطان کی بلکہ معروف شاہ چشتی ہند کی تصنیف سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تصنیف شاہ سلطان تانی کی ہے اس کی پہلی دلیل "سالات ۱۹"، "کشف الاسرار" مصنف خواجہ معروف چشتی میں یوں ملتی ہے:

"پس فقیر حقیر خواجہ معروف چشتی ہند حضرت فرد حقیقت
اکمل اولیا خواجہ شاہ عارف باللہ چشتی قدس اللہ اسرارہ
کے صدقے سوں سالکاں ہور طالباں کے واسطے اس صورت
(سورت) بندر میں عشق کا بازار کر کر عاشقاں کوں دکھلانے
یو مخفی کنجی (کنجی) یاٹ کھولتا ہے۔ بموجب فاسئلوا اہل الذکر

ان کنتم لا تعلمون یعنی بوجوں میں بات جانتے سو لوگاں
کوں کہ نہیں جانتے ہیں تو ہور اس رسالہ کا ناوں '
کشف الاسرار رکھا ہوں' جواب سلطان کے نور الاسرار
کا دیا ہوں تا مرید کو مراد حاصل ہو۔"

دوسری دلیل شرح نور الاسرار ص ۳۷ تصوف مقالات جلد دوم' صفحہ ۲۹۱، پر ملتی ہے

" آخری رسالہ میں نور الاسرار از حضرت سلطان
ثانی صاحب فرماتے ہیں سو اس کا شرح فقیر صغیر نعمت اللہ
اپنے سمجھ کے موافق کے ہیں ۔ مرشد خواجہ بدر الدین
حسینی کے صدقہ سوں کیا ؟

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے سلطان کے حالات زندگی اور تصانیف پر جو کچھ کام اب تک ہوا ہے وہ حرف آخر نہیں بلکہ اس سلسلہ میں مزید تحقیق کے لئے میدان کھلا پڑا ہے جو کوئی بھی اس بحر ذخار کی غواصی کرے گا تو " دارم یقین کہ یاد آں در سے بے بہارا ۔ ●

بقیہ سلسلہ " تعلیم کا مقصد " صفحہ (۲۵) سے آگے :

بچے تو ایسے ہی ہوتے ہیں کو یا جدید دور ایک ... سمجھتے ہیں جدید یا ماحول جاری ہے تر بیاں جایز' اور بد عنوانیاں ناگزیر ہیں۔ تربیت کی ضرورت نہیں' اخلاق کی ضرورت نہیں' کردار کی ضرورت نہیں اسی لئے ہماری نئی پود (FRUSTRATED) ہے۔ ایک ذہنی بے اطمینانی ان میں پائی جاتی ہے تہذیب و تمدن کی دیواریں گرتی جارہی ہیں۔ کیا ہمارا منشا یہی ہے کہ ہماری اولاد بغیر (MORALS) اور اعلیٰ اقدار کے زندگی گزارے ؟ کیا تہذیب و تمدن' اخلاق و آداب کا فقدان کسی ملک یا قوم کی ترقی کا ضامن ہو سکتا ہے ؟

موجودہ طریقہ' تعلیم میں کیا کمی ہے ؟ لڑکے لڑکیوں کا رجحان پستی کی طرف کیوں جارہا ہے' کیا اس کا مشاہدہ کرنے کی ابھی ضرورت ہے ؟ اگر نہیں ہے تو کیا ہم ذمہ داران تعلیم سے یہ مطالبہ نہیں کر سکتے کہ تعلیمی اداروں کا جایزہ لیں اور نصاب میں تبدیلی لائیں ؟ ہمیں اپنے بچوں کی صحیح رہنمائی کرنی ہے انھیں اجالوں میں لاکھڑا کرنا ہے اور اندھیروں میں گم نہیں ہونے دینا ہے ضروری ہے کہ ایک صالح معاشرہ کی ابتدا ہو تاکہ ہمارے بچے سر اٹھا کر جی سکیں۔ ان کے کردار کی نشو نما کر کے انھیں اچھا شہری بنانا ہماری پہلی ذمہ داری ہے اور ان کو اچھا انسان بنانا ہمارا پہلا فرض ہے ●

قطب سرشار

نقطۂ انجماد

جمود کا سناٹا
ہر طرف اک سرد سیاہی
کوئی تو گرم منظر ہو
ٹھٹھرتی باصرہ کو کچھ توانائی ملے
لیکن
ہمالہ کی طرح ہر پیکر یخ بستہ
اپنی اونچی قامت پر اکڑ تا ہے
اُدھر وہ ابر کے پردوں میں سورج
منہ چھپائے پھر رہا ہے
پرندے
آشیانوں میں
پروں میں منہ چھپائے
برف کی آواز پا سُن رہے ہیں
گماں کی نرم رو ندی کا سیل خوش ادا
ساکت کھڑا ہے
لغات روز و شب میں
بیشتر الفاظ
اپنی گرم معنی آفرینی کھو چکے ہیں ـــ!!!

پروفیسر خیر

صبحِ کاذب

یہ سچ ہے
جھوٹی حکایتیں من گھڑت لطیفے سنانے والے نے یہ کہا تھا
کہ لومڑی ـــــــ باز کی بہن ہے
جو شاخِ زیتون شوق سے نوش کر رہی ہے
تمام شائستہ شیر سرکس کے اپنے پنجروں میں جا چکے ہیں
جنابِ دجّال ایک مہدی کے روپ میں
گاہِ مشرق میں گاہِ مغرب میں جلوہ فرما ہیں
اوس و خزرج میں پھر لڑائی ٹھنی ہوئی ہے
فرات گنگا میں مل رہا ہے
نشان ہر شہر ہے فلسطینِ بے نشاں کا
گماں کیا کیا ہے بدگماں کا
پھر اس روایت کے بعد راوی نے یہ بھی چپکے سے کہہ دیا تھا
کہ ذکر اس کا کہیں نہ کرنا
یہ جھوٹ ہے سب یقیں نہ کرنا
پھر اس قدر زور کا قہقہہ پڑا تھا
جو دیدۂ تر میں آکے ٹوٹا
یہ سچ ہے

سراج منیر

اردو شاعری کی ایک نئی آواز

عہدِ جدید میں شاعری کے انسانی منصب کی تعریف سینٹ جان پرس نے بہت خوبصورتی سے کی ہے۔ پرس کا کہنا ہے کہ تاریخ کے ایک ایسے لمحے پر جب فلسفہ مابعد الطبیعات کی دہلیز تک پہنچتے پہنچتے ہانپ جاتا ہے صرف شاعری سے اس بات کی توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اعلیٰ ترین حقایق کے ظلم کدے تک پہنچے۔ اس منصب کے پیشِ نظر شاعری کو بجا طور پر "حیرت کی بیٹی" قرار دیا جا سکتا ہے اگر ہم اس امر کو تسلیم کر لیں تو شاعری انسانی حیات اور کائناتی رموز کے درمیان ایک مسلسل ربط کا زندہ اور پرّاں لمحہ ہے اعلیٰ شاعری کی یہ تعریف ذہن میں رکھتے ہوئے اردو شاعری کی پچھلی کچھ دہائیوں پر نگاہ کرنا ایک پُرافسوس تجربہ ہے۔ اس استثنائی مثالوں سے قطع نظر پچھلی دہائیوں کی شاعری حیرت کے زوال اور ادبی فریب کاری کے فروغ کا عبرت انگیز قصہ ہے۔ کسی اجتماعی تجربے میں شرکت کے عدم احساس نے شاعری کے میدان کو یوں بھی تنگ کر دیا اس لئے کہ بہت سے قوی شعرا بھی اپنی تہذیب کی مختلف کیفیتوں میں پوری طرح شریک نہ ہو سکے اور انفرادی طور پر ہی انہوں نے اپنے تجربے کو ایک شکل دی۔ لکھنے والا اپنے لوگوں کے ساتھ مل کر لکھتا ہے چنانچہ کسی بڑے تجربے میں نہ اتر سکنے کی مجبوری نے ان کے کینوس کو بہت تنگ کر دیا۔ اس تنگ دامنی نے اچھے شعرا تو بے شک پیدا کیے لیکن بڑی شاعری سامنے نہ آ سکی اس لئے کہ بڑی شاعری غیر معمولی وسعت کی طلب گار ہوتی ہے اور جو شعرا اپنے انفرادی آشوب سے مضمون آفرینی کرنے میں راسخ ہو گئے ہیں ان سے کسی نئی سطح کی دریافت کی توقع کرنا یا اپنے شعری منظر میں کسی کثیر الجہات طرزِ احساس کو برتنے کی امید رکھنا فضول ہے۔

فی الوقت شاعری ایک بغاوت طلب کرتی ہے۔ اپنی اصل، اپنی مٹی، اپنے بچپن، قلب اور لہو کے آہنگ کی طرف ایک مکمل اور ثمردار بغاوت! اس بغاوت کے بغیر شاعری متوسط الحال قسم کے لوگوں کی سماجی اور انفرادی فرسٹریشن کا بے رس روزنامچہ بن کر رہ گئی ہے۔ اس کیفیت میں

شعری منظر پر صلاح الدین پرویز کا سامنے آنا' اصل' کی طرف پلٹ پڑنے کے رزمیاتی عمل کی خبر دیتا ہے۔

ردّ و قبول سے قطع نظر اس امر میں تو کسی کو کلام نہیں کہ صلاح الدین پرویز کی شاعری ایک مختلف ڈھنگ کی چیز ہے اس میں مذہبی طرز احساس کا غلبہ اسے فوری طور پر دوسری شعری کاوشوں سے ممتاز کرتا ہے لہٰذا اس شاعری کو سمجھنے کے لئے اسی عنصر کے مطالعے سے آغاز کرنا مناسب ہوگا۔

بہت سے لوگوں نے یہ بات محسوس کی ہے کہ صلاح الدین کی شعری کائنات کے مرکز میں نور رسالتؐ سے والہانہ محبت نئے منظروں کو تخلیق کرتی اور نئے لہجوں کی بنیاد اٹھاتی ہے۔ وہ اسی مرکزی روشنی میں کائنات اور اشیاء کو دیکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ صلاح الدین کی نعتیں مروجہ نعتوں سے بدیہی طور پر مختلف ہیں۔ یہاں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی حیثیت ایک تاریخی اور تاریخ ساز شخصیت کی نہیں بلکہ ایک مستند اور رہنے والی روحانی واردات کی ہے۔

اسے بلاؤ کہ ٹوٹ جاؤں میں اس کی آنکھوں میں نیند بن کے
اسے بلاؤ کہ پھوٹ جاؤں میں اس کے سینے میں بوند بن کے

اس میں روحانی تجربے کی کیفیت ہے۔ اس کی شدت اور گہرائی میں حیران کن سچائی بولتی ہے اور حقیقت محمدیہؐ اور جمال رسالت کی تجلیوں میں کھو جانے کی سرمستی اتنی عظیم اور قوی ہے کہ اس کی حدیں جذب سے مل جاتی ہیں۔ اس مرحلے پر شاعری حیرت اور شوق کا ایک سرشار بیانیہ بن جاتی ہے۔ شیخ ابوالرضا محمد نے حقیقت محمدیہ علیٰ صاحب الصلوٰۃ والتحیات کے بارے میں ایک بہت جامع نقرہ لکھا ہے۔ " حقیقت محمدیہؐ برزخ کبریٰ ست درمیان خالق و مخلوق "

بنیاد صلاح الدین کی یہ سرشاری دراصل تکوین کے راز کے روبرو ایک قدم سے پیدا ہوتی ہے اور اس میں شان رسالتؐ کے ساتھ ساتھ کائنات کی فطرت کے اسرار بھی کلام کرتے ہیں یہ صورتحال ہمیں عموماً سلوک بالعشق کے طریق سے تعلق رکھنے والے صوفی شعرا کے ہاں دکھائی دیتی ہے۔ اردو میں اس کی مثالیں یوں تو جگہ جگہ دکھائی دیتی ہیں لیکن اس طرح مربوط تجربے کے طور پر اس کا ظاہر ہونا ایک نادر وحدت کی نشاندہی کرتا ہے۔ صلاح الدین پرویز کے ہاں پورے شعری منظر پر' رسول اکرمؐ کی ذات مبارک کا پرتو پڑتا دکھائی دیتا ہے۔ اردو شاعری کی روایت میں ایسا عموماً ہوتا رہا ہے کہ مجاز و حقیقت کے کنائے سے جمال کے استعارے اس ذاتؐ کی طرف راجع ہوں لیکن پچھلے ایک طویل عرصے سے اردو شاعری اس طریقہ کار سے روگرداں رہی ہے لیکن صلاح الدین نے اسے ایک نئے آہنگ میں زندہ کر دیا ہے۔ مذکورہ نعتوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ عموماً شاعری

کی مروجہ لفظیات سے ہٹ کر لکھی گئی ہیں، ہمیں اس بات کی رمز سمجھ لینا ضروری ہے۔

رسولِ اکرمؐ سے عشق اور ان کے لئے والہانہ شیفتگی انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ یہ ایک قدیم اور بے تغیّر جوہر ہے لیکن وہ روح جو اس سمت بڑھتی ہے اس کی بنت میں عہدِ جدید کا سارا کرب موجود ہے۔ چنانچہ صلاح الدین کے ہاں رسالتؐ کی طرف رُخ کرنا دراصل ایک سطح پر زمانی روح کا اپنے ازلی سوتے کی طرف پلٹنے کے مماثل ہے۔

عشقِ رسالتؐ کے اس مرکزی استعارے کے گرد صلاح الدین پرویز کی شعری کائنات رنگارنگ منظروں کے درمیان دور تک پھیلتی چلی جاتی ہے۔ اس پورے منظرنامے کی سب سے بڑی خصوصیت جو اسے اردو کے موجودہ شعری جہان میں غیر معمولی افتخار بخشتی ہے اس کی وسعت اور بے کناری ہے اس منظرنامے میں نعتیں ہیں، تقدیسی نظمیں، وصال و ہجر کے قصے، لوریاں، جدید شعری اسالیب، اور زبان کے قدیمی لہجے، ہر عنصر موجود ہے۔ اس طرح یہاں شاعری شخصیت کے کسی ایک پہلو کی نہیں بلکہ مکمل شخصیت کا اظہار بن جاتی ہے۔ یہی چیز فی الوقت اردو شاعری کی اہم ترین ضرورت ہے

صلاح الدین کے شعری مزاج کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے ہاں ایک بے حد سیّال کیفیت پائی جاتی ہے۔ ذات کی مختلف سطحوں سے بیک وقت کلام کرنا، کبھی یکے بعد دیگرے تیزی سے، ان سطحوں کو ایک ہی نظم میں اظہار دیتے چلے جانا، ان کے مزاج کا خاصہ ہے۔ اس طرح اکثر ایک ہی نظم میں بہت سے لسانی مزاج یکجا ہو کر سامنے آجاتے ہیں، اس قدر تیزی سے بدلتے ہوئے منظروں میں سفر کرنا، قاری کیلئے ایک حیران کن اور پُرلطف لیکن بہت مشکل تجربہ ہے اسی لئے ایک جہت سے اپنی تمام تر سادہ کاری کے باوجود صلاح الدین مشکل شاعر ہیں ان نظموں کے رنگ قاری کی فعال شرکت سے ابھرتے ہیں اور اس طرح یہ شاعری ذوق کی باطنی کائنات میں ایک پُرتاثیر تجربہ بن کر ابھرتی ہے۔ اگر ہم اس تاثیر کے پس منظر کا سراغ لگانے چلیں تو ہمیں فوراً یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ یہ شاعری انفرادی تجربیت سے نہیں بلکہ اجتماعی حافظے کی ایک عظیم لیکن گم شدہ جہت سے نمو پا رہی ہے۔

صلاح الدین پرویز کے شعری مزاج کا باطن لکھے ہوئے لفظ کی بجائے، بولے ہوئے لفظ کی شعری روایت سے ترتیب پاتا ہے۔ اس میں گھروں میں گائے جانے والے گیتوں سے لے کر صوفیاء کی محفلوں میں پڑھے جانے والے اشعار اور مجلسوں کے نوحوں اور سوز تک کی گونج سنائی دیتی ہے۔ اس تہہ دار روایت سے تعلق نے صلاح الدین کے شعری مزاج میں ایک غیر معمولی والہانہ پن اور تازگی پیدا کردی ہے۔ اس امر کی اہمیت یوں اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ پچھلے کافی عرصے سے اردو شاعری نے اپنے ان سوتوں سے روگرداں ہو کر اپنے رجحانات کے تعین کے لئے مغربی شاعری کے ادبی تراجم پر قناعت کر رکھی ہے

اب اس آواز سے اس بات کی امید بندھتی ہے کہ اردو شاعری کا قائم شدہ منظر ایک نئے لہجے سے طلوع ہوگا۔

اس لہجے کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی سرشاری اور وارفتگی ہے جو جذبات کی ایک پُراسرار کیمیا سے ترتیب پاتی ہے۔ یہ کیفیت صلاح الدین کے ہاں تقدیسی نظموں، ساقی ناموں اور وصال و جمال کے منظروں میں بہت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ اس وارفتگی میں وہ آنچ ہے جو اظہار کے سانچوں کو پگھلا کر انھیں باہم مدغم کر دیتی ہے اسی لیے صلاح الدین کے ہاں ایک ایک نظم میں خالص ہندی مزاج سے فارسی اور عربی موسموں تک مختلف کیفیتیں ایک دوسرے میں گھل مل کر ایک پیچیدہ اور رنگا رنگ منظر ترتیب دیتی ہیں۔ الفاظ کی مروج ترتیب اسی آنچ سے پگھل کر نئے نئے تلازماتی دائروں میں ڈھلتی اور ایک نئی حسیات کی بنیاد رکھتی ہے۔ اس مرحلے پر ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ لسانی سانچوں کی طرف صلاح الدین کے اس رازِ نظر کو پچھلی دہائی میں چلنے والی لسانی تشکیلات کی مصنوعی اور ناکام تحریک سے خلط ملط نہیں کرنا چاہیئے۔ ایک مابہ الامتیاز تو یہ ہے کہ صلاح الدین کے ہاں نئے لسانی سانچے ایجادِ بندہ کی ذیل میں نہیں ہیں بلکہ یہ گفتگو اور ہم کلامی کی فضا سے فطری طور پر پھوٹتے ہیں اور اس طرح اجتماعی حافظے کی پوری قوت ان کے پیچھے ہے۔ دوسرے یہ کہ سُکر کی وہ کیفیت جو ان میں مرتکز ہوگئی ہے وہ ان نئے تلازماتی دائروں کی تشکیل کے لیے وافر جواز ہے اور روایت میں حضرت امیر خسرو سے لے کر آج تک اس کی بہت بڑی مثالیں موجود ہیں۔

اگر ہم غور سے دیکھیں تو اب صلاح الدین کی شاعری میں ایسے سانچے ابھرنے لگے ہیں جو تہذیبی دائروں کے درمیان سفارت کرتے ہیں۔ اس شاعری میں ہندی تہذیب کی حسیاتی رنگا رنگی اپنے عروج پر ہے۔ فارسی تہذیب کی نزاکتیں، وہم و خیال سے پیدا ہونے والے نازک اور نفیس دائرے بھی موجود ہیں اور پھر جگہ جگہ عربی شعری اسالیب کی جھلک بہت واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔ ان سب سے الگ اور ایک سطح پر مربوط جدید شعری اسالیب کے زندہ عناصر ہیں۔ اس طرح ایک مکمل شخصیت کے شعری تجربے میں ایک بہت وسیع تہذیبی پس منظر سمٹ رہا ہے۔ مختلف مزاجوں اور عناصر سے ترتیب پاتا ہوا یہ تہذیبی جہاں عکسِ رسالتؐ سے ایک وحدت میں ڈھلتا چلا جاتا ہے۔ یہ امر شعری تاریخ میں توحیرا پنی جگہ ایک اہمیت کا حامل ہے ہی، اس کے ساتھ ساتھ شخصیت کے باطن سے پھوٹتا ہوا تہذیبی تجربہ بھی ہے۔

صلاح الدین پرویز کا شعری جہاں اتنا متنوّع اور پُر امکانات ہے کہ اس کے بارے میں سرسری باتیں نہیں کہی جا سکتیں یہ شاعری اپنے قاری سے وسیع ذوق اور شعری آہنگ کو جی سکنے کی صلاحیت کا تقاضا کرتی ہے اور آہستہ آہستہ اپنے در باز کرتی ہے اس کے پیچھے محض انفرادی آشوب نہیں،

بلکہ ایک زندہ کلچر کا پورا تجربہ رچا ہوا ہے اور مجرد خیالات کی بازی گاہ میں جہاں اردو شاعری سے انسانی کیفیات معدوم ہوتی جارہی ہیں اور آہنگ مردہ مشینی تکرار میں ڈھلتا جاتا ہے۔ صلاح الدین کی شاعری ہمیں اجتماعی حافظے میں کسی جہانِ زندہ کی خبر دیتی ہے اور اپنے آہنگ اور تمثالوں میں اس جہان کے عکس دکھاتی ہے۔ یہ بات بہت ذمہ داری سے کہی جاسکتی ہے کہ فی الوقت تہذیبی نقطۂ نظر سے صلاح الدین پرویز کا شعری تجربہ ہند اسلامی تہذیب کی بھرپور نمائندگی کرتا ہوا ' ذات کی اکائی سے مختلف سطحوں پر بازیافت کے ایک عمل کو جنم دیتا ہے اور ہم سے مانوس اور رچی ہوئی تہذیبی لفظیات میں کلام کرتا ہے اس لہجے میں اتنی قوت ہے کہ یہ ہمارے لہو میں رواں منظروں کے عکس سے ترتیب پاتا ہے۔

کنفیشن کے عنوان سے صلاح الدین کی طویل نظمیں ایک الگ منظر ہمارے سامنے پیش کرتی ہیں سیاسی اور سماجی مسائل کے اظہار کے سلسلے میں ایک نئی صنف کا درجہ رکھتی ہے اور اس میں لہجوں کے مختلف رنگ ' ایک گہرے آشوب میں گندھے ہوئے سامنے آتے ہیں۔ یہ معاشرے سے ہم کلام ہونے کا نیا اسلوب ہے اس لہجے میں حطابت غم کے ساتھ مخلوط ہوگئی ہے۔

صلاح الدین پرویز کا شعری جہان اپنے منظروں کے تنوع میں ایک غیر معمولی قوت کے ساتھ کسی نئی شعری حسیات کو تخلیق کرتا ہے اور ہمیں ایک بڑے تجربے کے رُو برُو لاتا ہے۔ اس تجربے کو سہارنا اپنی باطنی کائنات کی ترتیبِ نو کرنے کے مترادف ہے۔ یہ ترتیبِ نو ہماری شعری تاریخ میں ایک اہم روحانی واردات ہے۔ ٥

وفیات: (ص۲ سے آگے پڑھیے) پروفیسر عالم خوندمیری کو سانحہ سایا انھیں گردوں کی خرابی کا عارضہ لاحق تھا ملاکس کے کرب سے گزرنا پڑا بیرون ملک علاج معالجہ بھی ہوا آخرکار طبیب حقیقی نے انھیں اپنے پاس بلالیا۔ پروفیسر عالم خوندمیری حیدرآباد ہی نہیں برصغیر ہندو پاک کے دانشور عالموں میں شمار ہوتے تھے ان کے لکچرس اور مقالوں کی شہرت بین الاقوامی حدود کو تسخیر کرچکی تھی۔ اسلامیات، الٰہیات، تصوف کے مارکسی نظریات اور عصری ادبی رجحانات پر ڈاکٹر عالم کی نظر انتہائی وسعت کی رہی ہے حیدرآباد میں ان کا وجود علم و دانش کے کتنے ہی طالب علموں کیلئے فیضان کا باعث رہا۔ سچ ہے عالم صاحب ایسے عالموں کی موت ایک زمانے اور دور کی موت ہوتی ہے۔ جس دن عالم صاحب کا انتقال ہوا اسی شب حیدرآبادی روایات کی ایک بزرگ شخصیت ڈاکٹر راؤ دیشمکھ ڈاکر نے بھی داعی اجل کو لبیک کہا۔ ۸۴ سال عمر تھی۔ تین شعری مجموعے ان کی یادگار ہیں۔ ۱۱ اکتوبر ۸۳ء کو ایک بزرگ شاعر جناب محمود حسین ادیب بھی رخصت ہوئے اپنی وضع کی آپ مثال تھے کسی بھی موضوع پر افسانوی پیرایہ میں داستان گوئی کا ہنر ادیب مرحوم کا وصف خاص تھا جوان پر ختم ہوگیا۔

(وقار خلیل)

سید شاہ سکندر

حالی کی رُباعیاں

صنف غزل کے بعد شاعری میں رباعی کا بھی بہت
رہا ہے۔ یہی وہ صنف سخن ہے جو غزل سے بھی
ہے غزل میں عموماً ۵، ۷ یا ۹ شعر ہوتے ہیں
رباعی میں کل دو شعر یا چار مصرعے ، اس کی کل
ت ہے رباعی کو شعرا عموماً اس صنف سخن کو
نصیحت کے لیے استعمال کرتے رہے ۔ اپنی
ت اور موضوع دونوں کے لحاظ سے چونکہ یہ صنف
اور نصیحت کے لئے سب سے زیادہ کارگر ہے
لئے حالی نے اس سے پورا پورا فایدہ اٹھایا ہے
اردو کے اولین پیامی شاعر تھے اور یہ صنف
ان کے مزاج اور ان کی عصری آگہی سے خوب
ست رکھتی تھی اس لئے حالی کی تمام رباعیاں ان
یام و اصلاح کے مقصد کے لئے جس طرح کارگر
ت ہوئیں اسی طرح حالی کی رباعیاں فنی معیار پر پوری
ی ہیں۔ حالی نے فن رباعی کے سلسلے میں ایک
ی روش یہ اختیار کی ہے کہ بعض ایسے اقوال جو
الٰہی میں یا کسی حدیث میں آئے ہوئے ہیں ان کو
نہوں نے رباعی کی شکل میں کامیابی سے پیش کیا
۔ مثلاً یہ رباعی ؎

دنیائے دنی کو نقش فانی سمجھو
رو داد جہاں کو ایک کہانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا
ہر سانس کو عمرِ جاودانی سمجھو

رُباعی کے فن میں حالی کی کامیابی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے صداقت اور واقعیت ہی کو اپنا موضوع بنایا ہے اور ان ہی کیفیات کو پیش کیا ہے جو ان پر گزری ہیں۔ یہاں بھی ان کا اخلاقی پہلو وہی سماجی بھلائی اور اجتماعی بہبودی ہے۔ حالی کی رباعیوں پر ڈاکٹر سلام سندیلوی تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"حالی کی رباعیوں کا مطالعہ ہم کو ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگِ آزادی سے قریب تر کر دیتا ہے۔ اگر کوئی مورخ اس دور کی معاشرتی اور تمدنی تاریخ کا گہرا مطالعہ کرنا چاہے تو اس کو حالی کے کلام اور ان کی رباعیات سے کافی مدد ملے گی۔"

حالی کی رباعیاں صرف مسائل کو پیش نہیں کرتیں بلکہ ان کا ایک خاص پہلو یہ بھی ہے کہ وہ مسائل کا حل بھی پیش کرتے ہیں۔ ان اعلیٰ قدروں کو پیدا کرتی ہیں جو انسان کو دنیا میں باعزت اور باوقار بناتی ہیں۔ یہ بات

حالی کے پیشِ نظر تھی کہ وہ اس فن کو اپنے پیامی اور اصلاحی مقاصد کے لئے خوب خوب استعمال کریں اور انہوں نے یہی کیا۔ حالی کو زندگی کی چند قدریں بہت عزیز تھیں۔ حالی کے عہد کا سب سے بڑا مطالبہ انصاف، آزادی اور ترقی کا مطالبہ تھا۔ جماعتی صلاح اور فلاح حالی کی اولین اور اہم ترین ضرورت تھی اس کی خاطر حالی نے جن قدروں کو اپنایا اور اجاگر کیا ان سب میں سب سے بڑا پہلو جماعتی صلاح اور فلاح اور معاشرت کی بہبودی سب سے اہم اور اعلیٰ قدر ہے جنھیں خصوصیت سے اجاگر کیا ہے، چنانچہ ڈاکٹر سلام سندیلوی لکھتے ہیں

" حالی کی رباعیات کو صرف قوم کا مرثیہ ہی نہیں سمجھنا چاہیئے بلکہ وہ قوم کے لئے پیغام بھی ہیں۔ ان کی رباعیات میں ہر جگہ اصلاح کا پہلو نمایاں رہتا ہے انہوں نے قوم کی پست حالت کو ابھارنے کی کوشش کی، نوجوان طبقہ کو تحریک وعمل کی ترغیب دی اُن کو تحصیلِ علم کے لئے آمادہ کیا۔ گداگری کے پیشے کی مذمت کی، ہندو مسلم اتحاد کی بنیاد ڈالی، نوجوان کو بازاری عشق کے بُرے اثرات سے آگاہ کیا۔ ان کو محنت و مشقت کی طرف مائل کیا اور ان کو اپنے پیروں پہ کھڑے ہونے کا درس دیا۔ اس طرح حالی نے اپنی رباعیات کے ذریعہ قوم کے عیوب کو دور کرنے کی کوشش کی۔ اسی بنا پر مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی نے حالی کو رباعیات حالی کے دیباچے میں اٹلی کے نامور وطن پرست شاعر "کاردوشی" سے تشبیہ دی اور لکھا ہے۔ "کاردوشی نے زندگی کو وقف کردیا اس نے ملک سے بداخلاقیات کو چاک کیا اور سرزمین وطن کے ذرہ ذرہ کو منور کر دیا اس نے چرچ کی پست حالت پر حملہ کیا اور تقلید و قدامت پرستی کا مضحکہ اڑایا وحید الدین سلیم نے یہی خوبیاں حالی میں بتائی ہیں۔ حالی کی زندگی بھی ہندوستان کی لٹریری زندگی تھی اور انہوں نے بھی کاردوشی کی طرح ملک و قوم کی خدمت کے لئے اپنی زندگی کو وقف کر دیا تھا۔

" حالی کی بعض رباعیاں عوام میں مقبول ہیں۔ اکثر رباعیات اصلاح کا پہلو لئے ہوئے ہیں اور بعض پر تو پند و موعظت کا دھوکہ ہو جاتا ہے"

اس میں کوئی شک نہیں کہ حالی کی اکثر رباعیات سے پند و موعظت کا دھوکہ ہو جاتا ہے لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے دل میں قوم کی فلاح و بہبود کا جذبہ اس قدر شدید تھا کہ وہ اپنے پیغام کو اپنے طرز بیان پر ترجیح دیتے تھے۔ دراصل حالی پیامبر پہلے تھے اور شاعر بعد میں۔ ان کی بصیرت نے حال کے آئینہ میں مستقبل کو واضح کر دیا تھا۔ ایسے ہی جن موضوعات اور مسائل کو اپنی رباعیوں کا مرکز اور محور قرار دیا وہ مسائل ہر عہد میں زندگی کے بنیادی مسائل ہیں۔ حالی نے ان ہی مسائل اور موضوعات کو اہمیت دی جن کی اس وقت قوم اور ملک کو سب سے زیادہ ضرورت تھی یہ موضوعات جتنے اہم اور قابل قدر ہیں اس قدر ان میں ایک طرح کی خشکی اور سادگی بھی ان کا ایک نمایاں پہلو ہے۔ شاید اسی پہلو کے پیش نظر حالی نے اپنی شاعری کو ابالی کھچڑی کہا ہے۔

حالی نے جس عہد کو خاک و خون میں لت پت دیکھا تھا اس کا احساس اور اس کا مکمل اظہار ان کی رباعیوں میں مل جاتا ہے ؎
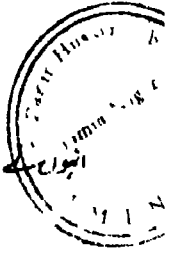
آبا کو زمین و ملک پر اطمینان　　اولاد کو کشتی پہ قناعت کا گمان
بچے آوارہ اور بے کار جوان　　ہیں ایسے گھرانے کوئی دن کے مہمان

انہوں نے عیش و عشرت کو قوم کے لیے مضر اور مہلک قرار دیا ہے

عشرت کا ثمر تلخ سدا ہوتا ہے　　ہر قہقہہ پیغام بُکا ہوتا ہے
جس قوم کو عیش دوست پاتا ہوں میں　　کہتا ہوں کہ اب دیکھیے کیا ہوتا ہے

اس عیش و عشرت نے نینوا، بابل، بغداد اور قرطبہ جیسی عظیم الشان سلطنتوں کو تباہ کر دیا تھا۔ حالی نے اسی تاریخی گواہی کو بطور ثبوت پیش کیا ہے

اے عیش و طرب تو نے جہاں راج کیا　　سلطاں کو گدا، غنی کو محتاج کیا

حالی نے اسی وجہ سے عشق کو بھی معیوب بتایا کیونکہ اس سے گھرانوں میں گھن لگ جاتا ہے اس نے قوموں کو تباہ کیا ہے

اے عشق کیا ہے تو نے گھرانوں کو تباہ　　پیروں کو ضعیف اور جوانوں کو تباہ
دیکھا ہے سدا اسلامی میں تیری　　قوموں کو ذلیل، خاندانوں کو تباہ

حالی نے گداگری کے خلاف بھی اپنی آواز بلند کی جو قومی تباہی کی علامت ہے

اک مرد توانا کو جو سائل پایا　　کی میں نے ملامت، وہ بہت شرمایا
بولا کہ ہے اس کا رن کی گردن پہ وبال　　دیدے کی جنھوں نے مانگنا سکھلایا

یہ اور اس قسم کی رباعیات اپنے ماحول کی آئینہ دار ہیں اس زمانے کے افراد جن خرابیوں میں مبتلا تھے ان کی عکاسی حالی نے اپنی رباعیات میں کی ہے اور اس طرح سے اگر مریض کو اس کے مرض سے آگاہ کیا ہے تو ساتھ ہی حالی نے ایک ہمدرد معالج کی حیثیت سے مرض کے لئے علاج بھی تجویز کیا ہے۔ انہوں نے ان تمام امراض کو دور کرنے کے لئے تحصیل علم پر زور دیا ہے اور یورپ معاشرے کو سامنے رکھا ہے

اے علم کیا ہے تو نے ملکوں کو نہال　　غائب ہوا تو جہاں سے وہاں آیا زوال
ان پر ہوئے غیب کے خزانے مفتوح　　جن قوموں نے ٹہرایا تجھے راس المال

اس کے علاوہ حالی نے قوم کی ترقی کے لئے نوجوانوں کو محنت و مشقت کرنے کی بھی تلقین کی ہے جو ان کے خیال میں ہماری قومی زندگی کی بنیاد ہے

محنت ہی کے پھل ہیں یاں ہر اک دامن میں　　محنت ہی کی برکتیں ہیں ہر خرمن میں
موسیٰ کو ملی نہ قوم کی پاسبانی!　　جب تک نہ چرائیں بکریاں مدین میں

حالی کی یہ شاعری پیامبری کی ہم پلہ ہے ان کی یہ شاعری ایک طرح سے قومی بھلائی کا صحیفہ تھی یعنی ہر بات جو قومی زندگی کے لئے ضروری ہے وہ حالی کا موضوع ہے۔ پروفیسر رضی الدین احمد کی روایت ہے کہ ان کے استاد حضرت عبیداللہ سندھی جب ہندستان سے چلا وطن ہو کر افغانستان، ترکی اور دوسرے ممالک میں گئے تو اس زمانے میں روس میں انقلاب ہوا جس سے انھیں دلچسپی پیدا ہوئی وہ افغانستان سے روس پہنچے اور روس میں ایک نمائش ہوئی

یہ دکھایا گیا تھا کہ انقلاب کے بعد اب جو زندگی کا دور شروع ہو رہا ہے وہ کتنا اچھا ہے اب ہر شخص کو محنت کرنے کا موقع ملے گا اور محنت کرنے سے پورا ماحول جنت بن جائے گا۔ اس نمائش میں محنت کی عظمت اور بڑائی کے بارے میں روسی مفکرین کے ارشادات مختلف زبانوں میں ترجمہ کر کے نمائش میں خاص طور پر آویزاں کئے گئے تھے۔ نمائش دکھانے والے نے حضرت سندھی سے پوچھا کہ کیا آپ کی زبان میں بھی کوئی ایسا شاعر یا ادیب ہے جس نے ایسی کام کی باتیں شعر میں یا نثر میں پیش کی ہوں۔ سندھی صاحب نے سوال کرنے والے روسی کو فوراً جواب دیا ہمارے ایک شاعر مولانا حالی تھے جنھوں نے ایک مشہور نظم "مسدس" مدوجزر اسلام لکھی ہے اس میں سب اسی طرح کی باتیں ہیں، جو تمہاری نمائش میں دکھائی جا رہی ہیں۔ اس نے کہا کہ آپ مسدس کا کوئی ایسا بند سنائیے جو اس معیار کا ہو۔ سندھی صاحب نے محنت کے بارے میں مسدس سے ایک بند سنایا چنانچہ روسی زبان میں اسی کا ترجمہ کرایا گیا اور پھر حالی کے نام سے یہی بند روسی مفکروں کے اقوام کے ساتھ نمائش کی زینت بنا رہا۔

غرض حالی کی رباعیات قومی بھلائی کا ایک ایسا لائحہ عمل ہیں کہ کوئی بات جو قومی زندگی کے لئے لازمی ہے ایسی نہیں ہے جس کا حالی نے حوالہ نہ دیا ہو۔

حالی نے سماج کی اصلاح کے علاوہ مذہب کی بھی اصلاح کی۔ ان کے عہد میں نوجوان طبقہ مذہب سے بیگانہ ہوتا جا رہا تھا اور انگریزی تعلیم و تہذیب کے زیر اثر اسلام کے اساسی اصولوں سے ناواقف ہوتا جا رہا تھا۔ اسی ناواقفیت کی بنا پر ایک طبقہ خدا کے وجود سے ہی انکار کرنے لگا تھا وہ طبقہ تخلیق کائنات کا سبب نیچر کو تسلیم کرتا تھا۔ حالی نے جوشِ عقیدت میں آکر ان نیچریوں اور دہریوں پر ایک ضرب کاری لگائی۔ ان کی یہ دو رباعیات ملاحظہ ہوں ؎

ہندو نے صنم میں جلوہ پایا تیرا — آتش پہ مغاں نے راگ گایا تیرا
دہری نے کیا دہر سے تعبیر تجھے — انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا

کانٹا ہے ہر اک جگر میں اٹکا تیرا — حلقہ ہے ہر اک گوشہ میں لٹکا تیرا
مانا نہیں جس نے تجھ کو جانا ہے ضرور — بھٹکے ہوئے دل میں بھی ہے کھٹکا تیرا

حالی کو نیچریوں کے علاوہ مولویوں اور زاہدوں پر بھی وار کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کیونکہ ان میں بھی پختگی ایمان کی کمی تھی ؎

زاہد کہتا تھا جان ہے دین پر قربان — پر آیا جب امتحان کی زد پر ایمان
کی عرض کسی نے کہئے اب کیا ہے صلاح — فرمایا بھائی جان، جی ہے تو جہان

ایران میں سعدی کو صوفیوں کی نیت پر شبہ ہوا ؎

صوفی کو کسی نے آزمایا ہی نہیں — نیکی میں شک اس نے کوئی لایا ہی نہیں
ہو سکے رائج میں بھی اس کے کوئی کھوٹ — پر اس کو کسی نے پایا ہی نہیں

حالی کو واعظ کے وعظ میں بھی خامی نظر آئی۔ انہوں نے اس کو درشتیٔ کلام سے باز آنے کی تلقین کی ؎

اک گبر نے پوچھے جو اصول اسلام — واعظ نے درشتی سے کیا اس سے کلام

لولاکہ حضور مقتدا ہوں جس کے ایسی ملت اور ایسے مذہب کو سلام

حالی نے یہ بھی محسوس کیا کہ مسلمانوں میں باہمی اختلاف اور نفاق ہے یہ اختلاف اور نفاق اسلام کی بیخ کنی پر آمادہ ہے ۔

کہتا تھا علی اک منار قرآن و منبر کیا لیں گے یہ اہل قبلہ باہم لڑ کر !!
کچھ دم ہے میدان میں آئیں ورنہ کتا بھی ہے شیر اپنی گلی کے اندر

اسی باہمی نفاق کی مذمت اور بھی رباعی میں سختی سے کی ہے اس کا لب و لہجہ رباعی سے زیادہ طنزیہ ہے ۔

جب تک کہ نہ ہو دشمن اخواں ایسا ہوتا نہیں مومن کا درجۂ ایماں پکا
ہم قوم کی خیر مانگتے ہیں حق سے سنتے ہیں کسی کو جب مسلماں پکا

حالی کی مندرجہ بالا رباعیاں اس دور کے مسلمانوں کی کمزوریوں کو بے نقاب کرتی ہیں۔ حالی کے لب و لہجے میں خلوص بھی ہے اور طنز بھی مگر جو کچھ ہے سراسر صداقت پر مبنی ہے۔ حالی کی رباعیات کے آئینے میں اسلام کے اصل خدوخال نظر آتے ہیں ان کی دو رباعیاں ملاحظہ فرمائیے :۔

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی مد ہے جذر کے بعد دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

صحرا میں جو پایا ایک چٹیل میدان برسات میں سبزے کا نہ تھا جس پہ نشان
مایوس تھے جوتنے سے دہقاں یاد آئی ہمیں قوم کے ادبار کی شان

حالی نے اسلام کے تنزل کو ایک چٹیل میدان سے تعبیر کر کے مسلمانوں پر ایک زبردست طنزیہ وار کیا اور یہی وار مسلمانوں کو بیدار کرنے کے لئے کافی ہے۔ اسی وار نے ان کو گراں خوابی سے چونکایا اور ابھرتی ہوئی صبح کے جلوؤں سے ہم کنار کیا۔

حالی کی شاعری کی ایک اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے شاعری سے شعر کے تقاضے پورے کرتے ہوئے قوم کی رہنمائی کا مقدس فریضہ بھی ادا کیا ہے۔

ڈاکٹر عابد حسین نے حالی کی شاعری کی تعمیری حقیقت کا اعتراف کیا ہے اور ساتھ ہی اکبر اور حالی کے نظریات کا فرق بھی بتایا ہے۔ یہی فرق حالی اور اکبر کی رباعیات پر بھی منطبق ہوتا ہے ایک حالی نے سوز داروں کے لہجے میں ملت اسلام کو اس کے عروج و زوال کی داستان سنا کر گزشتہ عظمت و اقبال کی یاد تازہ کر دی اور موجودہ پستی و نکبت پر غیرت دلائی۔ دوسرے اکبر جس نے ظرافت کے پیرائے میں مسلمانوں کو غیروں کی ذہنی غلامی کی ذلت سے آگاہ کیا اور اس کی نظر میں اپنے مذہب و تمدن کا احترام دوبارہ قائم کر دیا۔

حالی جدت پسند تھے قدیم تہذیب کی خرابیوں پر سخت نکتہ چینی کرتے تھے اور جدید تہذیب کی خوبیوں کو اختیار کرنے کی تعلیم دیتے تھے۔ اکبر قدامت پسند تھے نئی روشنی کی ہر چیز پر ہنستے تھے۔ اور پرانی روشنی کی ہر چیز کو

سراہتے تھے مگر دونوں نے مسلمانوں میں غیرتِ قومی کے جذبہ کو ابھارا اپنی مدد آپ کرنے کا حوصلہ دیا اور یاس کی تاریکی میں امید کی ایک جھلک دکھائی۔

ڈاکٹر عابد حسین نے حالی کے کلام کی جو خصوصیات بیان کی ہیں ان کی جھلک صاف طور پر ان کی رباعیات میں بھی پائی جاتی ہے۔ اور ان کا سوزِ دروں اور ان کے دل کی تپش ان کی بہت سی رباعیات میں ملتی ہیں۔ اسی لئے ان کی رباعیاں قوم کا مرثیہ معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً حالی نے ایک رباعی میں کاہلی اور سستی کی مذمت کی کیونکہ یہ بری عادتیں ہر گھرانے کے لئے تباہ کن ثابت ہوتی ہیں۔

حالی کی تمام رباعیاں اپنے موضوع اور مقصد کے لحاظ سے حالی کی شاعری میں سب سے زیادہ کامیاب ہیں ان کو بجا طور پر ہر فرد اور ہر قوم کی زندگی کا دستور العمل قرار دیا جاسکتا ہے۔ حالی کی رباعیاں ان کے مقصد اور پیام سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں اور ان کی پیامی شاعری کا سب سے کامیاب اور اچھا نمونہ ان کی رباعیوں کو کہا جاسکتا ہے۔ چونکہ حالی کا ذہن یکسر تعمیری تھا اس لئے انہوں نے رباعیوں کے ذریعے صورتِ حال کو پوری طرح سمجھنے اور بہتر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اکبر کی طرح انہوں نے محض طنز و ظرافت کا مظاہرہ نہیں کیا ہے۔ حالی کی شاعری میں اعلیٰ اخلاقی اصولوں کا براہِ راست بیان ' ان کی رباعیاں ہیں۔ ان کے اعلیٰ مقاصد اور ان کے بہترین ہونے میں کسی کو شک نہیں لیکن حقیقت اگر شعر کے جامے میں دل نواز نہ ہو اور صداقت شعر کے آئینے میں خوش گوار نہ ہو تو اس کی ادبی اور شعری حیثیت مجروح ہو جاتی ہے۔ اس بنا پر حالی کی رباعیوں میں جس شعریت کی کمی کا اظہار کیا گیا ہے وہ درست ہے۔ دوا کڑوی بھی ہو تو اسے کھانا پڑتا ہے لیکن شاعر دوا کی کڑواہٹ کو شعر کی شیرینی سے اگر بدل دے تو وہ حکیم اور مفکر سے بڑھ کر شاعر بن جاتا ہے۔

حالی نے ان موضوعات اور مسائل کے پیش قوم کو خوب خوب للکارا ہے۔ ان کی للکار میں گھن گرج کی سی کیفیت ہے لیکن یہ تاثیر سے بھرپور ہے۔ ...

— ادارۂ ادبیاتِ اردو میں حاضر ہو کر میں بہت مسرور ہوا۔ نوادر کا اتنا بڑا ذخیرہ ایک چھت کے نیچے ہندوستان میں شاید ہی کہیں ہو۔ خدا مرحوم زور صاحب کے درجات اعلیٰ کرے اور ۲۱ ادارے سے کے بیلا... کے ہاتھ مضبوط کرے تاکہ اس میں دن دگنی رات چوگنی ترقی ہو۔ (شمس الرحمن فاروقی ۵ جنوری ۱۹۸۰ء)

— محی الدین زور کے نام کے ساتھ کب سے میں ادارۂ ادبیاتِ اردو کا نام سن رہا ہوں۔ آج خوش نصیب ہوں اس ادارے میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ در و دیوار کو دیکھا، مخطوطات اور مطبوعات پر نظر ڈالی۔ تصاویر و فرامین، نوادر پر ایک نظر دیکھا، مخزن ہوا اور ایک روحانی بالیدگی حاصل ہوئی۔ (انتظار حسین ۱۷ اپریل ۸۳ء)

منوہر لال ہادی

مانگا جب ایک آئینہ شوقِ مراد نے
ذوقِ سفر دیا دلِ ہمت نژاد نے

دانشِ عمیق جب تذبذب میں غرق ہے
جب سے دکھا دیا اسے جوشِ تضاد نے

یہ کیا کیا ضمیر دیپک بجھا دیا
دل پر برس برس کے سحابِ عناد نے

خاکی تھا خاک کا ذرّہ بے نگاہ تھا
نوری بنا دیا مجھے نورِ جہاد نے

آتا تھا ورنہ مجھ کو بھی ساگر کھنگالنا
بے حوصلہ کیا نفیِ اعتماد نے

آئی نہ مرگ بار قیامت ابھی مگر
رستہ دکھا دیا اسے ماہِ عناد نے

سوئے نشیب چل اٹھے سانسوں کے قافلے
کیسا دیا چراغ دلِ بدنہاد نے

تیرا پتہ بتا نہ سکا ناطقہ ہنوز
دل میں بتا دیا نگہِ اعتقاد نے

ہم سے تو کی تھی اصلِ حقیقت بیاں مگر
مغرور کر دیا اسے تحسین و داد نے

پھیلا دیا ہے زہرِ ہلاہل سماج میں
اندازِ فکرِ عام کے مہلک فساد نے

تحفہ میں پیش کی مجھے تاریخ کی کتاب
ہادی بصد خلوص مری روئداد نے

۵۵

ساغر کرتپوری

اب اس منزل میں لے آیا ہے ذوقِ عاشقی مجھ کو
بہت یاد آئے ہے تڑپائے ہے تیری گلی مجھ کو

گزر کر ظلمتوں سے بجھ گئے آنکھوں میں جب تارے
یہاں پر دل کے داغوں سے ملی ہے روشنی مجھ کو

سفر صدیوں کا طے کر آیا ہوں لمحوں کی کشتی میں
خدا کے واسطے تم مت سمجھئے ناولی مجھ کو

ہوا کے زور پر منڈلا رہا تھا کل سروں پر جو
اسی ننھے سے تنکے سے ملی ہے سرکشی مجھ کو

مرے ہاتھوں نے یوں تو پتھروں کو حسن بخشا ہے
مگر ہر موڑ پر ڈستی رہی تیری کمی مجھ کو

ڈبو دیتا میں اپنی زیست کو کالے سمندر میں
ذرا بھی حوصلہ دیتا جو احساسِ خودی مجھ کو

سہارا پا کے تیرا آج میں خود سے بھی بچھڑا ہوں
طلب کی راہ میں اے زندگی تو کیا ملی مجھ کو

جلن آنکھوں میں اجڑے دل میں سو طوفان چلتے ہوں
مری شعلہ مزاجی بخش دے وہ بے کلی مجھ کو

گلوں سے زخم کانٹوں سے خلش جب سے ملی ساغر
بڑی حسرت سے تکتی ہے چمن کی ہر کلی مجھ کو

۵۵

سیدہ طیبہ بیگم

تعلیم کا مقصد

تعلیم کا لازمی نتیجہ کردار اور خیالات کی جلا ہے، ذہن و شعور کی آبیاری ہے۔ تعلیم ہماری سوچ و
لر کو بلندیوں سے ہمکنار کرتی ہے۔ تعلیم سے ہمارا کردار، ہمارا عمل اور ہماری شخصیت نکھر سنور کر عام
ادمی کی سطح سے بلند ہو جاتی ہے۔ آدمی وہی ہوتا ہے جو وہ سوچتا ہے انگریزی مثل ہے کہ:
"A MAN IS WHAT HE THINKS"۔ چنانچہ جس قدر ہماری سوچ و فکر اونچی ہوگی اُسی قدر
ہارا عمل احسن و اعلیٰ ہوگا۔ فکر بلند ہو، نظر بلند ہو تو یہی کردار کو بلندی عطا کرتے ہیں اور جس کا کردار بلند
ہوتا ہے زمانہ اس کے آگے سرنگوں ہو جاتا ہے وہ فاتح عالم کہلاتا ہے یہی انسان کی عظمت ہے اور
ہیں، پنچ کر اقبال نے کہا ہے ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خُدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے؟

اپنے وجود، اپنی شخصیت اور عظمت کو جاننے اور پہچاننے کے لئے ہمیں صحیح تعلیم کا حاصل
رنا ضروری ہے۔

تعلیم اور تربیت کے لئے ہمیشہ ماں کی گود ہی تلاش کی جاتی ہے۔ ماں ہی بچے کو تخلیق دیتی
ہے۔ اس کی فطرت کو سنوارتی ہے، ماں ہی بچے کی نشو ونما اور تربیت کی ذمہ دار ہوتی ہے۔
ہ الفاظ دیگر بچے کی زندگی ماں ہی کے ترتیب دیئے ہوئے سانچوں میں ڈھلتی ہے اس لئے تعلیم
سواں کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ایک پڑھی لکھی سلجھی ہوئی ماں ملک و سماج کو اچھے اور،
مہ دار شہری دے سکتی ہے، ایک منظم قوم تیار کر سکتی ہے۔ عورت کو قوم کا معمار کہا گیا ہے
ہوں کی آبادی یا بربادی کا انحصار عورت پر ہے۔

قدرت نے نہ صرف عورت کو تخلیقی قوت بخشی ہے بلکہ اس کی انفرادیت، اہمیت اور عظمت

اور بلند مقام کا بھی تعین کر دیا ہے۔ اقبال اور حالی نے عورت کو "آسمان کا تارہ" اور "قوموں کی عزت" سمجھا۔ عورت' شعروں کے زمزمے گلوں کی چہکاریں' صرف ایک احساس بن کر جینے کا نام نہیں' وہ ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ ایثار و قربانی اس کا شیوہ رہا ہے۔ اس نے دنیا کو ہمیشہ کچھ نہ کچھ دیا' لیکن بدلے میں کسی چیز کی خواہش نہیں کی۔ اس کی ممتا بے غرض' اس کا پیار مہان ہے اسی لئے قدرت نے اسے "ماں" بنایا کہ اس سے بڑھ کر پیار و محبت' صبر و برداشت اور علم و عمل کا منبع کوئی نہیں' اس سے بڑھ کر شکتی اور طاقت کوئی نہیں۔ اس سے بڑھ کر معلم کوئی نہیں۔ وہ مٹ کر دوسروں کو زندگی دیتی ہے اور زندگی کی قیمت سمجھاتی ہے۔ سمجھنے والے کے لئے عورت کی ذات خود ایک ایسی "کھلی کتاب" ہے جس میں اسے زندگی کا ہر سبق مل سکتا ہے۔

آج کے زوال پذیر ماحول میں امید کی ایک کرن صرف بچے ہیں' جنھیں صحیح تعلیم و تربیت اور پاکیزہ ماحول دے کر ہم ان کی زندگی اور مستقبل کو تابناک بنا سکتے ہیں۔ ان کی شخصیت کی تعمیر کر کے انھیں' آدمی سے انسان بنا سکتے ہیں۔ جب وہ انسانیت کے دائرے میں داخل ہوگا تو امن و محبت کا پیام پھیلا سکے گا۔ معاشرے کو بہتر بنا سکے گا۔ اچھی نسل کی تعمیر ہر اس ماں باپ اور استاد اور سماج کا فرض ہے' جو تہذیب و شائستگی اور اعلیٰ انسانی اقدار کو عزیز رکھتا ہے۔ جس طرح علم بغیر عمل کے ادھورا ہے' انسان بنا تہذیب کے نامکمل ہے۔ اخلاق و آداب سے آدمی مہذب کہلاتا ہے' شائستہ کہلاتا ہے اور مہذب اور شائستہ آدمی ہی مہذب قوم کو پیدا کر سکتا ہے اور مہذب سوسائٹی میں رہنے کے قابل بن سکتا ہے' تہذیب کے چراغ روشن رکھ سکتا ہے۔

زندگی میں چند قدریں یا (VALVES) ہیں۔ چند اخلاقی اور سماجی قدریں' جنھیں ہر قیمت پر قائم رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ وہ اعلیٰ روایتیں اور قدریں جو کبھی ہماری معاشرت' ہماری تہذیب و تمدن اور زندگی کا جز تھیں' آج فراموش کر دی گئی ہیں۔ ان کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔ اہمیت آج کل دولت کی ہے' رتبہ' کرسی یا پوزیشن کی ہے۔ ہر کوئی اسی کا طلب گار نظر آتا ہے' کیوں کہ اس میں طاقت ہے' یہ ہر برائی کی پردہ پوشی کرتی ہے۔ یہ ضمیروں کو خریدتی اور سچائی کو ملیامیٹ کرتی ہے۔ آدمی کی ذہنیت اس قدر پست ہوگئی ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ کرسی ہی اس کا خدا ہے' اس کا کھانا' پینا' اوڑھنا' بچھونا ہے۔ عزت سے جینا ہے تو کرسی کو تھامنا چاہیئے۔ کرسی ہی کو پوجنا چاہیئے۔ آدمی یہ کیوں بھول گیا کہ عہدہ' رتبہ' یا پوزیشن کی بلندی آدمی کو بڑا نہیں بناتی بلکہ آدمی خود اپنے بلند کردار' نیک عمل' راستبازی اور حق گوئی سے اس عہدہ یا پوزیشن کو بڑا کرتا ہے' جس پر وہ فائز رہتا ہے۔

سوچ و فکر میں اس قدر انحطاط آچلا ہے کہ آدمی اپنی خودداری کا بھی سودا کر چکا ہے، جھوٹی چمک دمک کے سہارے، کرسی اور طاقت کے بل بوتے پر، چند خود غرض لوگ سچائی کو مسخ کر کے معصوم اور بے گناہوں کی زندگیوں سے بھی کھیل لیتے ہیں لیکن کسی کی آواز نہیں اٹھ سکتی۔ دولت کی طاقت، سچ کی آواز کو کچل دیتی ہے۔ شاید اسی لئے کچھ لوگ دولت کو خدا کا مرتبہ بھی دیدیتے ہیں۔

زندگی اور اس کی قدروں کو جاننے کے لئے بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے اور بصیرت صرف علم ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ تعلیم وہ نہیں جو آج کل اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں دی جاتی ہے۔ نصابی کتابیں ذہن و شعور کے دروازے ضرور کھول دیتی ہیں لیکن اچھی بری باتوں کی تمیز تو صرف ایسا ماحول دے سکتا ہے جس میں اخلاقی و سماجی اقدار و اصول ہوں۔ یہ اصول موجودہ تعلیمی اداروں میں بتلائے نہیں جاتے۔ یہاں ان کی اخلاقی تربیت نہیں ہوتی یہاں بزرگوں کا احترام نہیں سکھایا جاتا جو نسل یا قوم اپنے اسلاف کے کارناموں کو جان کر ان سے سبق حاصل نہیں کر سکتی، جو قوم اپنے بزرگوں کا احترام نہیں کر سکتی، ان کی بتائی ہوئی تعلیمات سے مستفید نہیں ہو سکتی، وہ قوم و نسل کھوکھلی ہے۔ ہر حال کا ایک ماضی ہوتا ہے اور ہر ماضی اور حال ایک مستقبل سے منسلک ہوتے ہیں۔ ماضی کو فراموش کر کے ہم مستقبل سے ناتہ نہیں جوڑ سکتے۔ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بے اصولی، بے راہ روی، بے ادبی، چھیڑ چھاڑ، غنڈہ گردی، پتھراؤ، گھیراؤ اور دوسری نازیبا حرکتیں اچھے ماحول سے دوری کا نتیجہ ہے، یہ تعلیم کا مقصد نہیں۔ کوئی قوم، سماج یا ملک ایسے غیر محفوظ اور غیر منظم ماحول میں پنپ نہیں سکتا۔ یہ انسانی عظمت کے خلاف ہے۔

ہمیں بچوں کو بتانا ہے کہ اچھی چیزیں اور اچھے اقدار ہر زمانے میں اچھے ہوتے ہیں، انہیں اپنانا چاہیئے۔ چند اصول ہوتے ہیں جو دنیا میں رہنے اور جینے کے ڈھنگ سکھاتے ہیں۔ انھیں ہم دوسرے الفاظ میں "قوانین" کہہ سکتے ہیں، یہ ہمیں اپنے حقوق و فرائض بتلاتے ہیں تاکہ ہم دوسروں کے ساتھ اپنے حقوق کی بھی حفاظت کریں اور اپنے فرائض کا صحیح استعمال کریں تاکہ سماج میں امن و امان رہے اور شیطان صفت لوگوں کی ہمت افزائی نہ ہو۔

دورِ جدید کی جدیدیت کے اچھے اور برے دونوں پہلو نظر آتے ہیں۔ اس کے اچھے پہلوؤں کو اپنا کر برائیوں کو چھوڑنا ہوگا۔ دورِ جدید میں ایک تصور بہت نمایاں نظر آتا ہے کہ بچوں کو رہنمائی کی ضرورت نہیں، وہ اپنے بزرگوں سے زیادہ جانتے ہیں، اخلاق و آداب کی اہمیت نہیں، یہ سب فیوڈل سماج کی دین ہیں، یہی نہیں بلکہ دورِ جدید کا نام لے کر ماں باپ اپنی ذمہ داریوں سے منہ پھیر لیتے ہیں اور سارا الزام زمانہ پر تھوپ دیتے ہیں کہ اس دور کے

(بقیہ صفحہ ۱۹ پر دیکھئے)

وقار خلیل

اردو نامہ

اردو کی علمی، ادبی اور تہذیبی خبریں

اگست ۱۹۸۴ء

یکم اگست : صدر جمہوریہ ہند سردار گیانی ذیل سنگھ نے "راشٹرپتی نیلائم" میں ممتاز نقاد ڈاکٹر مغنی تبسم ہیڈ شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی و جوائنٹ سکریٹری ادارۂ ادبیات اردو کی نئی تصنیف "آواز اور آدمی" کی رسم اجراء انجام دی۔ آپ نے اس موقع پر جامعہ عثمانیہ اور ڈاکٹر مغنی تبسم کی دیرینہ علمی اور تعلیمی خدمات پر ستائشی کلمات ارشاد فرمائے۔ یہ خوشگوار تقریب ایلڈرس کونسل آف انڈیا کے زیر اہتمام آراستہ ہوئی تھی۔

۲ر اگست : اقبال اکیڈیمی کی طرف سے علامہ اقبال کے فلسفۂ شعر و حکمت پر علمی محفل پروفیسر سید سراج الدین کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ ڈاکٹر وحید اختر ریڈر شعبۂ فلسفہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے علاوہ یوسف اعظمی، ظہیر الدین احمد، مصلح الدین سعدی اور قدیر الزماں نے مقالوں اور مباحث کے ذریعہ اقبال شناسی کا فریضہ انجام دیا۔ خواجہ ناظم الدین نے نظامت کی۔

۶ر اگست : ادارۂ "جدید فکر و عوامی ادبی رجحانات" کے زیر اہتمام "مکس میلر بھون" میں ممتاز اور شہرت یافتہ مصور عزیز آرٹسٹ کے پینٹنگز کی مصوری نمائش "نذر پروفیسر عالم خوندمیری" کا جناب سید ہاشم علی اختر وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی نے افتتاح کیا۔ اس مقصدی نمائش میں عزیز کی فروخت شدہ پینٹنگز سے ۱۲ ہزار روپے کی آمدنی ہوئی جسے پروفیسر عالم کے معالجہ کیلئے استعمال میں لایا گیا۔

● بزرگ شاعر حکیم داور حسینی مرحوم کی یاد میں "بزم داور" کا افتتاحی مشاعرہ رحمان جامی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ نظیر علی عدیل اور نواب محمد بن صلاح (شمشیر یار جنگ) نے مہمانِ خصوصی کی حیثیت میں شرکت کی۔

۱۰ر اگست : دکن کے کثیر التصانیف ڈرامہ نویس، ادیب اور فن کا کھنا بیٹا منجو قمر یداللہی کا طویل علالت کے بعد انتقال ہوا اور حیدرآباد ایک کلاسیکی ڈرامہ شناس عالم اور مصنف سے محروم ہوگیا۔ ع خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں ....

۱۳ر اگست : محفل خواتین کا ادبی و شعری اجلاس بیگم ڈاکٹر راج پرشاد کی صدارت میں منعقد ہوا۔ عظمت عبدالقیوم اور ساجدہ عابد نے مضمون اور کہانی پیش کی۔ خواتین شعراء نے اپنا کلام سنایا۔

۱۴ر اگست : ملک الشعراء حضرت اوج یعقوبی کا اورنگ آباد (مہاراشٹرا) میں ۱۳ر اگست کی صبح حرکت قلب بند ہوجانے کے باعث اچانک انتقال ہوگیا۔ حضرت اوج ایک عرس کے مشاعرہ میں اپنے افراد خاندان اور تلامذہ کے ساتھ وہاں گئے ہوئے تھے۔ میت حیدرآباد لائی گئی اور ہزاروں اوج شناسوں نے جلوس میت اور تدفین میں شرکت کرکے دعائے مغفرت کی۔ حیدرآباد کے شعری، علمی اور صحافتی

حلقوں میں رحلتِ اوج پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا گیا اور ان کی رحلت کو سانحہ قرار دیا گیا۔ "گرفتِ نظر" اور "غنچۂ لب بستہ" دو شعری مجموعے حضرت اوجؔ کی یادگار ہیں۔

● بزمِ محبانِ اردو کی طرف سے "اردو گھر" میں غزل کے معتبر شاعر جناب داؤد نصیب کی خدمات کے اعتراف میں ۱۴ ہزار پانچ سو روپے کا کیسۂ زر نذر کیا گیا۔ جناب سید مکثر شاہ صدر ریاستی لیجسلیٹو کونسل نے صدارت کی۔ ڈاکٹر یعقوب عمر، جناب مبشر احمد اور جناب صادق نقوی نے داؤد کی شعری حیثیت اور ان کی سادہ اور پُرکار شخصیت پر اظہارِ خیال کیا۔

۱۶ اگست: ریاستی اردو اکیڈمی کی طرف سے حضرت اوجؔ کے پسماندوں کی خدمت میں ۲ ہزار روپے منظور کئے گئے جسے اکیڈمی کے عہدے داروں نے بیگم اوجؔ کے حوالے کیا اور اکیڈمی کی طرف سے اظہارِ تعزیت کیا گیا۔

۱۸ اگست: نامور طنز و مزاح نویس، مصنف اور ریاستی آئی اے ایس عہدیدار جناب نریندر لوتھر کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں "بہار اردو اکیڈمی" کی طرف سے ادبی ایوارڈ دیئے جانے پر حیدرآباد کے علمی اور ادبی حلقوں نے اظہارِ مسرت کیا۔

۲۴ اگست: مشہور طنز و مزاح نویس جناب مسیح انجم کی تیسری نگاہی تصنیف "چنانچہ" زندہ دلانِ حیدرآباد کی طرف سے شائع ہوئی۔

۲۵ اگست: فصاحت جنگ جلیل یادگار بین کلیاتی تقریری و تحریری مقابلوں کے انعامات کا جلسہ ڈاکٹر مغنی تبسم کی صدارت میں بمقام "اعظم پال سٹی کالج" منعقد ہوا۔ ڈاکٹر یوسف سرمست ریڈر شعبۂ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی مہمانِ خصوصی تھے۔ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ، ڈاکٹر سرمست اور ڈاکٹر تبسم نے حضرت جلیلؔ کی شعری خدمات پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے تقریری و تحریری مقابلوں کی افادیت پر روشنی ڈالی، محفلِ شعر میں علی احمد جلیلی، ڈاکٹر تبسم، ڈاکٹر مہر جہاں، ڈاکٹر بیگ، عبدالسلام جاوید اور تاج تمیم نے کلام سنایا۔

۲۶ اگست: جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل جناب مقبول فاروقی جو ان دنوں آندھرا یونیورسٹی والٹیر میں اردو کے لکچرار ہیں اور عصری شاعری کے نمائندہ بھی ہیں اپنے پی ایچ ڈی کے مقالہ "اردو شاعری میں ہندی عروض کا استعمال" کی تکمیل پر آندھرا یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری کے مستحق قرار پائے۔ ڈاکٹر مقبول فاروقی نے ڈاکٹر مغنی تبسم (عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد) اور ڈاکٹر شیخ محمد اقبال (لکچرار ہندی آندھرا یونیورسٹی والٹیر) کی نگرانی میں مقالہ سپردِ قلم کیا تھا۔

۲۸ اگست: اردو مجلس کی طرف سے اردو ہال میں بصدارت محترمہ جیلانی بانو "شامِ افسانہ" کا اہتمام ہوا۔ جناب عوض سعید، جناب نسیم زبیری، محترمہ بانو طاہرہ سعید اور صدر صاحبہ نے کہانیاں سنائیں۔ صلاح الدین نیر معتمد اردو مجلس نے نظامت کی اور شکریہ ادا کیا۔

۳۰ اگست: پروفیسر سید بشیر الدین صدر شعبہ جرنلزم عثمانیہ یونیورسٹی کے قطر میں ہندوستانی سفیر کی حیثیت سے نامزدگی پر "بزمِ کہکشاں" کی طرف سے

•بہادر یار جنگ ہال میں جلسہ تہنیت بصدارت ڈاکٹر نظم ڈائرکٹر سالار جنگ میوزیم کا اہتمام کیا گیا۔ مسز ظہور الحسن صدر بزم، شمیم نقوی اور سید علی برتر نے پروفیسر شہر کی خدمات کو خراج ادا کیا اور مختلف تنظیموں کی طرف سے موصوف کی گلپوشی کی گئی۔

۳۱ اگست : آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد کے شعبہ اردو کا محترمہ ثریا بیگم سعید نے جناب مرزا اظہر افسر سے پروگرام ایگزیکیٹو کا جائزہ حاصل کیا۔ جناب افسر نے اپنی مدت ملازمت کے اختتام پر سبکدوشی حاصل کرلی ہے۔ وہ ان دنوں تصنیف و تالیف اور حیدرآباد میں ریڈیائی ڈراموں اور ادب اطفال پر تخلیقی انہماک میں مصروف ہیں۔ محترمہ ثریا سعید کو ایک استقبالیہ تقریب میں کارکنان نشریات نے خوش آمدید کہا اور ریڈیو کے اردو پروگراموں کی بہتری کی توقعات وابستہ کیں۔ مسز ستیو سنکرن، بشیر قربان علی، اسلم فرشوری، باقر مرزا اور عابد سلطان شاہین نے مخاطب کیا۔ محترمہ ثریا بیگم نے حیدرآباد کو میزبانوں کا شہر قرار دیتے ہوئے تمام اصحاب سے بھرپور اشتراک و تعاون کی گذارش کی۔

ستمبر ۱۹۸۲ء

۴ ستمبر : تلامذہ و اوج شناسوں کی طرف سے "اردو گھر" میں جلسہ تعزیت حضرت اوج یعقوبی بصدارت سلطان صلاح الدین اویسی (ایم ایل اے) منعقد ہوا۔ مرحوم شاعر کے افراد خاندان کے لئے "فیملی ویلفیر فنڈ" کے قیام کا کرنٹی صدارت سے اعلان کیا گیا، جس کے اراکین مسز عابد علی خاں، ایڈیٹر سیاست، محبوب حسین جگر، جوائنٹ ایڈیٹر سیاست، سید لطیف الدین قادری، ایڈیٹر رہنمائے دکن، محمود انصاری ایڈیٹر منصف، عبدالمجیب خاں ایڈیٹر اسوسی ایٹڈ نیوز سرویس، رضا حسین اور سید عابدی منتخب ہوئے۔ مسز محمد علی زیرک اور اظہر شرفی معتمد خازن بنائے گئے ہیں۔ حضرت اوج کی شخصیت اور شاعری پر محمود انصاری، مجتبیٰ حسین، صادق نقوی نے اظہار خیال کیا اور شعراء نے نذرانۂ سخن پیش کیا۔ ایک قرارداد کے ذریعہ ریاستی حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ حضرت اوج کے افراد خاندان کی گذر بسر کے لئے وظیفہ جاری کرے۔ محمد علی زیرک نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔

۷ ستمبر : ڈاکٹر سید عبدالمنان صدر ریاستی انجمن ترقی اردو نے ریاستی وزیر اردو اکیڈیمی مسٹر محمد شاکر کو ایک مکتوب کے ذریعہ اس جانب توجہ مبذول کرائی ہے کہ سرکاری دفاتر میں اردو کے رواج کے لئے ۱۵ فیصد آبادی کی شرط قطعاً نامناسب ہے۔

● بزم کہکشاں کے زیر اہتمام ادبی و شعری محفل ممتاز طنز و مزاح نگار، لکھنے والے ادیب جناب مجتبیٰ حسین کی صدارت میں آراستہ ہوئی۔ جناب نریندر لوتھر صدر زندہ دلان حیدرآباد مہمان خصوصی رہے۔ مسٹر مجتبیٰ اور مسٹر لوتھر کے علاوہ جناب مسیح انجم، جناب طالب خوندمیری اور جناب برہان حسین نے اپنی مخصوص تخلیقات پیش کیں۔ مشاعرہ میں طنز و مزاح کے علاوہ سنجیدہ طرز فکر کے شاعروں نے بھی کلام سنایا۔

۱۱ ستمبر : نامور ترقی پسند شاعر اور سیاسی رہنما مخدوم محی الدین کی ۱۴ ویں برسی کے جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے

سابق چیف منسٹر مسٹر این ٹی راما راؤ نے فرقہ وارانہ فسادات کی شدید مذمت کرتے ہوئے کہا کہ محمد قلی قطب شاہ اور بھاگ متی کا یہ شہر آرزو جو صدیوں سے اپنے مشترکہ اقدار اور امن کا گہوارہ رہا ہے اس کی روایات کو پروان چڑھانے کا عہد لینا ہی مخدوم کی حقیقی یاد ہے "ایسلا" نے اس تقریب کا اہتمام کیا تھا جناب منوہر راج سکسینہ، ترناسٹ مسٹر پرتاب کشور اور ہندی شاعر مسٹر اگنی دت نے بھی خطاب کیا۔

۱۲ ستمبر: "حضور نظام آصف سابع کے فرزند اور ممتاز غزل گو شاعر' حضرت پرنس معظم جاہ شجیع کا مجموعۂ کلام "جذبات شجیع" کی رسم اجرا علم دوستوں اور شعرا کی موجودگی میں جناب محامد علی عباسی صدر ادارۂ ادبیات اردو نے انجام دی۔ ڈاکٹر سید عبدالمنان، نواب کاظم نواز جنگ ڈاکٹر مغنی تبسم اور مسٹر منوہر راج سکسینہ نے شجیع کی غزلیہ شاعری پر اظہار خیال کیا۔ کتاب کے ناشر مسرز نصیر احمد اور قاسم خاں (حسامی بکڈپو) نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔

۱۳ ستمبر: ترقی اردو بورڈ حکومت ہند کے زیر اہتمام مرکز خوشنویسی ادارۂ ادبیات اردو کے امیدواروں کا مسٹر ابوالفیض سحر مددگار ناظم بورڈ نے انٹرویو لیا اور سال اول میں ۲۷ طلبا وطالبات کو داخلہ دیا گیا۔

۲۳ ستمبر: کمشنر پولیس نے اردو روزنامہ "منصف" کے دفتر کی تالہ بندی کی، جس کے خلاف عمومی طور پر احتجاج کیا گیا۔

۲۷ ستمبر: نامور مفکر اور دانشور' پروفیسر سید عالم خوندمیری کا گردوں کی خرابی کے باعث طویل علالت کے بعد انتقال ہوا۔ ڈاکٹر عالم نے بغرض معالجہ امریکہ اور کینیڈا کا بھی دورہ کیا تھا حیدرآباد کے علمی' ادبی' سیاسی اور سماجی حلقوں کی طرف سے متعدد تعزیتی بیانات جاری ہوئے پروفیسر عالم کی وفات پر اظہار رنج والم کیا گیا۔

● بزرگ شاعر جناب دگمبر راؤ دیشمکھ دنکر ایڈوکیٹ کا طویل علالت کے بعد ۸۴ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ جناب دنکر کے تین شعری مجموعے ان کی یادگار ہیں۔

اکتوبر ۱۹۸۳ء

---

۵ اکتوبر: روزنامہ "منصف" ۱۲ دن کی تالہ بندی کے بعد عدالت العالیہ کے جسٹس مسٹر پی جیون ریڈی کے احکامات پر اشاعت پذیر ہوا جسٹس ریڈی نے فیصلہ دیا کہ "آزادی صحافت سے زیادہ اہم کچھ نہیں ہے۔"

۶ اکتوبر: بزرگ ماہر تعلیم دانشور پروفیسر سید علی اکبر صاحب سابق صدر ادارۂ ادبیات اردو کی گراں قدر خدمات کے اعتراف میں ادارہ کی طرف سے ایوان اردو میں جلسہ اعتراف خدمات منعقد ہوا۔ پروفیسر حبیب الرحمن سابق صدر ریاستی انجمن ترقی اردو نے صدارت کی۔ جناب محامد علی عباسی صدر' ادارۂ ادبیات اردو نے خیر مقدمی خطاب کیا۔ جناب عابد علی خاں' ایڈیٹر سیاست' نواب شاہ عالم خاں' صدر انوار العلوم ایجوکیشنل سوسائٹی' ڈاکٹر رحیم الدین کمال اور جناب سید عالم نے تعلیم اور علوم وفنون کے لیے پروفیسر علی اکبر صاحب کی خدمات کو حیدرآباد کلچر اور تعلیم کے ارتقاء کا سہرا باب قرار دیا۔

ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے پروفیسر علی اکبر کی خدمت میں مومنٹو

جناب عابد علی خاں نے نذر کیا۔ اس موقع پر جناب عابد نے صدر ادارہ کو ادبی ٹرسٹ کی طرف سے ڈیڑھ لاکھ روپیوں کا چیک ادارہ ٹرسٹ کے لئے حوالہ کیا۔ جناب رمن راج سکسینہ معتمد اعزازی ادارہ نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ صاحب حیدرآبادی اور ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید نے پروفیسر علی اکبر کو منظوم نذرانۂ سخن ادا کیا۔ "سب رس" کا علی اکبر نمبر (ستمبر اکتوبر ۱۹۸۴ء) بھی اس موقع پر شائع ہوا ہے۔ پروفیسر علی اکبر کی نمایندہ علمی اور تعلیمی اداروں کی طرف سے بکثرت گلپوشی بھی کی گئی۔

۸ راکتوبر : ممتاز مفکر اور دانشور پروفیسر عالم خوندمیری کی یاد میں مختلف علمی و ادبی اداروں "لسانی تنظیموں کی طرف سے" اردو ہال میں ایک نمایندہ تعزیتی جلسہ جناب ہاشم علی اختر وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر میر اکبر علی خاں سابق گورنر یوپی، کیمونسٹ رہنما کامریڈ روی نارائن ریڈی، شریمتی اندرا دھن راج گیر صدر ریاستی ہندی اکیڈیمی، ڈاکٹر مغنی تبسم شریک معتمد ادارۂ ادبیات اردو جناب افتر حسن شریک معتمد ریاستی اردو اکیڈیمی، ڈاکٹر حسینی شاہد معتمد ریاستی انجمن ترقی اردو، جناب ظہیر الدین احمد معتمد اقبال اکیڈیمی اور ڈاکٹر انور معظم صدر شعبۂ اسلامیات عثمانیہ یونیورسٹی اور تلگو، ہندی اور انگریزی کے دانشوروں نے پروفیسر عالم کی علمی خدمات اور دانشورانہ بصیرت و بصارت پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی وفات کو دنیائے علم و ادب کا نقصان عظیم قرار دیا۔

۱۲ راکتوبر : بزرگ شاعر اور داستان گوئی کے ماہر جناب محمود حسین ادیب کا مختصر علالت کے بعد انتقال ہوا۔

۱۷ راکتوبر : حیدرآباد کی ایک مثالی اور قدیم علمی تنظیم انوار العلوم ایجوکیشنل اسوسی ایشن کے انتخابات میں، نواب شاہ عالم خاں صاحب دوبارہ صدر منتخب ہوئے۔ اس اسوسی ایشن کے زیر انتظام ڈگری کالج، ایوننگ کالج، ویمنس کالج اور ہائی اسکول چلائے جا رہے ہیں۔

۲۰ راکتوبر : ڈاکٹر عابد رضا بیدار، ڈائرکٹر خدا بخش پبلک اورنٹیل لائبریری پٹنہ اور مسٹر پی جے شرما، ڈپٹی ایجوکیشنل ایڈوائزر مرکزی وزارت تعلیم حکومت ہند نے ادارۂ ادبیات اردو کے مختلف شعبوں کا معائنہ کیا۔ ہر دو اصحاب نے ادارہ کے شعبہ کتب خانہ (مخطوطات و مطبوعات) اردو میوزیم اور شعبۂ امتحانات کی کارکردگی پر اظہار طمانیت کرتے ہوئے حکومت ہند کو مشورہ دیا ہے کہ وہ اس علمی ادارے کی بھرپور اعانت کرے۔ ڈاکٹر مغنی تبسم جوائنٹ سکریٹری ادارہ نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور ادارہ کی سرگرمیوں سے متعارف کرایا۔

۲۰ راکتوبر : اقلیم ادب کے زیر اہتمام حضرت اوج یعقوبی اور ڈاکٹر عالم خوندمیری کی وفیات پر تعزیتی جلسہ ڈاکٹر مغنی تبسم کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جناب رحمن جامی اور قدیر انصاری کے علاوہ دوسروں نے بھی مرحومین کی علمی و ادبی خدمات کو خراج عقیدت ادا کیا۔

۲۶ راکتوبر : بین الاقوامی شہرت یافتہ اسکالر اور اقبال شناس دانشور ڈاکٹر و پروفیسر انا مری شمل (امریکہ) نے اقبال اکیڈیمی کی طرف سے آراستہ

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر دیکھئے)

سن اجراء : ۱۹۳۸ء

فون : ۳۸۴۶۹

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

مجلس اشاعت
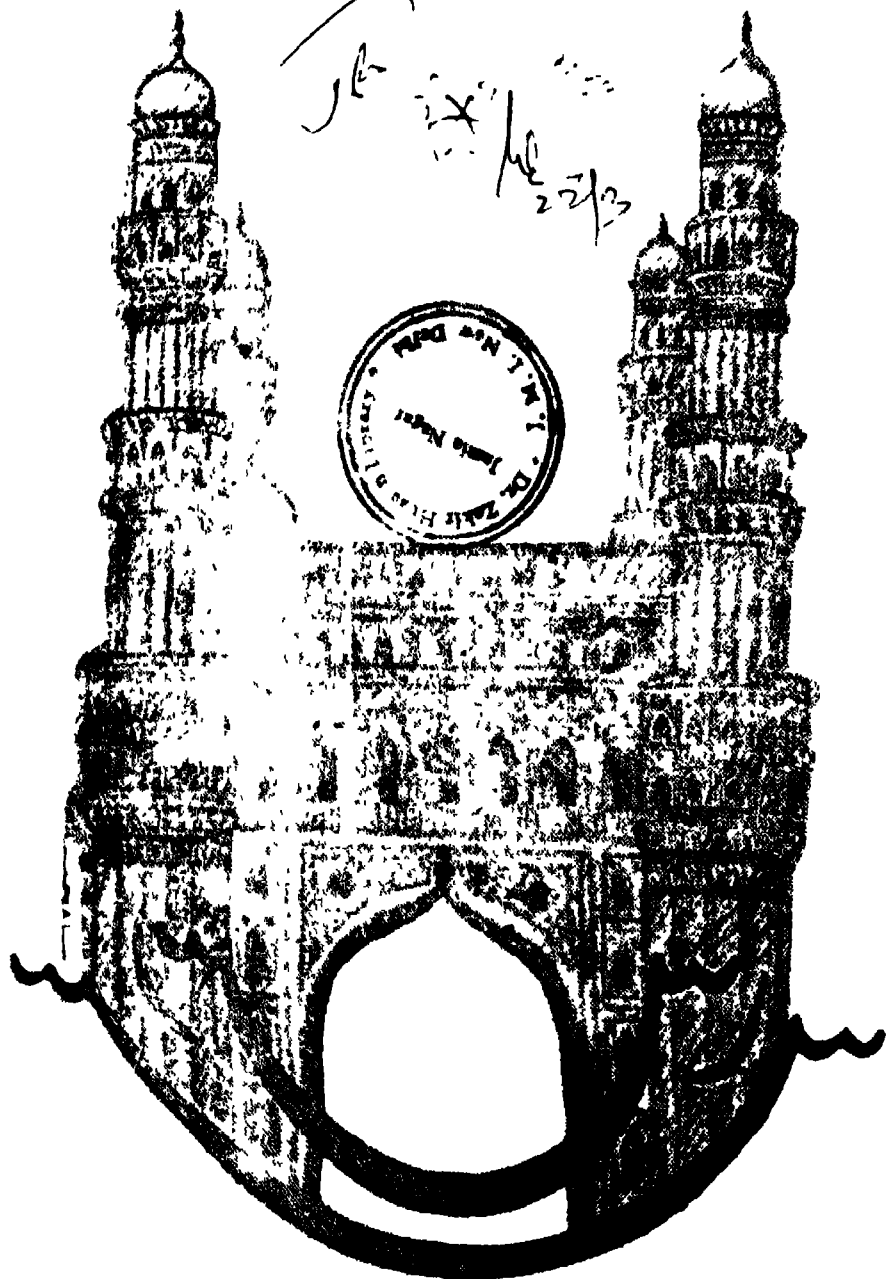
صدر : محامد علی عباسی

نائب صدر : ہاشم علی اختر

معتمد : ڈاکٹر مغنی تبسم

ارکان :

پروفیسر سید علی اکبر، عابد علی خان، پروفیسر گوپی چند نارنگ، محمد اکبر الدین صدیقی، رمن راج سکسینہ، پروفیسر سراج الدین، محمد منظور احمد

سید علی اکبر ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس یارکان میں چھپوا کر حیدرآباد-۲ سے شائع کیا۔

کتابت : رضی الدین اقبال

مدیر اعزازی : مغنی تبسم

معاون مدیر : وقار خلیل

جلد ۴۲، شمارہ (۱۲) ڈسمبر ۱۹۸۲ء

قیمت : ۲ روپے ۲۵ پیسے

زر سالانہ : ۲۵ روپے، کتب خانوں سے ۳۰ روپے

بیرونی ملکوں سے : (بذریعہ رجسٹری ۴۵ روپے)

	ہوائی ڈاک سے	بحری ڈاک سے
مشرق وسطیٰ	۱۲ ڈالر	۵ ڈالر
امریکہ	۱۶ ڈالر	۶ ڈالر
پاکستان، برما، سیلون	۸ ڈالر	۳½ ڈالر
انگلستان	۷ پونڈ	۳ پونڈ

ادارۂ ادبیات اردو، پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد-۵۰۰۰۰۴

ترتیب

اپنی بات

اس بار کرناٹک اردو اکیڈمی نے سو مائی تخصیص کے بغیر ہندوستان کے مختلف علاقوں سے شائع ہونے والے اردو کے علمی ادبی رسالوں کے لیے سالانہ گرانٹ منظور کرنے ایک مثالی اقدام کیا ہے۔ کسی زبان کو فروغ دینے میں علمی ادبی رسالوں کا اہم حصہ ہوتا ہے رسالوں کی اشاعت سے تخلیقی سرگرمیاں بڑھتی ہیں۔ قاری سے ادیب کا رشتہ استوار ہوتا ہے۔ نئے رجحانات فروغ پاتے ہیں اور عمومی طور پر ادب کا معیار بلند ہوتا ہے۔ علمی مضامین اور تراجم کی اشاعت سے زبان نئے افکار و خیالات سے مالا مال ہوتی ہے غرض علمی ادبی رسالے تہذیب و تمدن پر کئی طرح سے اثر ڈالتے ہیں۔

گذشتہ دس پندرہ برسوں میں اردو کے متعدد رسالوں کی اشاعت مسدود ہو گئی ہے ' جو رسالے شائع ہو رہے ہیں ان کی اشاعت بھی محدود ہوتی جا رہی ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ کتابت اور طباعت کی اجرتیں بڑھ گئی ہیں۔ کاغذ بھی گراں ہو گیا ہے علمی ادبی رسالوں کی تعداد اشاعت کم ہونے کی وجہ سے اشتہارات مشکل سے ملتے ہیں اور وہ کاروباری بنیاد پر شائع ہونے والے رسالوں اور ڈائجسٹوں کے ساتھ مسابقت میں ٹھہر نہیں سکتے۔ ان حالات میں ضروری ہے کہ معیاری علمی و ادبی رسالوں کو مالی اعانت دی جائے اور اردو کے دارالمطالعوں اور کتب خانوں کے لیے یہ رسالے خرید کر ان کی توسیع اشاعت میں مدد کی جائے۔ رسالوں کو مالی اعانت دیتے وقت علاقائی حد بندیوں کو ملحوظ نہیں رکھنا چاہیئے۔ علمی ادبی رسالے خواہ کسی مقام سے شائع ہوں ان کے پڑھنے والے سارے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں اور ان میں ہر علاقے کے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات شائع ہوتی ہیں کوئی ایک اکیڈمی تمام ادبی رسالوں کو خاطر خواہ مالی امداد نہیں دے سکتی ہو بلکہ چاہیے کہ ملک کی تمام اردو اکیڈمیاں اپنی گرانٹ کا ایک حصہ علمی ادبی رسالوں کی مالی اعانت کے لیے مختص کریں جو ملک گیر اساس پر شائع ہوتے ہوں یعنی جن کے لکھنے اور پڑھنے والے سارے ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہوں۔ تعداد اشاعت سے زیادہ رسالے کے معیار کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ تمام اکیڈمیوں کی مختص کردہ رقومات سے ایک مشترکہ فنڈ قائم کیا جائے اور ایک کمیٹی ان رسالوں کا انتخاب کرے جو معیار کے اعتبار سے اعانت کی مستحق ہوں۔

مغنی تبسم

ایک نظم

قاضی سلیم

سبھی کچھ
اچانک ہوا
ایک ہی ثانیے میں
ستر دعات بھی
خاتمہ بھی
جگر بھی نہ پائے تجھے دنیا
کہ وہ جا چکی تھی
جیسے مٹھی میں کوئی
ہوا کو پکڑنے کی کوشش کرے
موت کا اک بلاوا
کہ پگھلی ہوئی برف تھی خواہش
تیز جھکڑ سے
اجڑا کھنڈر زندگی
بھولے بسرے رمانوں کی کوئی کہانی
لگتا ہے سارا سفر
بے حاصلی کے سوا کچھ نہیں
کسی موت پر
کوئی رکتا نہیں
اپنے معمول پر گھومتی ہے زمین
اس طرح سے گپ لڑاتے ہیں لوگ
خدا مغفرت اس کی کرے
لوگو
جلدی جلدی دعائیں پڑھو
ہم کو جانا ہے
اپنی اپنی لحد کی طرف

پہلی جھڑی

آج موسم کی پہلی پھواریں
کتنی ٹھنڈی ہیں
آؤ کو تر چھڑکتا ہے کون
عود و لوبان پر
جانے والوں کی لوباس سب جانتے ہیں
ٹکڑا ہی مٹھی میں
لوباس کیسے پکڑ پائیں گے
اس سے پہلے تو شاید کبھی ان سے مل جائیں گے

ابھی وہ یہیں تھے
ابھی کچھ نہیں
اک جھپاکے میں اطراف سے اوجھل ہوئے
دیکھتے دیکھتے
گھنے پیڑوں سے
جھنجھناتی ہوئی چاندنی میں
بادلوں سے ہیولوں میں اوجھل ہوئے
گھر کے آنگن میں
دوڑتا کھیلتا کوئی معصوم سا
ہماری طرف
لوٹ آئے
نظر بھر کے دیکھے
تو سب دل اٹھیں
ارے "
یہ تو وہی ہے
وہی گول چہرہ
دیکھئے وہی انداز ــ ہو بہو
وہی رنگ روپ
پلکے بال تازہ حرفیں یا جگے
دانت کچے تھے
پھر لوٹ کر آ رہے ہیں
یہی کیا کم ہے
جانے والوں کو ہم
خداوند سے چھین کر
اپنے آنگن میں لے آئے ہیں
آج آنگن میں سارے فرشتے
دوڑتے کھیلتے پھر رہے ہیں۔

ڈاکٹر محمد علی اثر

دکنی ادب پر تحقیقی کام

قدیم اردو ادبیات پر تحقیقی کام کی ابتدا کا سہرا مشہور مستشرق گارساں دتاسی کے سر ہے اس محسن اردو نے ۱۸۲۵ء سے اس کام کا آغاز کیا تھا اور زندگی بھر وہ اردو کے قدیم ادب کی تحقیق و تنقید میں معروف رہا۔ کلیات ولی کو سب سے پہلے گارساں دتاسی ہی نے نو مخطوطات کی مدد سے ۱۸۳۴ء میں مرتب کر کے ' ایک عالمانہ مقدمہ کے ساتھ ' پیرس کے شاہی مطبع سے شائع کیا۔ اس کتاب کی اشاعت کے سو سال بعد احسن مارہروی کا مرتبہ کلیات ولی ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا۔ گارساں دتاسی پہلا شخص ہے جس نے اردو ادب پر تحقیقی کام کا آغاز کیا تھا اور ہمارے شعرا اور ادیبوں کی خدمات کا تنقیدی نظر سے جائزہ لیا اور فرانسیسی زبان میں ایک مبسوط تاریخ قلبند کر کے تین جلدوں میں شائع کی۔ اس کے کتب خانے میں دکنی ادب سے متعلق قلمی کتابوں کا اچھا ذخیرہ موجود تھا۔

جہاں تک دکنی ادبیات کی اشاعت کا تعلق ہے انیسویں صدی کے ربع دوم میں بمبئی کے مطبع محمدی اور مطبع حیدری نے قدیم ادبیات سے متعلق متعدد کتابیں شائع کیں۔ اس سلسلہ میں یہاں چند دکنی کتابوں کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ وجیہہ الدین وجدی کی مثنوی "پنچھی باچھا" یا "پنچھی نامہ" مطبع محمدی سے ۱۸۲۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہی کتاب مطبع حیدری سے ۱۸۵۷ء میں چھپی۔ دیوان ولی مطبع حیدری سے ۱۸۷۳ء میں شائع ہوا۔ اسی طرح مدراس کے مطبع عزیزی اور فورٹ سینٹ جارج کالج کے مطبع سے محمد باقر آگاہ کی تصنیف "ہشت بہشت" اور محمد ابراہیم بیجاپوری کی "دکنی انوار سہیلی" علی الترتیب ۱۸۵۷ء اور ۱۸۲۴ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آئی۔ گارساں دتاسی کا زیادہ تر کام فرانسیسی زبان میں تھا اور بمبئی یا مدراس کے چھاپہ خانے سے جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان کی حیثیت مخطوطات کی نقل سے زیادہ نہیں ہے۔

قدیم دکنی ادب کے موضوع پر پہلا تعارفی مضمون حکیم شمس اللہ قادری نے ۱۹۱۰ء میں لکھنؤ کے رسالے "لسان العصر" میں شائع کیا تھا۔ ۱۹۲۲ء میں بابائے اردو مولوی عبدالحق نے "کلیات محمد قلی قطب شاہ" سے متعلق ایک تحقیقی مضمون رسالہ "اردو" اورنگ آباد میں شائع کیا۔ ان مضامین کی اشاعت ' اردو زبان کی عمر میں چار پانچ صدیوں کے اضافہ کا باعث ہوئی اور دنیائے اردو اس امر سے آگاہ ہوئی کہ ولی دکنی سے صدیوں پہلے بہمنی ' قطب شاہی اور عادل شاہی سلاطین کے دور حکومت میں گلبرگہ ' بیدر ' گولکنڈہ اور بیجاپور کے علاقوں میں اردو شعر و ادب کا ایک مستقل دبستان موجود تھا۔

۱۹۲۸ء میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی معرکتہ الآرا کتاب "اردو شہ پارے" منظرِ عام پر آئی۔ یہ کتاب دکنی ادب کی تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ۱۹۲۵ء میں نواب سالار جنگ کی سرپرستی میں سٹی کالج میں "یوم دلی" کا شاندار پیمانے پر انعقاد عمل میں آیا تھا۔ اس موقعہ پر قدیم مخطوطات کی نمائش بھی کی گئی۔ نواب سالار جنگ افتتاحی اجلاس کے صدر تھے۔ انہوں نے اپنی تقریر میں ان مخطوطات کی اشاعت سے دلچسپی کا اظہار کیا۔ اس خصوص میں ایک مجلس اشاعت دکنی مخطوطات کی تشکیل عمل میں آئی جس میں سٹی کالج کے پرنسپل سید محمد اعظم، ڈاکٹر زور اور پروفیسر سید محمد کو بالترتیب صدر، نائب صدر اور معتمد بنایا گیا۔ اس مجلس کی جانب سے ڈاکٹر زور نے محمد قلی قطب شاہ کا ضخیم کلیات مرتب کیا۔ پروفیسر سروری نے ابن نشاطی کی مثنوی "پھول بن" مقیمی کی "قصۂ بے نظیر" اور سراج اورنگ آبادی کا کلیات مرتب کیا۔ پروفیسر سید محمد نے نصرتی کی "گلشنِ عشق" وجدی کی "پنچھی باچھا" فائز کی "رضوان شاہ و روح افزا" اور عبداللہ قطب شاہ کا کلیات شائع کیا۔

میر سعادت علی رضوی نے غواصی کی دو مثنویوں "سیف الملوک و بدیع الجمال" اور طوطی نامہ کو مرتب کیا۔ پروفیسر عبدالمجید صدیقی نے نصرتی کی "علی نامہ" کو محمد اکبرالدین صدیقی نے مقیمی کی "چندر بدن و مہیار" اور خواجہ حمید الدین شاہد نے شفیق اورنگ آبادی کی مثنوی "تصویر جاناں" کو مرتب کر کے شائع کیا۔

تحقیق کی ان اولین کاوشوں کے نتیجے میں دکنی ادب کی جو کتابیں شائع ہوئیں، ان میں تحقیق سے زیادہ تدوین کی جانب توجہ کی گئی۔ یہ کوششیں بنیادی طور پر ماخذ کے تحفظ پر مرکوز تھیں۔ اور اگر تحقیق و تنقید اور تدوینِ متن کے جدید اصولوں کی روشنی میں ان کا جائزہ لیا تو دو چار متنیات سے قطع نظر یہ کام غیر تشفی بخش اور خامیوں سے پُر نظر آئے گا۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کتابوں کی اشاعت سے آنے والی نسلوں کے لئے تحقیق و تنقید کی راہیں کافی آسان ہو گئیں۔

اسی دوران مولوی عبدالحق نے حضرت خواجہ بندہ نواز کے رسالے "معراج العاشقین"، وجہی کی "سب رس" اور "قطب مشتری" کو مرتب کر کے شائع کیا۔ بیجاپور کے ملک الشعرا نصرتی پر ایک تحقیقی کتاب لکھی اور قدیم اردو سے متعلق متعدد تحقیقی مضامین قلمبند کیے۔ جو "قدیم اردو" کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں "معراج العاشقین" کو بعد میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر خلیق انجم نے بھی مرتب کر کے شائع کیا ہے۔

۱۹۵۹ء میں محمد بن عمر نے "کلیاتِ غواصی" مرتب کیا تھا۔ جس میں ڈاکٹر زور کا مقدمہ بھی شامل ہے۔ یہ کتاب ملک الشعرا غواصی کے منتخب کلام کی حیثیت رکھتی ہے۔ محمد بن عمر نے "وجیہہ الدین وجدی" کے نام سے بھی ایک کتاب مرتب کی تھی۔

۱۹۶۲ء میں علی عادل شاہ ثانی شاہی کا کلیات ڈاکٹر زینت ساجدہ نے مرتب کر کے حیدرآباد اردو اکیڈیمی کی جانب سے شائع کیا تھا۔ شاہی کے کلیات کو پروفیسر مبارز الدین رفعت نے بھی اسی سال مرتب کر کے انجمن ترقی اردو علی گڈھ سے شائع کیا

دکنی ادب پر تحقیقی کام کے دوسرے مرحلہ کا آغاز ۱۹۶۵ء میں ہوا جب کہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں جو اس وقت صدر شعبہ اردو تھے، نے اپنے رفقاء کے تعاون سے ایک تحقیقاتی مجلّہ "قدیم اردو" کا اجراء عمل میں لایا۔ اس طرح پہلی بار قدیم ادب کی منتخب تخلیقات کے متون کو مختلف نسخوں کے باہمی مقابلہ کے بعد، متنی تنقید کے

جدید اصولوں کی روشنی میں، صحت کے ساتھ پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی۔ اس مجلہ کی پہلی مثنوی غواصی کی "مینا ستونتی" ہے۔ جسے ڈاکٹر غلام عمر خاں نے نو نو مخطوطات کی مدد سے تحقیق و ترتیب کے سائنسی اصولوں کی روشنی میں، ایک عالمانہ مقدمہ کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ اس مثنوی کے علاوہ "قدیم اردو" میں ڈاکٹر ابوالنصر محمد خالدی نے شاہ معظم کی دو مثنوی "گلزار عشق و عقل" "گنج مخفی" اور ایک قصیدہ کو مرتب کیا ہے۔ محمد اکبرالدین صدیقی نے شاہ داول کی مثنوی "کشف الوجود" کو ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے فیروز بیدری کی "پرت نامہ" کو مرتب کیا ہے۔ ڈاکٹر حسینی شاہد اور ڈاکٹر سیدہ جعفر نے بالترتیب حسن شوقی کی غزلیں اور دکنی رباعیاں کے موضوعات پر مقالے لکھے ہیں۔

قدیم اردو کا دوسرا شمارہ ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا جس میں ڈاکٹر غلام عمر خاں نے عاجز کی مثنوی "لیلیٰ مجنوں" کو بدیع حسینی نے میراں یعقوب کی "شمائل الاتقیا" کے انتخاب کو اکبرالدین صدیقی اور مبارز الدین رفعت نے علاول کی "ابلیس نامہ" کو مرتب کر کے شائع کیا ہے۔

قدیم اردو کا تیسرا شمارہ ۱۹۶۹ء میں منظر عام پر آیا، اس میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے عبدل کی مثنوی "ابراہیم نامہ" کو ایڈٹ کیا ہے۔ ۱۹۷۱ء میں قدیم اردو کا ایک اور شمارہ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کی ادارت میں شائع ہوا جس میں اکبرالدین صدیقی نے خاتم کی تصنیف "ارشاد نامہ" کو مرتب کیا ہے۔

۱۹۶۶ء میں ڈاکٹر محمد ہاشم علی کی کتاب "معظم مرغوب چہار شہادت" شائع ہوئی۔ اور "میراں جی شمس العشاق" کے نام سے ایک اور کتاب ۱۹۷۴ء میں منظر عام پر آئی۔

دکنی ادب سے متعلق پی ایچ ڈی کے لئے قلمبند کیے گئے مقالوں میں درج ذیل شائع ہو چکے ہیں۔

اردو نثر کا آغاز و ارتقا (ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ) اردو مرثیے کا ارتقا گولکنڈہ اور بیجاپور میں (ڈاکٹر چراغ علی) امین الدین اعلیٰ حیات اور کارنامے (ڈاکٹر حسینی شاہد) بیجاپور کی اردو مثنویاں (ڈاکٹر قیوم صادق) سب رس کی تنقیدی تدوین (ڈاکٹر حمیرہ جلیلی) مدراس میں اردو (ڈاکٹر افضل اقبال) تاج الحقائق کی تنقیدی تدوین (ڈاکٹر نورالسعید اختر) پی ایچ ڈی کے غیر مطبوعہ مقالوں میں ڈاکٹر محمد ہاشم علی کا مقالہ "شاہ صدرالدین حیات اور اردو خدمات" ڈاکٹر زینت ساجدہ کا مقالہ "نوسر ہار کی تنقیدی تدوین" ڈاکٹر مہرالنساء کا "دکنی اردو کا آغاز و ارتقاء" ڈاکٹر فرزانہ بیگم کا "دکنی کی نثری داستانیں" ڈاکٹر سید محمود قادری کا "تحزن عشق کی تنقیدی تدوین" ڈاکٹر رضیہ صدیقی کا "دیوان سلطان کی تنقیدی تدوین" ڈاکٹر عقیل ہاشمی کا "دیپک پتنگ کی تنقیدی تدوین" اور راقم الحروف کا "دکنی غزل کی نشو و نما" کے نام قابل ذکر ہیں۔

جہاں تک دکنی ادب کی تاریخ کا تعلق ہے اس موضوع پر پہلی کتاب مولوی نصیرالدین ہاشمی کی "دکن میں اردو" ہے۔ جس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا تھا۔ ۱۹۲۴ء میں حکیم شمس اللہ قادری کی کتاب "اردوئے قدیم" منظر عام پر آئی۔ ۱۹۵۱ء میں ڈاکٹر زور کی کتاب داستان ادب حیدرآباد اور ۱۹۵۸ء میں دکنی ادب کی تاریخ شائع ہوئی۔ زور صاحب کی موخرالذکر کتاب قدیم اردو ادب کی تاریخ کے موضوع پر اپنے وقت کی جامع کتاب تھی۔ اسی سال پروفیسر سیدہ جعفر(?) نے "اردو کی ادبی تاریخ" شائع کی۔ ۱۹۶۲ء میں آل احمد سرور کی ادارت میں، شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی جانب سے "علی گڑھ تاریخ ادب اردو" کی پہلی جلد

شائع ہوئی تھی جس میں بے شمار خامیاں راہ پاگئی تھیں۔ ۱۹۷۵ء میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی معرکتہ الآرا کتاب "تاریخ ادب اردو" (جلد اول) مجلس ترقی ادب لاہور سے شائع ہوئی۔ آٹھ سو صفحات پر مشتمل اس کتاب میں دکنی ادب کی تاریخ کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے۔

دکنی ادب کی تحقیق کے سلسلہ میں ڈاکٹر حفیظ قتیل اور ڈاکٹر سیدہ جعفر کے نام بھی قابلِ ذکر ہیں۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل نے نہ صرف یہ کہ ہاشمی بیجاپوری کا دیوان مرتب کیا بلکہ "میراں جی خدانما" اور "معراج العاشقین کا مصنف" کے نام سے دو تحقیقی کتابیں بھی تصنیف کیں۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر نے شاہ ابوالحسن قادری کی مثنوی "سکھ انجن"، شاہ تراب کی "من سمجھاون" اور حال ہی میں احمد گجراتی کی "یوسف زلیخا" کو مرتب کر کے شائع کیا ہے۔

دکنی ادب سے متعلق دیگر تحقیقی کتابوں میں ڈاکٹر محمد باقر کی "اردوئے قدیم دکن اور پنجاب میں"، سخاوت مرزا کی کتابیں "من لگن" اور "دیوانِ قاسم"، میر سعادت علی رضوی کی "عادل شاہی مرثیے"، افسر صدیقی امروہوی کی "بیاضِ میراثی"، ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی کی "اردو غزل ولی تک" اور "ولی گجراتی"، ڈاکٹر نذیر احمد کی کتاب "نورس"، ڈاکٹر جاوید وششٹ کی "غزالِ رعنا"، "وجہی کے انشائیے"، "روپ رس" اور "قصہ حسن و دل"، ڈاکٹر سہیل بخاری کی "سب رس پر ایک نظر"، ڈاکٹر منظر اعظمی کی "سب رس کا تنقیدی مطالعہ"، بدیع حسینی کی "دکن میں ریختی کا ارتقاء"، محمد اکبر الدین صدیقی کی "بجھتے چراغ"، ڈاکٹر نور السعید اختر کی "نقوشِ دکن"، ڈاکٹر حمیرہ جلیلی کی "کلمتہ الاسرار" اور قیوم صادق کی "دکنی غالب ملا وجہی" کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

قدیم ادب پاروں کی توضیح اور تحسین کے سلسلہ میں وضاحتی فہرستیں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ برٹش میوزیم۔ انڈیا آفس لندن۔ ٹیپو سلطان اور شاہانِ اودھ کے کتب خانوں کے مخطوطات کی توضیحی فہرستیں انگریزی میں شائع ہو چکی تھیں۔ اردو میں قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست مرتب کرنے کا سہرا پروفیسر سروری کے سر ہے، جنھوں نے ۱۹۲۹ء میں جامعہ عثمانیہ کے اردو مخطوطات کی وضاحتی فہرست مرتب کی تھی۔ اس کے بعد مولوی نصیر الدین ہاشمی نے ۱۹۳۲ء میں "یورپ میں دکنی مخطوطات" مرتب کی۔ اس کے علاوہ نصیر الدین ہاشمی نے کتب خانہ سالار جنگ، اسٹیٹ سنٹرل لائبریری، عجائب خانہ، حیدرآباد اور سنٹرل ریکارڈ آفس کے مخطوطات کی فہرستیں بھی مرتب کیں۔ ڈاکٹر زور نے ادارۂ ادبیات اردو کے مخطوطات کی وضاحتی فہرست مرتب کرنے کے کام کا آغاز ۱۹۴۳ء میں کیا تھا اور ۱۹۵۹ء تک ادارہ کے (۱۱۵۰) مخطوطات کی توضیحی فہرستیں پانچ جلدوں میں نہایت تفصیل کے ساتھ مرتب کیں۔ انجمن ترقی اردو کراچی کے اردو مخطوطات کی فہرست مولوی افسر صدیقی امروہوی نے سید سرفراز علی رضوی کے تعاون سے پانچ جلدوں میں شائع کی۔ اس کے بعد مختلف کتب خانوں کی توضیحی فہرستوں کی اشاعت کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا اور جامع مسجد بمبئی کے اردو مخطوطات، ٹونک کے اردو مخطوطات، دہلی کے اردو مخطوطات، خدا بخش لائبریری پٹنہ کے اردو مخطوطات، سبحان اللہ لائبریری علی گڑھ کے اردو مخطوطات، ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور کینیڈا کے مخطوطات، پیرس کے مخطوطات، جرمنی کے مخطوطات، انڈیا آفس لندن کے مخطوطات، اور کتب خانہ حضرت پیر محمد شاہ احمد آباد کے مخطوطات کی فہرستیں شائع ہوئیں۔

دکنی تحقیق کے سلسلہ میں ڈاکٹر جمیل جالبی ایک قدآور شخصیت کے مالک ہیں۔ انہوں نے نہ صرف قدیم اردو ادب کی تاریخ کے تاریک گوشوں کو روشنی میں لایا ہے بلکہ ملک الشعراء نصرتی اور حسن شوقی کے دواوین کو مرتب کرکے شائع کیا ہے بلکہ اردو کی پہلی مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" کو مرتب کرنے کا اعزاز بھی حاصل کیا ہے۔

دکنی قواعد اور فرہنگ نویسی پر بھی قابلِ لحاظ کام ہوا ہے۔ دکنی کی اب تک سات فرہنگیں مرتب کی گئی ہیں، جن کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) دکن کی زبان مرتبہ: عارف العلائی
(۲) دکنی لغات مرتبہ: سید ابوتراب خطائی
(۳) دکنی لغت مرتبہ: سید ستار احمد ہاشمی
(۴) دکنی فرہنگ مرتبہ: امیر عارفی
(۵) دریائے معانی مرتبہ: ڈاکٹر جاوید وششٹ
(۶) قدیم اردو کی لغت مرتبہ: ڈاکٹر جمیل جالبی اور ...
(۷) دکنی اردو کی لغت مرتبہ: ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور ڈاکٹر غلام عمر خاں۔

دکنی قواعد کے موضوع پر ڈاکٹر حبیب ضیاء کی کتاب "دکنی زبان کی قواعد" کے نام سے ۱۹۶۹ء میں کراچی سے شائع ہوئی ہے۔

۱۹۸۰ء میں پروفیسر غلام عمر خاں، صدر شعبہ کی ادارت میں شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ کی جانب سے اساتذہ اردو کے مضامین اور مقالوں پر مشتمل ایک مجلہ "مجلہ تحقیقاتِ اردو" کے نام جاری کیا گیا تھا جس میں دکنی ادب سے متعلق پروفیسر غلام عمر خاں، ڈاکٹر محمود قادری، ڈاکٹر محمد ہاشم علی، ڈاکٹر عقیل ہاشمی اور راقم الحروف کے مقالے شامل ہیں۔

راقم الحروف نے حال ہی میں محمد اکبر الدین صدیقی کے اشتراک سے ادارۂ ادبیاتِ اردو کے اردو مخطوطات کی چھٹی جلد مرتب کی ہے جو شائع ہوچکی ہے۔ اس کتاب کے علاوہ دکنی ادب سے متعلق راقم کی تنہا اور کتابیں "غواصی شخصیت اور فن"، "دبستانِ گولکنڈہ" اور "دکنی اور دکنیات" شائع ہوچکی ہیں۔

دکنی تحقیق و تنقید کے ارتقاء کے سلسلہ میں بعض رسائل نے ناقابلِ فراموش خدمات انجام دی ہیں۔ اس خصوص میں "سب رس"، "اردو" اور "نوائے ادب" کے نام بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ دکنی ادب کی ترویج و اشاعت میں "سب رس" کو ایک امتیازی مقام حاصل ہے۔

دکنی ادب کے موضوع پر چند رسائل کے خاص شماروں کا ذکر بھی ضروری ہے۔ ۱۹۲۵ء میں بمبئی کالج میگزین "الوسی" کا "یادگارِ ولی" شائع ہوا تھا۔ ۱۹۲۷ء میں طالبات جامعہ عثمانیہ کا "نذرِ ولی"، ۱۹۷۴ء میں مجلہ عثمانیہ کا "دکنی ادب نمبر" شائع ہوا اور شعبہ اردو بنگلور یونیورسٹی کے ترجمان فکر و ادب کا "مثنوی نمبر" ۱۹۸۰ء میں منظرِ عام پر آیا۔

دکنی ادب سے متعلق یہ جائزہ نامکمل رہے گا اگر اس میں دکن کے مورخین اور تذکرہ نگاروں کا ذکر نہ کیا جائے۔ دکن کی ادبی تاریخ اور دکنی تہذیب و تمدن کے آثار کے تحفظ کے سلسلہ میں جن مورخین اور تذکرہ نگاروں نے بے مثال خدمات انجام دی ہیں ان میں: عبدالجبار خاں صوفی ملکاپوری، مولوی بشیر الدین احمد، سید ہمایوں مرزا، محمد عبدالعزیز، محمد سلطان، سید علی بلگرامی، محمد حسین خاں، پروفیسر ہارون خاں شیروانی، پروفیسر عبدالمجید صدیقی، ڈاکٹر زور، مولوی نصیر الدین ہاشمی وغیرہ کے نام لائقِ ذکر ہیں۔ ●

فضا ابن فیضی

○

مرے ادھورے وجود کا عکس ہیں یہ پیکر نئے پُرانے
نئے پُرانے تمام منظر، تمام منظر نئے پرانے

ہر ایک چہرے پہ ثبت ہے لیکن اپنا اپنا شناخت نامہ
چلے تو ہیں ساتھ ساتھ اک دوسرے سے مل کر نئے پرانے

یہ بیچ میں اُن کے ہے جو گہری خیلیج اُسے کوئی پاٹ دیتا
رُکے ہیں صدیوں سے ایک محدود فاصلے پر نئے پرانے

ذرا بھی چوکے، تو پھر نہا جائیں گے خود اپنے لہو میں ہم سب
کہ زد پہ عصری بصیرتوں کے ہیں اب نہ دوست پُرانے

نہ خواب دیکھیں تو رات میں جیسے چاندنی پر ترستے پیاسے
ہمارے خوابوں کی ریت میں جذب ہیں سمندر نئے پرانے

جواب روایت ہے، عہد میں اپنے، تجربوں کی کلید تھی وہ
ملنگ سی سطح پر نہیں، فکر و فن کے محور نئے پُرانے

اُسی گلی میں پہنچ کے ہم، آج کٹ گئے ایک دوسرے سے
وہی گلی، جس میں آکے ملتے تھے دوست اکثر نئے پرانے

وہی دریچوں سے جھانکتی شوخ فاختائیں نئی پُرانی
وہی منڈیروں پر رقص کرتے سیہ کبوتر نئے پرانے

[illegible] ہیں [illegible]
[illegible] تب [illegible] ہزار [illegible]

ہمارا آئینہ سے جو ملیں تو خال [illegible] میں [illegible]
ہیں عکس میں کہ بس ایک ہی آئینے [illegible] نئے پرانے

[illegible] انسان [illegible] فضا
سب اپنے اپنے [illegible] رقص [illegible]

○○

ڈاکٹر صفدر علی بیگ

ہندوستانی تہذیب پر مسلمانوں کا اثر

ہندوستان اور مسلمانوں میں سب سے پہلے ربط ضبط جنوبی ہند میں پیدا ہونے لگا تھا جب کہ ساتویں صدی عیسوی کے درمیانی زمانے میں عرب مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد، تجارتی اغراض سے سمندر پار کر کے ہندوستان پہنچی۔ رفتہ رفتہ یہ عرب جنوبی ہند میں آباد ہو گئے اور ساحل مالابار پر توطن اختیار کیا۔ وہ نہ صرف ساحل مالابار پر رہے بلکہ تمام ملک کو عبور کیا اور ہندوستان کے مشرقی سواحل تک پہنچ گئے جہاں انھیں مجبوراً قیام کرنا پڑا۔

عرب فن جہاز رانی سے اچھی طرح واقف تھے اور اس کا سامان فراہم کرتے تھے۔ جب ساحل مالابار پر ان کی کثرت ہوگئی تو مسلمانوں نے ملیبار کے تین شہروں میں بھی آبادیاں قائم کیں۔ اسٹورک مویلوں کے حالات بیان کرتے ہوئے اس کی تصدیق کرتا ہے کہ "یہ بات بہت مشہور ہے کہ ساتویں صدی میں ایرانی اور عرب تاجر ہندوستان کے مغربی ساحل کی مختلف بندرگاہوں پر بڑی تعداد میں آباد ہوئے اور انھوں نے ہندوستان کی عورتوں سے شادیاں کیں۔ اس کے بعد مسلمانوں کا اثر تیزی سے بڑھنے لگا۔ تاجروں کی حیثیت سے ان کا خیر مقدم کیا جاتا تھا اور آباد کاری کی اجازت دی جاتی تھی اور اپنے مذہب پر عمل کرنے کی سہولتیں بہم پہنچائی جاتی تھیں۔"

ان لوگوں نے آباد ہوتے ہی سب سے پہلے تبلیغ مذہب کی کوشش کی اور بہتوں نے عزت و توقیر بھی حاصل کر لی تھی۔ نویں صدی کے اوائل تک وہ ہندوستان کے سارے مغربی سواحل تک پھیل چکے تھے۔

ان کے مخصوص عقائد اور طریقِ عبادت کی وجہ سے ہندو آبادی میں بھی ایک جوش و جذبہ اور ہلچل پیدا ہوگئی تھی۔ اس دور میں جنوبی ہندوستان میں یہاں کے مذہبی معاملات میں کافی کشمکش پیدا ہو چکی تھی۔ کیونکہ برہمن کا جدید ہندو مذہب اپنی فوقیت کیلئے بدھسٹوں اور جینیوں کے مقابلے کی پوری جدوجہد کر رہا تھا۔ سیاسی اعتبار سے بھی یہ دور تغیرات اور انتشار کا تھا۔ نئے نئے حکمراں خاندان حکومتیں کر رہے تھے۔ لوگوں کے دل و دماغ حیران و پریشان تھے۔ وہ نئے تصورات و تخیلات کو خواہ وہ کہیں سے آئیں، قبول کرنے پر آمادہ تھے۔ ڈاکٹر تاراچند کا خیال ہے کہ "اسلام ایمان کے ایک سادے سے اصول معین در

کے بیشتر عناصر کا اگر مطالعہ الگ الگ کیا جائے تو وہ قدیم مکاتبِ خیال ہی سے ماخوذ نظر آئیں گے لیکن ان تمام عناصر کا ان کی مجموعی حیثیت میں تجزیہ کیا جائے اور ان میں جس مخصوص چیز پر زور دیا گیا ہے اُسے سامنے رکھا جائے تو مُسلم عقیدے سے غیر معمولی مماثلت ظاہر ہوتی ہے اس لئے اسلامی اثر کی جو دلیل دی گئی ہے وہ قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے۔

البیرونی کے نزدیک ہندوؤں کی قوم خوددار تھی وہ بیرونی تصورات کو جذب تو کر لیتی ہے لیکن یہ برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ بھونڈی تقلید سے اس کی خودداری کو ٹھیس لگے۔ ابتدائی مدارج میں اسلام کا اثر بالواسطہ اور خاص خاص چیزوں میں تھا۔ ڈاکٹر تارا چند کا یہ بھی خیال ہے کہ یہ اسلامی لٹریچر کے مطالعے کا نتیجہ نہ تھا بلکہ مذہبی درویشوں کی زبان سے سُنی ہوئی تعلیمات اور ان کے رسوم اور دستور کے مشاہدے کا اثر تھا۔ ہندستانی مذاہب جنھیں جنوب میں سری شنکر آچاریہ اور ان کے جانشینوں نے فروغ دیا مُسلم دینیات و تصوّف کے مکاتیبِ خیال سے زبردست مماثلت و مشابہت رکھتے ہیں۔ وحدانیت کے تصوّر کو شنکر کے فلسفے کی مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے کی کوشش کی اور وحدانیت کے اس رجحان کے استحکام کو ایک پختہ وحدانیتِ اسلامی سے زبردست شہ ملی۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوؤں میں بہت سے عناصر اسلام سے براہ راست روابط کے ذریعے حاصل ہوئے۔ ان عناصر پر اسلام کی چھاپ نمایاں ہے۔

مسلمان درویش یہاں کے لوگوں میں اسلام کی تبلیغ کر رہے تھے اور بہتوں کو مسلمان بنا چکے تھے۔ اور ہندو راجہ مثلاً کون یا مڈیا مسجدیں بنانے کے لئے جاگیریں اور روپیہ پیسہ دے رہے تھے۔ راما نوجا کے فلسفے میں ایک ایسے صفات والے خدا کو مانا گیا ہے اور ایمان و عقیدت کے ساتھ اس کی عبادت کی تلقین کی ہے۔ اس نے اس خواہش کا بھی اظہار کیا ہے کہ مذہب کے دروازے ان طبقوں کے لئے بھی کھول دیئے جائیں جو اب تک اس سے محروم تھے۔ محبت کو صرف خدا اور انسان کے رشتے میں نہیں بلکہ انسان اور انسان کے رشتے میں بھی جگہ دی جائے۔ وشنو سوامی، نمبارکا اور مادھوا کے یہاں خدا کی صفات اور انسان کی حقیقت کے تعلق سے جو مابعد الطبیعیاتی مباحث پائے جاتے ہیں ان میں کسی قدر نظامِ اشعری اور الغزالی کے مباحث کی جھلک نظر آتی ہے۔

بہرحال نویں صدی کے بعد سے جنوبی ہند کے افکار میں بعض خصوصیات ایسی ملتی ہیں جو اسلامی اثرات کی طرف پُرزور اشارے کرتی ہیں۔ یہ خصوصیات وحدانیت پر بڑھتا ہوا اصرار ہے۔ جذباتی پرستش، خودسپردگی، معلّم کا احترام جسے گرو بھکتی کہا جاتا ہے، ذات پات کی سختیوں میں لچک اور نرمی اور ظاہری رسوم سے بے پروائی، یہ سب اسلامی اور صوفیانہ اثرات کو واضح کرتی ہیں۔

ان تمام لوگوں کا مذہبی عمل یہ تھا کہ نیک اعمال اور قربانیاں کی جائیں، ذہنی اور روحانی تربیت یا یوگ (ڈسپلن) پر عمل کیا جائے۔ دھرم شاستر، مہابھارت اور سکھیا، یوگ، فلسفے کی خاص تعلیم پر مبنی ہیں۔ اسی طرح رامانوجانے شدروں کو کچھ قیود کے ساتھ مندروں میں داخل کیا اور ان کی روحانی فلاح کیلئے خود سپردگی (پراپتی) اور گرو کے احترام (اچاریہ ابھیمان) کا مسلک رائج کیا۔ ڈاکٹر تاراچند کا خیال یہ ہے کہ یہ دونوں عناصر اسلام سے ہی آئے ہیں، کیوں کہ یہ دونوں خصوصیات اسلام ہی میں نمایاں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ لفظ اسلام کے معنی ہی سپردگی ہیں (یعنی تسلیم کرنا) اور اپنے آپ کو رضائے الٰہی کے سپرد کر دینا ہی مسلمانوں کے مذہبی شعور کا ایک لازمی جزو ہے۔ رامانوجانے یقیناً اسے اسلام سے لیا ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ گرو کے احترام کا تصور ہندوستان میں قدیم زمانے ہی سے ہے اور گرو اور برہماچاری (چیلا) کے تعلقات کے بارے میں قواعد مقرر کئے گئے ہیں۔

صوفیا کا یہ تصور کہ مرشد خدائی صفات کا حامل ہوتا ہے قرونِ وسطیٰ کے ہندوؤں نے اپنا لیا اسد گیرن نے "ستگر" کو "شیو" کا اوتار مانا ہے۔ یہ تصور کہ وسشنو اور ان کی معاشرے کے اوتار اچاریہ ہیں، یہ تمام صوفی طرز کے تصورات ہیں۔ جنوبی ہند میں اور دو فرقوں پر اسلام اثر انداز ہوا۔ یہ فرقہ لنگایت اور سدھار ہیں۔ کنٹر لنگایت ازم کا آغاز بارھویں صدی میں ہوا۔ لنگایت ایک خدا (یک شیو) کے پرستار ہیں، جو لامحدود، غیر مرئی اور خود مختار ہستی ہے۔ ان کے یہاں خدا کے تقریباً وہی صفات مانے جاتے ہیں جو اسلام میں بتائے گئے ہیں۔ صرف یہ کہ وہ روحِ انسانی کے رہنما اور نجات دلانے والے شیو کی حیثیت سے اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے۔ ان کے یہاں قربانیاں، برت، ضیافتیں اور یاترائیں نہیں ہیں۔ ان کے لئے کوئی ندی یا ست کرنے والی نہیں ہے۔ ان میں ذات پات نہیں ہیں۔ اگر کوئی چھوٹے فرقے کا ہے تو بھی برہمن سے کم نہیں ہے۔ سب ہی آدمی پوتر ہیں۔ شادی مرضی پر منحصر ہے۔ شادی سے پہلے دلہن کی مرضی ضروری ہے بالکل اسی جس طرح اسلام میں ہے کم سنی کی شادی بُری سمجھی جاتی ہے، طلاق کی اجازت، بیواؤں سے عزت کا سلوک، انھیں دوبارہ شادی کی اجازت اسلام ہی کی طرح ہوتی ہے۔ مردے جلائے نہیں جاتے بلکہ دفن کئے جاتے ہیں، مُردے کو نہلایا جاتا ہے۔ لنگایت لوگ تناسخ یا آواگن کے عقیدے کو نہیں مانتے، وہ اپنی سیرت کے لحاظ سے پارسا، سخت محتاط اور جنگ جُو ہوتے ہیں۔

مختصر یہ ہے کہ ڈاکٹر تاراچند کا یہ خیال ہے کہ ہندوستانی تمدن کے ارتقا میں مسلمانوں کی فتوحات کا بھی زبردست اثر ہے۔ مسلمان چاروں طرف ہندوؤں سے گھرے ہوئے تھے، دونوں نے تقریباً ایک راہ اختیار کی اور آپس میں پڑوسیوں کی طرح رہنے لگے۔ دونوں کے ہاں شادی بیاہ کے رسومات وغیرہ

میں یکسانیت پیدا ہوگئی۔ مسلمانوں نے ہندو رسوم بھی اختیار کر لئے۔ دونوں نے ایک نئی زندگی کی تلاش کی اور ایک نئی تہذیب کو جنم دیا جو نہ خالص ہندو تھی اور نہ خالص مسلم۔ ایک ہندو مسلم تہذیب پیدا ہوگئی۔ ہندو عورتیں پردہ بھی کرنے لگی تھیں۔ نہ صرف ہندو مذہب، ہندو آرٹ، ہندو لٹریچر اور ہندو سائنس نے مسلم عناصر کو جذب کیا بلکہ ڈاکٹر تارا چند کے بیان کی رو سے خود ہندو تمدن کی روح اور ہندو ذہن میں تبدیلی پیدا ہوگئی۔ ہندو مصنفین بھی ماہ محرم کو "محرم شریف" اور قرآن حکیم کو "کلام پاک" لکھنے لگے۔ اپنی تحریرات کو "بسم اللہ" سے شروع کرنے لگے تھے۔ خود مسلمانوں نے بھی جواباً ہر شعبۂ زندگی میں تبدیلی پیدا کر لی۔

جنوب کے ہندو فرقوں پر اسلام کے اثر نے شمال تک تبدیلیاں پیدا کیں۔ جو تحریک دکن میں پیدا ہوئی وہ شمال میں ترقی کرتی گئی اس طرح ہندو اور مسلم مذہب کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی کوشش کی گئی۔ مسلمانوں کے ہندستان آنے سے پہلے تک یہاں کپڑے کو سی کر پہننے کا تصوّر نہ تھا۔ مرد لوگ ایک کپڑا باندھ لیتے تھے اور ایک کپڑا کندھوں پر ڈال لیتے تھے اسی طرح عورتیں بھی صرف ساریاں باندھتی تھیں۔ اس زمانے کے ہندستان میں فنِ تعمیر میں بھی اسی امتزاج کا رجحان ظاہر ہوتا ہے۔ نہ صرف فنِ تعمیر کے مسلم عناصر کام میں لائے گئے بلکہ قدیم جمالیاتی اقدار کسی حد تک بدل گئے تھے۔ یہ چیزیں خاص طور پر راجپوتانہ اور وسطی ہند کی ہندو ریاستوں اور متھرا اور بندرابن اور بنارس کے مقدس مقامات میں نظر آتی ہیں اور کھنڈوا اور جنوبی ہند میں مدورا تک اس کا اثر ہے۔ ہندستانی مصوری خواہ مغل ہو یا راجپوت اس کا بھی وہی حال ہے جو فنِ تعمیر کا راجستھان کے اور دہلی اور جے پور کے طرز میں بڑا فرق ہے۔ خطوط، رنگ اور تناسب پر ہر چیز بدلی ہوئی ہے لیکن اس میں ایک انفرادیت بھی ہے جس کے سبب سے اُسے مسلم ہندو آرٹ بھی کہا جا سکتا ہے۔

جہاں تک ادب کا تعلق ہے شمال میں ہندی، مغرب میں مرہٹی اور مشرق میں بنگالی ترقی کر کے ادبی زبانیں بن گئیں اور ہندو مسلمان دونوں اس کامیابی کے افتخار میں شریک ہیں۔ ہندو اور مسلمانوں کے اختلاط کا سب سے بڑا ثبوت خود زبانِ اردو ہے۔ ہندی کے بکثرت مسلم شعرا اور اردو کے بکثرت ہندو شعرا اور نثر نگار اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

مظفر حنفی

غزلیں

ارمان ہے مرنے کا، خیرات میں کیا دینا
درویش کا پیشہ ہے، جینے کی دعا دینا

محفوظ کنارا تو اک ریت کی دلدل ہے
اے موجِ بلا تو ہی اس پار لگا دینا

ان سادہ مزاجوں کی ہر بات نرالی تھی
نیکی جو کوئی کرنا، دریا میں بہا دینا

گل ریزیِ موسم کا شہرہ ہے زمانے میں
دھوکے سے مری جانب دو پھول بڑھا دینا

گھر ہی میں خرابی کے امکان نکل آئے
لازم ہوا صحرا سے دیوار ملا دینا

اے شمعِ سحر دیدہ، راتیں ہی غنیمت ہیں
یادوں کا مہکنا، زخموں کا مزا دینا

محفل میں مظفر کے حامی تو ہزاروں ہیں
بس یہ ہے کہ تم پہلی آواز اٹھا دینا

لازم ہے گامزن ہو مرے یار دیکھ کر
چلتا ہے کارواں تری رفتار دیکھ کر

ہم ہیں وہ کج کلاہ نہ کی جو دل پہ نگاہ
سارا لہو نچوڑ دیا خار دیکھ کر

ہم پر وجود و وقت کے اسرار کھل گئے
دریا کے پار ریت کی دیوار دیکھ کر

ان کے [illegible] لوگ سنگ میں
پتھر اٹھائیں مجھ پہ ریاکار دیکھ کر

دلی میں ایک نقش تری [illegible] نہیں
ہم لوٹ آئے کوچہ و بازار دیکھ کر

تارے لرز رہے ہیں [illegible] آسمانوں میں
ذروں کی آسمان پہ یلغار دیکھ کر

ہم جانتے نہیں ہیں [illegible] کو [illegible] لیں!
غالب کی اس زمیں میں اشعار دیکھ کر

ڈاکٹر معین شاکر

اُردو کا مسئلہ اور مسلمان

اُردو کا موجودہ مسئلہ ملک کی تقسیم کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے اگر ملک کی تقسیم نہ ہوتی تو اردو کا مسئلہ اس کی موجودہ شکل میں پیدا ہی نہ ہوتا۔ جد و جہد آزادی کے دوران یہ بات تسلیم کرلی گئی تھی کہ "ہندستانی" کو دو طرح کے رسم الخط (اردو اور دیوناگری) کے ساتھ ملک میں رابطے کی زبان کے طور پر اختیار کرلیا جائے گا۔ قیام پاکستان اور اس کے ساتھ کی فرقہ وارانہ تباہیوں نے پورے ماحول کو بدل دیا۔ دستور ساز اسمبلی نے گاندھی جی اور کانگریس کے طے شدہ رابطے کی زبان کے اصول کو نظر انداز کر دیا۔

تقسیم کے بعد اردو کو بتدریج تعلیمی اداروں، انتظامیے اور دوسری تہذیبی انجمنوں سے بیدخل کر دیا گیا۔ ان تمام باتوں کی وجہ سے اردو خود اپنے ہی ملک میں غیر ملکی بن کر رہ گئی۔ مخالف اُردو احساسات کی جڑیں بہت گہری ہیں کیوں کہ اس سے ہندو مسلم دشمنی کا اظہار ہوتا ہے جو ہمارے فرقہ وارانہ منافرت کے ورثے کا حصہ ہے

۱۹۶۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ کی رو سے اردو بولنے والوں کی تعداد دو کروڑ تین لاکھ سے زیادہ ہے۔ دستور ہند کی آٹھویں جدول میں اردو کو ہندستان کی پندرہ زبانوں میں سے ایک زبان کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہے اس کے ہندستانی ہونے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے' پروفیسر مسعود حسین خاں کہتے ہیں:

"ایک ایسا شخص جو ہند۔ آرین زبانوں کی تاریخ سے واقف ہو یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اردو کا سلسلہ اس وقت سے جاری ہے جب آریائی لوگ ہندستان میں داخل ہوئے تھے یعنی تقریباً ۱۵۰۰ صدی قبل مسیح میں۔ یہ زبان اس وقت بھی ہندستان میں موجود تھی گو کہ اس کی ہیئت اور نام مختلف تھا۔ اس زبان کا دھارا ہمارے ملک میں زمانۂ قدیم سے رواں دواں ہے' اور اس کی ممتاز خصوصیات یہ ہیں کہ اس نے ہمیشہ ترقی پسند اثرات قبول کیے' اس لیے اسے ہند۔ ایران تہذیبوں کا امتزاج کہا جاسکتا ہے۔ اس کی سادگی' اس کی تراکیب کی لچک اور الفاظ کا ذخیرہ قابلِ قدر ہے اس کے علاوہ یہ ان چند زبانوں میں سے ایک ہے جنھیں بجا طور پر "جدید" کہا جاسکتا ہے کیوں کہ اس کی نشو و نما کسی مذہبی علم یا رسومات

کے زیر اثر نہیں ہوئی بلکہ ابتدا ہی سے اس کے ادب اور خصوصاً شاعری میں انسان دوستی، وسیع النظری
امن و آشتی کا قابل فخر سرمایہ رہا ہے۔ اردو ادب ہمیشہ سے غیر مذہبی اور ہر قسم کے تعصب و تنگ نظری
سے پاک رہا ہے۔ اردو شعر و ادب میں متصوفانہ نظریہ تمام مذاہب کے احترام اور اتحاد کا حامی ہے اور اس
کی روح سیکولرزم کی حامی ہے۔ یہ کہنا بھی مبالغہ نہ ہوگا کہ سماجی تبدیلیوں کی تمام بڑی لڑائیاں یا تو اردو کے
ذریعہ لڑی گئیں یا انھوں نے اس پر اپنا گہرا اثر چھوڑا۔ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی، سید احمد کی تحریک،
اصلاحات، آریہ سماج، خلافت اور انڈین نیشنل کانگریس کی تحریکات، یہاں تک کی لڑائی، ان تمام
تحریکات میں اردو کو استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد بھی جہاں اردو کو سرکاری [illegible]
کر لیا گیا ہے۔ یہاں ہندوستان میں اردو کی مقبولیت میں کمی واقع نہیں ہوئی۔ اخبارات کے رجسٹرار [illegible]
کے مطابق اردو روزناموں کی تعداد ۶۸ ہے جو صرف ہندی سے کم ہے۔ ۱۹۸۱ء کے ہفتہ وار،
پندرہ روزہ، ماہنامے، سہ ماہی اور ششماہی رسالوں کی مجموعی تعداد ۲۷۲ ہے جو صرف انگریزی
اور ہندی سے کم ہے۔ صرف ایک اردو رسالے کی اشاعت ۸۲،۰۰۰ ہے۔

اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہرگز نہیں ہے، گوکہ اردو مسلمانوں کے مابین ایک رابطے کا کام انجام
دیتی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ ہر صوبہ کا مسلمان اپنی مادری اور علاقائی زبان کے ساتھ ساتھ عام طور پر اردو
بھی سیکھتا ہے۔ غیر مسلم یعنی ہندو، سکھ، جین اور عیسائی بھی اردو کو اپنی زبان سمجھتے ہیں اور اردو کی بقا
کے لئے اور ترقی کیلئے ویسا ہی کردار ادا کر رہے ہیں جیسا کہ مسلمان کرتے ہیں۔ اس طرح اردو کی بقا کا مسئلہ
مسلم اور غیر مسلم دونوں کا مسئلہ ہے اور اسی طرح ہونا بھی چاہئے۔

ملک کی تقسیم کے بعد لسانی اساس پر صوبوں کی تنظیم جدید اردو کی موجودہ بدحالی کی سب سے بڑی وجہ
ہے کیوں کہ اردو کسی بھی صوبہ میں اکثریت کی زبان نہیں ہے اس لئے یہ اپنے ہی گھر میں بے گھر ہو کر رہ گئی۔
(عام کشمیریوں کی زبان اردو نہیں ہے) اردو ہر صوبے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور کسی ایک صوبے کی
سرحدوں میں محدود نہیں ہے۔ نتیجتاً اسے کسی صوبائی حکومت کی سرپرستی میسر نہ آسکی۔ صرف اردو میں تعلیم یافتہ
کو کسی صوبے میں ملازمت نہیں مل سکتی۔ کئی صوبوں میں اردو مادری زبان رکھنے والے بچوں کو اردو میں تعلیم
حاصل کرنے کی دستوری سہولتیں مہیا نہیں ہیں۔ اردو کے عظیم و وسیع کردار کے باوجود اسے کسی قسم کا فائدہ
حاصل نہ ہو سکا۔ اور اس کا مستقبل تاریک ہو گیا۔ اس تلخ حقیقت کو ہندوستان کی صوبائی حکومتوں اور بالخصوص
یو۔پی اور پنجاب میں اردو کی موجودہ کسمپرسی کے پس منظر میں دیکھنا چاہئے۔ جہاں اردو کے ساتھ سوتیلی
اولاد کا سا سلوک روا رکھا گیا ہے جیسے اس کا ہندوستان پر کوئی حق نہیں رہا۔ پنجاب میں جہاں عام بول چال
پنجابی میں اور نوشت و خواند اردو میں ہوا کرتی تھی وہاں اب ہندی کو مادری زبان قرار دے دیا گیا ہے۔

اسی طرح کا رویہ سابق صدر کانگریس پرشوتم داس ٹنڈن، یو پی کے سابق وزیراعلیٰ جی بی پنت، یو۔پی کے
سابق وزیر تعلیم سمپورنانند، بہار اسمبلی کے سابق اسپیکر ایل این سدرشن نے بھی اپنایا تھا۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء تک اردو اور ہندی دونوں زبانیں فوقانی مدارس میں ذریعۂ تعلیم تھیں، ابتدائیہ کی نچلی سطح پر ان کے استعمال کی اجازت تھی۔ اعلیٰ ثانوی امتحانات میں بھی انھیں استعمال کیا جا سکتا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں ہائی اسکول بورڈ کے امتحان میں اردو زبان میں امتحان دینے والے طلبہ ۴۸ فیصد تھے۔ یو پی ماتھر سبھا (اردو کنونشن میرٹھ جون ۲۶ و ۲۷، ۱۹۶۵ء) کا کہنا ہے کہ "آزادی کے بعد ایسا لگتا ہے کہ اس صوبے میں ترقیاتی منصوبے بنانے کا پہلا کام اردو کو تباہ کرنا تھا۔ ۱۹۴۹ء وزیر تعلیم کی طلب کردہ کانفرنس نے تحتانوی تعلیم اور مادری زبانوں کے تعلق سے ایک قرارداد منظور کی تھی جس میں لسانی اقلیتوں کے ان حقوق کو تسلیم کیا گیا تھا لیکن حکومت یو۔پی نے اسے منظور نہیں کیا اور نہ اردو کے تعلق سے کانگریس ایک کمیٹی کی قرارداد پر توجہ دی۔ اس طرح اردو سے یو پی سرکار کا غیر ہمدردانہ رویہ اور مرکزی حکومت کی نااہلی نے اتر پردیش سے اردو کو بے دخل کر دیا۔ اس بات کی توثیق لسانی اقلیتوں کے کمشنر کی رپورٹ سے بھی کی جا سکتی ہے۔ پانچویں رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ۶۱-۱۹۶۰ء میں گورکھپور میں اردو مدارس کی تعداد ۴۵ تھی، دوسرے ہی سال وہاں ایک بھی اردو مدرسہ باقی نہ رہا تھا۔ ضلع غازی پور میں ۶۱-۱۹۶۰ میں ۳۶ اردو مدارس تھے، دوسرے سال یہ تعداد گھٹ کر ۳۰ ہوگئی۔ ضلع فتح پور میں ایک ہی سال میں ۲۸ سے گھٹ کر ۲۲ رہ گئی تھی۔

جن اضلاع میں نسبتاً بہتر انتظامات روا رکھے گئے تھے تحتانوی جماعتوں میں اردو طلبہ کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا۔ مثال کے طور پر مراد آباد ضلع میں اردو تحتانوی مدارس کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا۔ مثال کے طور پر مراد آباد ضلع میں اردو تحتانوی مدارس کی تعداد میں اضافے کے ساتھ ہی ۱۹۶۲ء میں تحتانوی جماعتوں میں اردو طلبہ کی تعداد ۱۰،۶۱۰ تک پہنچ گئی تھی۔ یہی حال بارہ بنکی کا بھی تھا جہاں مدارس کی تعداد ۲۹ سے بڑھ کر ۳۷ تک پہنچ گئی تھی اور دیگر کئی مدارس میں اردو تعلیم کا انتظام کر دیا گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی طلبہ کی تعداد ۲،۱۵۶ سے بڑھ کر ۴،۵۸۵ ہوگئی تھی۔ انتظامی سہولتوں اور مدارس کے خاتمے کے ساتھ ہی طلبہ کی تعداد بھی گھٹ گئی۔ کمشنر کی ساتویں رپورٹ میں جو اعداد و شمار دیئے گئے ہیں وہ اہمیت کے حامل ہیں:

۶۰-۱۹۵۹ء	تحتانوی مدارس	متعلقہ جماعتیں	طلبہ کی تعداد	مدرسین کی تعداد
یو پی	۱،۲۸۵	۴۲۷	۱۰۰،۴۶۵	۲۵۲۵

دوران ۶۴ اور ۶۶-۱۹۶۵ء میں ۲۵۰ اردو مدرسین کا تقرر کیا گیا تھا، اس کے مقابلے میں سنسکرت کے مدرسین کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ ہوا تھا۔ چند اور مشکلات جن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ یہ ہیں:

(ا) بازاروں میں اردو کی کتابیں دستیاب نہیں ہوتیں۔

(ب) اختیاری مضامین کے لئے جو اردو کتب مقرر کی جاتی ہیں ان پر نظر ثانی نہیں کی جاتی، طلبہ کی استعداد کے لحاظ سے ان کتابوں کا معیار بہت بلند ہوتا ہے۔

(ج) داخلے کے فارموں میں مادری زبان سے متعلق کوئی کالم نہیں ہے۔

(د) اسلامی مکتب اور مدرسوں کے معائنے کی رپورٹ ہندی میں لکھی جاتی ہے جو ایک نامناسب طریقہ ہے

(ھ) آزادی کے بعد معائنہ کرنے والے عملے اور عہدہ داروں کا جو تقرر ہوا ہے ان میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو قطعاً اردو جانتے ہی نہیں۔

سیاسی سطح پر بھی اسمبلی اور پارلیمنٹ کے ارکان کو ان کی اپنی مادری زبان میں حلف لینے کے دستوری حق سے محروم کردیا گیا ہے۔

ڈی۔ ای اسمتھ نے دستور کی دفعہ ۲۹ جس میں اس بات کی ضمانت دی گئی ہے کہ "اگر کسی اقلیت کی اپنی ایک زبان، رسم الخط اور تہذیب ہے تو اسے اس بات کا حق ہے کہ وہ اس کی حفاظت کرے" کے تعلق سے اظہار خیال کیا ہے کہ "عملی طور پر اس ضمانت کی کوئی اہمیت نہیں ہے"۔ ہندوستانی مسلمان کس طرح اپنی تہذیب کی حفاظت کر سکتے ہیں جب کہ ان کے بچوں کی مادری زبان کو تحتانوی مدارس سے ختم کر دیا گیا ہے۔ تمام شمالی ہندوستان یعنی یو۔پی، بہار، مدھیہ پردیش اور راجستھان میں اردو کو مدارس میں ذریعے تعلیم کی حیثیت سے ختم کر دیا گیا ہے۔ وسطی ہند میں جو بعد میں مدھیہ پردیش کا علاقہ بن گیا ۱۹۴۹ء میں ایک قانون کے ذریعے دیوناگری رسم الخط میں بجز ہندی کے کسی دوسری زبان کے استعمال کو جرم قرار دے دیا گیا تھا۔ پنجاب میں انتظامیہ اور عوامی تعلیمی اداروں میں اردو کے استعمال پر پابندی عائد کردی گئی۔ مئی ۱۹۴۸ء میں یو۔پی سرکار نے ایسے قوانین جاری کیے کہ بچوں کو صرف ہندی کے ذریعے ہی تعلیم دی جائے گی۔ نئے نصاب کے مطابق ایک ایسا بچہ جس کی مادری زبان اردو ہو اپنی زبان سیکھ ہی نہیں سکتا جب تک کہ وہ چھٹے درجے تک نہ پہنچ جائے، جہاں اردو بحیثیت اختیاری مضمون پڑھائی جاتی ہے۔ نتیجتاً آزادی کے بعد اردو نے بہت کم ترقی کی ہے۔

اردو کے مستقبل کے تعلق سے مسلمانوں کی بے چینی بجا ہے۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ اردو ایک ایسی بدقسمت زبان ہے جو اپنے بچپن ہی میں یتیم، جوانی میں بیوہ اور بڑھاپے میں ناگوار مصیبت بن کر رہ گئی۔ اسے اپنے پیدائشی مقام ہی میں تسلیم نہیں کیا گیا اور گھر سے بے گھر کر دیا گیا۔" اس معاملہ میں جمہوری جانتوں

کی بے اعتنائی سے مسلمانوں کو دھکا لگا ہے اس سلسلہ میں جن سنگھ کا رویہ بہت واضح ہے، جو اردو کے خلاف زہر اگلنے کا کوئی موقعہ ضائع نہیں کرتی۔ بلراج مدھوک کے مطابق " اردو فرقہ واریت کے شعلوں کو ہوا دیتی ہے اور مسلمانوں کو قومی دھارے میں شریک ہونے سے روکتی ہے " جن سنگھ یہ الزام عائد کرتی ہے کہ یو۔پی اور بہار میں اردو کیلئے جو تحریکات چلائی جاتی ہیں ان کیلئے پاکستان سے امداد آتی ہے تاکہ اس سے ملک کی مزید تقسیم کی جائے۔ اس کے علاوہ، اردو کو ایک خاص علاقہ دے کر اسے کسی صوبے میں دوسری زبان کا درجہ دینے کا مطلب علیحدگی پسندی اور مخالف قومی یکجہتی رجحانات کی ترغیب دینا ہوگا۔

صرف کیمونسٹ پارٹی نے غیر مشروط طور پر اردو کی حمایت کی ہے۔ ۱۹۵۷ء اور ۱۹۶۱ء کے انتخابی منشور میں کیمونسٹ پارٹی نے اردو کی شکایات کو دور کرنے پر زور دیا ہے۔ کیمونسٹ پارٹی آف انڈیا کی مرکزی مجلس عاملہ نے مندرجہ ذیل اقدامات کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔

(ا) ثانوی سطح پر ایسے بچوں کے لئے اردو ذریعۂ تعلیم ہونا چاہیے جن کی مادری زبان اردو ہے۔

(ب) جن علاقوں میں اردو بولنے والے کافی تعداد میں رہتے ہوں، وہاں اردو ذریعۂ تعلیم کے فوقانی مدارس قائم کیے جائیں۔

(ج) جن لوگوں کی مادری زبان اردو ہے ان کے لئے یونیورسٹی کی سطح تک تعلیمی اداروں میں اردو ذریعۂ تعلیم کا انتظام کیا جائے۔

(د) جن علاقوں میں اردو داں عوام کی قابلِ لحاظ تعداد آباد ہو ان علاقوں کی عدالتوں اور دیگر دفاتر میں اردو میں لکھی ہوئی درخواستیں قبول کی جائیں۔

(ہ) تمام اہم نوٹسوں، سرکاری گزٹوں اور اشتہاروں وغیرہ کو اردو میں بھی جاری کیے جائیں ایسے کاغذات جو عام طور پر عوام کے استعمال کے ہوتے ہیں مثلاً انتخابی فہرستیں، راشن کارڈ وغیرہ اردو میں بھی شائع کیے جانے چاہئیں۔

(و) تمام سائن بورڈ اور دوسری چیزیں جو حکومت کی جانب سے عوام کی سہولت کیلئے مہیا کی جاتی ہیں اردو میں بھی لکھی جانی چاہئیں۔

(ز) ایسی تہذیبی و ادبی انجمنوں کو جو اردو کی ترقی اور اشاعت کے کام انجام دیتی ہوں مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی جانب سے خاطر خواہ مالی امداد ملنی چاہیے۔

(ح) صوبائی اور مرکزی حکومتیں سیکولر اور جمہوری ذہنیت کے لوگوں کی کمیٹیاں تشکیل دیں تاکہ وہ مندرجہ بالا اقدامات کے نفاذ کی نگرانی کر سکیں۔

مخالف جماعتوں نے جن سنگھ کے ساتھ مل کر مخالف اردو مہم چلا رکھی ہے۔ اس مسئلے میں مسلمانوں کا تعلق خاطر فطری ہے۔ اردو ان کی "بہت اہم تہذیبی اور مذہبی ضرورت ہے"۔ مصنف کا کہنا ہے کہ:

"اردو کے ساتھ روا رکھی گئی ناانصافی مسلم اقلیت میں ہراسانی کا سب سے بڑا سبب ہے"۔ مسلمانوں کو اس بات کا خطرہ ہے کہ انھیں ان کی زبان سے محروم کیا جا رہا ہے جس کی اہمیت مذہبی عقائد کے بعد سب سے زیادہ ہے۔ انتظامیہ کے نو برسوں میں جہاں دیگر امور میں بہت کچھ کیا گیا اس سلسلے میں کسی قسم کی کارروائی نہیں کی گئی اور نہ کسی قسم کی بہتری کی توقع کی جا سکتی ہے۔

۱۹۵۱ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین نے یو۔پی کے وزیر تعلیم کو لکھنؤ کے زائد از دس ہزار شہریوں کی طرف سے درخواستیں پیش کی تھیں جن میں یہ مطالبہ کیا تھا کہ ان کے بچوں کو اردو کے ذریعے تعلیم دی جائے۔ ۱۹۵۴ء میں انجمن ترقی اردو نے صدر جمہوریۂ ہندستان کی خدمت میں ایک یادداشت پیش کی تھی جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ اردو کو یو۔پی کی علاقائی زبان بنایا جائے۔ اس محضر پر ۲۰۰۰ سے زائد بالغ شہریوں اور ۱۲۰۰ [illegible] نابالغ [illegible] لوں نے دستخط کئے تھے۔

۱۹۵۶ء میں اسی طرح کا ایک اور محضر پیش کیا گیا تھا جس میں اردو کو بہار کی علاقائی زبانوں میں سے ایک زبان قرار دینے کا مطالبہ کیا گیا تھا اور اس محضر پر (۹۱۵۰۰۰) بالغ شہریوں نے دستخط کیے تھے لیکن ان پر کسی طرح کی کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔

۱۹۵۸ء میں انجمن ترقی اردو نے صدر جمہوریۂ ہند سے دوسری بار نمایندگی کی اور یو۔پی، بہار، دہلی اور پنجاب میں اردو کو علاقائی زبان بنانے کا مطالبہ کیا تھا۔

آل انڈیا سالیڈیریٹی کونسل نے بھی اردو کے ساتھ انصاف کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ ۱۹۶۵ء میں ایک سو ارکان پارلیمان نے وزیر اعظم ہند کو ایک یادداشت پیش کی جس میں زور دیا گیا تھا کہ "اردو کو یو۔پی، بہار، مدھیہ پردیش، دہلی، پنجاب اور راجستھان میں سرکاری طور پر تسلیم کیا جائے اور گجرات، مہاراشٹر، مدراس اور میسور اور مغربی بنگال میں اردو کو خاطر خواہ سہولتیں فراہم کی جائیں جہاں کی لسانی اقلیتیں اردو کو اپنی مادری زبان کہتی ہیں"۔ ۱۹۶۷ء میں عام انتخابات میں کانگریس کو یو۔پی اور بہار میں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ متحدہ محاذ کی حکومت نے اردو کے ساتھ انصاف کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن اردو بولنے والوں کے حصے میں مایوسی کا احساس آیا۔ حال ہی میں اردو کمیشن نے وزیر اعظم کو ایک اور میمورنڈم پیش کیا ہے اس وفد کی قیادت آنند نرائن ملا رکن پارلیمان نے کی تھی۔ اس میں کہا گیا کہ لسانی عصبیت اور حکمران طبقے کی تنگ نظری اردو کے حق میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

اردو کی شکایات رفع کرنے کیلئے اردو داں عوام محضروں اور نمایندگی کا راستہ اختیار کرنے پر یقین رکھتے

ہیں ادراس کا یہ ایقان ہے کہ اگر دستور میں دی گئی ضمانتوں کا نفاذ عمل میں لایا جائے تو اردو کے ساتھ کی جانے والی ناانصافی ختم ہو جائے گی لیکن اس گداگرانہ طرزِ عمل سے کسی طرح کی کامیابی نہیں ہوئی۔ محرومی اور ناکامی کے احساسات کے ردِ عمل کے طور پر اردو بولنے والے عوام کے کچھ طبقوں نے مظاہرے کرنا شروع کر دیئے۔ اردو محاذ ان مظاہروں کی افادیت پر یقین رکھتا ہے۔

یہاں دو باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ اردو آج بھی ہندوؤں کے طبقے کی محبوب زبان ہے۔ پنڈت سندر لال کہتے ہیں کہ "اس سے بڑھ کر میری خوش نصیبی اور کیا ہو سکتی ہے کہ میں اردو اور اسلام کے مفادات کی حفاظت کی خاطر اپنی جان دے دوں۔" اس طرح شخصی حمایت کی بجائے ان ساری جماعتوں کی حمایت کا حصول زیادہ مفید ہوگا جو اردو کے فروغ کے کام کی خواہاں ہیں یعنی ان افراد کی تائید و حمایت کی جائے جو ملک میں حقیقتاً سیکولرزم لانا چاہتے ہیں اس طرح دو مقاصد پورے ہوں گے۔ اردو [illegible] ملک کی جدید سے مسلم سیاست کا غیر ترقی پسند کردار۔ مسئلے کو اس پہلو سے دیکھنے [illegible] سب سے آسان حل مسلمانوں کا اتحاد ہے "ریڈینس" متنبہ کرتا ہے کہ

"ہمیں اردو کے تحفظ کیلئے اپنی تمام قوتوں کو ایک [illegible] اتحاد کرنا چاہئے۔ احتجاج خودکشی قربانی یا دھمکیاں اردو کے لئے مددگار [illegible] یہ روش مخالف ہندو تنظیموں کو یہ کہنے کا موقع فراہم کرتا ہے کہ اردو کا مسئلہ فرقہ وارانہ سیاسی مقاصد کے لئے اٹھایا جا رہا ہے۔"

مسلمانوں کو جو کام انجام دینے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ وہ قومی سیاسی امور [illegible] سیکولر [illegible] کے ساتھ صدقِ دل سے تعاون کریں۔ قومی زندگی میں بھرپور حصہ لیں اور سیکولرزم پر اپنے یقین کو مستحکم بنائیں۔

دوسری بات یہ کہ یو پی کے اردو بولنے والوں کا طریقۂ کار غلط طرز کا ہے۔ اردو [illegible] نرائن ملا کا خیال ہے کہ "ہندوستان کی صرف ایک ہی زبان ہونی چاہئیے" یہ بات [illegible] اردو کے لئے نقصان دہ ہے بلکہ ملک کے تہذیبی مستقبل کیلئے بھی خطرناک ہے۔" ایک زبان کی [illegible] کے مفادات کی حفاظت کیلئے کام کرنے کی نوعیت کسی طرح ایک نہیں ہو سکتی۔ [illegible] قومی زبان نہیں ہے اردو تحریک کے قائدین اس بات میں یقین رکھتے ہیں کہ ہندی کے ادیبوں کی حمایت کے لئے اردو کا تحفظ ممکن نہیں۔ لیکن یہ حمایت اردو کی قربانی دے کر حاصل نہیں کی جانی چاہیئے [illegible] کے اردو اور ہندی ادیبوں کے ایک دستخط شدہ بیان (۱۹۶۷ء) میں یہ بات تسلیم کر لی گئی تھی کہ [illegible] ہندی ہی صوبہ کی سرکاری زبان ہے۔" ان میں سے کچھ نے اردو کا رسم الخط بدلنے کی وکالت بھی شروع کر دی تھی جو شکست خوردگی کی بدترین مثال ہے۔ اردو والوں کی ناکامی اور محرومی کا تجزیہ کرنے [illegible]

گوپال متل نے کہا تھا کہ انھیں اردو کے تحفظ کی خاطر آواز اٹھانے کے لئے اپنے آپ جرأت پیدا کرنی چاہیئے۔ اس سلسلے میں جمہوری طریقہ یہی ہے کہ وہ لسانی اقلیتوں سے تعاون حاصل کرکے ایک مشترکہ مقصد کیلئے کام کریں، اور جب وہ محسوس کریں گے کہ مختلف زبانوں کے لئے اور ایک زبان کے تصور کے خلاف لڑنا ہندستان کی روایت کے عین مطابق ہے تو انھیں پتہ چلے گا کہ ان کی تحریک فرقہ وارانہ بنیادوں پر نہیں ہے۔ ہندی کی آمریت کے خلاف آواز اٹھانا ملک کی صحیح خدمت کرنے کے برابر ہے۔"

لیکن گوپال متل کا رویہ بھی پورے طور پر صحیح نہیں ہے انھوں نے ان عناصر کو پہچاننے میں غلطی کی جو ہندی کے خلاف لڑ رہے ہیں اور انھوں نے دوسری لسانی اقلیتوں سے تعاون حاصل کرنے کا کوئی طریقہ بھی نہیں بتایا۔ ان کا یہ فیصلہ کہ ایک سیکولر اور سوشلسٹ حکومت کا قیام اردو کے تحفظ کی ضمانت نہیں ہے ادب اور سیاست میں ان کے غیر ترقی پسندانہ رویہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس سے سوائے اس کے اور کوئی نتیجہ نہیں نکلتا کہ ہندستانی مسلمانوں کو مذہب آمیز سیاست سے چمٹے رہنا چاہیئے۔ اردو کے تحفظ کا مسئلہ بنیادی طور پر سیکولرزم اور جمہوریت اور ہندی کی ترویج و اشاعت کا سوال ہے۔ صرف ایک سیکولر ریاست ہی میں دستور میں دی گئی ضمانتوں پر عمل کیا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر مقبول فاروقی

ترائیلے

ہستی پہ اپنی سایہ فگن چند خواب تھے
جھلسا رہی تھی دھوپ وگرنہ حیات کی
منظر بھی سارے آنکھوں پہ اپنی عذاب تھے
ہستی پہ اپنی سایہ فگن چند خواب تھے
تپتے سفر میں جیسے سروں پر سحاب تھے
مدھم تھی جن کے دم ہی سے لو حادثات کی
ہستی پہ اپنی سایہ فگن چند خواب تھے
جھلسا رہی تھی دھوپ وگرنہ حیات کی

غزل

آج جو کچھ بھی سخن میری زبانی لکھنا
کل کو جب میں نہ رہوں میری کہانی لکھنا
تم مجھے یاد رکھو کوئی بھی عنواں سے ہی
دوست گر لکھ نہ سکو دشمن جانی لکھنا
اپنی تحریر کو ہم خود ہی بدل لیتے ہیں
کوئی آساں نہیں جو دل میں ہے ٹھانی لکھنا
یہ کوئی رسم سہی پر ہمیں منظور نہیں
دھوپ کو چاندنی اور آگ کو پانی لکھنا

اپنے بے کیف سے حالات کہاں تک لکھیں
جی تو چاہے ہے کوئی پریوں کی کہانی لکھنا

رمن راج سکسینہ

ڈاکٹر زور ـــــ ایک یادگارِ زمانہ شخصیت

بیسویں صدی کے ربع اول میں جو ممتاز شخصیتیں دکن میں پیدا ہوئیں، ان میں بجا طور پر ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کا شمار کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر زور ایک ٹھیٹ حیدرآبادی تھے اور انھیں دکن کی ہر چیز سے پیار تھا۔ وہ ۲۵ دسمبر ۱۹۰۵ء میں حیدرآباد کے ایک قدیم اور اس زمانے کے بارونق محلہ ستارہ گنج میں پیدا ہوئے اور یہاں بڑے بڑے امرا کے وسیع اور شاندار ایوانات اسی محلہ ستارہ گنج میں واقع تھے۔ ڈاکٹر زور کا سلسلۂ نسب حضرت سید شاہ علی سانگڑے سلطان سے ملتا ہے۔ آپ کے والد ... کے نامی گرامی صوفی حضرت سید شاہ غلام محمد قادری زعم کے فرزند تھے۔ صوفیانہ روایتیں ڈاکٹر زور کو ورثہ میں ملی تھیں۔ سینہ بے کینہ اور تعصب سے پاک تھا۔ رواداری، وضعداری، اخلاص و اخوت کا پیکر تھے۔

بچپن کا زمانہ حیدرآباد کے قدیم مدرسوں یعنی حسینی علم کے کالستہ پاٹھ شالہ اور کوٹلہ عالی جاہ کے مفیدالانام ہائی اسکول میں گذرا۔ عثمانیہ کالج میں زندگی کے کچھ سال گزارے۔

جامعہ عثمانیہ میں پروفیسر وحیدالدین سلیم نے ان میں ایسا ستھرا ادبی ذوق پیدا کر دیا کہ گریجویشن کے فوری بعد ادبی تنقید پر اپنی پہلی کتاب "روحِ تنقید" پیش کی۔ اس کتاب کی اشاعت کے وقت ان کی عمر بیس یا اکیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ یہ جامعہ عثمانیہ کی جانب سے پہلی ادبی پیش کش تھی۔ ارباب جامعہ عثمانیہ نے زور صاحب کی قابلیت اور صلاحیت کو مدنظر رکھتے ہوئے انھیں یوروپین اسکالرشپ دے کر مزید تحقیقی کام کے لیے جامعہ لندن میں داخلہ دلایا۔ اس زمانہ میں عام خیال یہ تھا کہ پروفیسر وحیدالدین سلیم کی سبکدوشی کے بعد ڈاکٹر زور ہی ان کے جانشین ہوں گے۔

تین سال کی مسلسل تحقیق کے بعد ڈاکٹر زور نے عادل شاہی اور قطب شاہی دور کے مخطوطات پر جو یورپ کے مختلف کتب خانوں میں یہاں وہاں محفوظ تھے اور برٹش میوزیم اور انڈیا آفس میں

رکھے ہوئے تھے انھیں پیشِ نظر رکھ کر ایک کتاب "اردو شہ پارے" مرتب کی۔ جامعہ لندن سے پی ایچ ڈی کا طیلسان حاصل کیا اور جامعہ پیرس سے لسانیات کا ڈپلوما لے کر وطن واپس ہوئے۔

تین چار سال بعد جب وہ یورپ سے حیدرآباد واپس ہوئے تو اس مختصر عرصہ میں جامعہ عثمانیہ کا علمی ماحول کافی بدل گیا تھا۔ مقامی اردو داں اصحاب میں عجیب احساسِ کمتری پیدا ہو گیا تھا۔ دکنی نوجوان لوگوں نے [illegible] لکھنا شروع کر دیا جنھیں اپنی علمیت [illegible] کے پڑھے لکھے اصحاب اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کے باوجود کسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہوئے جھجکتے تھے۔ جامعہ عثمانیہ میں بحیثیت استاد اپنے تقرر کے بعد ڈاکٹر زور نے پہلا کام تو یہ کیا کہ باصلاحیت طلبہ سے مختلف موضوعات پر مضامین لکھوانے اور انھیں چھوٹی چھوٹی کتابوں کی صورت میں شائع کرتے رہے۔ اس طریقِ کار سے مقامی لوگوں میں جو احساسِ کمتری پیدا ہو گیا تھا وہ جاتا رہا۔ ڈاکٹر زور نے ایک ایسے ادبی مرکز کے قیام کی شدید ضرورت محسوس کی جس کے ذریعہ دکن کے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کی اشاعت ممکن ہو سکے۔ اس طرح ۱۹۳۱ء میں محض چار سو روپے کے خانگی عطیہ کے ساتھ "ادارۂ ادبیاتِ اردو کی بنا ڈالی گئی جو گذشتہ نصف صدی سے دکن میں ریسرچ سنٹر کی حیثیت سے کام کر رہا ہے اور اپنے بانی کی ایک زندہ یادگار ہے۔

ڈاکٹر زور اسی خاکِ دکن کے فرزند تھے۔ وہ یہاں کے لوگوں کی صلاحیتوں اور کمزوریوں سے خوب واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ دکن کے لوگ بڑے محنتی ہوتے ہیں اور جب ارادہ کر لیں تو بڑے سے بڑے کام سرانجام دے سکتے ہیں لیکن وہ اس حقیقت سے بھی واقف تھے کہ یہاں کے لوگ ضرورت سے زیادہ انکساری سے کام لیتے ہیں۔ اپنا پروپگنڈہ خود آپ کرنا ناپسند کرتے ہیں اس لیے کہ یہاں کئی صاحبانِ علم و فن پیدا ہوئے لیکن اپنی اسی انکساری کی وجہ سے وہ ایک محدود حلقے تک متعارف رہے اور اپنے کمالِ فن کو عام طور پر منوا نہ سکے انھیں ہندوستان گیر شہرت حاصل نہ ہو سکی۔ ڈاکٹر زور دکن والوں کی اس کمزوری سے خوب واقف تھے کہ یہ لوگ کسی نئے کام کو شروع کرنے سے پہلے اس کام کو ملتوی رکھنا یا پھر ٹال دینا پسند کرتے ہیں اور "حیدرآباد کی کل" ان کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ اپنے چہیتے شاگرد پروفیسر حفیظ قتیل سے انہوں نے فرمایا کہ

" کوئی قلم اٹھاتے ہی نوبل پرائز ہولڈر نہیں بن جاتا۔ برسوں قلم گھسنا پڑتا ہے تب کہیں ایک معیار پیدا ہوتا ہے مگر یہ بات ہم دکنیوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ چاہتے ہیں کہ لکھیں گے تو معرکہ کی کہانیاں لکھیں گے ورنہ نہیں لکھیں گے

نتیجتاً اسی طرح گمنامی میں مرجاتے ہیں۔"

ڈاکٹر زورؔ اس بات کے قائل تھے کہ یہ کام فوری شروع کیا جائے اور ایک ہی وقت میں وہ کئی کام کرنے کے قائل تھے وہ جلد سے جلد کام کی تکمیل کرنا چاہتے تھے۔ وہ ایک ہی وقت میں اپنی کئی کتابوں کا مواد فراہم کرتے جاتے تھے اور کئی کتابیں ایک ساتھ ترتیب دیا کرتے تھے۔

تقسیم ہند اور انضمام حیدرآباد کے بعد کچھ لوگ بے حاصد سوادی کی بنا پر پریشان تھے لیکن ڈاکٹر زورؔ کے حوصلوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اب جو تبدیلی آئی ہے اس کے باعث کام کرنے کے مواقع اور میدان بدل گئے ہیں ہم اردو والے اب تک حکومت کے زیرِ سایہ کام کرتے تھے اب اردو والوں کو اپنے عزم اور عمل کی بناء پر آگے بڑھنا ہے اور کام کرنے کا یہی تو اصل وقت ہے۔

۱۹۵۶ء میں جب لسانی ریاستیں قائم ہوئیں اور ریاست حیدرآباد کے کئی بارونق اضلاع ہمسایہ ریاستوں میں شامل کر دیئے گئے تو دکن کے کئی صاحب فہم حضرات ان لسانی ریاستوں کے آئندہ کام کاج سے متعلق طرح طرح کے اندیشوں میں مبتلا تھے لیکن اس لسانی انقلاب کا ڈاکٹر زورؔ پر کوئی اثر نہ ہوا وہ اس بات سے خوش اور مطمئن تھے کہ آندھرا پردیش کی موجودہ ریاست کے حدود وہی ہیں جو کبھی گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت کے حدود تھے وہ اپنی جگہ سمجھ رہے تھے کہ گولکنڈہ کی قدیم سلطنت، ریاست آندھرا پردیش کے روپ میں اب پھر سے قائم ہوگئی ہے۔

ڈاکٹر زورؔ کو گولکنڈہ کے قطب شاہی تمدن سے ہمیشہ دلچسپی رہی اور ان کی اس دلچسپی کا اظہار ان کے افسانوں سے ہوسکتا ہے جو "سیر گولکنڈہ" اور "گولکنڈے کے ہیرے" کے نام سے شائع ہوچکے ہیں۔

قیام آندھرا پردیش کے بعد ۱۹۵۸ء میں ڈاکٹر زور نے بانی شہر حیدرآباد اور اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کی یاد میں ایک شاندار جلسہ شہر حیدرآباد سے تقریباً بارہ میل دور محمد قلی قطب شاہ کی گنبد کے قریب گولکنڈہ میں منعقد کیا۔ اس جلسہ کی صدارت اس وقت کے ہردل عزیز گورنر عالی جناب بھیم سین سچر نے فرمائی تھی۔ یوم محمد قلی قطب شاہ کی یہ تقاریب گزشتہ اکیس سال سے ادارۂ ادبیات اردو کے زیرِ اہتمام بڑی پابندی سے منائی جارہی ہیں اور دکن کے ایک قومی تہوار کا درجہ رکھتی ہیں۔

ڈاکٹر زورؔ نوابانہ آن بان سے زندگی بسر کرتے تھے۔ ہواخوری کے لیئے بھی وہ موٹر پر جاتے تھے بس میں انہوں نے کبھی سفر نہیں کیا البتہ ایک مرتبہ جب وہ دہلی تشریف لے گئے تھے تو ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، جگن ناتھ آزاد اور حسن نعیم نے ان سے بہ اصرار کہا کہ کناٹ پیلس سے بس یونیورسٹی کو روانہ ہوتی ہے اس لیئے وہ بس سے تشریف لے جائیں ٹیکسی میں روپیہ خواہ مخواہ برباد ہوگا۔ وہ اس اصرار کی بناء پر کناٹ پیلس سے بس کے ذریعہ

یونیورسٹی روانہ ہوئے۔ دوسرے دن جب ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے ڈاکٹر زورؔ سے رسماً پوچھا کہ بس میں آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔ بس ڈاکٹر زورؔ ان پر برس پڑے اور کہنے لگے۔

"آپ سب نااہل ہیں۔ بالکل نکمّے' میرے بار بار منع کرنے پر بھی آپ لوگوں نے مجھے بس میں بٹھا دیا۔ یونیورسٹی کا ہے کو ہے' جنگل ہے جنگل مجھے کیا معلوم مکان کہاں ہے۔ رات کے بارہ بجے تک ڈھونڈتا پھرتا رہا"۔

زورؔ صاحب بڑے خوش وضع اور خوش مزاج انسان تھے۔ وہ بہت جلد بگڑتے اور جلد ہی مان جاتے تھے۔ ان کی خفگی میں بھی خلوص کا رنگ ہوتا تھا' مجھ سے اکثر کہا کرتے تھے ادارہ کا کوئی کام نہیں کرتے' بالکل بے کار آدمی ہو میں نے تمہارے متعلق بہت کچھ سوچا تھا' مگر جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ وہ میرے غیاب میں دوسروں سے کہتے کہ رمن راج اور دوسرے نوجوان' ادارہ کا کام کرتے ہیں تو مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے' اردو کا کام اب بوڑھوں کو نہیں' نوجوانوں کو کرنا چاہئے۔

زورؔ صاحب ایک باغ و بہار انسان تھے' فکر غرور اور خود پسندی انھیں چھو کر بھی نہیں گئی تھی ہر کسی سے برابر کا سلوک کرکے خوش ہوتے۔ خود کسی سے مرعوب ہوتے اور نہ کسی کو مرعوب کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اچھے تن و توش کے انسان تھے۔ کھلا ہوا رنگ' بال کے تاثا۔

کہتے ہیں کہ آخری زمانہ میں ذیابیطس کا عارضہ ہوگیا تھا مگر انہوں نے کبھی کسی سے ذکر نہیں کیا اور نہ اس سے پرہیز کیا۔ کام اس قدر تھے آرام لینے کی مہلت ہی نہ تھی۔

ڈاکٹر زورؔ کے حصہ میں ۵۷ سال کی مختصر زندگی لکھی تھی اس مختصر دور حیات میں ڈاکٹر زورؔ نے وہ وہ کام سرانجام دیئے ہیں جو شاید ایک انجمن سے بھی پایۂ تکمیل کو پہونچ نہ سکتے' وہ بیک وقت نثر نگار' ادیب' شاعر' نقاد' مورخ' افسانہ نگار' اچھے معلم اور غیر معمولی تنظیمی صلاحیتوں کے مالک تھے۔

ڈاکٹر زورؔ کو انتقال کئے پورے اکیس سال ہوگئے ہیں لیکن ان کی جیتی جاگتی تصویر آج بھی ہماری آنکھوں کے سامنے ہے ان کی تازہ اور توانا یاد ہم سے بار بار کہہ رہی ہے ؎

موت سے بھی مر نہ سکے ہم زورؔ ہم
زندگی میں جو کچھ کام کر جائیں گے

یا پھر یہ کہ ؎

زندگی سانس لیتی رہے گی یوں ہی
زندہ دل ہنستے ہنستے گذر جائیں گے ●●

رحمٰن جامی

نذرِ محمد قلی قطب شاہ

قلی تیرا دکن خرّم و آباد رہے
وہ کام کیا ہے کہ سدا یاد رہے
محکوم ترے دَور میں آزاد رہے
ہر حال میں مسرور رہے شاد رہے
حیدرآباد حسیں شہر بسایا تو نے
پیار ہی پیار کا احساس جگایا تو نے

تیری محبت ہی محبت ٹھہری
و تیری محبت ہی محبت ٹھہری
و تیری محبت ہی محبت ٹھہری
تیری محبت ہی محبت ٹھہری
تو نے بھی اپنی محبت کی نشانی دی ہے
چار مینار سی عظمت کی نشانی دی ہے

اوصافِ حمیدہ میں گناؤں کیا کیا
تصویر زمانے کو دکھاؤں کیا کیا
ٹ پڑتا ہے خزانہ میں چھپاؤں کیا کیا
ریہ کہ تری بات بتاؤں کیا کیا
پہلا اردو کا ہے تو صاحب دیواں شاعر
اہلِ دل اہلِ وفا یعنی کہ انساں شاعر

قومی یکجہتی ترے دَور کی تہذیب رہی
بات ٹالی نہ گئی بھاگ متی نے جو کہی
رود موسیٰ بھی ترے عزم کے ہمراہ بہی
تو نے ہنس ہنس کے محبت کی ہر اک چوٹ سہی
زندگی تو ہے ادا تو ہے جوانی تو ہے
مختصر یہ کہ محبت کی کہانی تو ہے

آج آئے ہیں تری یاد منانے کے لئے
دل میں سوئے ہوئے جذبات جگانے کے لئے
اپنی بگڑی ہوئی ہر بات بنانے کے لئے
عزم کرتے ہیں ترے در پہ نبھانے کے لئے
زندگانی کی کبھی رات نہ ہونے دینگے
شہر میں تیرے فسادات نہ ہونے دینگے

O

سنائی۔ محفلِ شعر میں رحمت یوسف زئی، نورالنساء تسکین، رشید ارشد نے کلام سنایا۔

۲۰ر نومبر: ہفتہ کتب خانہ کے موقع پر اسٹیٹ سنٹرل لائبریری میں سہ لسانی مشاعرہ ڈاکٹر ایم راما ریڈی، ڈپٹی ڈائرکٹر تلگو اکیڈیمی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر ریڈی، ڈاکٹر نگم علی احمد جلیلی، کنول پرساد کنول، امیر احمد خسرو، اوم پرکاش نرمل، نہپال سنگھ ورما، صلاح الدین نیر، علی الدین نوید، رئیس اختر، فیض الحسن خیال، عزیز قیصر، رحمن جامی اور منیر الزماں منیر نے کلام سنایا۔

۲۴ر نومبر: علامہ اقبال کے ہم عصر دکن کے بزرگ سخنور حضرت شاہ محمد چندا حسینی ناقی کوہ سولر نظامی شاہ پوری کا مجموعۂ کلام "سخن ناقی" مرتبہ وقار خلیل، کرناٹک اردو اکیڈیمی کی اعانت سے حیدرآباد میں طبع ہوا۔

۲۵ر نومبر: جناب میر احمد علی الہام واحدی کو ان کے مقالہ "شاب اورنگ آبادی شخصیت اور فن" پر ایم فل کی ڈگری عثمانیہ یونیورسٹی کی طرف سے دی گئی۔ جناب واحدی ان دنوں اردو گھر میں اردو تعلیمی تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

۲۶ر نومبر: بزرگ نعت گو شاعر الحاج فخر الدین رازی، جن کا نعتیہ مجموعہ کلام "تجلیاتِ حرم" کے نام سے چھپ چکا ہے، مختصر علالت کے بعد انتقال ہوا۔

۲۷ر نومبر: اردو مجلس کا ماہانہ ادبی اجلاس جناب بھارت چند کھنہ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جناب حاتم حسن سعید پرنسپل کالج آف لینگویجز نے "ہم اور ہمارا انسانی شعور" کے زیر عنوان مقالہ اور جناب رشید الدین نے "حالی کا تنقیدی شعور" پر مضمون سنایا۔ محفلِ شعر میں اسحٰق ایوبی، سرینواس لاہوٹی اور معتمد اردو مجلس جناب صلاح الدین نیر نے کلام سنایا۔

● اقلیم ادب کی طرف سے جناب حبیب عبدالرحمن باعقیل حبیب محوی (وفات ۲ر نومبر ۱۹۸۳ء) کی یاد میں ادبی اجلاس اور مشاعرہ جناب نظیر علی عدیل کی صدارت میں منعقد ہوا۔ عدیل، رحمن جامی اور مسعود مفکر نے محوی مرحوم کی شعری صلاحیتوں اور ان کی زندگی پر تعزیتی تاثرات پیش کئے۔ محفلِ شعر میں عدیل، جامی، امان ارشد، صاحبزادہ کلیم، مسعود مفکر اور منیر صدیقی نے کلام سنایا۔

.CEMBER 1983

R. N. |
Regd. H/|

The "SABRAS" Urdu Monthly

Organ of "Idara-e-Adabiyat-e-Urdu", Aiwan-e-Urdu, Hyderabad-500 004. (A.

National Fine Printing Press, Charkaman, Hyd.